منتخب سوویت ادب کی لائبریری

ن۔ آستراوسکی

دار و رسن کی آزمائش

نکولائی آستراوسکی

دار و رسن کی آزمائش

غیرملکی زبانوں کا دارالاشاعت
ماسکو

Н. ОСТРОВСКИЙ

КАК ЗАКАЛЯЛАСЬ СТАЛЬ

نکولائی آستراوسکی

نکولائی آستراوسکی سوویت یونین کے ممتاز ادیبوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ناول «دار و رسن کی آزمائش» کو سوویت ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ کس طرح عوام کی مسرت کے لئے جدوجہد کرنے، اور ہمت و جرائت کے ساتھہ ذاتی زندگی کے مصائب اور سختیوں پر قابو پانے کے دوران میں ایک اولوالعزم، سورما کردار کی تشکیل ہوتی ہے، نیا انسان پیدا ہوتا ہے۔ سوویت یونین اور دوسرے ملکوں میں اس ناول کے پڑھنےوالوں کو پاویل کورچاگن اور اس کے رفیقان کار کی تصویرکشی میں سوویت انسان کے، ہمارے دور کے ہیرو کے، مخصوص خط و خال نظر آئیں گے۔ نوجوان مصنف کا تخلیق کیا ہؤا کردار ہمیں سکھاتا ہے کہ کس طرح زندہ رہنا، جدوجہد کرنا اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا چاہئے۔ اس کتاب کی تخلیق بھی آستراوسکی کی تمام ادبی تصانیف کی طرح، ایک جوہر قابل رکھنے والے کمیونسٹ ادیب کی غازیانہ مہم ہے، ایک ایسی مہم جو اسکی اولوالعزمانہ زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔

آستراوسکی ۱۹۰٤ء میں، راونو علاقے کے آستراژسکی نامی ضلع کے ایک گاؤں، ولییا میں پیدا ہؤا تھا۔ اس کے باپ کو سال میں صرف چند مہینے کارخانے میں کام ملتا تھا۔ نو سال کی عمر میں

عمر میں وہ یوکرین کے ایک چھوٹے سے قصبے شپیتووکا میں ایک
اسٹیشن ریستوران کے سیلے تہ خانے میں باورچی خانے کا پھٹکل کام
کرتا تھا ۔ شپیتووکا میں اس کے والدین پہلی جنگ عظیم شروع ہونے
کے بعد منتقل ہو گئے تھے ۔ ریلوے ڈپو کے مزدوروں سے، جہاں
اس کا بھائی کام کرتا تھا، کم عمر آستراوسکی نے لینن اور لینن
کے نظریوں کا تذکرہ سنا ۔ اکتوبر کے عظیم اشتراکی انقلاب کے
بعد کے چند ابتدائی مہینوں میں اس نے مقامی بالشویکوں کے لئے،
جو خفیہ سرگرمیوں میں مصروف تھے، مختلف قسم کے کارہائے خدمت
انجام دئے ۔

نکولائی آستراوسکی شپیتووکا کے سب سے پہلے کومسومول ممبروں
میں سے ایک تھا ۔ اگست ۱۹۱۹ء میں وہ اپنے گھر سے چلا گیا
اور محاذ جنگ کے لئے اپنی خدمات پیش کیں ۔ محاذ پر وہ سرخ
فوج کی صفوں میں، گریگوری کتووسکی کی مشہور ڈویژن میں اور
اس بودینی کی پہلی گھوڑ سوار فوج میں رہ کر بڑی بےجگری اور
بہادری سے لڑا، جو عوام کی صفوں سے آیا تھا اور ترقی کرکے
ایک نامور فوجی رہنما بن گیا تھا ۔ ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں
پندرہ سالہ آستراوسکی بہت شدید طور پر زخمی ہؤا اور فوجی خدمت
سے سبک دوش کر دیا گیا ۔

۱۹۲۱ء کے موسم گرما میں آستراوسکی یوکرین کے دارالسلطنت
کئیف چلا گیا ۔ وہ ریلوے کے کارخانے میں کام کرتا تھا اور ساتھ
ہی ساتھ ایک ٹکنکل کورس بھی لے رہا تھا ۔ وہ مقامی کومسومول
تنظیم کی رہنمائی بھی کرتا تھا ۔ شہر میں روٹی اور ایندھن بہت
کمیاب تھے ۔ اور آستراوسکی کی سرکردگی میں نوجوان رضاکاروں
کے ایک دستہ نے انتہائی تکلیف دہ اور سخت حالات میں ایک چھوٹی
ریلوے لائن کی تعمیر کی تاکہ قریب کے جنگل سے شہر تک وہ

ایندھن کی لکڑی لائی جا سکے جس کی بڑی شدید ضرورت تھی۔ وہ بہادرانہ اور مجاہدانہ تعمیری کام تو کامیابی کے ساتھہ مکمل ہو گیا لیکن آستراوسکی بہت خطرناک طریقے سے بیمار پڑ گیا۔

میدان جنگ میں لگا ہوا زخم، ٹائی فس اور شدید گٹھیا کے درد، ان سب نے مل کر اس کی صحت کو برباد کر دیا۔ لیکن وہ خود کو ملک کی پرجوش، تخلیقی زندگی کے ایک بے عمل تماشائی کی شکل میں تصور ھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسکی پیہم اور پراصرار درخواست پر شپیتووکا کی پارٹی اور کومسومول تنظیموں نے اسے یوکرین کے ایک دور دراز چھوٹے سے سرحدی قصبے، بیریزدوف میں بھیج دیا۔ وہاں اپنی بیماری کو خاطر میں نہ لاتے ہوتے وہ تن، من، دھن سے اجتماعی سرگرمیوں میں لگ گیا۔

۱۹۲٤ء میں آستراوسکی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن گیا۔ اس کی صحت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور ۱۹۲٦ء میں وہ تمام عمر کے لئے بستر سے لگ گیا۔ تین سال بعد وہ بالکل اندھا ہو گیا اور ۱۹۳۰ء میں اس کے جوڑ مکمل طور پر بےحس و حرکت اور جامد ہو گئے، سوائے اس کے کہ وہ صرف کہنیوں تک حرکت کر سکتا تھا۔

صحت یابی کی تمام امیدیں ختم ہونے کے بعد آستراوسکی نے ایک منصوبہ تیار کیا «ایک ایسا منصوبہ جو زندگی میں معنویت پیدا کر سکے، جو زندہ رھنے کا جواز بن سکے۔» اپنی شدید بیماری کے باوجود وہ عمل اور جدوجہد سے دور اپنی زندگی کا تصور ھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ ایک نئے ھتھیار، لکھے ہوئے الفاظ، سے مسلح ہوکر مجاھدوں کی صفوں میں واپس آ جائے گا۔ اس نے طے کیا کہ وہ ماضی کے متعلق ایک کتاب لکھے گا جو عوام کے لئے فائدہ‌مند ہوگی اور نئی نسل کی تربیت کے کام میں پارٹی کی مدد کرے گی۔

نومبر ۱۹۳۰ء میں، اندھے اور اپاھج آستراوسکی نے، کئی مہینے تک کتاب کے پلاٹ پر غور و خوض کرنے کے بعد، اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ـ اپنے سفاک درد کے باوجود، ایک خاص طور پر بنائے ہوئے پیپر کیس کی مدد سے اس نے اپنا ناول «دار و رسن کی آزمائش» ایک ایک صفحہ کر کے لکھنا شروع کر دیا ـ بعض صفحات خود مصنف کے اپنے ھاتھہ کے لکھے ہوئے ھیں اور بعض اس نے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے لکھوائے ھیں، جنہوں نے برضا و رغبت اپنی خدمات اس کام کے لئے پیش کی تھیں ـ

دسمبر ۱۹۳۲ء ناول کا پہلا حصہ شائع ہؤا اور فوراً ھی بے شمار پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گیا ـ جون ۱۹۳۳ء میں یہ کتاب، جو اس کی پہلی تصنیف تھی، مکمل ہو گئی ـ کچھہ ھی عرصے بعد آستراوسکی سوویت مصنفین کی انجمن کا رکن بن گیا ـ یکم اکتوبر ۱۹۳۵ء کو سوویت یونین کی حکومت نے خانہ جنگی کے جاں باز اور سورما مجاھد اور ایک جوھردار ناول کے مصنف آستراوسکی کو «آرڈر آف لینن» کا خطاب عطا کیا ـ

«دار و رسن کی آزمائش» مصنف کی زندگی کی داستان ھے لیکن جیسا کہ مصنف نے خود کہا ھے، اور پورے جواز کے ساتھہ کہا ھے، «یہ ایک ناول ھے، اور محض کومسومول کے رکن آستراوسکی کی ایک سوانح حیات نہیں ھے ـ»

وہ تخلیقی کام جس کے کرنے کا آستراوسکی نے پختہ ارادہ کر لیا تھا، یہ تھا کہ ایک جواں سال مجاھد کا کردار پیش کیا جائے جس کے نقش قدم پر نوجوان چل سکیں ـ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ ضروری تھا کہ یہ سوانح حیات بہت دلکش اور بہادرانہ اور اولوالعزمانہ ہو ـ آستراوسکی کی نظروں میں محنت کش عوام کی روزمرہ زندگی کی جواں مردی اور اولوالعزمی، جو ایک عظیم نظرئے سے تحریک اور فیضان حاصل کرتی ھے، ایک دلکش انقلابی رومانوی

خصوصیت کی حامل اور مثال کے ذریعہ تعلیم دینے والی قوت
ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بہادرانہ اور اولوالعزمانہ سوانح
حیات کو ایک معمولی سوانح حیات بھی ہونا چاہئے، جو یہ دکھا
سکے کہ اس قسم کے راستے پر چلنا ہر نوجوان شخص کے لئے
ممکن ہے۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نوجوان فنکار نے خود
اپنی اور اپنے معاصرین کی سوانح حیات میں سے مناسب تفصیلات کا
انتخاب کیا، اور پاویل کورچاگن اور اس کے رفیقان کار کے بہادرانہ
کرداروں کی تخلیق کا عمل شروع کیا۔ اس نے ان کرداروں میں
سوویت یونین کی نئی پود کے مخصوص خط و خال کی عکاسی
کی ہے۔

انتہائی حد تک قابل یقین ہونے کی کوشش میں آستراوسکی
بالاراده اپنے بچپن اور نوجوانی کے بعض غیرمعمولی بہادرانہ
کارناموں کا ذکر کرنے سے باز رہا ہے۔ «لوگ کہیں گے کہ میں نے
مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے، اور انہیں یقین نہیں آئے گا» جیسا کہ
اس نے اپنے اڈیٹر سے وضاحت کرتے ہوئے کہا، مثلاً اس نے اس
واقعہ کا ذکر نہیں کیا کہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا جب اس نے اپنی جان
جوکھوں میں ڈال کر اور جرمن سنتری کی آنکھ میں دھول جھونک کر
خفیہ انقلابی کمیٹی کے چھاپے ہوئے پرچے جگہ جگہ چپکائے تھے،
یا یہ واقعہ کہ اس نے پندرہ سال کی نوخیز عمر میں نووگراد
ولیانسکی کے قریب ایک پل اڑایا تھا، اسی طرح ایک ایسے قصبے
میں، جس پر کولکوں کے ایک گروہ نے قبضہ کر لیا تھا، اپنے
بے انتہا باہمت اور جاں بازانہ سراغرسانی کے کام کی تفصیلات کا اس
نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بعض اوقات مصنف نے اپنی زندگی کے
بعض پرخطر واقعہ کتاب میں شامل کئے ہیں لیکن ان میں انتہائی
جوکھوں اور خطرے، جانبازی اور شجاعت کے جو عناصر شامل تھے
ان سب کو نکال دیا ہے۔

اپنے فنکارانہ شعور اور موقع شناسی کی تحریک پر آستراوسکی نے وہ سب تفصیلات مسترد کر دیں جو اس کے هیرو کی داستان حیات کو «غیر ممکن»، عام حالات سے ماوراء یا محض کسی غیرمعمولی اور خصوصی صورت میں ممکن هو سکنے کا رنگ دیتیں ۔

آستراوسکی نے اپنا پہلا ناول «دار و رسن کی آزمائش» ختم کرنے کے ساتھ هی فوراً ایک دوسری کتاب «طوفان کے پالے هوئے» شروع کر دی ۔

اس وقت ایک دوسری جنگ عظیم کا خطرہ انسانیت کے سر پر منڈلانے لگا تھا ۔ اس نئی کتاب میں آستراوسکی نے اپنے سامنے جو مقصد رکھا وہ یہ تھا کہ نوجوانوں کو فاشزم کے خلاف جہاد کرنے کے لئے ابھارا جائے، اشتراکی سماج کے ماحول میں پرورش پائی هوئی نوجوان نسل کو دکھایا جائے کہ ان کے دشمن کا اصلی چہرہ کیا تھا ۔ اپنے آخری ناول میں اس کی توجہ پولینڈ کے اونچے سرمایہ‌دار طبقہ اور زمین‌دار طبقہ پر مرکوز تھی، جو اس وقت فاشزم کی راہ پر گام زن تھے ۔

۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء کو آستراوسکی نے «طوفان کے پالے هوئے» کے پہلے حصے کو مکمل کر لیا ۔ لیکن مصنف اس ناول کو ختم نہیں کر سکا ۔ نکولائی آستراوسکی کا ۲۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو انتقال هو گیا ۔

آستراوسکی آج زندہ نہیں هے، لیکن اس کمیونسٹ مصنف کی تصانیف، اس کے پرجوش مضامین، ریڈیو کی تقریریں اور نوجوانوں کے سامنے دئے خطبات آج بھی اقوام‌عالم کی اس جدوجہد کے لئے جو وہ امن، تخلیقی محنت اور انسانیت کی مسرت کے لئے کر رهی هیں، ایک بیش بہا امداد هیں ۔

دَار و رَسَن کی آزمائش

حِصّۂ اوّل

پہلا باب ۱

«ایسٹر کی چھٹیوں سے پہلے تم میں سے جو طالب علم میرے گھر پر امتحان دینے کے لئے آئے تھے، کھڑے ہو جائیں!»

یہ الفاظ ایک بھاری بھر کم جسم والے شخص کے تھے جو پادری کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے گلے میں ایک وزنی صلیب لٹک رہی تھی۔ اس نے ساری جماعت پر ایک غضب آلود نظر جما دی۔

چھہ بچے جن میں چار لڑکے تھے اور دو لڑکیاں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور اس لبادہ پوش آدمی کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی تیز نگاہیں ان بچوں کے جسم کو چیر کر پار نکل جائیں گی۔

«تم بیٹھہ جاؤ» پادری نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اطمینان کا سانس لیا۔

فادر واسیلی کی چیاں جیسی آنکھیں باقی چار لڑکوں پر گڑ کے رہ گئیں۔

«اچھا صاحبزادوں، آپ سب ذرا ادھر تو تشریف لائیے!»

فادر واسیلی اٹھا، اپنی کرسی پیچھے سرکائی اور ان چاروں بچوں کے پاس جا پہنچا جو ایک دوسرے سے لگے ہوئے، سکڑے کھڑے تھے۔

« بدمعاشوں تم میں سے سگریٹ کون کون پیتا ہے؟»

«فادر ہم تو سگریٹ نہیں پیتے» چاروں نے ڈری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

پادری کا چہرہ تمتما اٹھا۔

«اچھا تم سگریٹ نہیں پیتے۔ بدمعاش کہیں کے؟ پھر میرے خمیر میں تمباکو کس نے ملایا تھا؟ بولو جواب دو! خیر ابھی پتہ چلا جاتا ہے کہ سگریٹ پیتے ہو یا نہیں! اچھا اپنی جیبیں تو خالی کرو۔ چلو میں کہتا ہوں جیبیں خالی کر کے دکھاؤ!»

تین بچے اپنی اپنی جیبوں کی چیزیں نکال نکال کر میز پر رکھنے لگے۔

پادری نے ان کی جیبوں کی سیونوں کا غور سے معائنہ کیا کہ شاید ان میں تمباکو کا چورا مل جائے لیکن ان میں کچھ بھی نہ نکلا۔ پھر پادری چوتھے لڑکے کی طرف مخاطب ہؤا۔ اس نو عمر لڑکے کی آنکھوں کی پتلیاں سیاہ رنگ کی تھیں اور وہ ایک بھورے رنگ کی قمیص اور نیلا پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پتلون کے گھٹنوں پر پیوند لگے ہوئے تھے۔

«آخر وہاں بت بنے کیوں کھڑے ہو؟»

لڑکے نے سوال کرنے والے پر خاموش نفرت کی نظر ڈالی۔

«میرے کپڑوں میں کوئی جیب ہی نہیں ہے» اس نے ضدی پن سے جواب دیا۔

«اچھا جیب ہی نہیں ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ میں جانتا نہیں کہ یہ شرارت کس نے کی ہوگی؟ میرا سارا خمیر تباہ کر کے رکھ دیا۔ تمہارا خیال ہے کہ اس بات پر میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟ ہرگز نہیں میاں صاحبزادے تمہیں اس کی سزا دی جائے گی۔ پچھلی بار میں نے تمہیں اس اسکول میں اس لئے رہنے دیا تھا کہ تمہاری ماں میرے پاس خوشامد کرتی ہوئی آئی تھی کہ میں تمہیں اسکول سے نہ نکالوں

لیکن اب میں تم سے عاجز آ چکا ہوں۔ نکل جاؤ یہاں سے!» اس نے بچے کا کان اتنے زور سے اینٹھا کہ وہ درد سے بے قرار ہو گیا۔ پھر پادری نے اسے برآمدے میں دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

ساری جماعت سہمی ہوئی خاموش بیٹھی رہی۔ کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر پاویل کورچاگن کو کیوں نکال دیا گیا۔ صرف سرگئی بروژاک جو پاویل کا سب سے قریبی دوست تھا اس کا سبب جانتا تھا۔ اس نے اسے پادری کے باورچی‌خانے میں ایسٹر کے کیک کے خمیر میں مٹھی بھر دیسی تمباکو ڈالتے دیکھا تھا۔ اس دن وہ چھ طالب علم جو پڑھائی میں پیچھے رہ گئے تھے پادری کے باورچی‌خانے میں اس کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آئے تو دوبارہ اس کو اپنا سبق سنائیں۔

اسکول سے نکال دئے جانے کے بعد پاویل اسکول کے زینے کی سب سے نچلی سیڑھی پر بیٹھ گیا اور بڑی مایوسی سے سوچنے لگا کہ جب وہ اپنی ماں کو ساری داستان سنائے گا تو وہ کیا کہے گی۔ اس کی غریب محنتی ماں جو صبح سے رات تک آب‌کاری کے داروغہ کے یہاں کھانا پکانے کا کام کرتی تھی۔

اس کا گلا رندھ گیا۔

«اب میں کیا کروں؟ یہ سب اس کمبخت پادری کی وجہ سے ہؤا اور مجھے بھی نہ جانے کیا سوجھی تھی کہ جاکر اس کے خمیر میں تمباکو ملا دیا۔ یہ سب سریوژکا نے سمجھایا تھا، اس نے کہا تھا: «آؤ اس بوڑھے خبیث کو مزا چکھائیں۔» اسی لئے ہم لوگوں نے یہ حرکت کی اور اب سریوژکا تو صاف بچ جائیگا اور میں یقیناً نکال دیا جاؤں گا۔»

فادر واسیلی سے اسے بہت پرانا بغض تھا۔ اس کا یہ جھگڑا اسی دن سے چلا آ رہا تھا جس دن میشکا لیوچکوف کے ساتھ اس کی مار پیٹ ہوئی تھی اور سزا کے طور پر اسے اسکول کے بعد روک لیا

گیا تھا ـ اور اس لئے کہ خالی کمرے میں وہ کوئی شرارت نہ کرنے پائے اسے لے جاکر دوسری جماعت کے ساتھہ پڑھنے کے لئے بٹھا دیا گیا تھا ـ

پاویل وہاں جاکر پیچھے بیٹھہ گیا ـ اس جماعت کے ماسٹر صاحب ایک مختصر اور منحنی سے آدمی تھے ـ وہ ایک کالا کوٹ پہنے ہوئے تھے ـ جماعت کے لڑکوں کو وہ کرۂارض اور اجرام فلکی کے بارے میں بتا رہے تھے ـ پاویل نے جب یہ سنا کہ زمین کروڑوں برسوں سے قائم ہے اور ستارے بھی اسی دنیا کی طرح کی دنیائیں ہیں تو وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا ـ اس نے جو کچھہ سنا اس سے وہ اتنا حیرت زدہ ہؤا کہ اس کا جی تو بہت چاہا کہ کھڑا ہوکر کہہ دے «مگر بائبل میں تو یہ نہیں لکھا ہے!» لیکن بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ کو روک سکا وہ اور زیادہ مصیبت مول لینا نہیں چاہتا تھا ـ

پادری دینیات میں پاویل کو ہمیشہ پورے نمبر دیتا تھا ـ اسے دعا کی پوری کتاب تقریباً حفظ تھی ـ اور اس کے علاوہ عہدنامہ جدید اور عتیق بھی اسے اچھی طرح یاد تھے ـ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ خدا نے ہفتے کے کس دن کون سی چیز تخلیق کی تھی ـ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں فادر واسیلی سے دریافت کرے گا ـ اگلے ہی سبق کے وقت پادری درجہ میں آکر ابھی ٹھیک سے اپنی کرسی پر بیٹھہ بھی نہ پایا تھا کہ پاویل نے اپنا ہاتھہ اٹھا دیا اور بولنے کی اجازت پاتے ہی اٹھہ کھڑا ہوا ـ

«فادر دوسری جماعت کے ماسٹر صاحب یہ کیوں کہتے ہیں کہ یہ دنیا کروڑوں برس پرانی ہے؟ بائبل میں تو لکھا ہے کہ دنیا صرف پانچ ہزار...» فادر واسیلی کی کڑک دار آواز نے اس کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی ـ

«کیا کہا تو نے بدمعاش کہیں کا؟ ایسے یاد کرتا ہے تو اپنا دینیات کا سبق ـ کیوں؟»

I—83

قبل اس کے کہ پاویل سمجھ پاتا کہ بات کیا ہے پادری نے اس کے دونوں کان پکڑکر اس کا سر بار بار دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ چند ہی منٹ بعد اس نے اپنے آپ کو باہر برآمدے میں کھڑا پایا۔ خوف سے وہ بری طرح دہل گیا تھا اور اسے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

اس بار اس کی ماں نے بھی اسے زور کی ڈانٹ بتائی تھی۔

دوسرے دن اسکول جاکر اس نے فادر واسیلی کی بہت خوشامد کی تھی کہ وہ پاویل کو اسکول میں واپس لے لیں۔ اسی دن سے پاویل کو پادری سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں نفرت بھی تھی اور خوف بھی۔ اس کا ننھا سا معصوم دل ہر قسم کی بے انصافی کے خلاف بغاوت کرتا تھا چاہے وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ پادری نے بلاوجہ اس کی پٹائی کی تھی اس کے لئے وہ اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگا اور اس کے دل میں تلخی پیدا ہو گئی۔

اس واقعے کے بعد پاویل کو کئی بار فادر واسیلی کے غصے کا نشانہ بننا پڑا۔ پادری اسے ہمیشہ درجہ سے باہر نکالتا رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی شرارت کے لئے اسے لگاتار کئی ہفتوں تک کونے کی طرف منھ کرکے کھڑا رہنا پڑتا تھا اور اس سے کبھی کسی سوال کا جواب دینے کو نہیں کہا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسٹر کی چھٹیوں سے قبل پاویل کو پچھڑے ہوئے لڑکوں کے ساتھ دوبارہ امتحان دینے کے لئے پادری کے گھر جانا پڑا۔ وہیں باورچی خانہ میں اس نے کیک کے خمیر میں تمباکو ملا دیا تھا۔

ایسا کرتے ہوئے اسے کسی نے بھی نہ دیکھا تھا پھر بھی پادری فوراً تاڑ گیا تھا کہ یہ حرکت کس کی ہوگی۔

آخرکار سبق ختم ہوا اور تمام لڑکے باہر میدان میں نکل کر پاویل کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ بہت اداس اور خاموش کھڑا رہا۔ سرگئی بروژاک درجہ سے باہر نہیں نکلا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ

وہ بھی قصوروار ہے لیکن اپنے دوست کی مدد کرنے کے لئے وہ کچھ نہ کر سکتا تھا ۔

استادوں کے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے اسکول کے ہیڈ ماسٹر یفریم واسیلوچ نے اپنی گردن باہر نکالی اور گرج کر کہا:

«کورچاگن کو فوراً میرے پاس بھیج دو!» ہیڈ ماسٹر کی بھاری گونجتی ہوئی آواز سنتے ہی پاویل چونک پڑا اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس نے ان کے حکم کی تعمیل کی ۔

اسٹیشن کے ریستوران کے مالک نے پاویل کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھا ۔ وہ ادھیڑ عمر کا زرد رو شخص تھا اور اس کی آنکھیں بے رنگ اور بےآب تھیں ۔

«کیا عمر ہے اس کی؟»

«بارہ سال ۔»

«اچھا تو اسے چھوڑ جاؤ ۔ اسے مہینے میں آٹھ روبل ملیں گے اور جس دن کام کرے گا اس دن کھانا ملے گا ۔ اسے ایک دن چھوڑکر متواتر چوبیس گھنٹے کام کرنا ہوگا ۔ لیکن یاد رکھنا میں چوری قطعی نہیں برداشت کروں گا ۔»

«بالکل نہیں جناب، چوری نہیں کرے گا ۔ اس کی ذمہ‌داری میں لیتی ہوں» پاویل کی ماں نے ریستوران کے مالک کو مطمئن کرنے کے لئے جلدی سے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا ۔

«آج ہی سے کام شروع کر دو» ریستوران کے مالک نے حکم دیا اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت کی طرف مڑکر بولا «ضینا اس لڑکے کو باورچی خانے میں لے جاؤ اور فروسیا سے کہہ دو کہ اسے گریشکا کی جگہ کام پر لگا دے ۔»

شراب دینے والی نوکرانی نے چاقو وہیں میز پر رکھہ دیا جس سے وہ سؤر کا گوشت کاٹ رہی تھی اور پاویل کو اشارہ کیا ۔ اسے

ساتھ لےکر ہال کو پار کرتی ہوئی وہ ایک بغلی دروازے پر جا پہنچی جو برتن صاف کرنے کی کوٹھڑی میں کھلتا تھا ـ پاویل اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا ـ اس کی ماں بھی ہڑبڑاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے آئی اور جلدی سے اس نے پاویل کے کان میں کہا «میرے بچے پاولوشکا دیکھو خوب جی لگا کر کام کرنا، ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے شرمندگی اٹھانی پڑے ـ»

اداس آنکھوں سے وہ اسے اندر جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر وہاں سے چلی گئی ـ

برتن صاف کرنے کی کوٹھڑی میں کام خوب زور شور سے ہو رہا تھا ـ میز پر رکابیوں، کانٹوں اور چھریوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور کئی عورتیں اپنے کندھوں پر جھاڑن ڈالے ہوئے انہیں پونچھ کر سکھا رہی تھیں ـ

ایک لڑکا جس کے سر پر سرخ رنگ کے بالوں کا گندا سا گچھا تھا اور جو عمر میں پاویل سے کچھ بڑا تھا دو بڑے بڑے سماواروں کو گرم کر رہا تھا ـ

ایک بڑی سی ناند میں کھولتا ہوا پانی بھرا تھا جس میں رکابیاں دھوئی جا رہی تھیں ـ ناند کے کھولتے ہوئے پانی سے اٹھتی ہوئی بھاپ ساری کوٹھڑی میں بھری تھی جس کی وجہ سے شروع میں پاویل ان عورتوں کے چہرے بھی نہیں دیکھ پایا ـ وہ کھویا کھویا سا اس انتظار میں کھڑا رہا کہ کوئی آکر اسے بتائے کہ اسے کیا کام کرنا ہے ـ

شراب دینے والی نوکرانی ایک برتن دھونے والی نوکرانی کے پاس گئی اور اس کا کندھا تھپتھپا کر بولی:

«فروسیا میں تمہارے لئے ایک نئے لڑکے کو لائی ہوں جو گریشکا کی جگہ کام کریگا ـ تم اسے سمجھا دو کہ اسے کیا کیا کرنا ہے ـ»

«یہاں کے کام کی یہی ذمہ‌دار ہیں» ضینا نے اس عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاویل سے کہا جسے اس نے فروسیا کے نام

سے مخاطب کیا تھا ــ «وہ تمہیں سب کام سمجھا دے گی ــ» اتنا کہہ کر وہ مڑی اور کھانے کے کمرے میں واپس چلی گئی ــ

«اچھی بات ہے» پاویل نے نرمی سے جواب دیا اور سوالیہ انداز میں فروسیا کی طرف دیکھنے لگا ــ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس عورت نے پاویل کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا جیسے کہ وہ اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا رہی ہو. پھر اس نے اپنی آستینیں چڑھائیں جو کھسک کر کہنیوں کے نیچے آ گئی تھیں اور گہری اور نہایت خوشگوار آواز میں بولی:

«یہاں کام تو کچھ ایسا خاص نہیں ہے لیکن پھر بھی تمہیں کافی لگ کر کام کرنا ہوگا ــ وہ ادھر جو تانبے کا پتیلہ رکھا ہے اسے صبح ہی گرم کرنا ہوتا ہے تاکہ ہر وقت کھولتا ہؤا پانی مل سکے، اس کے علاوہ کچھ لکڑی چیرنی ہوگی اور پھر سماواروں کا بھی خیال رکھنا ہوگا ــ کبھی کبھی تمہیں چھری کانٹے بھی صاف کرنے ہوں گے اور گندے پانی کی بالٹی بھی باہر لے جانی پڑیگی ــ کام تو کافی ہے میاں» وہ کوستروما کے علاقے کے مخصوص لہجے میں بولتی تھی اور الف کی آواز کو بہت کھینچ کر ادا کرتی تھی ــ اس کا لہجہ، اسکا تمتمایا ہؤا چہرہ اور اس کی چھوٹی سی اٹھی ہوئی ناک ان سب میں ایک ایسی بات تھی جس سے پاویل کو کافی تقویت پہنچی ــ

«یہ تو کافی نیک معلوم ہوتی ہے» پاویل اپنے دل میں اس نتیجے پر پہنچا اور اپنے شرمیلےپن پر قابو پاکر بولا «اچھا خالہ بتاؤ مجھے ابھی کیا کرنا ہے؟»

اس کی یہ بات سنتے ہی برتن صاف کرنے والیوں میں قہقہہ پڑ گیا:

«ہا ہا! دیکھو تو فروسیا جانے کہاں سے اپنے لئے ایک بھانجہ ڈھونڈھ لائی ہے!»

فروسیا خود اوروں سے بھی زیادہ جی کھول کر ہنسی ۔

بھاپ کے دھندلکے میں پاویل نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ فروسیا ایک نوجوان لڑکی ہے ۔ اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی ۔

سٹ پٹا کر وہ اس لڑکے کی طرف مخاطب ہؤا اور اس سے پوچھا:

«بتاؤ مجھے کیا کام کرنا ہے؟»

لیکن وہ بھی اندر ہی اندر ہنسنے لگا ۔ «اپنی خالہ ہی سے پوچھو وہی تم کو بتائیں گی، میں تو چلا ۔» اتنا کہکر وہ تیر کی طرح باورچی خانے کے دروازے سے باہر نکل گیا ۔

برتن صاف کرنے والی عورتوں میں سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اسے بلا کر کہا «ادھر آؤ ذرا یہ کانٹے پونچھ کر رکھ دو ۔»

پھر دوسری عورتوں کو ڈانٹتے ہوئے اس نے کہا «بس بس بہت ہو چکا یہ کیا کھی کھی لگا رکھی ہے؟ لڑکے نے آخر ایسی ہنسی کی کیا بات کہی تھی؟ لو یہ لو ۔» یہ کہہ کر اس نے پاویل کو ایک جھاڑن پکڑا دیا ۔ «لو اس کا ایک سرا اپنے دانتوں میں پکڑ لو اور دوسرے کو کس کر تان لو ۔ اور یہ رہا کانٹا ۔ جھاڑن کی کور سے کانٹوں کی گھائیاں اچھی طرح صاف کر دو ۔ دیکھو ذرا بھی میل نہ رہنے پائے ۔ اس معاملہ میں یہاں بہت سختی برتی جاتی ہے ۔ گاہک لوگ ہمیشہ کانٹوں کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور اگر ذرا سا بھی میل رہ جاتا ہے تو بہت واویلا مچاتے ہیں ۔ اگر اس قسم کی کوئی واردات ہو گئی تو مالکن تمہیں فوراً نکال کر باہر کریں گی ۔»

«مالکن؟» پاویل نے حیرت سے یہ لفظ دھرایا ۔ «میں تو سمجھتا تھا کہ جس آدمی نے مجھے نوکر رکھا ہے وہی یہاں کا مالک ہے ۔»

وہ عورت ہنس دی ۔

«وہ مالک تو یہاں بالکل ویسا ہی ہے جیسے میز کرسیاں وغیرہ ۔ اصل میں تو سب کچھ مالکن کے ہاتھ میں ہے ۔ آج وہ یہاں نہیں

ہیں ۔ لیکن کچھہ دن کام کروگے تو تمہیں خود ہی سب کچھہ معلوم ہو جائےگا ۔ »

برتن دھونے کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور تین ویٹر چھوٹی طشتریوں سے لدی ہوئی کشتیاں لئے ہوئے داخل ہوئے ۔

ان میں ایک جس کے شانے چوڑے، آنکھیں بھینگی اور جبڑا چوکور اور بھاری تھا بولا « ذرا جلدی جلدی ہاتھہ چلاؤ ۔ بارہ بجے کی گاڑی آنے ہی والی ہے، اور تم یہاں کھڑی کھڑی وقت ضائع کر رہی ہو ۔ »

پھر اس نے پاویل کی طرف دیکھہ کر پوچھا « یہ کون ہے؟ »

« یہ وہ نیا لڑکا ہے » فروسیا نے کہا ۔

« اچھا نیا لڑکا » اس ویٹر نے کہا اور پاویل کے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھہ رکھہ کر اسے سماواروں کی طرف دھکا دیتے ہوئے بولا ۔ « سن بے چھوکرے، یہ دیکھنا تیرا کام ہے کہ یہ دونوں ہر دم کھولتے رہیں لیکن دیکھہ ایک بالکل ٹھنڈا پڑا ہے اور دوسرے میں بھی برائے نام آنچ لگ رہی ہے ۔ آج تو چھوڑے دیتا ہوں لیکن اگر کل سے ایسا ہؤا تو تیرا منھہ اسی میں جھلسا دوں‌گا ۔ سمجھا؟ »

پاویل بغیر ایک لفظ کہے سماوار گرام کرنے میں مشغول ہو گیا ۔

اس طرح اس کی محنت اور مشقت کی زندگی کی ابتدا ہوئی ۔ پاوکا نے اس سے پہلے اپنی زندگی میں کبھی اتنی محنت نہیں کی تھی جتنی کہ اپنی ملازمت کے پہلے دن اسے کرنا پڑی ۔ اس نے سمجھہ لیا کہ ہوٹل اس کا گھر نہیں تھا جہاں وہ اپنی ماں کی حکم عدولی کر سکتا تھا ۔ اس بھینگے ویٹر نے اس پر یہ بات صاف طور پر واضح کر دی تھی کہ اگر اس نے ان لوگوں کی مرضی اور ہدایت کے مطابق کام نہ کیا تو اسے اس کی سزا بھگتنی پڑے گی ۔

پاویل نے اپنا ایک بوٹ چمنی پر رکھہ دیا اور اس سے دھونکنی کا کام لے کر دیکھتے دیکھتے آگ سلگا دی ۔ ان بڑے بڑے مٹکے

جیسے سماواروں میں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ اس کے بعد اس نے کچرے کی بالٹی اٹھائی اور لے جاکر گھورے پر پھینک آیا۔ پھر پانی کھولانے کے برتن کے نیچے آنچ تیز کرنے کے لئے اس نے چولھے میں کچھ لکڑیاں اور ڈال دیں اور طشتریاں پونچھنے کے جھاڑنوں کو گرم سماواروں پر سکھا دیا۔ غرض کہ جو کچھ اس سے کرنے کو کہا گیا تھا وہ سب اس نے کر ڈالا۔ اس دن بہت رات گئے جب پاویل تھک کے چور ہوکر باورچی خانہ میں پہونچا تو اسی ادھیڑ عمر کی عورت انیسیہ نے جو برتن دھونے کا کام کرتی تھی، دروازہ پر ایک نظر ڈالی جسے پاویل نے داخل ہونے کے بعد بند کر دیا تھا اور کہا «اس لڑکے میں ایک عجیب بات ہے۔ دیکھو بالکل دیوانوں کی طرح بھاگ بھاگ کر کام کرتا ہے۔ ضرور کوئی وجہ ہوگی کہ اسے یہاں کام پر رکھا گیا۔»

«بہت اچھا کام کرتا ہے» فروسیا نے کہا۔ «کبھی کسی کام کے لئے جلدی ہاتھ چلانے کو کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔»

«تھوڑے ہی دن میں سارا جوش ٹھنڈا پڑ جائےگا» لوشا نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ «شروع شروع میں تو سب ہی محنت سے کام کرتے ہیں...»

دوسرے دن صبح تک پاویل تھک کر بالکل چور ہو چکا تھا۔ ساری رات اس نے کھڑے کھڑے گزار دی تھی۔ سات بجے اس نے کھولتے ہوئے سماوار اس لڑکے کے حوالے کر دئے جو اس کی جگہ لینے آیا تھا۔ یہ لڑکا بھرے بھرے گالوں والا ایک نو عمر چھوکرا تھا جس کی آنکھوں میں ایک عجیب خطرناک سی چمک تھی۔ اس نے کھولتے ہوئے سماواروں کا جائزہ لیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ہر چیز درست ہے تو اپنی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر حقارت آمیز احساس برتری کے ساتھ اس نے دانتوں کی ریخوں میں سے تھوکا۔

«سن بے نکٹے» اس نے پاویل پر اپنی بےآب آنکھیں گاڑ کر جارحانہ لہجے میں کہا ـ «دیکھہ کل صبح یہاں ٹھیک چھہ بجے کام پر پہنچ جانا ـ»

«چھہ بجے کیوں؟» پاوکا نے اس سے سوال کیا ـ «پالی تو سات بجے بدلتی ہے نا؟»

«اس سے تم کو کوئی مطلب نہیں کہ پالی کتنے بجے بدلتی ہے ـ تم یہاں چھہ بجے پہنچ جانا اور دیکھو زیادہ بک بک مت کیا کرو نہیں تو میں یہ بدھوؤں کا سا منھہ‌توڑ دونگا ہمت تو دیکھو آج ہی کام شروع کیا اور آج ہی اکڑنے لگا ـ»

برتن دھونے والی عورتیں جن کی پالی بھی اسی وقت ختم ہوئی تھی کھڑے ہو کر بڑی دلچسپی سے ان دونوں لڑکوں کی تو تو میں میں سننے لگیں ـ دوسرے لڑکے کی ڈانٹ کے لہجے اور دھونس جمانے کے طریقے پر پاویل کو غصہ آ گیا ـ وہ اس موذی کی طرف بڑھا اور اس پر گھونسے کا ایک وار کرنے کو ہی تھا کہ یک بیک اس کے دل میں یہ خوف پیدا ہؤا کہ کہیں اس کی یہ نئی لگی ہوئی نوکری نہ چھٹ جائے، اس لئے وہ ضبط کر گیا ـ

پاویل کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا ـ اس نے کہا «بند کرو اپنی بکواس اور دیکھو مجھہ پر رعب نہ جھاڑنا نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے ـ میں کل سات بجے یہاں آؤں گا اور یہ بھی بتا دوں کہ تمھارے ہی نہیں میرے بھی دو ہاتھہ ہیں ـ اگر زور آزمانا چاہتے ہو تو میں تیار ہوں ـ»

اس کا حریف پانی کھولانے کے برتن کے پیچھے دبک گیا اور پاویل کو حیرت سے منھہ کھولے دیکھتا رہا جو غصہ سے آگ بگولا ہو رہا تھا ـ اسے اتنا زبردست منھہ توڑ جواب پانے کی توقع نہ تھی ـ

«اچھی بات ہے ـ اچھی بات ہے ـ دیکھا جائے گا» اس نے بدبدا کر کہا ـ

اپنی ملازمت کا پہلا دن بخیر و عافیت گزار دینے کے بعد پاویل اپنے گھر کی طرف تیزی سے روانہ ہؤا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ ایمانداری کے ساتھہ محنت کرکے اس نے آرام کرنے کا حق حاصل کیا ہے۔ اب وہ بھی مزدور ہے۔ اور اب کوئی بھی اس پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ دوسروں کی کمائی پر پلتا ہے۔

دور تک پھیلی ہوئی لکڑی چیرنے کے کارخانے کی عمارتوں کے پیچھے سے صبح کا سورج اوپر ابھر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں لیش‌چینسکی کے باغ کے پیچھے وہ چھوٹا سا گھر دکھائی دینے لگےگا جہاں پاویل رہتا تھا۔

«ماں ابھی سوکر اٹھی ہونگی اور میں کام پر سے گھر واپس پہنچوں‌گا» پاویل نے سوچا اور اپنے قدم تیز کر لئے۔ چلتے چلتے وہ سیٹی بجاتا جا رہا تھا۔ «اسکول سے نکال دیا جانا میرے لئے کچھہ خاص برا نہیں ہؤا۔ اور بہر حال وہ کمبخت پادری تو مجھے کبھی چین نہ لینے دیتا۔ اب وہ بھاڑ میں جائے میری بلا سے» یہ سوچتے سوچتے پاویل گھر پہنچ گیا اور اس نے پھاٹک کھولا۔ «اور رہی ان طرم شاہ کی بات تو ان کا میں کسی روز حلیہ بگاڑکر رکھہ دوں‌گا۔»

اس کی ماں صحن میں بیٹھی سماوار میں آگ سلگا رہی تھی اپنے بیٹے کی آہٹ سنتے ہی اس نے سر اٹھاکر اوپر دیکھا اور بے قراری سے پوچھا:

«کیوں بیٹا کام کیسا تھا؟»

«اچھا تھا» پاویل نے جواب دیا۔

اس کی ماں کچھہ کہنے ہی والی تھی کہ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے پاویل کو اپنے بھائی آرتیم کی چوڑی سی پیٹھہ کی ایک جھلک دکھائی دی۔

«کیا آرتیم بھیا آئے ہیں؟» اس نے بہت فکرمند ہوکر پوچھا۔

«ہاں وہ کل رات آیا ہے۔ اب یہیں رہے گا اور ریلوے کے یارڈ میں کام کرے گا۔»

جھجھکتے جھجھکتے پاویل نے کمرے کا دروازہ کھولا۔

دروازہ کی طرف پیٹھ کئے ہوئے جو شخص میز کے پاس بیٹھا تھا اس نے پاویل کے داخل ہوتے ہی اپنا تنومند جسم گھمایا۔ گھنی کالی بھنؤوں کے نیچے اس کی آنکھوں میں سختی کا انداز تھا۔

«اچھا آپ ہیں میاں تمباکو۔ کہئے کیا حال چال ہیں؟»

پاویل اس کے بعد پوچھے جانے والے سوالوں سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔

اس نے سوچا «شاید آرتیم کو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اب اس کی ڈانٹ پڑے گی اور خوب پٹائی ہوگی سو الگ۔» پاویل اپنے بڑے بھائی کے خوف سے سہما ہؤا کھڑا رہا۔

لیکن آرتیم کا اپنے بھائی کی مرمت کرنے کا بظاہر کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکائے تپائی پر بیٹھا پاویل کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا اس کے دیکھنے کے انداز میں حقارت بھی تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ دل ہی دل میں اسے اس واقعہ پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔

«تو اب آپ عالم فاضل ہو گئے، کیوں؟ جو کچھ پڑھنے کو تھا سب پڑھ لیا اور اب آپ نے اپنی توجہ جھوٹے برتنوں کی صفائی کی طرف کی ہے، کیوں؟»

پاویل نگاہیں نیچی کئے فرش کی ایک درز کو گھورتا اور وہاں پر گڑی ہوئی ایک کیل کا جائزہ لیتا رہا۔ آرتیم میز کے پاس سے اٹھا اور باورچی خانے میں چلا گیا۔

«معلوم ہوتا ہے اب مار نہیں پڑے گی» یہ سوچ کر پاویل نے اطمینان کا سانس لیا۔

بعد میں چائے پیتے وقت آرتیم نے اسکول کے اس واقعہ کی بابت دریافت کیا۔ پاویل نے سارا واقعہ سچ سچ بتا دیا۔

«اگر بڑے ہوکر بھی تم ایسے ھی آوارہ‌گرد رھے تو تمہارا کیا انجام ھوگا؟» ماں نے انتہائی افسردگی کے ساتھ کہا۔ «سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں اس کا؟ نہ جانے کس پر پڑا ھے؟ یا خدا اس لڑکے کی خاطر میں نے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائی ھیں!» اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

آرتیم نے خالی پیالہ اپنے آگے سے سرکا دیا اور پاویل سے مخاطب ھؤا:

«اچھا دوست سنو» اس نے کہا۔ «جو ھو گیا وہ تو ھو گیا۔ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا مگر اب آئندہ کے لئے محتاط رھو اور اپنا کام ٹھیک سے کرو۔ شرارت چھوڑ دو کیوں‌کہ اگر تم اس جگہ سے بھی نکالے گئے تو میں تمہاری خوب مرمت کرونگا۔ یاد رکھنا ویسے بھی تم ماں کو کافی تکلیف دے چکے ھو۔ ھمیشہ کسی نہ کسی مصیبت میں پھنستے رھتے ھو۔ لیکن اب اس طرح کام نہیں چلے‌گا۔ ایک آدھ سال وھاں کام کر لوگے تو میں کوشش کرکے تمہیں ریل کے ڈپو میں امیدوار کی حیثیت سے رکھوا دوں‌گا کیوں‌کہ اگر تم عمر بھر جھوٹے برتن صاف کرتے رھے تو کبھی کسی لائق نہیں بن پاؤگے۔ کوئی نہ کوئی ھنر تو تمہیں سیکھنا ھی پڑے‌گا۔ خیر ابھی تو تم بہت چھوٹے ھو لیکن سال بھر بعد دیکھوں‌گا کہ تمہارے لئے کیا کیا جا سکتا ھے۔ شاید وہ لوگ تمہیں کام پر رکھ لیں۔ اب میں یہیں کام کروں‌گا اور ماں کو کام پر جانے کی ضرورت نہیں ھے۔ بس بہت جان کھپا چکی وہ ان طرح طرح کے سؤروں کے لئے۔ پاوکا بس اس بات کا دھیان رکھو کہ تمہیں انسان بننا ھے۔»

اتنا کہہ‌کر وہ اٹھ کھڑا ھؤا۔ اس کے آس پاس کی تمام چیزیں اس کے لحیم شحیم جسم کے سامنے بونی معلوم ھو رھی تھیں۔ کرسی

پر سے اپنا کوٹ اتار کر پہنتے ہوئے اس نے ماں سے کہا "ماں مجھے ذرا گھنٹے بھر کے لئے باہر جانا ہے -" اور اتنا کہہ کر وہ جھک کر دروازہ سے باہر نکل گیا -

پھاٹک کی طرف جاتے ہوئے اس نے کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا اور پکار کر پاویل سے کہا - "میں تمہارے لئے ایک جوڑ بوٹ اور ایک چاقو لایا ہوں - ماں سے لے لینا -"

اسٹیشن کا ریستوران چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا -

اس جنکشن پر چھہ مختلف سمتوں سے ریل کی پٹڑیاں آکر ملتی تھیں - اسٹیشن مسافروں سے ہر وقت کھچا کھچ بھرا رہتا تھا - رات کو صرف دو تین گھنٹے کے لئے جب دو گاڑیوں کے بیچ تھوڑا سا وقفہ ہوتا تھا وہاں نسبتاً کچھہ سکون رہتا تھا - اس اسٹیشن سے سینکڑوں گاڑیاں مختلف سمتوں کو جاتی تھیں - جنگی مورچہ اور عقب کے درمیان آنے جانے والی گاڑیاں، مورچہ سے ہزاروں زخمی اور اپاہج لوگوں کو لانے والی گاڑیاں اور وہ گاڑیاں جن میں اکتا دینے والے بھورے رنگ کے اوورکوٹوں میں ملبوس نئے سپاہی مسلسل جنگی مورچے کی طرف لے جائے جا رہے تھے -

پاویل نے وہاں دو سال کام کیا اور ان دو برسوں میں اس نے برتن صاف کرنے کی کوٹھڑی اور باورچی خانے کے علاوہ کچھہ بھی نہیں دیکھا - باورچی خانہ تہ خانے میں تھا اور وہاں بیس بائیس آدمی ہر دم پاگلوں کی طرح کام میں جتے رہتے تھے - دس ویٹر مسلسل باورچی خانے اور ریستوران کے بیچ میں چکر لگاتے رہتے تھے -

لیکن اب پاویل کو آٹھہ کے بجائے دس روبل ملنے لگے تھے - ان دو برسوں میں وہ لمبا بھی ہو گیا تھا اور اس کا سینہ بھی خوب چوڑا نکل آیا تھا، اس عرصے میں اسے مصیبتیں بھی بہت اٹھانی پڑی تھیں - چھہ مہینے تک اس نے باورچی خانے میں بھی کام کیا لیکن

بعد میں اسے پھر برتن صاف کرنے کے کام پر لگا دیا گیا تھا ۔ ہوٹل کے قادر مطلق صدر باورچی کو اس سے بغض للہی تھا ۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے پاویل پر ہاتھ اٹھایا تو نہ جانے کب وہ وحشی چھوکرا اسے چھرا مار دے ۔ اور حقیقت بھی یہ تھی کہ اگر پاویل میں سخت محنت کرنے کی اتنی زبردست صلاحیت نہ ہوتی تو اس کے گرم مزاج کی وجہ سے اس کی نوکری نہ جانے کب کی چلی گئی ہوتی ۔ بات یہ تھی کہ وہ باقی تمام لوگوں سے زیادہ سخت محنت کر سکتا تھا اور بظاہر تھکتا بھی نہیں تھا ۔

جن اوقات میں ریستوران میں گاھکوں کی بھیڑ بہت زیادہ ہوتی تھی اس وقت وہ اوپر تک لدی ہوئی کشتیاں لےکر باورچی‌خانے کے زینے پر ایک ایک جست میں چار چار پانچ پانچ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آندھی کی طرح اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر بھاگتا رہتا تھا ۔

رات کے وقت جب ریستوران کے دونوں کمروں میں ہنگامہ کم ہو جاتا تھا تو تمام ویٹر نیچے باورچی‌خانے کے گودام میں جمع ہو جاتے تھے اور جوئے کا بازار گرم ہو جاتا تھا ۔ پاویل نے بارہا جوئے کے ان کھیلوں میں بڑی بڑی رقموں کے نوٹ ادھر سے ادھر ہوتے دیکھے تھے ۔ وہاں اتنی بڑی رقموں کے ڈھیر دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہ ہوتی تھی، کیوں‌کہ وہ جانتا تھا کہ ہر پالی میں ہر ویٹر کو ایک ایک روبل آدھا آدھا روبل کرکے بخشش کی شکل میں تیس تیس، چالیس چالیس روبل کی آمدنی ہو جاتی تھی ۔ بعد میں وہ یہ رقم جوئے اور شراب میں اڑا دیتے تھے ۔ پاویل کو ان سے نفرت تھی ۔

وہ سوچتا تھا «کم بخت سور کہیں کے! ایک آرتیم ہے اول درجے کا مستری ہے اور اسے مہینے بھر میں کیا ملتا ہے ۔ صرف اڑتالیس روبل! مجھے ملتے ہیں دس روبل ۔ اور یہ ہیں کہ ایک ایک دن میں اتنی بہت سی رقم پیٹ لیتے ہیں ۔ اور کام کیا کرتے ہیں

یہاں سے کشتی اٹھائی وہاں پہنچا دی۔ وہاں سے کشتی لائے یہاں پٹک دی۔ اور سارا پیسہ جوئے اور شراب میں اڑا دیتے ہیں۔»

یہ ویٹر پاویل کے نزدیک اتنے ہی اجنبی اور دشمن تھے جتنا کہ اس کے مالک۔ «یہاں یہ سالے، سور موری کے کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگتے ہیں لیکن ان کی بیویاں اور بچے شہر میں رئیسوں کی طرح اینڈتے پھرتے ہیں۔»

کبھی کبھی یہ ویٹر اپنے بیٹوں کو کالج کی ٹھاٹ دار یونیفارم پہناکر وہاں لاتے تھے اور بعض اوقات اپنی بیویوں کو بھی جو آرام طلبی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے موٹی اور پھپس ہو گئی تھیں۔ پاویل اپنے دل میں کہتا «میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کے پاس ان رئیسوں سے بھی زیادہ پیسہ ہے جن کی میزوں پر یہ دوڑ دوڑ کر چیزیں پہنچاتے ہیں۔» رات کے وقت باورچی‌خانے اور گوداموں کے تاریک گوشوں میں جو کچھ ہوتا تھا اسے دیکھ کر بھی اب پاویل کے جذبات کو ٹھیس نہ لگتی تھی۔ وہ بخوبی سمجھ گیا تھا کہ برتن دھونے والی یا شراب دینے والی کوئی بھی نوکرانی اس وقت تک اپنی ملازمت کو برقرار نہیں رکھ سکتی جب تک کہ وہ اپنا جسم چند روبلوں کی خاطر ان لوگوں کے ہاتھ بیچنے پر راضی نہ ہو جن کا یہاں طوطی بولتا تھا۔

پاویل نے یہاں زندگی کی ذلیل‌ترین پستیوں کی، زندگی کے قعر مذلت کی سب سے نچلی تہوں کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اسے یہاں سے ایک ناقابل برداشت سڑاند آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، بالکل ویسی ہی جیسی کہ سڑتی ہوئی دلدل میں سے آتی ہے اور وہ ہر نئی اور انجانی چیز کی طرف بڑے اشتیاق سے لپکتا تھا۔

آرتیم اپنے بھائی کو ریلوے یارڈ میں امیدوار رکھانے میں ناکام رہا۔ وہ لوگ پندرہ برس سے کم کے کسی لڑکے کو لینے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن پاویل کے دل میں اس بڑی سی پکی عمارت کے لئے

جو دھوئیں سے کالی ہو چکی تھی بڑی کشش تھی اور وہ اس دن کے انتظار میں تھا جب اسے ریستوران سے نجات ملے گی۔

وہ اکثر آرتیم سے ملنے یارڈ میں جایا کرتا تھا اور کبھی کبھی اس کے ساتھ وہ بھی ریل کے ڈبوں کے معائنے کو نکل جاتا تھا اور جتنا بھی ممکن ہوتا اس کی مدد کرتا تھا۔

خصوصاً فروسیا کے چلے جانے کے بعد وہ بہت تنہائی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس خوش مزاج اور ہنس مکھ لڑکی کے چلے جانے کے بعد پاویل کو اس بات کا احساس اور بھی شدت کے ساتھ ہؤا کہ اس کے ساتھ اس کی دوستی کتنی گہری ہو چکی تھی۔ اب صبح کے وقت جب وہ برتن دھونے کی کوٹھڑی میں آتا اور پناہ گزیں عورتوں کے لڑنے جھگڑنے کی چخ چخ سنتا تو اسے ایک خلا اور تنہائی کا احساس ہوتا جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کئے دے رہا تھا۔

ایک دن رات کو پانی کھولانے کے برتن کے نیچے آگ سلگا کر وہ بھٹی کے سامنے بیٹھ گیا اور آنکھیں سکیڑ کر آگ کی لپٹوں کو گھورنے لگا۔ وہ سلگتی ہوئی آگ کی گرمی کا لطف لے رہا تھا۔ اس وقت برتن دھونے کی کوٹھڑی میں وہ اکیلا ہی تھا۔

بےاختیار وہ فروسیا کے بارے میں سوچنے لگا اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومنے لگا جو اس نے ابھی چند ہی دن پیشتر دیکھا تھا۔

سنیچر کے دن رات کی چھٹی کے وقت پاویل زینے سے اتر کر باورچی‌خانے کی طرف جا رہا تھا کہ یک بیک تجسس کے جذبے کے تحت وہ لکڑیوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نیچے گودام میں کیا ہو رہا ہے۔ عام طور پر جواری وہیں جمع ہوتے تھے۔

کھیل اپنے عروج پر تھا۔ زالیوانوف بینک چلا رہا تھا اور جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اتنے ہی میں سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پاویل نے مڑ کر دیکھا کہ پروخوشکا نیچے آ رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی وہ جھٹ سے زینے کے نیچے سرک گیا اور اسے باورچی خانہ کی طرف چلا جانے دیا۔ زینے کے نیچے اندھیرا تھا اس لئے پروخوشکا اسے دیکھہ نہیں پایا۔

جب پروخوشکا زینے کے موڑ پر گھوما تو پاویل کو اسکی چوڑی پیٹھہ اور بڑے سر کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اتنے میں سیڑھیوں پر کسی اور کے ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دی جو بڑی پھرتی کے ساتھہ اس ویٹر کے پیچھے لپکا آ رہا تھا۔ اور پاویل نے ایک جانی پہچانی آواز کو پکارتے سنا:

«پروخوشکا بات سنو!»

پروخوشکا رک گیا اور اوپر زینے کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔

«کیا چاہتی ہے؟» اس نے غرا کر کہا۔

تیز قدموں کی آہٹ اسی طرح سنائی دیتی رہی اور پھر فروسیا نظر آئی۔

اس نے ویٹر کا بازو پکڑکر رندھی ہوئی شکستہ آواز میں کہا «پروخوشکا، لفٹیننٹ نے تمہیں جو رقم دی ہے وہ کہاں ہے؟»

اس آدمی نے جھٹک کر اپنا بازو اس لڑکی کی گرفت سے چھڑا لیا۔

«کونسی رقم؟ میں نے تمہیں دے دی تھی یا نہیں؟»

اس کے لہجے میں سختی اور خباثت بھری ہوئی تھی۔

«لیکن اس نے تو تمہیں تین سو روبل دئے تھے» فروسیا کی آواز گھٹی ہوئی سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔

«ہوں، تین سو!» پروخوشکا نے تضحیک کے انداز میں کہا۔

«سب لینا چاهتی هے - کیوں؟ دهوتی هو جهوٹے برتن اور اڑتی هو آسمان پر - کیوں میم صاحب؟ جو پچاس میں نے تجهے دیدئے وهی بہت هیں - تجهه سے کہیں اچهی پڑهی لکهی چهوکریوں تک کو اتنے نہیں ملتے - جو کچهه مل گیا هے اسکا شکر کرو - ایک رات کے لئے پچاس روبل بہت هوتے هیں - خیر میں تجهے دس اور دے دوں گا، اچها بیس سہی بس اس سے زیادہ نہیں اور اگر عقل سے کام لے گی تو اور بهی آمدنی هو سکتی هے - تو کہے تو میں تیری مدد کر سکتا هوں» اتنا کہه کر پروخوشکا تیزی سے گهوما اور باورچی خانے میں غائب هو گیا -

«بدمعاش! سؤر!» فروسیا نے اس کے پیچهے چیخ کر کہا اور لکڑی کے ڈهیر کا سہارا لیکر پهوٹ پهوٹ کر رونے لگی -

فروسیا کو لکڑی کے کندوں پر کرب کی حالت میں رہ رہ کر سر پٹکتے دیکهه کر، زینے کے نیچے، اندهیرے میں کهڑے هوئے پاویل کے دل کا جو حال هوا اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں - لیکن اس نے باهر نکل کر اپنی شکل نہیں دکهائی - بس وہ ایک تشنجی سی کیفیت میں زینے کے لوهے کے جنگلے میں بار بار اپنی انگلیاں گاڑ دیتا تها -

«تو ان لوگوں نے اسے بهی بیچ دیا - کمبخت کہیں کے! آہ فروسیا، فروسیا...»

اس کے دل میں پروخوشکا کے لئے پہلے سے بهی زیادہ نفرت پیدا هو گئی اور اسے اپنے آس پاس کی هر چیز گهناؤنی اور قابل نفرت معلوم هونے لگی - «اگر مجهه میں طاقت هوتی تو میں اس بدمعاش کی جان لے لیتا - کاش میں آرتیم کی طرح بڑا اور طاقت ور هوتا!»

پانی کهولانے کے برتن کے نیچے آگ کے شعلے بهڑک کر دهیمے پڑ گئے - ان کی لرزتی هوئی سرخ زبانوں نے ایک دوسرے سے

لپٹ کر ایک لمبی سی نیلگوں چکردار سیڑھی کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ پاویل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی طنز و استہزاء سے پر شیطان کا بچہ اپنی زبان نکال کر اس کا منھہ چڑھا رہا ہو اور اس کا مذاق اڑا رہا ہو ۔

کوٹھڑی میں مکمل خاموشی تھی، صرف چنگاریوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی اور ایک معینہ وقفہ کے ساتھہ نل سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں ۔

کلمکا نے آخری برتن جسے اس نے مانجھہ کر خوب چمکا دیا تھا الماری پر رکھہ دیا اور اپنے ہاتھہ پونچھہ ڈالے ۔ باورچی خانے میں کوئی اور نہیں تھا ۔ اس وقت جس باورچی کی ڈیوٹی تھی وہ اور باورچی خانے کے کام کرنے والے تمام دوسرے لوگ کلوک روم میں پڑے سو رہے تھے ۔ رات کے تین گھنٹوں کے لئے باورچی خانے پر سکون طاری ہو گیا ۔ یہ عرصہ کلمکا ہمیشہ اوپر پاویل کے ساتھہ گذارتا تھا ۔ بات یہ تھی کہ باورچی خانے میں کام کرنے والے اس نو عمر لڑکے اور پانی کھولانے والے اس کالی آنکھوں والے لڑکے میں بڑی گہری دوستی ہو گئی تھی ۔ اوپر پہنچ کر کلمکا نے دیکھا کہ پاویل بھٹی کے سامنے بیٹھا ہے ۔ پاویل نے اس جانے پہچانے جھبرے بالوں والے لڑکے کا سایہ دیوار پر پڑتے دیکھا اور بغیر مڑے ہی وہ بولا:

«کلمکا بیٹھہ جاؤ ۔»

وہ لڑکا لکڑیوں کے ڈھیر پر چڑھہ کر لیٹ گیا اور پاویل کو تکنے لگا جو بالکل خاموش بیٹھا ہؤا تھا ۔

«آگ میں کیا اپنی تقدیر دیکھہ رہے ہو؟» اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

پاویل نے آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں پر سے اپنی نظر ہٹائی اور اس کی دو بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، جن میں گھٹے ہوئے غم

کا ایک طوفان پوشیدہ تھا، کلمکا پر جم گئیں ۔ کلمکا نے اپنے دوست
کو اس سے پہلے کبھی اتنا اداس نہیں دیکھا تھا ۔
«پاویل آج تمہیں ہؤا کیا ہے؟» تھوڑی دیر رک کر اس نے پھر
پوچھا «کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟»
پاویل اٹھا اور آکر کلمکا کے پاس بیٹھ گیا ۔
«ہؤا تو کچھ بھی نہیں» اس نے دبی آواز میں کہنا شروع
کیا ۔ «کلمکا بس اب میرے لئے یہاں رہنا ناممکن ہو گیا ہے» اور
گھٹنوں پر رکھے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں ۔
«کیا ہو گیا ہے تمہیں آج؟» کلمکا نے کہنیوں کے بل اٹھ کر
پھر اپنا سوال دھرایا ۔
«آج؟ جب سے مجھے یہ کام ملا ہے تبھی سے میرا یہ حال ہے ۔
ذرا اس جگہ کی حالت پر غور کرو ۔ ہم لوگ بیلوں کی طرح کام
کرتے ہیں اور اس کے انعام میں ہمیں کیا ملتا ہے ۔ گھونسے اور
لاتیں! جس کا جی چاہے ہمیں مار دے لیکن کوئی ہماری طرفداری
کرنے نہیں آتا ۔ مالک نے ہمیں نوکر رکھا ہے اپنا کام کرانے کے
لئے لیکن جس کسی میں بھی طاقت ہے اسے ہم کو مارنے کا اختیار
ہے ۔ تم ہی بتاؤ ہم بھاگتے بھاگتے اگر جان بھی دے دیں تب بھی
سب کو تو خوش نہیں کر سکتے اور جسے بھی ہم خوش نہیں کر
پاتے وہی ہماری خبر لینے کے لئے تیار رہتا ہے ۔ اسکے علاوہ ہم
چاہے جتنی کوشش کریں کہ ہر کام ٹھیک ہو تاکہ کسی کو شکایت
کا موقع نہ ملے لیکن کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور نکل آتا ہے جس
کا کام اس کی مرضی کے مطابق اور ٹھیک وقت پر پورا نہیں ہوتا
اور بس اس صورت میں بھی ہماری شامت آ جاتی ہے . . .»
«اتنی زور زور سے باتیں نہ کرو» کلمکا نے ڈر کے مارے اس کی
بات بیچ میں ہی کاٹ دی ۔ «اگر کوئی آ گیا اور اس نے تمہاری بات
سن لی تو خیریت نہیں ۔»

پاویل اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

«سن لینے دو۔ میں تو خود ہی یہاں سے جا رہا ہوں۔ اس بدمعاشوں کے اڈے میں پڑے رہنے سے کہیں بہتر میں یہ سمجھتا ہوں کہ سڑکوں پر سے برف صاف کرنے کا کام کرنے لگوں۔ دیکھو تو کتنا پیسہ ہے ان بدمعاشوں کے پاس! یہ ہمیں جانوروں سے زیادہ بدتر سمجھتے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھہ جیسا چاہتے ہیں سلوک کرتے ہیں۔ نیک چلن لڑکیاں جو ان کے اشاروں پر ناچنے سے انکار کرتی ہیں ٹھوکر مار کر نکال دی جاتی ہیں اور ان کی جگہ فاقہ زدہ پناہ گزیں عورتیں کام پر رکھہ لی جاتی ہیں جن کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اور یہ عورتیں یہاں اس لئے چپکی رہتی ہیں کہ انہیں کم سے کم کھانے کو تو مل جاتا ہے۔ ان کی حالت اتنی عبرت ناک ہوتی ہے کہ روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے وہ کچھہ بھی کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔»

پاویل اتنے جوش میں بول رہا تھا کہ کلمکا نے اس ڈر سے کہ کہیں کوئی سن نہ لے، لپک کر باروچی‌خانے کا دروازہ بند کر دیا۔ پاویل بدستور اپنے دل کا غبار نکالتا رہا، اس تلخی کو اگلتا رہا جو اس کی روح میں سرایت کر گئی تھی۔

«اور کلمکا تم چپ چاپ ان کی مار برداشت کرتے رہتے ہو۔ آخر تم کبھی اپنی زبان کیوں نہیں کھولتے؟»

پاویل میز کے پاس پڑی ہوئی ایک تپائی پر دھم سے بیٹھہ گیا اور تھکے ہوئے انداز میں اس نے دونوں ہتھیلیوں پر اپنا سر ٹکا لیا۔ کلمکا بھی آگ میں تھوڑی سی لکڑیاں اور ڈال کر میز کے پاس آکر بیٹھہ گیا۔

«کیا آج پڑھنے کا ارادہ نہیں ہے؟» اس نے پاویل سے پوچھا۔

«پڑھنے کے لئے کچھہ ہے ہی نہیں» پاویل نے جواب دیا۔ «کتابوں کی دکان بند ہے۔»

«آج کیوں بند ہے؟» کلمکا نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔
«پولیس کتاب والے کو پکڑ کر لے گئی ہے ۔ اس کے یہاں کوئی چیز برآمد ہوئی تھی» پاویل نے جواب دیا ۔
«پکڑ کر لے گئی؟ کس لئے؟»
«کہتے ہیں سیاست کا الزام ہے ۔»
کلمکا پاویل کو گھورتا رہا ۔ وہ اس کی بات قطعی نہیں سمجھ پایا ۔
«سیاست! سیاست کیا ہوتی ہے؟»
پاویل نے اپنے کندھے جھٹک دئے ۔
«خدا جانے کیا ہوتی ہے ۔ سنا ہے کہ اگر کوئی زار کے خلاف ہو جائے تو اسے سیاست کہتے ہیں ۔»
کلمکا بالکل بھونچکا سا رہ گیا ۔
«تو کیا لوگ ایسا بھی کرتے ہیں؟»
«معلوم نہیں» پاویل نے جواب دیا ۔
اتنے میں دروازہ کھلا اور گلاشا برتن دھونے کی کوٹھڑی میں داخل ہوئی ۔ نیند کے مارے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ۔
«تم دونوں سو کیوں نہیں جاتے؟ ابھی سونے کے لئے گھنٹے بھر کا وقت اور ہے پھر گاڑی آ جائے گی ۔ پاوکا، تم تھوڑا سا آرام کر لو ۔ میں تمہارے بجائے انگیٹھی کو دیکھ لوں گی ۔»

پاویل کو جتنی جلدی کام چھوڑنے کا خیال تھا اس سے پہلے ہی اس نے نوکری چھوڑ دی اور جس طرح اسے نوکری چھوڑنی پڑی اس کا اسے گمان بھی نہ تھا ۔
جنوری کے دن تھے ۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا ۔ ایک دن جب پاویل اپنی پالی ختم کر کے گھر جانے کے لئے تیار ہؤا تو اس نے دیکھا کہ جو لڑکا اس کی جگہ لینے کے لئے آنے والا تھا وہ نہیں آیا ہے ۔ پاویل ریستوران کے مالک کی بیوی کے پاس گیا اور اس سے

کہا کہ کچھ بھی ہو وہ تو گھر جا رہا ہے۔ لیکن اس نے ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دی۔ پاویل کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ وہ کام کرتا رہے حالانکہ پورے دن اور پوری رات کام کرتے کرتے وہ تھک کر بالکل چور ہو چکا تھا۔ شام ہوتے ہوتے تھکن کے مارے اس کے اعضاء جواب دینے لگے۔ رات کے وقفے کے دوران میں اسے پانی کے برتن بھرنے تھے اور انہیں کھولانا تھا تاکہ تین بجےوالی گاڑی آنے سے پہلے پانی تیار ہو جائے۔

پاویل نے نل کھولا۔ لیکن اس میں پانی ہی نہیں آ رہا تھا۔ یقیناً پمپ میں کوئی خرابی تھی۔ نل کو کھلا چھوڑ کر وہ لکڑی کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ تھکن اس پر غالب آ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔

چند منٹ بعد نل میں غر، غر شوں، شوں کی آواز ہوئی اور برتن میں پانی بھرنے لگا۔ رفتہ رفتہ برتن منھ تک بھر گیا اور پانی بہہ کر برتن دھونے کی کوٹھڑی کے پکے فرش پر پھیلنے لگا۔ حسب معمول اس وقت وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں سارے فرش پر پانی ہی پانی ہو گیا اور پھر دروازے کے نیچے سے نکل کر پانی ریستوران میں جانے لگا۔

پانی اونگھتے ہوئے مسافروں کے تھیلوں اور گٹھڑیوں کے نیچے جمع ہونے لگا۔ لیکن کسی کی بھی توجہ اس بات کی طرف اس وقت تک نہ گئی جب تک کہ وہ فرش پر سوئے ہوئے ایک مسافر کے قریب نہ پہنچ گیا۔ وہ مسافر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور چیخ پڑا۔ سب لوگ اپنے اپنے سامان کی طرف لپکے اور ایک زبردست ہنگامہ مچ گیا۔

پانی مسلسل بہہ کر آتا رہا۔

پروخوشکا دوسرے ہال میں میزیں صاف کر رہا تھا۔ شور و غل کی آواز سن کر وہ بھاگا ہؤا آیا۔ جابجا بھرے ہوئے پانی کو

پھلانگتا ہؤا وہ دروازہ کی طرف لپکا اور ایک جھٹکے کے ساتھہ اس نے دروازہ کھول دیا ۔ دروازہ سے جو پانی رکا ہؤا تھا وہ بھی ہال میں بہہ آیا ۔

اور زیادہ شوروغل مچنے لگا ۔ جتنے ویٹر ڈیوٹی پر تھے سب کے سب برتن دھونے کی کوٹھڑی کی طرف بھاگے ۔ پروخوشکا سوئے ہوئے پاویل پر ٹوٹ پڑا ۔

اس لڑکے کے سر پر گھونسوں کی بارش ہونے لگی ۔ وہ بالکل مبہوت رہ گیا ۔

ابھی تک اس کی نیند پوری طرح ٹوٹی نہیں تھی ۔ اس کی سمجھہ میں کچھہ بھی نہ آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے ۔ اسے صرف اتنا احساس تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے چکا چوندھہ کر دینے والی بجلی کے کوندے لپک رہے ہیں اور اس کے تمام جسم میں شدید درد ٹیسیں مار رہا ہے ۔

پاویل کو اتنی بری طرح مارا گیا تھا کہ وہ نہ معلوم کیسے گھسٹتا گھسٹاتا بڑی مشکل سے گھر پہونچا ۔

صبح آرتیم نے غصہ سے آگ بگولا ہوکر اور تیوریاں چڑھاکر اپنے بھائی سے رات کے واقعہ کے بارے میں دریافت کیا ۔

پاویل نے سب کچھہ بتلا دیا ۔

«تمہیں مارا کس نے؟» آرتیم نے کرخت لہجے میں پوچھا ۔

«پروخوشکا نے ۔»

«اچھی بات ہے اب تم چپ چاپ آرام کرو ۔»

اس کے آگے ایک لفظ بھی کہے بغیر آرتیم نے اپنا کوٹ پہنا اور گھر سے باہر نکل گیا ۔

«یہاں پروخور نام کا ایک ویٹر ہے نا؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں ۔ کہاں ملے گا؟» اس نے برتن دھونے والی ایک لڑکی سے پوچھا ۔

گلاشا نے اس اجنبی کو دیکھا جو مزدوروں کے لباس میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

«ابھی آتا ہوگا» اس نے جواب دیا۔

آرتیم اپنے بھاری جسم کو دروازہ کے پاکھے کے سہارے ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

«اچھی بات ہے، میں یہیں انتظار کرتا ہوں۔»

پروخور ایک کشتی میں جھوٹے برتنوں کا پہاڑ لادے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور برتن دھونے کی کوٹھڑی میں داخل ہؤا۔

«یہی ہے» لڑکی نے ویٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آرتیم ایک قدم آگے بڑھا اور پروخور کے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھہ رکھہ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھورنے لگا۔

«تم نے میرے بھائی پاوکا کو کیوں مارا؟»

پروخور نے اپنا کندھا چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ وہ کامیاب ہوتا آرتیم کے ایک ھی گھونسے میں وہ فرش پر لوٹنے لگا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اتنے میں ایک دوسرا گھونسہ پڑا جو پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ اور وہ وھیں ڈھیر ہو گیا۔

برتن دھونےوالی عورتیں دھشت‌زدہ ہوکر ادھر ادھر کھسک گئیں۔

آرتیم پھرتی کے ساتھہ مڑا اور باھر جانے کے دروازہ کی طرف چل دیا۔

پروخوشکا فرش پر پڑا تھا۔ اس کے زخمی چہرے سے خون بہہ رہا تھا۔

اس دن شام کو آرتیم ریلوے یارڈ سے گھر واپس نہیں آیا۔

پتہ لگانے پر اس کی ماں کو معلوم ہؤا کہ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔

چھہ دن بعد آرتیم بہت رات گئے گھر لوٹا ـ اس وقت اس کی ماں سوچکی تھی ـ وہ پاویل کے پاس گیا ـ پاویل اپنے بستر پر بیٹھا ہؤا تھا ـ آرتیم نے بڑی نرمی سے پوچھا:

«بھیا اب جی تو اچھا ہے نا؟» اور وہ پاویل کے پاس بیٹھہ گیا ـ «خیریت ہوئی کہ اس سے زیادہ چوٹ نہیں آئی ـ» ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد اس نے پھر کہا «خیر کوئی پرواہ نہیں، تمہیں بجلی گھر میں کام مل جائے گا ـ میں نے وہاں تمہارے لئے بات چیت کی ہے ـ وہاں تم واقعی ایک مفید ہنر سیکھہ جاؤ گے ـ»

پاویل نے آرتیم کا طاقتور ہاتھہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا ـ

دوسرا باب

یہ اہم اور زبردست خبر آندھی کی طرح اس چھوٹے سے شہر میں پھیل گئی «زار کا تختہ الٹ دیا گیا!»

شہر کے باشندوں نے اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کر دیا ـ

برفانی طوفان میں ایک ٹرین رینگتی ہوئی اسٹیشن میں داخل ہوئی اور اس پر سے دو طالب علم اپنی یونیفارم پہنے کندھوں پر رائفلیں لٹکائے ہوئے اترے ـ ان کے پیچھے انقلابی سپاہیوں کا، جن کے بازوؤں پر سرخ بلے لگے ہوئے تھے، ایک دستہ بےترتیبی سے پلیٹ فارم پر اتر پڑا اور ان لوگوں نے اسٹیشن پر تعینات پولیس والوں، ایک بوڑھے کرنل اور محافظ شہر فوج کے سپہ سالار کو گرفتار کر لیا ـ تب جاکر شہروالوں کو اس خبر پر یقین آیا ـ ہزاروں لوگ برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں کو پار کرتے ہوئے شہر کے چوک کی طرف چل پڑے ـ

وهاں انہوں نے بڑے اشتیاق سے پہلی بار آزادی، مساوات اور اخوت کے الفاظ سنے، اتنے اشتیاق سے جیسے اپنی تشنگی بجھا رہے ہوں۔

اس واقعہ کے بعد کے دن بہت طوفانی تھے اور وہ جوش و خروش اور جشن و شادمانی کے دن بھی تھے۔ پھر اس کے بعد ایک سکوت طاری ہو گیا اور ٹاؤن ہال پر لہراتا ہؤا سرخ پرچم اس تغیر کی واحد نشانی باقی رہ گیا۔ ٹاؤن ہال پر مینشویکوں اور بُند کے ماننےوالوں نے اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔ باقی ہر چیز پہلے ہی کی طرح قائم رہی۔

جاڑے کے ختم کے قریب گھوڑ سوار سنتریوں کی ایک رجمنٹ شہر میں تعینات کر دی گئی۔ صبح کے وقت یہ سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بناکر جنوب مغربی جنگی مورچہ سے بھاگ کر آنےوالے سپاہیوں کی تلاش میں اسٹیشن پہونچ جاتے تھے۔

یہ سنتری بہت لحیم شحیم اور تنومند تھے۔ ان کے چہروں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اچھی غذا ملتی رہی ہے۔ ان کے بیشتر افسران شاہزادے اور بڑے بڑے کاؤنٹ تھے، ان کے شانوں پر اب بھی سنہری پٹیاں اور برجسوں پر روپہلی گوٹیں چمکتی تھیں۔ بالکل ویسی ہی جیسی کہ زار کے زمانے میں ہوتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کبھی انقلاب آیا ہی نہ ہو۔

پاویل، کلمکا اور سرگئی بروژاک کے لئے تو کوئی بھی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ وہی مالک اب بھی بدستور قائم تھے۔ نومبر میں جاکر کچھہ غیرمعمولی واقعات کی ابتدا ہوئی۔ اسٹیشن پر نئی قسم کے لوگ نظر آنے لگے اور انہوں نے وہاں کے حالات میں کچھہ جوش اور حرکت پیدا کرنی شروع کی۔ ان میں سے زیادہ‌تر تعداد ایسے سپاہیوں کی تھی جو سیدھے جنگ کے مورچے سے آ رہے تھے اور ان کی تعداد مسلسل بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ان کا نام بھی کچھہ عجیب سا تھا «بالشویک»۔

اس بات کا کسی کو بھی علم نہ تھا کہ اس پرزور اور پراثر لفظ کی ابتدا کس طرح ہوئی تھی۔

مورچے پر سے بھاگ کر آئے ہوئے سپاہیوں کو گرفتار کر کے رکھنا سنتریوں کے لئے دن بدن زیادہ مشکل ہوتا گیا۔ اسٹیشن پر گولیاں چلنے اور کانچ ٹوٹنے کی آوازیں دن بدن زیادہ سنائی دینے لگیں۔ لوگ جنگ کے مورچوں پر سے ٹولیاں بنا کر آ رہے تھے اور جب انہیں روکا جاتا تھا تو وہ سنگینوں سے مقابلہ کرتے تھے۔ دسمبر شروع ہوتے ہوتے وہ ریل گاڑیوں میں بھر بھر کر آنے لگے۔

ان سپاہیوں کو روکنے کی غرض سے سنتری اپنی پوری طاقت کے ساتھ اسٹیشن پر آئے۔ لیکن انہیں مشین گن کی گولیوں کی بوچھار سے چھلنی کر دیا گیا۔ ریل کے ڈبوں سے جو سپاہی اترتے تھے انہیں موت کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔

بھورے اوورکوٹ پہنے ہوئے مورچوں پر سے لوٹنے والے سپاہی سنتریوں کو کھدیڑ کر شہر کی طرف بھگا دیتے اور پھر اپنے سفر پر آگے بڑھ جاتے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے نہ جانے کتنی ریل گاڑیاں گزر گئیں۔

۱۹۱۸ء کے موسم بہار کے ایک دن تین دوست سرگئی بروژاک کے گھر سے تاش کھیل کر نکلے اور کورچاگن کے باغ میں جاکر گھاس پر لیٹ گئے۔ وہ اکتا سے گئے تھے۔ وقت کاٹنے کی جتنی ترکیبیں انہیں معلوم تھیں سب بےکیف نظر آنے لگی تھیں۔ اور وقت کاٹنے کے کسی زیادہ دلچسپ طریقے کی تلاش میں وہ اپنے دماغوں پر زور دے رہے تھے۔ اتنے میں انہیں پیچھے سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور انہوں نے دیکھا کہ ایک گھوڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑائے سڑک پر چلا آ رہا ہے۔

ایک ہی چھلانگ میں گھوڑا باغ کے نیچے سے احاطے اور سڑک

کے بیچ کی کھائی کو پار کر گیا اور گھوڑ سوار نے اپنا چابک پاویل اور کلمکا کی طرف پھٹکارتے ہوئے کہا:

«اے لڑکوں، ادھر آؤ!»

پاویل اور کلمکا اچھل کر کھڑے ہو گئے اور باغ کی چہار دیواری کی طرف دوڑے۔ گھوڑ سوار گرد سے اٹا ہؤا تھا۔ اس کی ٹوپی پر جسے اس نے سر کے پیچھے کی طرف سرکا رکھا تھا اور اس کی خاکی قمیص اور برجس پر گرد کی ایک موٹی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس کی بھاری سی فوجی پیٹی میں ایک ریوالور اور دو جرمن دستی بم لٹک رہے تھے۔

«بچوں! مجھے تھوڑا سا پانی پلا سکتے ہو؟» گھوڑ سوار نے ان سے پوچھا۔ پاویل پانی لینے کے لئے گھر کی طرف بھاگا۔ اس عرصہ میں گھوڑسوار سرگئی کی طرف مخاطب ہؤا جو مسلسل اسے تکے جا رہا تھا۔ «اچھا بچے یہ تو بتاؤ کہ تمہارے شہر میں کس کی حکومت ہے؟»

سرگئی نے ایک سانس میں تمام مقامی خبریں اس نووارد کو سنا ڈالیں۔

«دو ہفتے سے تو کوئی بھی حکومت نہیں ہے۔ اس وقت ہوم گارڈ کی حکومت ہے۔ تمام لوگ باری باری رات کو شہر میں پہرہ دیتے ہیں۔ لیکن آپ کون ہیں؟» سرگئی نے پلٹ کر اس سے سوال کیا۔

«بس بس بہت سیانے بچے وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں» گھوڑسوار مسکرایا۔

پاویل ایک برتن میں پانی لئے ہوئے گھر کی طرف سے بھاگتا ہؤا آیا۔

سوار نے ایک ہی گھونٹ میں برتن خالی کر کے پاویل کو واپس کر دیا۔ اور پھر گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دے کر وہ سرپٹ صنوبر کے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔

«کون تھا؟» پاویل نے کلمکا سے پوچھا۔

«مجھے کیا معلوم؟» کلمکا نے کندھا جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔
«معلوم ہوتا ہے شہر کی حکومت پھر بدلنے والی ہے۔ اسی لئے لیش چینسکی اپنے پورے کنبے کو لےکر کل ہی چلا گیا۔ اور اگر امیر لوگ بھاگ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چھاپہ مار آنے والے ہیں» سرگئی نے اس سیاسی مسئلے کا حل پیش کرتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ فیصلہ‌کن انداز میں اعلان کیا۔

اس کے اس اعلان کی دلیل اس قدر قائل کر دینے والی تھی کہ پاویل اور کلمکا دونوں نے فوراً اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

ابھی اس سوال پر لڑکوں کی بحث ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ بڑی سڑک کی طرف سے پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی جسے سن کر وہ تینوں پھر احاطے کی طرف بھاگے۔

دور ناظم جنگلات کے بنگلے کے پاس جو پیڑوں کے جھرمٹ میں ٹھیک سے دکھائی بھی نہ دیتا تھا انہوں نے بہت سے آدمیوں اور کئی گاڑیوں کو جنگل سے نکلتے دیکھا۔ اس قافلے سے کچھ آگے انہیں اپنے سے نسبتاً زیادہ قریب سڑک پر پندرہ بیس گھوڑ سواروں کی ایک ٹکڑی نظر آئی جو اپنے گھوڑوں کی زین کے اگلے حصے پر اپنی رائفلیں رکھے ہوئے تھے۔ ان سواروں کے آگے آگے ادھیڑ عمر کا ایک آدمی گھوڑے پر بیٹھا ہؤا چلا آ رہا تھا۔ وہ خاکی کوٹ پہنے تھا اور افسروں جیسی پیٹی لگائے ہوئے تھا۔ اس کے سینے پر ایک دوربین لٹک رہی تھی۔ اس کے برابر وہی آدمی تھا جس سے ابھی ابھی ان لڑکوں نے بات کی تھی۔ ادھیڑ عمر والے اس آدمی کے سینے پر ایک سرخ فیتہ ٹکا ہؤا تھا۔

«کیا کہا تھا میں نے؟» سرگئی نے پاویل کی پسلی میں کہنی مارتے ہوئے کہا۔ «وہ لال فیتہ دیکھا؟ چھاپہ‌مار ہیں۔ اگر نہ ہوں تو میں اپنا نام بدل دوں...» اور خوشی سے ناچتے ہوئے باڑ کو پھاندکر وہ سڑک پر جا کھڑا ہؤا۔

باقی دونوں نے بھی ایسا ھی کیا اور تینوں سڑک کے کنارے کھڑے ھوکر قریب آتے ھوئے سواروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رھے۔

جب سوار بالکل قریب آ گئے تب اس شخص نے جس سے وہ لڑکے پہلے مل چکے تھے، ان کو مخاطب کیا اور لیش‌چینسکی کے مکان کی طرف اپنے چابک سے اشارہ کرکے پوچھا:

«اس مکان میں کون رھتا ھے؟»

پاویل اس کے ساتھہ ساتھہ قدم بڑھاتا ھوا چلنے لگا۔ اس کی مستقل کوشش یہی تھی کہ وہ پیچھے نہ رہ جائے۔

«اس میں لیش‌چینسکی وکیل رھتا تھا۔ وہ کل بھاگ گیا۔ شائد آپ ھی لوگوں کے ڈر سے بھاگا ھوگا...»

«تمہیں کیسے معلوم کہ ھم لوگ کون ھیں؟» اس ادھیڑ عمر کے آدمی نے مسکرا کر پوچھا۔

«وہ جو لگا ھے» پاویل نے فیتے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ «کوئی بھی بتلا سکتا ھے۔»

شہر میں داخل ھونےوالے اس فوجی دستے کو دیکھنے کے لئے بڑے اشتیاق سے لوگ گھروں سے نکل نکل‌کر سڑک پر جمع ھونے لگے۔ ھمارے تینوں نوعمر دوست بھی سڑک پر کھڑے ھوکر دھول سے اٹے اور تھکے ھوئے سرخ سپاھیوں کو ادھر سے گذرتے دیکھہ رھے تھے۔ اور جب اس فوجی دستے کی واحد توپ اور مشین‌گنوں کی گاڑیاں سڑک کے پتھروں پر سے کھڑ کھڑ کرتی ھوئی گذریں تو یہ لڑکے بھی چھاپہ‌ماروں کے ساتھہ ھو لئے اور اس وقت تک گھر نہیں لوٹے جب تک کہ وہ ٹکڑی شہر کے بیچ میں پہنچ کر رک نہیں گئی اور سپاھیوں کو لوگوں کے گھروں میں ٹھیرانے کی تیاریاں نہیں شروع ھو گئیں۔

اس دن شام کو چار آدمی لیش‌چینسکی کے لمبے چوڑے دیوان‌خانے میں نقشین پایوں والی بھاری میز کے گرد بیٹھے ھوئے تھے۔ ان میں سے ایک تو اس دستے کا کمانڈر کامریڈ بلگاکوف تھا وہ ادھیڑ عمر

کا آدمی تھا اور اس کے بال کہیں کہیں سفید ہو چلے تھے۔ باقی تین آدمی اس دستے کی کمان کے افسر تھے۔

بلگاکوف نے میز پر اس علاقے کا ایک نقشہ کھول رکھا تھا اور اس وقت وہ اس پر اپنی انگلیاں دوڑا رہا تھا۔

«کامریڈ یرماچینکو تمہارا کہنا ہے کہ ہمیں یہاں پر مورچہ جمانا چاہئے» بلگاکوف نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو مخاطب کر کے کہا جس کے گالوں کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی اور دانت بہت مضبوط تھے۔ «لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے صبح ہی چل دینا چاہئے۔ زیادہ اچھا تو یہی ہوتا کہ ہم لوگ رات کو ہی چل پڑتے۔ لیکن سپاہیوں کو آرام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ جرمنوں کے آنے سے پہلے ہٹ کر ہم کازاتن پہنچ جائیں۔ اس وقت ہمارے پاس جتنی طاقت ہے اسے لے کر مقابلہ کرنا بہت ہی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ ایک توپ ہے جس میں صرف تیس گولے پھینکنے بھر کے لئے گولا بارود ہے۔ دو سو پیدل سپاہی اور ساٹھ سوار ہیں۔ کیا کہنے کتنی زبردست طاقت ہے۔ کیوں ہے نا! اور خصوصاً اس صورت میں جب کہ جرمن فوجیں پگھلے ہوئے فولاد کے سیلاب کی طرح آگے بڑھی آرہی ہیں۔ نہیں، ہم اس وقت تک ٹکر نہیں لے سکتے جب تک کہ ہم پیچھے ہٹنے والے دوسرے سرخ دستوں سے نہ جا ملیں۔ اس کے علاوہ کامریڈ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جرمنوں کے علاوہ ہمیں راستے میں طرح طرح کے متعدد انقلاب دشمن گروہوں سے بھی نبٹنا ہوگا۔ میری تجویز یہ ہے کہ اسٹیشن سے آگے والا پل اڑا کر ہم لوگ صبح ہی یہاں سے چل پڑیں۔ پل کی مرمت کرنے میں جرمنوں کو دو تین دن لگ جائیں گے اور اتنے عرصے کے لئے ریل کے ذریعے ان کا آگے بڑھنا رکا رہے گا۔ کیوں ساتھیوں آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ فیصلہ تو

ہمیں کو کرنا ہے...» اس نے میز کے گرد بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرف مڑکر کہا ۔

استرژکوف نے جو بلگاکوف کے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھا ہؤا تھا، اپنے ہونٹ چوستے ہوئے پہلے نقشے کی طرف نظر ڈالی اور پھر بلگاکوف پر۔

«میں بلگاکوف سے اتفاق کرتا ہوں» آخرکار وہ بولا۔

ان میں سے سب سے کم عمر شخص نے جو مزدوروں کی سی قمیص پہنے ہوئے تھا، بلگاکوف سے اتفاق کیا ۔ وہ بولا:

«بلگاکوف ٹھیک کہتے ہیں ۔»

لیکن یرماچینکو، وہی شخص جس نے دن میں لڑکوں سے بات کی تھی اپنا سر ہلاتا رہا ۔

«پھر آخر ہم نے یہ دستہ کس مقصد کے لئے منظم کیا تھا؟ بغیر مورچہ لئے جرمنوں کے حملوں کے سامنے پیچھے ہٹتے جانے کے لئے؟ جہاں تک میری رائے کا سوال ہے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہیں مورچہ جماکر دشمن سے ٹکر لینی چاہئے ۔ میں پیچھے ہٹتے ہٹتے تھک گیا ہوں ۔ بالکل اکتا گیا ہوں ۔ اگر میرا بس چلتا تو میں بلاشبہ یہیں ان سے ٹکر لے لیتا...» جھٹکے کے ساتھ اپنی کرسی پیچھے سرکا کر وہ اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا ۔

بلگاکوف نے اسے ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ۔

«یرماچینکو ہمیں عقل سے کام لینا چاہئے ۔ ہم اپنے سپاہیوں کو ایسی لڑائی میں نہیں جھونک سکتے جس میں ہماری شکست اور تباہی یقینی ہو ۔ یہ بہت ہی مضحکہ خیز بات ہوگی ۔ ہمارے پیچھے ایک پوری ڈویژن آ رہی ہے جس کے پاس بڑی بڑی توپیں ہیں اور زرہ بند موٹریں ہیں... یہ وقت اسکول کے لڑکوں کی طرح اونچی اونچی، پرشوکت باتیں کرنے کا نہیں ہے، کامریڈ یرماچینکو!...» پھر دوسروں سے مخاطب ہوکر وہ کہتا رہا «تو یہ فیصلہ ہو گیا کہ ہم

کل صبح اس جگه کو چھوڑ دیں گے... اب دوسرا مسئله ہے یہاں کے لوگوں کے ساتھه تعلق قائم رکھنے کا» بلگاکوف کہتا رہا ـ «چونکه ہم سب سے بعد میں یہاں سے جا رہے ہیں اس لئے جرمنوں کے عقب میں کام کی تنظیم کرنے کی ذمه‌داری ہماری ہے ـ یه بہت بڑا ریلوے جنکشن ہے اور شہر میں دو اسٹیشن ہیں ـ ہمیں اس بات کا انتظام کرنا ہے که ریلوے میں کام کرنے کے لئے کسی معتبر ساتھی کو مقرر کیا جائے ـ ہمیں ابھی اس بات کا فیصله کرنا ہوگا که یہاں کام شروع کرنے کے لئے کسے چھوڑا جائے ـ تمہارے ذہن میں کوئی ہے؟»

«میرا خیال ہے که فیودور ژوخرائی کو یہاں رہنا چاہئے ـ وہی جو ملاح ہے نا» یرماچینکو نے میز کے قریب آکر کہا ـ «پہلی بات تو یه ہے که وہ یہیں کا رہنے والا ہے ـ دوسرے وہ فٹر اور میکینک بھی ہے ـ اس لئے اسے اسٹیشن پر کوئی کام بھی مل جائے گا اور فیودور کو کسی نے ہمارے دستے کے ساتھه دیکھا بھی نہیں ہے ـ وہ رات سے پہلے یہاں پہنچے گا بھی نہیں ـ بڑا سمجھدار آدمی ہے ـ وہ سارا کام بخوبی سنبھال لے گا ـ میری رائے میں تو اس کام کے لئے وہی سب سے مناسب آدمی ہے ـ»

بلگاکوف نے سر ہلایا ـ

«ٹھیک ہے ـ یرماچینکو میں تم سے متفق ہوں ـ آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے، ساتھیو؟» اس نے دوسرے لوگوں سے پوچھا ـ «کوئی نہیں نا؟ تو یه فیصله رہا ـ ہم لوگ ژوخرائی کے پاس کچھه رقم چھوڑ جائیں گے اور اسے ایک سند بھی دے جائیں گے جس کی اسے اپنے کام کے سلسلے میں ضرورت پڑے گی ـ اچھا ساتھیو، اب رہا تیسرا اور آخری سوال ـ یہاں شہر میں جو اسلحه جمع ہیں ان کا کیا ہوگا؟ یہاں بہت کافی رائفلیں ہیں کم سے کم بیس ہزار ہوں گی ـ وہ زارشاہی جنگ کے زمانے کی بچی ہوئی ہیں اور کسی

کو ان کا خیال بھی نہیں ہے — وہ سب کی سب ایک کسان کے چھپر میں ڈھیر ہیں — مجھے یہ بات اس چھپر کے مالک سے معلوم ہوئی ہے — اور وہ ان سے چھٹکارا پانے کے لئے بےقرار ہے — ہم انہیں یہاں جرمنوں کے استعمال کے لئے تو چھوڑ کر نہیں جا سکتے — میری رائے میں تو انہیں جلا دینا چاہئے — اور یہ کام فوراً ہی کر ڈالنا چاہئے تاکہ صبح تک فرصت مل جائے — دشواری صرف یہ ہے کہ آس پاس کی جھونپڑیوں میں آگ پھیل جانے کا خطرہ ہے — وہ جگہ شہر کے سرے پر ہے جہاں غریب کسان رہتے ہیں —»

استرژکوف اپنی کرسی میں کسمسایا — وہ بہت ہٹا کٹا آدمی تھا — اس کی ڈاڑھی بڑھ کر کافی گھنی ہو گئی تھی — کئی دن سے حجامت بنانے کی نوبت نہیں آئی تھی —

«رائفلوں کو جلایا کیوں جائے؟ میں تو انہیں یہاں کے لوگوں کے درمیان تقسیم کر دینے کے حق میں ہوں —»

بلگاکوف نے پھرتی سے مڑکر اس کی طرف دیکھا —

«کیا کہا تقسیم کر دیا جائے؟»

«بہت عمدہ خیال ہے!» یرماچینکو نے پرجوش تائید کی — «انہیں مزدوروں کو دے دیا جائے اور اگر کوئی اور شخص چاہے تو اس کو بھی — جب جرمن ان لوگوں کی زندگی عذاب کر دیں گے تب ان کے پاس جوابی حملہ کرنے کے لئے کوئی چیز تو ہوگی — اس میں تو کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ جرمنوں کے مظالم کی کوئی انتہا نہ ہوگی — اور جب حالات ناقابل برداشت ہو جائیں گے تو یہ لوگ ہتھیار لےکر ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے — استرژکوف کا کہنا ٹھیک ہے: رائفلیں بانٹ دینی چاہئیں — اگر کچھ رائفلیں دیہاتوں میں بھی پہنچا دی جائیں تو برا نہیں ہے — کسان انہیں حفاظت سے چھپاکر رکھیں گے اور جب جرمن ان کی ہر چیز ضبط کرنا شروع کریں گے اس وقت رائفلیں بہت مفید ثابت ہوں گی —»

بلگاکوف ایک دبی ہوئی ہنسی ہنس پڑا ۔
«یہ تو درست ہے لیکن جرمن یقیناً تمام ہتھیار واپس کرنے کا حکم دیں گے اور ہر شخص ان کے اس حکم کی تعمیل کرے گا ۔»
«ہر شخص نہیں کرے گا» یرماچینکو نے اعتراض کیا ۔ «کچھ لوگ کریں گے لیکن باقی لوگ نہیں کریں گے ۔»
بلگاکوف نے میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا ۔
«میں رائفلیں بانٹ دینے کے حق میں ہوں» اس نوجوان مزدور نے بھی یرماچینکو اور استرژکوف کی تائید کی ۔
«اچھی بات ہے تو یہ فیصلہ ہو گیا» بلگاکوف بھی راضی ہو گیا ۔ «اب اور کچھ تو رہا نہیں» اس نے اپنی کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا ۔ «ہم صبح تک آرام کر سکتے ہیں ۔ جب ژوخرائی آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا ۔ مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں ۔ یرماچینکو تم ذرا سنتریوں کی چوکیوں کا معائنہ کرلو ۔»
جب سب لوگ چلے گئے تو بلگاکوف دیوان خانے سے ملے ہوئے سونے کے کمرے میں چلا گیا اور گدے پر اپنا اوورکوٹ بچھاکر لیٹ گیا ۔

دوسرے دن صبح پاویل بجلی گھر سے مکان واپس آ رہا تھا ۔ پچھلے سال بھر سے وہ وہاں بھٹی جھونکنے والے کے مددگار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا ۔
اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ شہر میں کسی غیرمعمولی ہیجان اور ہلچل کا دور دورہ ہے ۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا اسے اور زیادہ لوگ ملتے گئے جو ایک، دو اور کوئی کوئی تو تین تین رائفلیں لئے چلے جا رہے تھے ۔ اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر معاملہ کیا ہے ۔ اس لئے وہ بے تحاشہ پوری رفتار

سے گھر کی طرف لپکا ۔ لیش چینسکی کے باغ کے باہر اس نے دیکھا کہ کل جن لوگوں سے اس کی جان پہچان ہوئی تھی وہ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے ۔

پاویل بھاگا بھاگا گھر میں گیا اور جلدی سے منھ ہاتھ دھو ڈالا ۔ جب اسے اپنی ماں سے یہ معلوم ہوا کہ آرتیم ابھی تک گھر واپس نہیں آیا ہے تو وہ فوراً باہر بھاگا اور اس نے سیدھے سرگئی بروژاک کے گھر کا رخ کیا ۔ سرگئی شہر کے دوسرے حصے میں رہتا تھا ۔

سرگئی کا باپ ریل کے انجن کے ڈرائیور کے نیچے کام کرتا تھا ۔ اس کا اپنا ایک چھوٹا سا گھر تھا اور تھوڑی سی زمین بھی ۔

سرگئی کہیں گیا ہوا تھا ۔ اس کی ماں نے جو ایک موٹی سی زرد رو عورت تھی بہت جھنجھلاہٹ کے ساتھ پاویل پر نظر ڈالی ۔

«خدا جانے کہاں چلا گیا ہے! آنکھ کھلتے ہی گھر سے نکل گیا ۔ بالکل دیوانوں کی طرح ۔ کہتا تھا کہ کہیں رائفلیں بٹ رہی ہیں ۔ میں سمجھتی ہوں وہیں گیا ہوگا ۔ تم سب نکٹے سپاہیوں کو ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہاری ذرا اچھی طرح ٹھکائی کی جائے ۔ تم لوگ بالکل ہاتھ سے نکل گئے ہو ۔ ابھی دودھ کے دانت بھی تو تمہارے ٹوٹے نہیں اور چلے ہیں رائفلوں کے پیچھے ۔ کہہ دینا اس بدمعاش سے کہ اگر میرے گھر میں ایک کارتوس بھی لایا تو چمڑی ادھیڑ دوں گی ۔ نہ جانے گھر میں کیا اٹھا لائے گا اور پھر بھگتنا پڑے گا مجھے ۔ تم تو وہاں نہیں جا رہے ہو نا؟»

لیکن سرگئی کی بکی ماں کی بات ابھی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ پاویل سڑک پر پہنچ چکا تھا اور سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا ۔

بڑی سڑک پر اسے ایک شخص ملا جو دونوں کندھوں پر ایک ایک رائفل لئے چلا آ رہا تھا ۔ پاویل بھاگ کر اس کے پاس پہنچا ۔

«چچا! ذرا ہمیں بھی بتا دو کہ یہ کہاں ملی ہیں؟»
«وہاں ورخووینا میں لوگ بانٹ رہے ہیں۔»
پاویل جتنا تیز ہو سکتا تھا بھاگا۔ دو سڑکیں پار کرنے کے بعد وہ ایک لڑکے سے ٹکرا گیا جو ایک بھاری سی پیدل سپاہیوں والی رائفل گھسیٹتا ہؤا چلا آ رہا تھا۔ اس پر سنگین بھی لگی ہوئی تھی۔ پاویل نے اس لڑکے کو روک کر پوچھا:
«تمہیں یہ بندوق کہاں سے ملی؟»
«وہاں اسکول کے سامنے فوجی بانٹ رہے تھے۔ لیکن اب ایک بھی نہیں رہ گئی ہے۔ سب بٹ گئیں۔ ساری رات بانٹی ہیں انہوں نے۔ اب تو بس خالی بکسے رہ گئے ہیں۔ یہ تو میں دوسری لئے جا رہا ہوں» لڑکے نے بڑے فخر کے ساتھہ اعلان کیا۔
یہ خبر سن کر پاویل کے بالکل چھکے چھوٹ گئے۔
«لعنت ہے۔ مجھے سیدھے وہیں جانا تھا» پاویل نے مایوس ہو کر سوچا۔ «میں کیسے اتنی غفلت کر گیا؟»
دفعتاً اسے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ پھرتی کے ساتھہ مڑا اور دو ہی تین چھلانگوں میں اس لڑکے کے پاس جا پہنچا جو مخالف سمت میں جا رہا تھا اور اس نے اس کے ہاتھہ سے رائفل چھین لی۔
«تمہارے لئے ایک کافی ہے۔ یہ اب میری ہو گئی» اس نے ایک قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔
دن دہاڑے اس لوٹ پر وہ لڑکا آگ بگولا ہو گیا اور پاویل پر جھپٹا لیکن پاویل چھٹک کر پیچھے ہٹ گیا اور اس نے رائفل کی سنگین اپنے حریف کی طرف تان دی۔
«خبردار! نہیں تو میں نہیں جانتا۔ چوٹ کھا جاؤ گے» پاویل نے چلا کر کہا۔

کھسیاھٹ کے مارے وہ لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بے بسی کے غصہ میں گالیاں بکتا ھؤا بھاگ گیا ۔ پاویل اپنی کامیابی پر بےانتہا خوش ھوتا ھؤا گھر کی طرف چل دیا ۔ باغ کے جنگلے کو پھاندکر وہ بھاگا بھاگا سائبان میں پہنچا اور وھاں اس نے اپنے مال غنیمت کو کھپریل میں چھپا دیا اور خوشی سے مگن ھو کر سیٹی بجاتا ھؤا گھر میں داخل ھؤا ۔

بہت ھی حسین ھوتی ھیں یوکرین کی گرمیوں کی شامیں! یوکرین کے شیپیتووکا جیسے چھوٹے شہروں میں جو اپنے آس پاس کے گاؤں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ھیں ۔ گرمیوں کی پرسکون راتوں کی کشش تمام نوجوانوں کو گھروں سے باھر کھینچ لاتی ھے ۔ برساتیوں میں، مکانوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں یا سڑک کے کنارے پڑے ھوئے لکڑی کے ڈھیروں پر، غرض ھر جگہ آپ کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں یا جوڑوں میں نوجوان لوگ بیٹھے ھوئے مل جائیں گے ۔ ان کے شوخ و شنگ قہقہے اور نغمے شام کی خاموشی میں گونجتے رھتے ھیں ۔

فضا پھولوں کی خوشبو سے بوجھل اور عطربار رھتی ھے ۔ آسمان کی نیلگوں گہرائیوں میں مدھم ستارے جھلملاتے رھتے ھیں اور نقرئی آوازیں فضا کی لہروں پر تیرتی ھوئی دور، بہت دور، پہنچ جاتی ھیں ...

پاویل کو اپنے ایکارڈین باجے سے بہت محبت تھی ۔ وہ اس سریلے باجے کو بڑی شفقت آمیز احتیاط کے ساتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ لیتا اور اپنی سبک انگلیوں کو بہت روانی کے ساتھ پردوں کی دوھری قطار پر اوپر نیچے دوڑانے لگتا ۔ نیچے مدھم سروں میں آہ بھرنے کی سی آواز آتی اور پھر پرکیف نغمے کا ایک طوفان ابل پڑتا ۔

جب ایکارڈین کی لہردار دھونکنیاں چلتی ہیں اور ساز کے گرم سانسوں کے ساتھہ دل کو موہ لینے والی تانیں لرزنے لگتی ہیں تو کوئی کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا اور آپ کے پاؤں سنگیت کی اس پرالتجا دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ زندگی بھی کیا ہی پرلطف چیز ہے!

لیکن آج کی شام خاص طور سے خوشی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ پاویل کے گھر کے باہر شہتیروں کے ڈھیر پر مست مسرت نوجوانوں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی ہے۔ اور سب سے زیادہ مگن تو گالوچکا ہے۔ وہ سنگتراش کی بیٹی جو پاویل کے پڑوس میں رہتی ہے۔ گالوچکا لڑکوں کے ساتھہ ناچنے گانے پر جان دیتی ہے۔ اس کی باریک مخملی آواز میں بڑی گہرائی ہے۔

پاویل اس سے کچھہ ڈرتا بھی ہے کیونکہ گالوچکا زبان کی بہت تیز ہے۔ وہ پاویل کے پاس آکر بیٹھہ گئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

« ایکارڈین بجاتے ہوئے تم کتنے پیارے لگتے ہو!» اس نے کہا۔ « افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم بہت چھوٹے ہو، نہیں تو میں تم سے شادی کر لیتی۔ بہت ہی اچھی رہتی ہماری جوڑی۔ جو مرد ایکارڈین بجا لیتے ہیں ان پر تو میں جان چھڑکتی ہوں۔ ان پر تو میں بالکل لٹو ہوں۔»

مارے شرم کے پاویل کے کانوں کی لویں تک سرخ ہو گئیں۔ لیکن اس کی خوش‌قسمتی سے رات کی تاریکی میں کوئی اسے دیکھہ نہ سکتا تھا۔ اس چنچل چھوکری سے جتنا ہی دور ہٹنے کی وہ کوشش کرتا اتنا ہی وہ اس سے اور چمٹتی جاتی۔

« اچھا میری جان تم مجھہ کو چھوڑکر بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟ کیوں بولو نا؟ تم کتنے پیارے ہو!» یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

اس کا گداز سینہ پاویل کے کندھے سے چھو گیا اور بے اختیار پاویل کے دل میں ایک عجیب سا ہیجان پیدا ہو گیا ۔ وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے قہقہے معمولاً پرسکوت گلی کی خاموشی میں گونج اٹھے ۔

«ذرا کھسک کے بیٹھو، مجھے بجانے بھر کی جگہ تو دو» پاویل نے اس کے کندھے کو ہلکے سے جھٹکا دیتے ہوئے کہا ۔

اس پر ایک قہقہہ اور لگا ۔ لوگ فقرے بازی کرنے لگے اور آوازے کسنے لگے ۔

ماروسیا نے پاویل کی جان چھڑائی ۔ «پاویل کوئی غم کا گیت سناؤ جسے سن کر دل کے تار جھنجھنا اٹھیں ۔»

رفتہ رفتہ ایکارڈین کی دھونکنیاں چلنے لگیں ۔ پاویل کی انگلیاں ساز کے پردوں پر تھرکنے لگیں اور ایک مشہور اور سب کا محبوب نغمہ فضا میں گونج اٹھا ۔ گانے میں سب سے پہلے گالینا شریک ہوئی، پھر ماروسیا، پھر باقی لوگ:

اپنی اپنی جھونپڑیوں میں مانجھی سارے
جمع ہوئے ہیں صبح سکارے
کتنا میٹھا !
کتنا سندر!
مل کر گاتے دکھ کے مارے...

گانے والوں کی لرزتی ہوئی کم سن آوازیں فضا میں گونجتی ہوئی دور جنگل کی گہرائیوں تک پہونچ گئیں ۔

«پاوکا !» یہ آرتیم کی آواز تھی ۔ پاویل نے اپنے ایکارڈین کی دھونکنی بند کر دی اور تسمہ لگا دیا ۔

«مجھے گھر میں بلا رہے ہیں ۔ میں اب چلوں گا ۔»

«ارے تھوڑی دیر اور بجاؤ ۔ جلدی کیا ہے ایسی؟» ماروسیا نے خوشامد کے ساتھ اسے روکتے ہوئے کہا ۔

لیکن پاویل اپنی ضد پر اڑا رہا ۔

«میں نہیں رک سکتا ۔ کل پھر گائیں گے ۔ لیکن اس وقت تو مجھے جانا ہی پڑے گا ۔ آرتیم نے پکارا ہے ۔» اتنا کہہ کر وہ سڑک پار کر کے بھاگتا ہوا سامنے والے چھوٹے سے گھر میں گھس گیا ۔

اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ کمرے میں آرتیم کے علاوہ دو آدمی اور بیٹھے ہیں ۔ ایک تو آرتیم کا دوست رومان تھا اور دوسرا کوئی اجنبی ۔ وہ تینوں میز کے گرد بیٹھے تھے ۔

«آپ نے مجھے بلایا ہے؟» پاویل نے پوچھا ۔

آرتیم نے سر ہلایا اور اس اجنبی سے مخاطب ہؤا:

«یہی ہے میرا وہ بھائی جس کے بارے میں ہم لوگ باتیں کر رہے تھے ۔»

اجنبی نے اپنا کھردرا گانٹھہ دار ہاتھہ پاویل کی طرف بڑھا دیا ۔

«بات یہ ہے پاوکا» آرتیم نے اپنے بھائی سے کہا ۔ «تم کہہ رہے تھے نا کہ بجلی گھر کا کوئی مستری بیمار ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ کل تم یہ دریافت کر آؤ کہ ان لوگوں کو اس کی جگہ کسی ہوشیار آدمی کی ضرورت تو نہیں ہے ۔ اگر ہو تو آکر ہمیں اطلاع دینا ۔»

اجنبی بیچ میں بول اٹھا:

«یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ میں اس کے ساتھہ چلا جاؤں گا اور خود ہی بڑے صاحب سے بات کر لوں گا ۔»

«ضرورت تو ہے انہیں ایک آدمی کی ۔ آج بجلی گھر صرف اس لئے ٹھپ پڑا رہا کہ استانکووچ بیمار تھا ۔ بڑے صاحب نے دو چکر بھی لگائے ۔ انہیں اس کی جگہ کام کرنے کے لئے کسی آدمی کی سخت تلاش تھی ۔ لیکن کوئی ملا ہی نہیں ۔ اور صرف ایک بھٹی جھونکنے والے کی مدد سے انجن چالو کرتے ہوئے انہیں ڈر لگتا تھا ۔ بجلی کے مستری کو ٹائی فس ہو گیا ہے ۔»

«تب تو بات پکی ہے» اس اجنبی نے کہا ۔ «میں کل تمہارے پاس آؤں گا اور پھر ہم دونوں وہاں ساتھ چلیں گے» اس نے پاویل سے مخاطب ہو کر کہا ۔

«اچھی بات ہے ۔»

پاویل کی نظریں اجنبی کی پرسکون بھوری آنکھوں سے ٹکرائیں ۔ اجنبی بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا ۔ اس کی جمی ہوئی نظروں کے مسلسل، پرغور جائزے سے پاویل کچھ بوکھلا سا گیا ۔ وہ نووارد اجنبی بھورے رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھا، جس کے اوپر سے لےکر نیچے تک تمام بٹن بند تھے ۔ دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوٹ اس کے لئے چھوٹا ہے کیونکہ اس کی مضبوط چوڑی پیٹھ پر کوٹ کی سیون ادھڑی جا رہی تھی ۔ اس کے سر اور کندھوں کے درمیان بیل کی سی ایک مضبوط موٹی گردن تھی ۔ اس کے پورے جسم کو دیکھ‌کر شاہ بلوط کے کسی پرانے تناور درخت کا خیال آتا تھا ۔

«خدا حافظ ژوخرائی» آرتیم نے اسے دروازے تک پہنچاکر کہا ۔ «تو کل تم میرے بھائی کے ساتھ چلے جانا اور وہاں نوکری کی بات پکی کر لینا ۔ امید تو ہے کہ ضرور کامیابی ہوگی ۔»

اس دستے کے چلے جانے کے تین دن بعد جرمن فوجیں شہر میں داخل ہوئیں ۔ ان کے آنے کی خبر اسٹیشن پر انجن کی سیٹی بجنے سے ملی کیوں‌کہ ادھر پچھلے کچھ دنوں سے تو اسٹیشن بالکل ویران پڑا تھا ۔

«جرمن آ رہے ہیں» سارے شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی ۔

شہر بھر میں اس طرح کھلبلی مچ گئی جیسے کسی نے چیونٹوں کے بل کو چھیڑ دیا ہو ۔ حالانکہ شہر والوں کو کچھ دن پہلے سے

یہ معلوم تو تھا کہ جرمن آنے والے ہیں لیکن انہوں نے کسی وجہ سے اس بات پر یقین نہ کیا تھا ۔ اور اب یہ خونخوار جرمن کہیں راستے میں نہیں تھے بلکہ یہیں عین ان کے شہر میں پہونچ گئے تھے ۔

شہر کے باشندے اپنے گھروں کے سامنے والے باغیچوں کی چہار دیواری اور چھوٹے چھوٹے پھاٹکوں کے اندر ہی سے جھانکتے رہے ۔ خوف کے مارے ان کی سڑک پر نکلنے کی جرائت نہ ہوتی تھی ۔

جرمن فوجیں سڑک کے دونوں طرف اکہری قطار میں مارچ کرتی ہوئی شہر میں داخل ہوئیں ۔ ان سپاہیوں کے جسموں پر زیتونی رنگ کی وردیاں تھیں اور وہ اپنی بندوقیں تانے چل رہے تھے ۔ ان کی رائفلوں کے آگے چوڑی چوڑی چاقو کی قسم کی سنگینیں لگی ہوئی تھیں ۔ ان کے سروں پر فولاد کے وزنی خود اور پیٹھ پر بڑے بڑے تھیلے تھے ۔ اسٹیشن سے شہر تک سپاہیوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا ۔ وہ بہت چوکنے تھے اور ہر لمحہ کسی بھی حملے کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے حالانکہ ان پر حملہ کرنے کی بات کسی نے خواب میں بھی نہ سوچی تھی ۔

ان کے آگے دو افسر تھے جن کے ہاتھوں میں ماؤزر پستولیں تھیں ۔ سڑک کے بیچ میں ترجمان چلا آرہا تھا ۔ وہ ہیٹمین کے تابع کام کرنے والا سارجنٹ میجر تھا ۔ وہ نیلے رنگ کا یوکرینی کوٹ اور اونچی سی سمور کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا ۔

جرمن سپاہی شہر کے بیچ والے بڑے چوک میں صفیں باندھ‌کر کھڑے ہو گئے ۔ نقارے بج رہے تھے ۔ نسبتاً زیادہ باہمت شہریوں کا ایک چھوٹا سا مجمع وہاں پر لگ گیا ۔ ہیٹمین کا وہ ملازم جو یوکرینی کوٹ پہنے ہوئے تھے دواؤں کی دوکان کی برساتی پر چڑھ‌ گیا اور وہاں سے اس نے بہ‌آواز‌بلند کمانڈینٹ میجر کارف کا جاری کردہ حکم پڑھ‌کر سنایا :

۱

میں حکم دیتا ہوں کہ:

شہر کے تمام باشندے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام اسلحہ جات اور دوسرے مہلک ہتھیار جو ان کے پاس ہوں یہاں داخل کر دیں۔ اس فرمان کی حکم عدولی کرنے والے کو سزا کے طور پر گولی سے اڑا دیا جائے گا۔

۲

شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے اور شہریوں کو رات کے آٹھ بجے کے بعد سڑک پر نکلنے کی قطعی ممانعت ہے۔

میجر کارف، ٹاون کمانڈینٹ۔

جرمن کمان نے اپنا دفتر اسی عمارت میں قائم کر لیا جو پہلے شہری نظام حکومت کے استعمال میں تھی اور جہاں انقلاب کے بعد مزدوروں کے نمائندوں کی سوویت کا دفتر تھا۔ عمارت کے صدر پھاٹک پر ایک سنتری تعینات کر دیا گیا۔ اس کے سر پر پریڈ کرتے وقت پہننے کا خود تھا جس پر ایک بڑا سا عقاب کی شکل کا شاہی نشان بنا ہؤا تھا۔ اسی عمارت کے پیچھے والے صحن میں شہریوں سے واپس ملنے والے ہتھیار جمع کرنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔

گولی سے اڑا دئیے جانے کی دھمکی سے ڈر کر تمام دن شہر کے باشندے ہتھیار لا لاکر جمع کرتے رہے۔ بالغ لوگ تو آئے نہیں۔ انہوں نے نوجوانوں اور چھوٹے بچوں کے ہاتھ ہتھیار بھجوا دئیے۔ جرمنوں نے کسی کو گرفتار نہیں کیا۔

جو لوگ وہاں خود نہیں جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے رات کے وقت اپنے ہتھیار سڑکوں پر پھینک دئیے اور صبح کو جرمنوں کی

ایک گشتی ٹکڑی نے تمام ہتھیار جمع کر کے ایک فوجی گاڑی میں بھر کر کمان کے دفتر پہنچا دئیے۔

دو پہر کے ایک بجے جب ہتھیار واپس کرنے کی میعاد معینہ ختم ہو گئی تو جرمن سپاہیوں نے اس مال غنیمت کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کل ملاکر چودہ ہزار رائفلیں واپس آئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چھہ ہزار رائفلیں واپس نہیں کی گئی تھیں۔ جرمنوں نے گھر گھر جو تلاشیاں لیں ان میں زیادہ کچھہ برآمد نہ ہوا۔

ان دو ریلوے مزدوروں کو جن کے گھروں سے چھپی ہوئی رائفلیں برآمد ہوئی تھیں دوسرے دن علی‌الصبح شہر کے باہر لے جا کر یہودیوں کے پرانے قبرستان میں گولی مار دی گئی۔

آرتیم کو جوں ہی کمانڈینٹ کے حکم کی خبر ملی وہ بھاگا ہؤا گھر آیا۔ صحن ہی میں پاویل کی اس سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے پاویل کے کندھے پر ہاتھہ رکھہ کر بہت دھیرے سے لیکن سختی کے ساتھہ پوچھا:

«تم گھر کوئی ہتھیار لائے تھے؟»

پاویل نے طے تو یہی کیا تھا کہ وہ رائفل کے بارے میں کسی کو نہ بتلائےگا۔ لیکن وہ اپنے بھائی سے جھوٹ نہ بول سکا اور اس لئے اس نے سب کچھہ صاف صاف بتا دیا۔

وہ دونوں ساتھہ سائبان میں گئے۔ آرتیم نے کھپریل میں چھپی ہوئی رائفل اتار کر اس کا توڑا اور سنگین نکالی اور پھر رائفل کی نلی پکڑ کر اسے پوری طاقت کے ساتھہ گھما کر ایک باڑ کے کھمبے پر دے مارا۔ رائفل کا کندہ پرخچے پرخچے ہو گیا۔ جو کچھہ بچا وہ باغیچے کے پار کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ سنگین اور توڑے کو آرتیم نے غلاظت کے گڑھے میں ڈال دیا۔

یہ کام ختم کر چکنے کے بعد آرتیم اپنے بھائی سے مخاطب ہؤا:
«دیکھو پاوکا اب تم بچے نہیں رہے اور تمہیں اتنا سمجھنا چاہئے کہ بندوق کھیلنے کی چیز نہیں ہے۔ دیکھو خبردار گھر میں کوئی ایسی ویسی چیز مت لانا۔ یہ بہت ہی سنگین اور خطرناک بات ہے۔ آج کل اس قسم کی حرکتوں سے جان جوکھوں میں پڑ سکتی ہے۔ اس طرح کی حرکتیں چھوڑ دو کیوں‌کہ اگر تم اس قسم کی کوئی چیز گھر لائے اور وہ یہاں پکڑی گئی تو سب سے پہلے مجھے گولی مار دی جائے گی۔ تم کو تو بچہ سمجھ کر کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ زمانہ بہت خطرناک ہے، سمجھے!»

پاویل نے وعدہ کر لیا۔

جس وقت دونوں بھائی صحن پار کر کے گھر میں داخل ہو رہے تھے اسی وقت ایک گاڑی لیشچینسکی کے پھاٹک کے سامنے آکر رکی اور اس میں سے وکیل، اس کی بیوی اور دو بچے نیلی اور وکٹر اترے۔

«اچھا تو یہ چڑیاں پھر اپنے گھونسلے میں واپس آ گئیں» آرتیم غصے سے بڑبڑایا۔ «اب ان کے عیش ہیں۔ خدا غارت کرے ان کو!» اور یہ کہتا ہؤا وہ مکان میں داخل ہو گیا۔

سارا دن پاویل بڑی مایوسی کے ساتھ رائفل کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسی عرصہ میں اس کا دوست سرگئی ایک پرانے ویران سائبان میں، دیوار کے پاس زمین میں گڑھا کھودنے میں مصروف تھا۔ آخرکار گڑھا تیار ہو گیا۔ سرگئی نے تین بالکل نئی رائفلیں اچھی طرح سے چیتھڑوں میں لپیٹ کر گڑھے کے حوالے کر دیں۔ سرخ فوج کے اس دستے نے جب عوام میں ہتھیار تقسیم کئے تھے اسی وقت اس نے یہ رائفلیں حاصل کی تھیں۔ اور انہیں جرمنوں کے حوالے کر دینے کا اس کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے ساری رات اس بات کی جان توڑ کوشش کی تھی کہ رائفلوں کو حفاظت کے ساتھ کہیں چھپا دیا جائے۔

اس نے گڑھے کو پاٹ کر، مٹی کو اپنے پاؤں سے روند دیا اور اس کے اوپر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا دیا ـ اپنی کوششوں کے نتیجے پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ کام قابل اطمینان طور پر پورا ہو گیا ہے تو اس نے اپنی ٹوپی اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھ ڈالا ـ

"اب ڈھونڈھنے دو سالوں کو ـ اور اگر انہیں مل بھی گئی تو عمر بھر انہیں اس کا پتہ نہیں چل سکتا کہ ان کو یہاں کس نے چھپایا ہے ـ کیونکہ یہ سائبان تو کسی کا بھی نہیں ہے ـ"

رفتہ رفتہ پاویل اور اس سنجیدہ چہرے والے بجلی کے مستری میں دوستی پیدا ہو گئی ـ اسے بجلی گھر میں کام کرتے ہوئے اب پورا ایک مہینہ ہو چکا تھا ـ

ژوخرائی نے بھٹی جھونکنے والے کی مدد کرنے والے اس لڑکے کو سمجھایا کہ برقی رو پیدا کرنے والی مشین کس طرح بنتی ہے اور اسے کیسے چلایا جاتا ہے ـ

وہ ملاح اس ہوشیار لڑکے کو بہت پسند کرنے لگا تھا ـ چھٹیوں کے دن وہ اکثر آرتیم کے یہاں جاتا اور اس کی ماں سے گرہستی کے جھنجھٹوں اور مصیبتوں کا دکھڑا سنتا ـ جب وہ اپنے بیٹے پاوکا کی شرارتوں کے بارے میں شکایت کرتی تو خصوصاً وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتا ـ ژوخرائی بہت سنجیدہ اور سمجھدار آدمی تھا ـ ماریا یاکوولیونا کو اس کی وجہ سے بہت اطمینان ہوتا اور اس کی بہت سی فکریں دور ہو جاتیں ـ جب وہ وہاں ہوتا وہ اپنی پریشانیاں بھول جاتی اور زیادہ خوش نظر آتی ـ

ایک دن پاویل بجلی گھر کے صحن میں ایندھن کے اونچے اونچے انباروں کے بیچ میں سے ہو کر گزر رہا تھا کہ اتنے میں ژوخرائی نے اسے روکا ـ

«تمہاری ماں مجھ سے کہتی تھی کہ تمہیں لڑائی جھگڑے کا بڑا شوق ہے» اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ «تمہارے بارے میں وہ کہہ رہی تھی کہ بالکل لڑاکو مرغوں جیسا ہے» ژوخرائی اتنا کہہ کر اپنے ہونٹ بھینچ کر پسندیدگی سے ہنس پڑا ۔ «دراصل لڑنا کوئی بری بات نہیں ہے بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ کس سے لڑنا ہے اور کیوں ۔»

پاویل صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ ژوخرائی مذاق کر رہا ہے یا سنجیدگی سے بات کر رہا ہے ۔

«میں بھی بلاوجہ نہیں لڑتا» اس نے جواب دیا ۔ «میں ہمیشہ حق اور انصاف کی بات کے لئے لڑتا ہوں ۔»

«کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں ٹھیک طرح لڑنا سکھا دوں؟» ژوخرائی نے اس سے یہ غیر متوقع سوال کیا ۔

«ٹھیک طرح لڑنے کا کیا مطلب؟» پاویل نے اسے تعجب سے دیکھا ۔

«تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا ۔»

اور اس دن پاویل کو مکے بازی کے فن کی بابت ایک مختصر ابتدائی لکچر دیا گیا ۔

اس فن میں پاویل کو آسانی سے مہارت نہ حاصل ہو سکی ۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ژوخرائی کا مکہ کھا کر وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر لوٹنے لگا ۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ بہت محنتی اور مستقل مزاج شاگرد ثابت ہوا ۔

گرمیوں کے دن تھے ۔ کلمکا کے یہاں سے واپس آکر پاویل ایک دن اپنے کمرے میں تھوڑی دیر ادھر ادھر پہلو بدلتا رہا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کر کے وقت گذاری کرے ۔ آخر کار پاویل نے اپنی پسندیدہ جگہ پر جا کر بیٹھنے کا فیصلہ کیا ۔ اس کے مکان کے پیچھے باغ کے ایک کونے میں ایک سائبان پڑا ہوا

تھا - اسی کی چھت اس کی محبوب جگہ تھی - مکان کے پیچھے والا صحن پار کر کے وہ باغ میں داخل ہؤا اور باغ میں سے ہوتا ہؤا تختوں کے بنے ہوئے اس سائبان کے پاس جا پہونچا اور اس کی چھت پر چڑھہ گیا - سائبان کے اوپر جھکی ہوئی چیری کے درختوں کی گھنی شاخوں کے بیچ میں سے راستہ بناتا ہؤا وہ چھت کے بیچوں بیچ پہنچ گیا اور دھوپ کھانے کے لئے لیٹ گیا -

سائبان کا ایک حصہ لیش‌چینسکی کے باغ کی طرف نکلا ہؤا تھا اور چھت کے سرے پر سے اس کا پورا باغ اور گھر کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا - چھت کی کگر سے آگے اپنا سر نکال‌کر پاویل کو صحن کا بھی ایک حصہ دکھائی دینے لگا - اس نے صحن میں ایك گاڑی کھڑی دیکھی - لیش‌چینسکی کے ساتھہ جو جرمن لیفٹیننٹ رہتا تھا اس کا اردلی اپنے مالک کے کپڑوں کو برش سے صاف کر رہا تھا -

پاویل نے اس لیفٹیننٹ کو اکثر اس پھاٹک پر دیکھا تھا جس سے ہوکر صحن میں جانے کا راستہ تھا - اس کا قد پستہ اور چہرے کا رنگ بالکل چقندر کی طرح سرخ تھا - وہ ایک چھوٹی سی ترشی ہوئی مونچھہ رکھے ہوئے تھا، بغیر کمانی کا چشمہ پہنتا تھا اور اس کی ٹوپی کے آگے چھجا سا نکلا ہؤا تھا جس پر چمک‌دار لاکھہ لگا ہوا تھا - پاویل یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بغلی کمرے میں رہتا ہے جس کی کھڑکی باغ میں کھلتی تھی اور سائبان کی چھت پر سے دکھائی دیتی تھی -

اس وقت لیفٹیننٹ میز پر بیٹھا کچھہ لکھہ رہا تھا - دفعتاً اس نے اپنا لکھا ہؤا کاغذ اٹھایا اور کمرہ سے باہر چلا گیا - کاغذ اردلی کو دے کر وہ اس راستہ پر چل دیا جو باغ سے ہو کر پھاٹک کی طرف جاتا تھا - سمرهاؤس کے قریب رک کر وہ اندر کسی سے باتیں کرنے لگا - ایک لمحہ بعد نیلی لیش‌چینسکایا باہر نکلی - لیفٹیننٹ نے اس کے ہاتھہ میں ہاتھہ ڈال دیا اور وہ دونوں پھاٹک

کے باہر سڑک پر نکل گئے ۔ پاویل اپنی بڑھیا جگہ سے یہ تمام کارروائی دیکھ رہا تھا ۔ یک بیک اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں ۔ اور وہ آنکھیں بند کرکے سونے کو ہی تھا کہ اس نے اردلی کو لیفٹیننٹ کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا ۔ اردلی نے وردی کھونٹی پر ٹانگ دی، باغ کی طرف والی کھڑکی کھولدی اور کمرے کی ہر چیز سلیقے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر رکھ دی ۔ اس کے بعد باہر آکر اس نے دروازہ بند کر دیا ۔ دوسرے لمحے پاویل نے اسے اصطبل کے پاس دیکھا جہاں گھوڑے بندھے تھے ۔

کھلی ہوئی کھڑکی میں سے پاویل نے پورے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا ۔ میز پر چمڑے کی ایک پیٹی اور کوئی چمک دار چیز پڑی تھی ۔

بے اختیار اس کے دل میں تجسس کا جذبہ پیدا ہوا جس پر قابو پانا اس کے لئے نا ممکن تھا ۔ اسی جذبے کے تحت پاویل انتہائی خاموشی کے ساتھ چھت پر سے چیری کے درخت پر آیا اور لیش چینسکی کے باغ میں اتر گیا ۔ اپنی کمر جھکائے وہ بھاگ کر باغ کو پار کر گیا اور کھڑکی سے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا ۔ اس کے سامنے میز پر چمڑے کی ایک پیٹی پڑی ہوئی تھی جس میں کندھے سے لٹکانے کے لئے ایک تسمہ بھی تھا ۔ اسی پیٹی میں پستول رکھنے کا چمڑے کا ایک خول لگا ہؤا تھا جس کے اندر ایک نہایت عمدہ بارہ کارتوسوں والا مین لیکر پستول رکھا ہوا تھا ۔

پاویل نے اپنا دم سادھ لیا ۔ چند سکنڈ تک تو وہ ایک اندرونی کشمکش میں مبتلا رہا لیکن جان ہتھیلی پر رکھ کر جرائت کرنے کا جذبہ آخرکار اس پر غالب آ گیا اور کمرے میں داخل ہوکر اس نے پستول کا خول اٹھایا اور اس میں سے وہ نیا نیلگوں فولاد کا ہتھیار نکال کر کھڑکی سے باہر کود گیا ۔ چاروں طرف پھرتی سے نظر ڈال کر اس نے بڑی احتیاط سے پستول کو اپنی جیب میں ڈالا

اور بجلی کی طرح باغ کو پار کر کے چیری کے درخت کے پاس پہنچ گیا۔ بندروں جیسی پھرتی کے ساتھہ وہ چھت پر چڑھہ گیا اور وہاں دم لے کر اس نے پیچھے نظر ڈالی۔ اردلی ابھی تک سائیس کے ساتھہ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ باغ میں خاموشی اور سناٹا تھا۔ پاویل جلدی سے چھت کے دوسری طرف اترا اور گھر کی طرف بھا گا۔

اس کی ماں باورچی خانہ میں کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ اس لئے اس نے پاویل کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

پاویل نے صندوق کے پیچھے سے ایک پرانا کپڑا نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھر سب کی نظریں بچا کر وہ بھاگ کر صحن کے پار ہو گیا اور جنگلہ پھاند کر جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر آ نکلا۔ وہ اپنی جیب میں رکھے ہوئے اس بھاری پستول کو پکڑے ہوئے تھا تاکہ وہ اس کی ران سے نہ ٹکرائے، وہ بےتحاشہ اپنی پوری رفتار سے بھاگتا ہؤا پاس والے اینٹوں کے بھٹے کے قریب پہنچ گیا۔ یہ بھٹہ اب کام نہیں کرتا تھا اور ٹوٹ پھوٹ کر بالکل کھنڈر ہو چکا تھا۔ بھاگتے وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے پاؤں زمین پر پڑ ہی نہ رہے ہوں۔ ہوا اس کے کان کے پاس سے سنسناتی ہوئی گذر رہی تھی۔

اینٹوں کے اس پرانے بھٹے کے آس پاس مکمل خاموشی تھی۔ وہاں کا منظر بہت ہی مایوس کن تھا۔ لکڑی کی چھت جگہ جگہ سے گر گئی تھی۔ چاروں طرف ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے انبار لگے تھے اور اینٹیں پکانے کی بھٹیاں بھی ٹوٹ کر گر چکی تھیں۔ اس جگہ چاروں طرف جھاڑ جھنکار لگا ہؤا تھا۔ پاویل اور اس کے دوستوں کو چھوڑ کر وہاں کبھی کوئی اور نہ جاتا تھا۔ وہ لوگ کبھی کبھی یہاں کھیلنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ پاویل کو وہاں کئی ایسی خفیہ جگہیں معلوم تھیں جہاں اس کا یہ چرایا ہوا خزانہ چھپایا جا سکتا تھا۔

وہ ایک بھٹی کی درز میں سے ہوکر اوپر چڑھ گیا اور بڑی ہوشیاری سے چاروں طرف نظر دوڑائی، لیکن کوئی بھی دکھائی نہ دیا ۔ صرف صنوبر کے درختوں سے دھیمی دھیمی سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی اور ہوا کے ہلکے جھونکوں سے سڑک پر کبھی کبھی تھوڑی سی گرد اڑ جاتی تھی ۔ فضا میں رال کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی ۔

پاویل نے چیتھڑوں میں لپٹا ہؤا پستول بھٹی کے فرش کے ایک کونے میں رکھہ دیا اور اس کے اوپر پرانی اینٹوں کا ایک چھوٹا سا ٹیلہ سا بنا دیا ۔ باہر نکلتے وقت اس نے اس پرانی بھٹی کے منھہ کو اینٹوں سے بند کر دیا اور اس جگہ کو جہاں اس نے پستول چھپایا تھا بڑے غور سے ذہن نشین کر لیا ۔ اور پھر دھیرے دھیرے وہ گھر کی طرف چل پڑا ۔ اس کے پاؤں بری طرح کانپ رہے تھے ۔

«اس سب کا کیا انجام ہوگا؟» اس نے سوچا اور اس کا دل ایک نا معلوم اندیشہ کے بوجھہ سے دبنے سا لگا ۔

وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے وہ معمول سے پہلے ہی بجلی گھر پہنچ گیا ۔ اس نے چوکیدار سے چابی لی اور پاور ہاؤس میں داخل ہونےوالے چوڑے دروازے کھول دئے ۔ راکھہ کا گڑھا صاف کرتے ہوئے، بائلر میں پانی بھرتے ہوئے اور آگ سلگاتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ لیش‌چینسکی کے گھر پر کیا ہو رہا ہوگا ۔

گیارہ بجے کے قریب ژوخرائی نے آکر پاویل کو باہر بلایا ۔

«آج تمہارے گھر پر تلاشی کیوں ہوئی تھی؟» اس نے دھیرے سے پوچھا ۔

پاویل چونک پڑا ۔

«تلاشی؟»

«مجھے تو اس بات سے بڑی تشویش ہو گئی ہے» ژوخرائی

نے تھوڑی دیر رک کر کہا ۔ «تمہیں تو نہیں معلوم وہ کس چیز کی تلاش میں آئے تھے؟»

پاویل کو بخوبی معلوم تھا کہ وہ کس چیز کی تلاش میں آئے تھے ۔ لیکن وہ ژوخرائی کو پستول کی چوری کی بابت بتانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا ۔ اس کا سارا بدن اندیشے کی وجہ سے کانپ رہا تھا ۔ اس نے پوچھا :

«انہوں نے آرتیم کو گرفتار تو نہیں کیا؟»

«گرفتار تو کسی کو نہیں کیا لیکن گھر کی ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دی ۔»

اس بات سے پاویل کو کچھ تھوڑی سی تسلی ہوئی حالانکہ اس کی پریشانی ابھی پوری طرح دور نہ ہوئی تھی ۔ چند منٹ تک وہ اور ژوخرائی دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے کھڑے رہے ۔ ان میں سے ایک بخوبی جانتا تھا کہ تلاشی کس لئے ہوئی تھی اور اس کے انجام کا تصور کرکے پریشان ہو رہا تھا ۔ دوسرا اس بات کو نہیں جانتا تھا ۔ اس لئے محتاط اور چوکنا تھا ۔

«خدا انہیں غارت کرے ۔ شائد انہیں کسی طرح میرے بارے میں کچھ بھنک مل گئی ھے» ژوخرائی نے سوچا ۔ «آرتیم تو میرے بارے میں کچھ جانتا نہیں ھے ۔ پھر انہوں نے اس کے گھر کی تلاشی کیوں لی ۔ اب مجھے زیادہ محتاط رہنا پڑے گا ۔»

وہ دونوں کچھ کہے بغیر ایک دوسرے سے رخصت ہوئے اور اپنے اپنے کام پر واپس چلے گئے ۔

لیش چینسکی کے گھر پر ایک ھنگامہ مچا ھوا تھا ۔

لیفٹیننٹ کو جب پتہ چلا کہ پستول غائب ھے تو اس نے اپنے اردلی کو طلب کیا ۔ اردلی نے بڑی معصومیت سے کہہ دیا کہ کسی نے چرا لیا ھوگا ۔ اس پر افسر آپے سے باھر ھو گیا، ضبط و اعتدال نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے اردلی کی کنپٹی پر ایک بھرپور

طمانچہ رسید کر دیا۔ طمانچہ پڑتے ہی اردلی کی آنکھوں کے آگے زمین گھوم گئی۔ لیکن وہ تنا ہوا اٹنشن کی حالت میں کھڑا رہا۔ وہ اپنی آنکھیں مچمچا رہا تھا اور انتہائی فرمانبرداری کے ساتھ اگلے اقدام کا انتظار کر رہا تھا۔

جب وکیل کو اس حادثے کی تشریح کے لئے بلایا گیا تو وہ چوری کی خبر سن کر بہت چراغ پا ہوا اور اس نے لیفٹیننٹ سے اس بات کی معافی مانگی کہ اس قسم کی واردات اس کے گھر میں ہوئی تھی۔

وکٹر لیش چینسکی نے اپنے باپ کو سمجھایا کہ ممکن ہے پستول پڑوسیوں نے چرایا ہو اور خصوصاً اس بدمعاش چھوکرے پاویل کورچاگن نے۔ باپ نے بلاتامل اپنے بیٹے کا قیاس لیفٹیننٹ کے کانوں تک پہنچا دیا۔ اور اس نے فوراً تلاشی کا حکم دے دیا۔

تلاشی سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور گمشدہ پستول کے واقعہ سے پاویل کا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ اس قسم کی پر خطر حرکتیں بھی کبھی کامیاب ہو جاتی ہیں۔

تیسرا باب

تونیا کھلی ہوئی کھڑکی میں کھڑی خیالات میں ڈوبی ہوئی اس جانے پہچانے باغ کا جائزہ لے رہی تھی۔ باغ کے چاروں طرف لگے ہوئے حور کے تناور درخت ہوا کے ہلکے جھونکوں سے دھیرے دھیرے جھوم رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس جگہ جہاں اس نے اپنا سارا بچپن گذارا تھا پورے سال بھر بعد آئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ کل ہی یہاں سے گئی ہو اور صبح کی گاڑی سے لوٹ آئی ہو۔

وہاں کی کوئی چیز بھی تبدیل نہ ہوئی تھی۔ رس بھری کی جھاڑیاں ہمیشہ کی طرح بڑے ستھرے طریقے سے کٹی ہوئی تھیں اور باغ کے راستے بھی ہمیشہ کی طرح نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ راستوں کے دونوں طرف پینزی کی روشیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ پھول اس کی ماں کو سب سے زیادہ پسند تھے۔ باغ کی ہر چیز صاف ستھری اور خوشنما تھی۔ ہر چیز پر ایک ایسی چھاپ تھی جیسے کسی ماہر باغبان نے کتابوں سے حاصل کیا ہوا اپنا سارا علم اس باغ کو ترتیب دینے میں صرف کر دیا ہو۔ ان صاف ستھرے اور نپے تلے راستوں کو دیکھتے دیکھتے تو نیا اکتا گئی تھی۔

اس نے اپنا ناول اٹھا لیا جسے وہ پڑھ رہی تھی اور برآمدے میں آنے کا دروازہ کھول کر زینے سے اترتی ہوئی باغ میں چلی گئی۔ پھر اس نے پھاٹک کی چھوٹی سی چور کھڑکی کھولی جو روغن سے چمک رہی تھی! اور خراماں خراماں اسٹیشن کے پمپ ہاوس کے پاس والے تالاب کی طرف روانہ ہوئی۔

پل پار کر کے وہ سڑک پر نکل آئی جس کے دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ اس کی دائیں طرف تالاب تھا جس کے گرد بید مجنوں اور دوسری قسم کے بید کے درخت تھے۔ بائیں جانب جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

وہ پتھروں کی پرانی کان کے پاس والے تالابوں کی طرف جا رہی تھی کہ اتنے میں پانی کی سطح پر مچھلی پکڑنے کی ایک بنسی کو اوپر نیچے ہوتا دیکھ کر وہ ٹھہر گئی۔

اس نے بید مجنوں کے درخت کے ایک ٹیڑھے میڑھے اینٹھے ہوئے تنے پر جھک کر اس کی شاخوں کو ہٹا کر جھانکا تو اسے ایک لڑکا نظر آیا۔ اس لڑکے کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے اور اس نے اپنے پتلون کے پائنچے گھٹنوں کے اوپر چڑھا رکھے تھے۔ سورج کی تپش سے اس کا رنگ سنولا گیا تھا۔ اس کے قریب ہی ٹین کا

ایک زنگ خوردہ ڈبہ رکھا تھا جس میں بنسی میں چارہ لگانے کے لئے کچھ کیڑے رکھے تھے۔ لڑکا اپنے کام میں اتنا محو تھا کہ اس نے لڑکی کو بھی نہ دیکھا۔

«تمہارا خیال ہے کہ تم یہاں مچھلیاں پکڑ سکتے ہو؟»

پاویل نے غصے سے پیچھے کی طرف گردن گھماکر دیکھا۔

بید کے درخت کا سہارا لئے ہوئے پانی کے اوپر جھکی ہوئی ایک لڑکی وہاں کھڑی تھی جسے پاویل نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ملاحوں جیسا سفید رنگ کا بلاؤز، جس پر نیلے رنگ کا دھاری‌دار کالر تھا اور ہلکے بھورے رنگ کا چھوٹا سا سایہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے سڈول پاؤں پر جو دھوپ سے سنولا گئے تھے چھوٹے موزے منڈھے ہوئے تھے... اور ان موزوں کے کنارے پر رنگین دھاری تھی۔ اس کے سرخی مائل بھورے بال ایک موٹی سی چوٹی کی شکل میں گندھے ہوئے تھے۔

پاویل کا بنسی والا ہاتھ کانپ گیا اور اس کے ساتھ ہی بنسی کی ڈور میں بندھا ہؤا بطخ کا پر بھی ہل گیا جس کی وجہ سے پانی کی ساکت سطح پر گول گول دائرے سے پھیلنے لگے۔

«دیکھو، دیکھو مچھلی پھنس گئی!» پاویل کے پیچھے سے ایک پرجوش آواز آئی۔

یہ سن کر پاویل اپنا سکون اور دل جمعی بالکل ہی کھو بیٹھا اور اس نے بنسی کو اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ مچھلی پکڑنے کا کانٹا اور اس کے سرے پر لگا ہؤا کیڑہ اچھل کر پانی کے باہر آ گئے۔

«لعنت ہے! بھلا اب مچھلی کا شکار کیا خاک ہو سکے گا! نہ جانے اسے یہاں آنے کی کیا پڑی تھی» پاویل نے جھنجھلا کر اپنے دل میں سوچا اور اس حقیقت کو چھپانے کے لئے کہ اسے مچھلی کا شکار نہیں آتا اس نے اب کی بار کانٹے کو اور دور پھینکا۔ لیکن کانٹا

ایسی جگہ پر جاکر گرا جو اس کے لئے سب سے زیادہ نا موزوں تھی ـ کیوں کہ اس جگہ پر دو خاردار پودے تھے جن میں ڈور کے بڑی آسانی سے پھنس جانے کا خطرہ تھا ـ

پاویل کو فوراً احساس ہؤا کہ کیا حادثہ پیش آیا ہے اور بغیر مڑے ہی اس نے شی شی کرکے لڑکی کو خاموش کرنے کی کوشش کی جو نسبتاً اونچائی پر تالاب کے کنارے بیٹھی ہوئی تھی ـ

«تم سے چپ نہیں بیٹھا جاتا؟ اس طرح تو ساری مچھلیاں ڈر کے بھاگ جائیں گی ـ»

اوپر کی طرف سے ایک تضحیک آمیز آواز آئی:

«مچھلیاں تو تمہاری صورت دیکھ‌کر پہلے ہی بھاگ گئی ہیں اور بھلا تیسرے پہر کے وقت کوئی شریف آدمی مچھلی پکڑتا ہے!»

پاویل نے اب تک شرافت سے پیش آنے کی حتی‌الامکان کوشش کی تھی لیکن اب اور ضبط کرنا اس کے لئے نا ممکن تھا ـ وہ اٹھ کھڑا ہؤا اور اس نے اپنی ٹوپی آنکھوں پر سرکا لی ـ طیش میں آنے پر وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا ـ

«بہت اچھا ہو مس صاحبہ اگر آپ یہاں سے اپنا راستہ ناپیں» اس نے دانت پیس‌کر کہا ـ وہ اپنے جذبات اس سے زیادہ شائستہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا تھا ـ

تونیا کی آنکھیں کچھ سکڑ گئیں اور ان میں مسکراہٹ ناچنے لگی ـ

«کیا میں سچ مچ تمہارے کام میں رکاوٹ ڈال رہی ہوں؟»

اس کے لہجے میں اب چھیڑ خانی کا انداز نہیں رہا تھا ـ بلکہ اس کے بجائے ایک صلح جویانہ اور دوستانہ رویہ پیدا ہو گیا تھا ـ پاویل اپنے آپ کو اس کے لئے پوری طرح تیار کر چکا تھا کہ وہ ان «مس صاحبہ» کو جو نہ جانے کہاں سے آ ٹپکی تھیں دو چار کھری

کھری باتیں سنا دے گا ۔ لیکن اس کے اس رویہ کے سامنے وہ بالکل بے بس ہو گیا ۔

«تمہارا جی چاہے تو چپ چاپ بیٹھ کر دیکھ سکتی ہو۔ میرا کیا جاتا ہے» اس نے بادل ناخواستہ کہا اور دوبارہ بنسی کی ڈور میں لگے ہوئے بطخ کے پر کی طرف متوجہ ہؤا لیکن وہ پھر اس خاردار پورے میں الجھ گیا تھا اور اس میں کوئی شبہہ نہیں تھا کہ کانٹا بھی اسی پورے کی جڑ میں پھنس گیا تھا ۔ پاویل کو اسے کھینچتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر کہیں پھنس گیا تو چھڑانا دشوار ہو جائے گا ۔ اور پھر اس بات پر وہ لڑکی یقیناً ہنس دے گی ۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ وہاں سے چلی جائے ۔

لیکن تونیا بید کے درخت کے ھلکے ھلکے جھومتے ہوئے تنے پر اور بھی اطمینان کے ساتھ جم کر بیٹھ گئی تھی ۔ اور گھٹنوں پر اپنی کتاب رکھے ہوئے وہ اس دھوپ میں سنولائے ہوئے، کالی آنکھوں والے اکھڑ لڑکے کو دیکھ رہی تھی جس نے اتنے روکھے پن سے اس کا استقبال کیا تھا اور اب جان بوجھ کر اس کی طرف بے نیازی کا رویہ اختیار کئے ہوئے تھا ۔

پاویل کو تالاب کے پانی کی آئینے جیسی شفاف سطح پر اس لڑکی کا عکس صاف نظر آ رہا تھا ۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنی کتاب پڑھنے میں کافی محو ہے تو احتیاط کے ساتھ اس نے کانٹوں میں پھنسی ہوئی ڈور کو کھینچا ۔ ڈور سے بندھا ہؤا بطخ کا پر بھی پانی کی سطح کے نیچے چلا گیا اور ڈور اور بھی تن گئی ۔

«لاحول و لاقوۃ ۔ الجھ گئی نا!» یک بیک اس کے دماغ میں یہ خیال دوڑ گیا اور ساتھ ھی اس نے کنکھیوں سے دیکھا کہ پانی کے اندر سے اس لڑکی کا ہنستا ہؤا چہرہ اسے دیکھ رہا ہے ۔

اتنے میں پمپ ہاوس کے پل پر سے دو نوجوان آتے ہوئے دکھائی پڑے ۔ دونوں ثانوی مدرسے کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے ۔

ان میں ایک ریلوے بارڈ کے سب سے بڑے افسر، انجینیر سخارکو کا بیٹا تھا۔ اس کی عمر تقریباً سترہ سال کی ہوگی۔ اس کا جسم بھدا اور بے ڈول اور بال سنہرے رنگ کے تھے۔ اس کے چہرے پر جھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ صورت سے بالکل لا ابالی معلوم ہوتا تھا۔ اسکول میں اس کے ساتھیوں نے اس کا نام «چیچک رو شورکا» رکھہ چھوڑا تھا۔ وہ ہاتھہ میں ایک بہت ہی شاندار بنسی اور کانٹا لئے تھا اور اس کے منہہ کے کونے سے سگریٹ لٹک رہی تھی۔ اس کے ساتھہ وکٹر لیش چینسکی تھا۔ وکٹر لمبے قد کا زنانہ سا نوجوان تھا۔

«یار یہ لونڈیا تو بڑی پٹاخہ ہے۔ سارے علاقے میں اس کی ٹکر کی کوئی لڑکی ہے ہی نہیں» سخارکو نے بڑے معنی‌خیز انداز میں آنکھہ مارکر اپنے دوست کی طرف جھک کر کہا۔ «ارے مجھہ سے پوچھو میں جانتا ہوں۔ سر سے پاؤں تک رومان اور چنچلتا میں ڈوبی ہوئی۔ چھٹی جماعت میں کیئف کے کسی اسکول میں پڑھتی ہے۔ آج کل یہاں گرمیوں کی چھٹیاں بتانے اپنے باپ کے پاس آئی ہے۔ اس کا باپ یہاں کا ناظم جنگلات ہے۔ میری بہن لیزا اسے جانتی ہے۔ ایک بار میں نے اسے ایک جذباتی سا خط بھی لکھا تھا۔ تم تو جانتے ہو کچھہ اسی قسم کی باتیں کہ میں تمہارے عشق میں پاگل ہوں اور بڑی بےقراری سے تمہارے جواب کا انتظار کروں گا، یہاں تک کہ میں نے خط میں نیڈسن کے کچھہ حسب حال شعر بھی ٹکا دئے تھے۔»

«اچھا تو پھر نتیجہ کیا نکلا؟» وکٹر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

«ارے اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے تھے۔ بڑے نخرے کئے» سخارکو نے ذرا جھینپ کر دھیرے سے کہا۔ «مجھہ سے کہنے لگی خط لکھنے میں کیوں بیکار کاغذ ضائع کرتے ہو۔ اور اسی قسم کی

نہ جانے کیا کیا باتیں ۔ لیکن شروع شروع میں تو سب کا یہی حال ہوتا ہے ۔ میں تو اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہوں ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میں تو اس رومینٹک خرافات کا قائل ہی نہیں ہوں کہ برسوں بیٹھے چاند کو تک رہے ہیں اور سرد آہیں بھر رہے ہیں ۔ اس سے کہیں زیادہ آسان یہ بات ہے کہ شام کو نکلے اور ٹہلتے ہوئے مستریوں کی بارکوں کی طرف چلے گئے، وہاں تین روبل میں ایسا مال مل جاتا ہے کہ منھ میں پانی آ جائے اور کوئی جھنجھٹ بھی نہیں ۔ میں تو وہاں والکا تیخونوف کے ساتھ اکثر جایا کرتا تھا ۔ جانتے ہو نا اسے؟ وہ ریلوے فورمین کا بیٹا ہے ۔»

وکٹر حقارت سے ناک بھوں سکیڑنے لگا ۔

«شورا تمہارے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تم اس قسم کی گندگی میں بھی حصہ لیتے ہو ۔»

شورا نے اپنی سگریٹ چباکر زور سے زمین پر تھوکا اور منھ بنا کر بولا:

«اچھا یہ نہ ظاہر کرو کہ تم اتنے پاک باز ہو ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم کیسی کیسی حرکتوں کو پسند کرتے ہو ۔»

وکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا :

«اچھا اس پٹاخے سے میرا تعارف نہیں کراؤ گے؟»

«کیوں نہیں ۔ آؤ جلدی چلیں، نہیں تو وہ نکل جائے گی ۔ کل صبح وہ اکیلے مچھلی کا شکار کرنے گئی تھی ۔»

جب دونوں دوست تونیا کے پاس پہنچے تو سخارکو نے اپنے منھ سے سگریٹ نکالی اور بڑی عاشقانہ نیازمندی کے ساتھ جھک کر اس کو تعظیم دی:

«میڈموزیل تمانووا آپ کا مزاج کیسا ہے؟ کیا آپ بھی مچھلی کے شکار کو آئی ہیں؟»

«نہیں، میں تو صرف دیکھ رہی ہوں» تونیا نے جواب دیا ۔

«آپ لوگوں کا تعارف تو نہیں ہے ـ یا ہے؟» سخارکو نے وکٹر کا ہاتھہ پکڑ کر جلدی سے کہا ـ «یہ ہیں میرے دوست وکٹر لیش چینسکی ـ»

وکٹر نے کچھہ بوکھلاکر تونیا کی طرف اپنا ہاتھہ بڑھا دیا ـ

«لیکن آج آپ مچھلی کا شکار کیوں نہیں کر رہی ہیں؟» سخارکو نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کی غرض سے کہا ـ

«میں آج اپنی بنسی بھول آئی» تونیا نے جواب دیا ـ

«میں آپ کے لئے ابھی دوسری لئے آتا ہوں» سخارکو نے کہا ـ «تب تک آپ یہ استعمال کر سکتی ہیں ـ میں ابھی ایک منٹ میں آیا ـ»

وکٹر سے اس لڑکی کا تعارف کرا دینے کا اس نے جو وعدہ کیا تھا وہ اس نے پورا کر دیا تھا ـ اور اب وہ ان دونوں کو اکیلا چھوڑ دینے کی جلدی میں تھا ـ

« نہیں جانے دیجئے ـ ہم لوگ بلاوجہ کسی کی راہ میں رکاوٹ کیوں ڈالیں ـ آج تو یہاں ایک اور صاحب شکار کر رہے ہیں» تونیا نے کہا ـ

« رکاوٹ کس کی راہ میں؟» سخارکو نے پوچھا ـ «اچھا آپ کا مطلب ان حضرت سے ہے؟» اب تک اس کی نظر پاویل پر نہیں پڑی تھی کیونکہ وہ ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھا ہوا تھا «ارے انہیں تو میں ابھی دو دھکوں میں یہاں سے کھسکائے دیتا ہوں ـ»

قبل اس کے کہ تونیا اسے روکتی وہ لپک کر اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں پاویل بیٹھا ہوا اپنی بنسی اور کانٹے سے الجھہ رہا تھا ـ

«اپنی بنسی لےکر اب یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ» سخارکو نے پاویل سے کہا ـ جب پاویل خاموشی کے ساتھہ مچھلی کے شکار میں مصروف رہا تو سخارکو نے پھر کہا ـ «جلدی کرو، کھسکو یہاں سے...»

پاویل نے سر اٹھا کر سخارکو کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں یہ انداز صاف جھلک رہا تھا کہ اس کا ارادہ کچھ نیک نہیں ہے۔

«میں کہتا ہوں چپ رہو۔ خبردار جو اب کچھ کہا!»

«کیا کہا» سخارکو برس پڑا۔ «تیری یہ مجال کہ مجھ سے زبان درازی کرتا ہے۔ دو کوڑی کا چھوکرا۔ بھاگ جا یہاں سے!» اتنا کہہ‌کر اس نے کیڑوں والے ڈبے پر ایک زور کی ٹھوکر لگائی اور ڈبہ ہوا میں چکر کھاتا ہؤا جاکر تالاب میں گرا جس سے پانی اچھل‌کر تونیا کے چہرے پر جا پڑا۔

«سخارکو شرم نہیں آتی تمہیں!» اس نے چلا کر کہا۔

پاویل اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پاویل جانتا تھا کہ سخارکو ریلوے یارڈ کے سب سے بڑے افسر کا بیٹا تھا اور آرتیم وہیں کام کرتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے اس کے مکروہ چوھے جیسے تھوبڑے پر ایک مکا رسید کر دیا تو وہ جاکر اپنے باپ سے شکایت کر دے گا اور پھر آرتیم مصیبت میں پھنس جائے گا۔ صرف اسی بات کا خیال کرکے وہ رک گیا ورنہ وہ تو مسئلے کو وہیں کا وہیں حل کر دیتا۔

یہ دیکھ‌کر کہ پاویل اس پر کسی بھی لمحے حملہ کر دے گا سخارکو آگے جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے سینے پر زور کا دھکا مارا۔ پاویل پانی کے بالکل کنارے کھڑا تھا، دھکا لگتے ہی وہ بری طرح لڑکھڑا گیا لیکن کسی طرح ہاتھ پاؤں مارکر وہ سنبھلا اور اس نے اپنے آپ کو تالاب میں گرنے سے بچا لیا۔

سخارکو عمر میں پاویل سے دو برس بڑا تھا اور چھٹا ہوا فسادی اور غنڈہ تھا۔

سینے پر مکا کھاکر پاویل کو دن تارے نظر آنے لگے تھے۔

«اچھا تو یہ چاہتے ہیں آپ! تو یہ لیجئے!» اور یہ کہہ کر اس نے اپنے بازو کی ایک مختصر سی جنبش سے سخارکو کے منھ پر

ایک زناٹے کا طمانچہ رسید کر دیا ۔ جب تک سخارکو سنبھلے سنبھلے پاویل نے اس کا گریبان مضبوطی سے پکڑ لیا اور اسے دبوچ کر پانی میں گھسیٹ لایا ۔

سخارکو تالاب میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑا پوری طاقت سے اپنے آپ کو پاویل کی آہنی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اس کی پتلون اور چمکدار جوتے بالکل تربتر ہو گئے تھے ۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد پاویل کودکر کنارے پر آکھڑا ہوا ۔ سخارکو نے غصے سے بیتاب ہوکر پاویل پر حملہ کیا ۔ اسے اتنا غصہ آ رہا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ پاویل کی بوٹی بوٹی اڑا دیتا ۔

جس وقت اپنے حریف کا مقابلہ کرنے کے لئے پاویل پھرتی سے مڑا اس وقت اسے یاد آیا:

«اپنے جسم کا بوجھہ اپنے بائیں پاؤں پر رکھو، داھنی ٹانگ سخت رکھو اور داھنا گھٹنا جھکا لو ۔ مکا مارتے وقت اپنے جسم کا پورا زور اس میں لگا دو اور اوپر کی طرف ٹھوڑی پر وار کرو ۔»

کھٹاک!..

دفعتاً دانتوں کے ٹکرانے کی ایک کرخت آواز ھوئی اور سخارکو ایسا محسوس ھوا کہ جیسے اس کی ٹھوڑی میں کسی نے چھرا بھونک دیا ھو ۔ دانتوں کے بیچ آکر اس کی زبان بھی کٹ گئی تھی ۔ درد کے مارے وہ تلملا اٹھا ۔ اپنے دونوں ھاتھہ پھیلاکر اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اوندھے منھہ پانی میں جا گرا اور اس کے گرتے ھی ایک زور کا چھپاکا ھوا ۔

تالاب کے کنارے کھڑی ھوئی تونیا کا ھنسی کے مارے برا حال تھا ۔

«شاباش، شاباش!» اس نے تالی بجاتے ھوئے کہا ۔ «کیا ھاتھہ مارا ھے!»

کانٹوں میں الجھی ہوئی اپنی بنسی کو پکڑ کر پاویل نے اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ وہ ٹوٹ گئی اور سڑک پر جا گری۔

پاویل نے جاتے جاتے وکٹر کو تونیا سے کہتے سنا: "یہ پاویل کورچاگن ہے۔ اس کا ایسا بدمعاش کہیں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملے گا۔"

اسٹیشن پر کسی ہنگامے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ افواہ تھی کہ اس لائن پر کام کرنےوالے مزدور ہڑتال کرنےوالے تھے۔ اس اسٹیشن کے بعدوالے بڑے اسٹیشن کے یارڈ کے مزدوروں نے تو ایک زبردست تحریک شروع بھی کر دی تھی۔ پرچے بانٹنے کے شبہے میں جرمنوں نے دو انجن ڈرائیوروں کو گرفتار بھی کیا تھا۔ جن مزدوروں کا تعلق ابھی تک دیہات سے قائم تھا ان میں بڑی کھلبلی تھی کیونکہ ان کی چیزیں ضبط کی جا رہی تھیں۔ اور بڑے بڑے زمینداروں کو زمینیں واپس دی جا رہی تھیں۔

کسانوں کی پیٹھوں پر ہیٹ‌مین کے سپاہیوں کے کوڑوں کے زخم پڑے تھے۔ ضلع میں چھاپہ مار تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ بالشویک اسوقت تک تقریباً ایک درجن چھاپہ مار دستے منظم کر چکے تھے۔

ان دنوں ژوخرائی کو دم مارنے کی فرصت نہیں تھی۔ شہر میں اپنے قیام کے دوران میں اسنے بہت کافی کام کر لیا تھا۔ ریلوے میں کام کرنےوالے بہت سے مزدوروں کے ساتھ اس نے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا۔ اس نے نوجوانوں کے کئی جلسوں میں بھی شرکت کی تھی۔ اور ریلوے یارڈ کے مستریوں اور لکڑی چیرنے کے کارخانے کے مزدوروں میں اس نے ایک کافی مضبوط ٹولی منظم کر لی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آرتیم کتنے پانی میں ہے اسی لئے اس نے ایک بار اس سے پوچھا بھی تھا کہ بالشویک پارٹی اور اس کے نصب‌العین کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔

«فیودور، مجھے ان پارٹیوں وارٹیوں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے» اس لحیم شحیم جسم والے مستری نے جواب دیا تھا۔ «لیکن اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو تم ہر قسم کے کام کے لئے مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو۔»

فیودور کو اطمینان ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آرتیم کچا آدمی نہیں ہے اور وہ اپنی بات کا دھنی بھی ہے۔ جہاں تک پارٹی کا تعلق تھا وہ ابھی اس کے لائق نہیں تھا۔ «خیر کوئی بات نہیں ہے» اس نے سوچا۔ «ایسے زمانے میں وہ بہت جلد خود ہی سب کچھ سمجھنے لگے گا۔»

فیودور بجلی گھر چھوڑ کر ریلوے یارڈ میں کام کرنے لگا تھا۔ وہاں رہ کر وہ اپنا کام زیادہ آسانی سے کر سکتا تھا۔ بجلی گھر میں کام کرنے سے ریلوے مزدوروں کے ساتھ اس کا کوئی بھی تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔

ریلوں کی آمدورفت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ جرمن فوجیں یوکرین کا مال لوٹ لوٹ کر جرمنی بھیج رہی تھیں۔ ہزاروں گاڑیوں میں مال ڈھو ڈھو کر جرمنی پہنچایا جا رہا تھا — رائی، گیہوں، مویشی...

ایک دن ہیٹ مین کے سنتریوں نے اسٹیشن کے تار بابو پونومارینکو کو گرفتار کر لیا۔ اس حملے کا پہلے سے کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ اسے فوجی حوالات میں لے جاکر بےرحمی سے پیٹا گیا۔ ظاہر ہے کہ آرتیم کے دوست رومان سدورینکو کے بارے میں تمام باتیں اسی نے قبول دی ہوں گی۔

کارخانے میں کام کے دوران ہی میں دو جرمن سپاہی اور ہیٹ مین کا ایک گارڈ جو اسٹیشن کمانڈینٹ کا نائب تھا، رومان کی تلاش میں آئے۔ ایک لفظ کہے بغیر ہی نائب کمانڈینٹ اس جگہ پہنچ گیا

جہاں رومان کام کر رہا تھا اور اس نے رومان کے منھہ پر گھوڑے کا چابک مار کر اسے لہولہان کر دیا ۔

«ادھر چل حرامزادے!» اس نے کہا ۔ «ھمیں تجھہ سے کچھہ باتیں کرنی ھیں» انتہائی غصہ اور حقارت کی نظروں سے اس کی طرف دیکھہ کر اس نے اس مستری کا ھاتھہ پکڑ کر زور سے موڑ دیا ۔ «ابھی تجھے مزا چکھائے دیتے ھیں مزدوروں کے بھڑکانے کا!»

آرتیم نے، جو رومان کے پاس ھی کھڑا کام کر رہا تھا، اپنے ھاتھہ کی ریتی وھیں ڈال دی اور نائب کمانڈینٹ کے پاس آیا ۔ اس وقت اس کا لحیم شحیم جثہ بہت بھیانک دکھائی دے رہا تھا، جیسے وہ کوئی خطرناک کام کرنے کے لئے پر تول رہا ھو۔

«خبردار جو اس پر ھاتھہ اٹھایا حرامی!» اپنے غصے پر قابو پانے کی پوری کوشش کے باوجود آرتیم نے کرخت لہجے میں کہا ۔

نائب کمانڈینٹ پیچھے ھٹ گیا اور ساتھہ ھی اس نے اپنا پستول نکال لیا ۔ جرمن سپاھیوں میں سے ایک نے جو بھرے ھوئے جسم کا ناٹا سا آدمی تھا کندھے پر سے اپنی رائفل اتار لی جس کے سرے پر چوڑے پھل والی سنگین لگی ھوئی تھی اور پھر بڑی مستعدی کے ساتھہ اس نے رائفل کا گھوڑا چڑھا دیا ۔

«ھالٹ!» وہ کتے کی طرح بھونکا ۔ وہ ذرا سی جنبش پر گولی چلا دینے کو تیار تھا ۔

وہ لحیم شحیم طاقتور مستری پدی بھر کے اس سپاھی کے سامنے بےبس کھڑا رہا ۔ وہ کچھہ بھی نہ کر سکتا تھا ۔

رومان اور آرتیم دونوں کو گرفتار کر لیا گیا ۔ آرتیم کو تو گھنٹے بھر بعد چھوڑ دیا گیا ۔ لیکن رومان کو تہخانے میں سامان رکھنے کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ۔

گرفتاری کے دس منٹ کے اندر اندر تمام لوگوں نے کام روک دیا ۔ ڈپوؤں کے تمام مزدور اسٹیشن کے پارک میں جمع ھو گئے ۔

سوئچ مین اور سپلائی کے گوداموں میں کام کرنے والے لوگ بھی آکر ان میں مل گئے۔ لوگوں میں بےحد غم و غصہ تھا۔ کسی نے اس مطالبہ کا ایک تحریری مسودہ پیش کیا کہ رومان اور پونومارینکو کو فوراً رہا کیا جائے۔

لوگوں کا غصہ اور بھی زیادہ تیز ہو گیا جب نائب کمانڈینٹ سنتریوں کی ایک ٹکڑی لےکر، پستول چمکاتا ہوا پارک میں آیا اور چلانے لگا:

«کام پر واپس جاؤ، نہیں تو میں ایک ایک کو گرفتار کر لوں گا۔ اور کچھ کو ابھی گولی سے اڑا دوں گا!»

غصے سے بےقابو مزدوروں نے اس کا اتنا گرج کر جواب دیا کہ اسے پناہ لینے کے لئے اسٹیشن کی طرف بھاگتے ھی بن پڑا۔ لیکن اسی اثناء میں اسٹیشن کمانڈینٹ نے شہر سے جرمن فوجیں بلوا لی تھیں۔ اور کئی ٹرکیں متعدد جرمن سپاہیوں کو لادے ہوئے اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر روانہ ھو چکی تھیں۔

مزدور تتر بتر ھوکر جلدی جلدی اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ ایک شخص بھی حتی کہ اسٹیشن ماسٹر تک اپنے کام پر موجود نہیں تھا۔ ژوخرائی کے کام کا اثر نظر آنے لگا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اسٹیشن کے مزدوروں نے کوئی اجتماعی قدم اٹھایا تھا۔

جرمنوں نے پلیٹ فارم پر ایک بھاری مشین گن لگا دی۔ وہ مشین گن وھاں پر اس طرح لگی ھوئی تھی جیسے شکار کا پتہ لگانے والا کتا شکار کو دیکھ کر منھ اوپر اٹھا کے کھڑا ھو جاتا ھے۔ مشین گن کے پاس ایک جرمن کارپورل اس کو چلانے والی موٹھ پر ھاتھ رکھے بیٹھا تھا۔

اسٹیشن پر الو بولنے لگا۔

رات کے وقت گرفتاریاں شروع ھوئیں۔ گرفتار کئے جانے والوں

میں آرتیم بھی تھا - اس رات کو گھر واپس نہ جانے کی وجہ سے ژوخرائی بچ گیا -

تمام گرفتارشدہ لوگوں کو مال گودام کے ایک بڑے سے سائبان میں بھیڑوں کی طرح ٹھونس دیا گیا اور ان کے سامنے یہ دو صورتیں رکھی گئیں کہ یا تو وہ کام پر واپس جائیں یا کورٹ مارشل کا سامنا کریں -

ساری ریلوے لائن پر تقریباً تمام مزدور هڑتال پر تھے - مکمل ایک دن اور ایک رات تک ادھر سے هوکر ایک بھی گاڑی نہیں گذری - وهاں سے تقریباً پچھتر میل کے فاصلے پر چھاپہ ماروں کے ایک بہت بڑے دستے کے ساتھ زبردست لڑائی هو رهی تھی - چھاپہ ماروں نے ریلوے لائن کاٹ دی تھی اور پل اڑا دئے تھے -

رات کے وقت جرمن سپاهیوں سے بھری هوئی ایک گاڑی اسٹیشن پر آئی لیکن وهاں سے آگے نہ جا سکی کیونکہ انجن ڈرائیور، اس کا مددگار اور فائرمین انجن چھوڑ کر بھاگ گئے تھے - اسٹیشن کی بغلی پٹڑیوں پر دو گاڑیاں اور بھی آگے جانے کے انتظار میں کھڑی تھیں -

مال گودام کے سائبان کا جنگی سا پھاٹک کھلا اور اسٹیشن کمانڈینٹ، ایک جرمن لفٹیننٹ، اس کا نائب اور دوسرے جرمن سپاهیوں کی ایک ٹکڑی اندر داخل هوئی -

«کورچاگن، پولین‌توفسکی، بروزاک» نائب کمانڈینٹ نے یہ تین نام پکارے - «تم لوگوں کو انجن پر کام کرنا هے اور ایک گاڑی لے کر فوراً آگے جانا هے - اگر تم انکار کروگے تو تمہیں یہیں گولی مار دی جائےگی - بولو کیا کہتے هو؟»

تینوں مزدوروں نے خاموشی سے سر هلاکر اپنی رضامندی کا اظہار کیا - گارڈ کے پہرے میں انہیں وهاں سے باهر نکالا گیا اور

نائب کمانڈینٹ دوسری گاڑی کے لئے انجن ڈرائیور، اس کے مددگار اور فائرمین کے نام پکارنے لگا۔

انجن نے ایک خراٹا سا بھرا جیسے بہت خفا ہو اور اس کی چمنی میں سے جھنڈ کی جھنڈ چنگاریاں نکل کر فضا میں بکھر گئیں۔ گھرے سانس لیتا ہؤا انجن اپنے سامنے کے اندھیرے کو چیرتا ہؤا پٹڑی پر رات کی تاریک گھرائیوں میں آگے بڑھا۔ آرتیم نے انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونک کر پاؤں کی ٹھوکر سے اس کا دروازہ بندکر دیا اور اوزاروں کے بکس پر رکھی ہوئی چھوٹی ٹونٹی والی کیتلی سے پانی کا ایک گھونٹ پی کر وہ بوڑھے انجن ڈرائیور پولین توفسکی سے مخاطب ہؤا:

«اچھا بابا تو کیا ہم اسے منزل تک پہونچا ھی دیں گے؟»

پولین توفسکی کی آنکھیں اس کی گھنی، لٹکی ہوئی بھنؤوں کے نیچے جھنجھلاھٹ کے مارے تیزی سے جھپکنے لگیں۔

«ایسی حالت میں جب کہ تمھارے پیچھے ایک آدمی مسلسل سنگین لئے کھڑا ھو اور کیا ھی کیا جا سکتا ھے۔»

«ھم لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جانے کی کوشش کیوں نہ کریں» بروزاک نے کنکھیوں سے اس جرمن سپاھی کی طرف دیکھا جو پیچھے کوئلہ پانی والے ڈبے پر بیٹھا ہؤا تھا۔

«میرا بھی یہی خیال ھے» آرتیم نے چپکے سے کہا۔ «بس ھمارے پیچھے جو یہ چنڈال بیٹھا ھے اسی کی وجہ سے ساری دقت ھے۔»

«سو تو ھے» بووزاک نے کھڑکی کے باھر سر نکال کر کہا۔ اس کے لہجے سے یہ واضح نہیں تھا کہ وہ کس بات کے حق میں ھے۔

پولین توفسکی کھسک کر آرتیم کے قریب آ گیا۔

«ھم لوگ یہ گاڑی منزل تک نہیں لے جا سکتے، سمجھے؟» اس نے اس کے کان میں کہا۔ «آگے لڑائی چل رھی ھے۔ ھمارے ساتھیوں

نے ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دی ہیں۔ ایسی حالت میں کیا ہم لوگ ان سؤروں کو لے جاکر وہاں پہنچا دیں گے کہ یہ انہیں گولیوں سے بھون ڈالیں؟ بیٹا تمہیں شائد نہیں معلوم کہ زار کے زمانے میں بھی میں نے ہڑتال کے دوران میں کبھی کوئی انجن نہیں چلایا اور نہ آج چلاؤں گا۔ اگر ہم اپنے ہی ساتھیوں کی تباہی کا باعث بنیں تو عمر بھر کے لئے ہمارے منھ پر کالک لگ جائے گی۔ جو لوگ اس انجن کو ہم سے پہلے چلا رہے تھے آخر وہ بھی تو بھاگ گئے، کیوں ہے نا؟ انہوں نے اپنی جان خطرہ میں ڈال دی لیکن اپنا مقصد پورا کرکے دکھا دیا۔ ہم کسی بھی حالت میں اس گاڑی کو اس کی منزل تک نہیں لے جا سکتے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

«بابا کہتے تو تم ٹھیک ہو، مگر اس کا کیا کروگے؟» اس نے آنکھ سے اس سپاہی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

ڈرائیور نے بھی اپنی بھنویں سکیڑ کر دیکھا۔ پھر اس نے ایک چیتھڑے سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور خونی آنکھوں سے انجن کے پریشر گیج کو گھورنے لگا جیسے اس میں وہ اس سوال کا جواب تلاش کر رہا ہو جو اسے مستقل پریشان کر رہا تھا۔ پھر غصے اور لاچاری سے وہ گالیاں بکنے لگا۔

آرتیم نے کیتلی میں سے پھر تھوڑا سا پانی پیا۔ وہ دونوں ایک ہی بات کے بارے میں سوچ رہے تھے لیکن کسی کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس گہرے سکوت کو توڑے۔ آرتیم کو ژوخرائی کا سوال یاد آیا کہ «اچھا بھائی یہ تو بتاؤ کہ بالشویک پارٹی اور کمیونسٹ نظریے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟» اور اپنا جواب بھی کہ «میں ہمیشہ مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، تم مجھ پر پورا بھروسہ کر سکتے ہو...»

«اچھی مدد کر رہا ہوں» اس نے سوچا۔ «دشمنوں کے سپاہیوں کو اپنے ساتھیوں پر حملہ کرنے کے لئے لے جا رہا ہوں...»

اس وقت پولین توفسکی آرتیم کے برابر اوزاروں کے بکس
پر جھکا ہؤا کھڑا تھا ۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:
«اس شخص کو ہمیں ٹھکانے لگانا ہے سمجھے؟»
آرتیم چونک پڑا ۔ پولین توفسکی نے بھنچے ہوئے دانتوں
سے کہا:
«اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے ۔ پہلے ہم اس کی کھوپڑی
توڑکر اس کا کام تمام کر دیں گے اور پھر بخارے اور بیرم کو
بھٹی میں پھینک کر بھاپ بند کر کے ہم لوگ بھاگ لیں گے ۔»
آرتیم کو ایسا محسوس ہؤا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا
بوجھ ہٹ گیا ہو۔ وہ بولا:
«ٹھیک ہے!»
پھر بروزاک کی طرف جھک کر اس نے اپنا فیصلہ اسے بتا دیا ۔
بروزاک نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا ۔ وہ لوگ ایک بہت
بڑا خطرہ مول رہے تھے ۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے کنبے کی فکر
تھی ۔ پولین توفسکی کا کنبہ سب سے بڑا تھا وہ نو آدمیوں کا پیٹ
پالتا تھا ۔ لیکن وہ تینوں اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ
وہ یہ گاڑی منزل آخر تک نہیں پہنچا سکتے ۔
«اچھی بات ہے، میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں» بروزاک نے
کہا ۔ «لیکن اس موذی کا کیا کرو گے؟ اسے کون...؟» اس نے اپنی
بات پوری نہیں کی ۔ لیکن آرتیم اسکا مطلب بخوبی سمجھ گیا ۔
آرتیم نے پولین توفسکی کی طرف دیکھا وہ اس وقت بخارے کے
ساتھ کچھ کر رہا تھا ۔ آرتیم نے سر ہلاکر اس پر یہ ظاہر کر
دیا کہ بروزاک بھی ان سے متفق ہے لیکن ایک مسئلہ اسے بہت
پریشان کر رہا تھا جس کا کہ ابھی تک کوئی حل نہیں نکلا تھا ۔
وہ اس بوڑھے کے اور قریب آ گیا ۔
«لیکن یہ سب کچھ کریں گے کیسے؟»
پولین توفسکی نے آرتیم کی طرف دیکھا ۔

«پہلا وار تمہیں کرو۔ تمہیں سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔ پھر ہم سبل سے اس کا کام تمام کر دیں گے باقی سب ٹھیک ہو جائے گا» بوڑھا بہت مشتعل ہو گیا تھا۔

آرتیم نے بھنویں سکیڑ کر کہا:

«مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ میں نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر اس آدمی کا قصور کیا ہے؟ اسے بھی تو سنگین کی نوک کے سہارے اس کام میں گھسیٹا گیا ہے۔»

پولین توفسکی کی آنکھیں شرارے برسانے لگیں۔

«کیا کہا تم نے اس کا کوئی قصور نہیں۔ ہمیں جو یہ کام کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تو اس میں ہمارا ہی کیا قصور ہے۔ لیکن تم یہ بھولتے ہو کہ ہم لوگ دشمن کے سپاہیوں کی گاڑی لئے جا رہے ہیں جو کہ ہمارے ساتھیوں کو مارنے جا رہے ہیں۔ تمہارے یہ بھولے بھالے معصوم سپاہی چھاپہ ماروں پر گولی چلانے جا رہے ہیں۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ سارا قصور ان چھاپہ ماروں کا ہے؟ نہیں میرے بچے تم میں طاقت تو بہت ہے مگر عقل اتنی ہی کم ہے۔»

«اچھی بات ہے، اچھی بات ہے» آرتیم کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے سبل اٹھا لیا لیکن اتنے میں پولین توفسکی نے اس کے کان میں دھیرے سے کہا:

«نہیں میں ہی کروں گا۔ زیادہ ٹھیک رہے گا۔ تم بیلچہ لے کر اوپر چڑھ جاؤ اور یہ ظاہر کرو کہ تم کوئلہ گرانے آئے ہو۔ اگر ضرورت پڑے تو ایک بیلچہ تم بھی جڑ دینا۔ میں یہ ظاہر کروں گا کہ میں کوئلے کو سبل سے کرید رہا ہوں۔ تاکہ بیلچے سے آسانی سے اٹھ سکے۔»

بروزاک نے ان کی بات سنی اور اپنا سر ہلا دیا۔ «بوڑھا ٹھیک کہتا ہے» اس نے کہا اور بخارے کے پاس اپنی جگہ پر آکر کھڑا ہو گیا۔

جرمن سپاہی اپنے دونوں پیروں کے بیچ میں رائفل تھامے کوئلے والے ڈبے کی کگر پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اس کے سر پر ایک کشتی دار فوجی ٹوپی تھی جس کے چاروں طرف ایک سرخ فیتہ لگا ہؤا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ انجن چلانے والوں پر جو اپنی اپنی جگہوں پر کام میں مصروف تھے ایک نظر ڈال لیتا تھا۔

جس وقت آرتیم کوئلے کے ڈھیر پر چڑھا سنتری نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ پھر جب پولین توفسکی نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ کوئلے والے ڈبے میں ایک طرف کو پڑے ہوئے بڑے بڑے ٹکڑے نکالنا چاہتا ہے، اس سپاہی سے ایک طرف ہٹ جانے کے لئے اشارہ کیا تو جرمن سپاہی بلا کسی عذر کے انجن میں داخل ہونے والے دروازے کی طرف سرک آیا۔

دفعتاً اس جرمن سپاہی کی کھوپڑی کے چٹخنے کی آواز سن کر آرتیم اور بروژاک دونوں اچھل پڑے جیسے دھکتے ہوئے انگاروں پر ان کا پاؤں پڑ گیا ہو۔ سبل کے ایک ہی وار میں اس جرمن سپاہی کی کھوپڑی پچی ہو گئی اور اس کی لاش لڑھکتی پڑھکتی انجن میں جانے والے گلیارے میں آ گری۔

بھورے رنگ کی اونی کشتی دار ٹوپی میں سے رس رس کر خون بڑی تیزی سے بہہ نکلا اور اس کی رائفل ایک کرخت جھنجھناہٹ پیدا کرتی ہوئی کوئلے والے ڈبے کی لوہے کی دیوار سے ٹکرائی۔

«ختم ہو گیا» پولین توفسکی نے سبل کو فرش پر ڈالتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ «اب ہمارے لئے پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔» اس نے اضافہ کیا، اس کا چہرہ بےاختیار رہ رہ کر پھڑک رہا تھا۔

اس کی آواز ٹوٹ گئی اور پھر ان تینوں آدمیوں پر جو گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا اسے توڑنے کے لئے یک بیک چیخ میں تبدیل ہو گئی۔

«بخارہ کھول دو۔ جلدی کرو!» اس نے چلا کر کہا۔
دس منٹ کے اندر سارا کام پورا ہو گیا۔ انجن کو قابو میں رکھنے والا اب کوئی بھی پرزہ کام نہیں کر رہا تھا اور اس کی رفتار دھیرے دھیرے کم ہوتی جا رہی تھی۔
انجن کے آس پاس کی روشنی کے دائرے میں راستے کے پیڑ ایک لمحے کے لئے سیاہ افسردہ شکلوں میں نمودار ہوتے اور پھر پیچھے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں غائب ہو جاتے۔ انجن کے آگے لگی ہوئی تیز بتی رات کی سیاہ تاریکیوں کا کفن چیرنے کی شدید کوشش کر رہی تھی۔ لیکن بارہ تیرہ گز سے زیادہ دور تک اندھیرے کو چیرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ انجن کا اکھڑتا ہوا سانس رفتہ رفتہ بالکل دھیما پڑنے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہو چکی ہے۔
«کود جاؤ، بیٹا!» آرتیم کو پیچھے سے پولین توفسکی کی سی آواز سنائی دی۔ اور اس نے انجن کے دروازے کے باہر لگی ہوئی لوہے کی چھڑ کو جسے وہ پکڑے ہوئے تھا چھوڑ دیا۔ گاڑی کی رفتار کی وجہ سے اس کا تنو مند جسم ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکھڑاتا ہؤا آگے کی طرف گرا۔ لیکن ایک ہی لمحے میں اس کے پاؤں زمین سے آ لگے۔ اسے ایسا محسوس ہؤا جیسے زمین خود اوپر اٹھ کر اس کے پاؤں سے آ لگی ہو۔ وہ ایک دو قدم آگے کی طرف بھاگا پھر قلابازی کھاکر دھم سے منھ کے بل گر پڑا۔
اس کے بعد دو اور سائے انجن سے باہر کودے۔ ایک انجن کے ایک طرف سے اور دوسرا دوسری طرف سے۔

بروزاک کے گھر پر سوگ طاری تھا۔ سرگئی کی ماں آنتونینا واسیلیونا پچھلے چار دنوں سے رو رو کر اپنا کلیجہ نکالے دے رہی تھی۔ اسے اپنے شوہر کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی، صرف اتنا

معلوم ہو سکا تھا کہ جرمنوں نے اسے زبردستی کورچاگن اور پولین توفسکی کے ساتھہ انجن چلانے کے لئے بھیج دیا تھا اور کل ہیٹ مین کے تین سنتریوں نے آکر اس سے بڑی بدتمیزی اور گالی گفتار کے ساتھہ سوال جواب کیا تھا۔

ان کی باتوں سے اسے کچھہ کچھہ یہ اندازہ ہؤا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔ ان سپاہیوں کے جاتے ہی وہ شدید بےچینی کے عالم میں سر پر جلدی سے رومال باندھہ کر اس امید سے ماریا یاکوولیونا کے گھر چل پڑی تھی کہ شائد وہاں اسے اپنے شوہر کے بارے میں کوئی خبر مل سکے۔

اس کی سب سے بڑی بیٹی والیا نے جو باورچی خانہ صاف کر رہی تھی اسے چپکے سے گھر سے باہر جاتے ہوئے دیکھہ لیا تھا۔

«ماں کہاں جا رہی ہو؟» بیٹی نے پوچھا۔

«کورچاگن کے یہاں» آنتونینا واسیلیونا نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیٹی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ «شائد ان لوگوں کو تمہارے باپ کی کوئی خبر ہو۔ اگر سرگئی آئے تو اس سے کہنا کہ وہ اسٹیشن جاکر ذرا پولین توفسکی کے گھر پر بھی پتہ لگا آئے۔»

والیا نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

«ماں تم فکر نہ کرو» بیٹی نے ماں کو دروازے پر رخصت کرتے ہوئے کہا۔

ماریا یاکوولیونا نے حسب معمول بڑی گرمجوشی کے ساتھہ آنتونینا واسیلیونا کا استقبال کیا۔ ان دونوں عورتوں کو اپنی اپنی جگہ پر یہ امید تھی کہ دوسری کو کچھہ اطلاع ہوگی۔ لیکن گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ان کی امیدوں پر پانی پڑ گیا۔

رات کو کورچاگن کے گھر پر بھی تلاشی ہوئی تھی۔ سپاہی آرتیم کی تلاش میں آئے تھے اور چلتے چلتے ماریا یاکوولیونا کو

ہدایت دے گئے تھے کہ آرتیم جیسے ہی گھر واپس آئے فوراً کمان کے صدر دفتر میں اطلاع دی جائے۔

سنتریوں کے آتے ہی مارے ڈر کے آرتیم کی ماں کے حواس گم ہو گئے تھے۔ وہ گھر پر اکیلی ہی تھی کیونکہ پاویل رات کی پالی میں کام کرنے بجلی گھر گیا ہؤا تھا۔

جب پاویل صبح سویرے کام پر سے گھر واپس لوٹا اور اسے اپنی ماں سے تلاشی کی بابت معلوم ہؤا تو وہ اپنے بھائی کی خیریت کی فکر سے بےقرار ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا دل کھرچ رہا ہے۔ حالانکہ ان دونوں بھائیوں کے مزاج بہت مختلف تھے اور آرتیم اس کے ساتھ بظاہر بڑی رکھائی سے پیش آتا تھا لیکن پھر بھی دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی۔ ان کی محبت بہت ہی غیرجذباتی قسم کی تھی اور وہ اس کا بہت زیادہ اظہار بھی نہیں کرتے تھے لیکن پاویل جانتا تھا کہ کوئی بھی قربانی ایسی نہیں تھی جو وہ اپنے بھائی کی خاطر کرنے کو تیار نہ ہو۔

ایک لمحے کو بھی آرام کرنے کے لئے رکے بغیر وہ بھاگا بھاگا ژوخرائی کی تلاش میں اسٹیشن پہنچ گیا لیکن وہ وہاں کہیں نہیں ملا اور دوسرے مزدور بھی جنہیں وہ جانتا تھا اسے ان بھاگے ہوئے آدمیوں کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ انجن ڈرائیور پولین توفسکی کے گھروالے بھی بالکل لا علم تھے۔ پولین توفسکی کے سب سے چھوٹے بیٹے بورس سے جس سے اس کی ملاقات اتفاق سے ریلوے کے یارڈ میں ہو گئی تھی اسے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس کے گھر کی بھی تلاشی لی گئی تھی۔ سپاہی اس کے گھر پولین توفسکی کو ڈھونڈھتے ہوئے آئے تھے۔

پاویل بغیر کوئی اطلاع حاصل کئے اپنی ماں کے پاس واپس آ گیا۔ وہ تھک کر بالکل چور ہو گیا تھا اس لئے وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی فوراً سو گیا۔ لیکن اس کی نیند بہت بے چین تھی۔

دروازے پر کسی کی دستک سن کر والیا نے سر اٹھاکر دیکھا۔
«کون ہے؟» اس نے چٹخنی کھولتے ہوئے پوچھا۔
کھلے ہوئے دروازے میں کلمکا مارچن‌کو کا سرخ الجھے ہوئے بالوں والا سر نظر آیا۔ اس کی صورت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھاگتا ہوا آیا تھا، کیوں‌کہ اس کا دم پھول رہا تھا اور سخت محنت کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
«تمہاری ماں گھر پر ہیں؟» اس نے والیا سے پوچھا۔
«نہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔»
«کہاں گئی ہیں؟»
«میرے خیال میں کورچاگن کے یہاں گئی ہیں۔» کلمکا جوں ہی باہر بھاگنے کے لئے مڑا والیا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
کلمکا نے جھجھکتے ہوئے سر اٹھاکر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔
«مجھے ان سے ایک ضروری کام سے ملنا ہے» اس نے جرائت کرکے کہا۔
«آخر کیا کام ہے؟» والیا اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ «بتا نا کیا کام ہے لال سروالا بھالو کہیں کا۔ بتاتا کیوں نہیں؟ مجھے بلا وجہ دگدا میں کیوں ڈال رکھا ہے» لڑکی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
ژوخرائی کی تنبیہات اور سخت ہدایات کو فراموش کرکے کہ پرچہ آنتونینا واسیلیونا کے علاوہ اور کسی کے ہاتھ میں نہ دیا جائے کلمکا نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک میلا سا ٹکڑا نکالا اور اس لڑکی کے حوالے کر دیا۔ وہ سرگئی کی اس خوبصورت، سنہرے بالوں والی بہن کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ کیوں‌کہ حقیقت یہ تھی کہ اس کے دل میں اس کے لئے ایک لطیف جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن وہ جھینپو اتنا تھا کہ خود اپنے آپ سے بھی اس بات

کا اقرار نہیں کر سکتا تھا کہ وہ والیا کو پسند کرتا ہے ۔ لڑکی نے وہ پرچہ جلدی سے پڑھا جو کلمکا نے اسے دیا تھا ۔ پرچے میں لکھا تھا:

«پیاری تونیا! پریشان مت ہونا ۔ سب خیریت ہے ۔ ہم لوگ بالکل محفوظ ہیں ۔ جلد ہی تمہیں ہمارے بارے میں مزید اطلاع ملے گی ۔ دوسروں کو بھی خبر کر دینا کہ سب لوگ خیریت سے ہیں اس لئے وہ لوگ فکر نہ کریں ۔ اس پرچے کو پڑھ کر ضائع کر دینا ۔ زاخار ۔»

والیا لپک کر کلمکا کے اور قریب آ گئی ۔

«اچھا میرے ننھے لال بھالو یہ تو بتاؤ یہ پرچہ تمہیں کہاں ملا؟ کس نے دیا تمہیں؟» اور اتنا کہہ کر اس نے کلمکا کو اتنے زور سے جھنجھوڑا کہ اس کے ہوش گم ہو گئے ۔ اور قبل اس کے کہ اس کے حواس درست ہوتے وہ دوسری غلطی کر چکا تھا ۔

«مجھے اسٹیشن پر ژوخرائی نے دیا تھا ۔» پھر یک بیک اسے خیال آیا کہ اسے یہ نہیں بتانا چاہئے تھا ۔ اور اس لئے اس نے لڑکی سے کہا «لیکن اس نے مجھے منع کر دیا تھا کہ میں اس پرچے کو تمہاری ماں کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں نہ دوں ۔»

«کوئی بات نہیں» والیا نے ہنس کر کہا ۔ «میں کسی سے کہوں گی نہیں ۔ اب تم اچھے بچوں کی طرح بھاگ کر پاویل کے یہاں چلے جاؤ ۔ ماں تمہیں وہیں مل جائیں گی ۔» اتنا کہہ کر اس نے لڑکے کی پیٹھ کو ہلکا سا دھکا دے دیا ۔

ایک سکنڈ میں کلمکا کا سرخ بالوں والا سر باغیچے کے پھاٹک کے باہر نظروں سے گم ہو گیا ۔

ان تینوں ریلوے مزدوروں میں سے کوئی بھی گھر واپس نہیں آیا ۔ شام کے وقت ژوخرائی کورچاگن کے یہاں گیا اور وہاں اس

نے ماریا یاکوولیونا کو گاڑی کا پورا واقعہ سنایا ۔ اس نے آرتیم کی دہشت زدہ ماں کو تسلی دینے کی حتی الامکان کوشش کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ تینوں بروزاک کے چچا کے یہاں، جو دور کے کسی گاؤں میں رہتا تھا، بالکل محفوظ ہیں ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس وقت تو ان کا آنا ممکن نہیں ہے لیکن ساتھہ ہی یہ بھی اطلاع دی کہ جرمن بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں اور حالات کسی وقت بھی تبدیل ہو سکتے ہیں ۔

ان تینوں آدمیوں کے فرار ہو جانے کے بعد سے ان کے گھروالے ایک دوسرے سے پہلے سے بھی زیادہ قریب ہو گئے ۔ ان لوگوں کے پاس سے جو نادر رقعے آتے تھے انہیں بڑی مسرت کے ساتھہ پڑھا جاتا تھا لیکن ان لوگوں کے بغیر گھر سونا اور ویران معلوم ہوتا تھا ۔

ایک دن ژوخرائی پولین توفسکی کے گھر گیا جیسے یوں ہی اس کی بیوی سے ملنے چلا آیا ہو اور اس نے پولین توفسکی کی بیوی کو کچھہ پیسے دئے ۔

«تمہارے شوہر نے گھر کے خرچ کے لئے بھیجے ہیں» اس نے کہا ۔ «لیکن دیکھو کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا ۔»

بڑھیا نے انتہائی تشکر کے ساتھہ اس کا ہاتھہ اپنے ہاتھہ میں تھام لیا ۔

«بہت بہت شکریہ ۔ بڑی سخت ضرورت تھی ہمیں ۔ بچوں کے کھانے کے لئے گھر میں کچھہ بھی نہیں رہ گیا تھا ۔»

یہ پیسے دراصل اسی رقم میں سے دئے گئے تھے جو بلگاکوف چھوڑ گیا تھا ۔

اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے ژوخرائی نے دل ہی دل میں کہا: «خیر اب دیکھیں کیا ہوتا ہے ۔ اگر گولی سے اڑا دینے کی دھمکی دے کر ہڑتال توڑ بھی دی گئی، اور مزدور کام پر واپس چلے بھی

گئے تب بھی کم سے کم اتنا تو ہو ہی گیا ہے کہ چنگاری بھڑک اٹھی ہے اور اب اسے بجھایا نہیں جا سکتا ۔ ان تینوں نے تو کمال ہی کر دیا ۔ بڑے جانباز نکلے ۔ سچے مزدور!» اس کا دل فخر و مسرت سے بھر گیا ۔

واروبیووابالکا نامی گاؤں کے سرے پر ایک چھوٹی سی لوہار کی دکان تھی جس کا دروازہ سڑک پر کھلتا تھا اور کلونس سے بالکل سیاہ ہو گیا تھا ۔ اسی دکان میں دھکتی ہوئی بھٹی کے سامنے پولین توفسکی کھڑا تھا ۔ شعلوں کی چمک کی وجہ سے اس کی آنکھیں آدھی مچی ہوئی تھیں ۔ اس نے ایک لمبے دستےوالے چمٹے کی مدد سے لوہے کے ایک دھکتے ہوئے ٹکڑے کو پلٹ دیا ۔

آرتیم چھت کے شہتیر سے لٹکی ہوئی دھونکنیاں چلا رہا تھا ۔

«ہوشیار مزدوروں کے لئے آجکل گاؤں میں کوئی دقت نہیں ہے ۔ جتنا چاہو کام مل سکتا ہے» بوڑھے انجن ڈرائیور نے خوش مزاجی کے ساتھہ اپنی ڈاڑھی کے اندر سے مسکراتے ہوئے کہا ۔ «اگر ایک دو ہفتے اسی طرح گذر گئے تو ہم لوگ اپنے گھر کھانے کے لئے کچھہ آٹا اور گوشت بھیج سکیں گے ۔ بیٹا بات یہ ہے کہ کسان ہمیشہ لوہار کی بڑی عزت کرتا ہے ۔ تم دیکھنا ہم لوگ ڈھیرے ڈھیرے کھا پی‌کر سرمایہ‌داروں جیسے موٹے ہو جائیں گے ۔ زاخار ہم لوگوں سے ذرا مختلف ہے وہ کسانوں کے ساتھہ بھی چپکا ہؤا ہے ۔ اپنے چچا کی وجہ سے اس کی جڑیں ابھی تک کھیتی باڑی میں ہی جمی ہوئی ہیں ۔ خیر میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس میں اسکا کوئی قصور ہے ۔ لیکن آرتیم ہماری بات اور ہے ۔ ہمارے پاس تو جیسے کہتے ہیں کہ نہ زمین ہے نہ جائیداد ۔ لے دے کے کچھہ ہے تو بس یہی دو ہاتھہ ہیں اور بوجھہ ڈھونے کے لئے یہ مضبوط پیٹھہ ہے ۔ مزدوری

کرتے ہوئے پیدا ہوئے ہیں اور مزدوری ہی کرتے کرتے مر جائیں گے ۔
اصل مزدور اور کسے کہتے ہیں ۔ ہم ہی لوگوں کو نا ۔ ہا ۔ ہا ۔
لیکن زاخار کے ایسے لوگوں کی حالت کچھ آدھا تیتر، آدھا بٹیر
جیسی ہوتی ہے ۔ ایک پاؤں ریل کے انجن میں ہے اور دوسرا گاؤں
میں ۔» اس نے چمٹے سے لوہے کا دھکتا ہؤا ٹکڑا پیٹ دیا اور زیادہ
سنجیدہ لہجے میں اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے بولا ۔ «بیٹا جہاں
تک ہمارا تعلق ہے، آثار بہت برے نظر آتے ہیں ۔ اگر جرمنوں کو
بہت جلد شکست نہ دی گئی تو ہمیں بھاگ کر یکاترینوسلاو یا
روستوف چلا جانا ہوگا ۔ ورنہ ہمیں پتہ بھی نہیں چلنے پائے گا اور
ایک دن معلوم ہوگا کہ ہم آفت میں پھنس گئے ہیں ۔ دھوبی کے
کتے کی طرح نہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے ۔»

«یہ تو ٹھیک ہی کہتے ہو» آرتیم نے دبی آواز میں کہا ۔

«کاش مجھے کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ ہمارے گھروالوں
پر کیا گذر رہی ہے ۔ معلوم نہیں کہ وہ درندے انہیں چین بھی
لینے دیتے ہوں گے یا نہیں ۔»

«ہاں بابا ہم لوگ پھنسے تو بہت برے ہیں ۔ ہمیں تو اب
گھر واپس جانے کا خیال بھی چھوڑ دینا چاہئے ۔»

انجن ڈرائیور نے اس دھکتے ہوئے نیلگوں دھات کے گرم ٹکڑے
کو بھٹی میں سے نکال لیا اور بڑی مشاقی کے ساتھ اسے نہائی پر
رکھ دیا ۔

«ہاں بیٹا ذرا لگاؤ تو چوٹ!»

آرتیم نے ایک وزنی ہتوڑی اٹھا لی اور اسے سر پر سے گھماکر
نہائی پر چوٹ لگائی ۔ ایک ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ تابناک
چنگاریوں کا ایک فوارہ سا چاروں طرف بکھر گیا اور ایک لمحے کے
لئے لوہارخانے کا تاریک ترین گوشہ بھی روشن ہو اٹھا ۔

پولین توفسکی دھکتے ہوئے ٹکڑے کو ہتوڑی کی کاری ضربوں کے نیچے الٹتا پلٹتا رہا اور لوہا اتنی فرمانبرداری کے ساتھ چپٹا ہوتا گیا جیسے وہ موم کا نرم ٹکڑا ہو۔

لوہار خانے کے کھلے ہوئے دروازے سے تاریک رات کے گرم گرم سانس اندر آ رہے تھے۔

نیچے جھیل اپنی تاریک اور بےکنار وسعت کے ساتھ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جھیل کے گرد صنوبر کے درخت کھڑے اپنی بلند کلغیاں ہلا رہے تھے۔

«بالکل جان‌دار معلوم ہوتے ہیں» ونیا نے پیڑوں کی طرف دیکھ‌کر سوچا۔ وہ جھیل کے پتھریلے کنارے پر ایک نشیبی سے حصے میں لیٹی ہوئی تھی جہاں پر ہری ہری دوب کا قدرتی غالیچہ بچھا ہؤا تھا۔ اس سے اوپر کی طرف وادی کے پار جنگل کا سرا دکھا دیتا تھا اور اس اونچے سے کنارے کے عین نیچے جھیل شروع ہو جاتی تھی۔ پہاڑیوں کے سایوں نے جھیل کو اس طرح اپنی آغوش میں لے رکھا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پانی کے گہرے رنگ کی چادر پر ایک اور زیادہ گہرے رنگ کی گوٹ لگی ہے۔

پتھر کی یہ پرانی کان جو اسٹیشن سے بہت دور نہیں تھی تونیا کی محبوب‌ترین جگہ تھی۔ کان کے گہرے کھدے ہوئے حصوں میں جہاں بہت عرصے سے کھدائی کا کام بند کر دیا گیا تھا چشمے پھوٹ نکلے تھے اور اب وہاں پر تین جھیلیں بن گئی تھیں۔جس جگہ پر ساحل پانی سے ملتا تھا وہاں سے ایک چھپاکے کی آواز سن کر تونیا نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے سامنے کی شاخوں کو ہٹاکر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ ایک پھرتیلا دھوپ سے سنولایا ہؤا جسم لمبے لمبے ہاتھ مارتا ہوا ساحل سے جھیل کے اندر کی طرف تیرتا ہوا جا رہا تھا۔ تونیا کو تیرنےوالے کی گندمی رنگ

کی پیٹھہ اور کالا سر نظر آ رہے تھے ۔ وہ دریائی گھوڑے کی طرح پھنکار پھنکارکر پانی کی کلیاں کر رہا تھا اور بڑی پھرتی سے ہاتھہ پاؤں چلا رہا تھا ۔ تیرتے تیرتے کبھی کبھی وہ پہلو بدلتا اور قلابازی کھاکر غوطہ لگا جاتا ۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنی پیٹھہ کے بل تیرنے لگا ۔ سورج کی تیز روشنی سے اسکی آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں ۔ اس کے دونوں ہاتھہ پھیلے ہوئے تھے اور اس کا جسم خفیف سا جھکا ہؤا تھا ۔

تونیا نے درخت کی شاخ چھوڑ دی ۔ «کسی کو تیرتا ہؤا دیکھنا خلاف تہذیب حرکت ہے» تونیا نے مسکراکر اپنے دل میں کہا اور پھر اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی ۔

لیش چینسکی نے اسے جو کتاب دی تھی اسے پڑھنے میں وہ اتنی محو تھی کہ اس نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ وادی اور صنوبر کے جنگلوں کے درمیان والی پتھر کی چٹانوں پر چڑھہکر کوئی اوپر آرہا ہے ۔ شائد اس بےبلائے مہمان کے پیر کی ٹھوکر لگ کر ایک کنکری لڑھکتی ہوئی جب اس کی کتاب پر آکر گری تب اس نے چونک کر اوپر دیکھا کہ سامنے پاویل کورچاگن کھڑا ہے ۔ وہ خود بھی اس غیرمتوقع ملاقات سے سٹ پٹا گیا تھا ۔ اس لئے بوکھلاہٹ میں وہ واپس جانے کے لئے مڑا ۔

«شائد یہی ہوگا جسے میں نے ابھی پانی میں تیرتے دیکھا تھا» تونیا نے اس کے گیلے بالوں کو دیکھہکر اندازہ لگایا ۔

«کیا آپ مجھے دیکھہکر ڈر گئیں؟ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ یہاں ہیں» پاویل نے چٹان کی کگر پر اپنا ہاتھہ جماتے ہوئے کہا ۔ وہ تونیا کو پہچان گیا تھا ۔

«نہیں تم کسی طرح بھی میرے کام میں مخل نہیں ہو ۔ اگر جی چاہے تو تھوڑی دیر بیٹھہکر میرے ساتھہ باتیں کرو ۔»

پاویل نے تعجب سے تونیا کو دیکھا ۔

«ہم کیا باتیں کر سکتے ہیں؟»

تونیا مسکرا دی۔

«آخر تم بیٹھ کیوں نہیں جاتے۔ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ» یہ کہہ کر اس نے ایک پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ «اچھا تمہارا نام کیا ہے؟»

«پاوکا کورچاگن۔»

«میرا نام تونیا ہے۔ اچھا اب تو ہمارا تعارف ہو گیا نا۔»

پاویل الجھن اور پریشانی کے مارے ہاتھ میں اپنی ٹوپی لئے اسے مڑوڑتا رہا۔

«تو تمہیں پاوکا کہتے ہیں سب لوگ؟» تونیا نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ «پاوکا کیوں؟ یہ کچھ اچھا نام نہیں ہے۔ پاویل اس سے کہیں بہتر نام ہے۔ میں تو تمہیں اسی نام سے پکاروں گی۔ پاویل کیا یہاں تم اکثر آتے ہو...؟» وہ اس کے آگے کہنا چاہتی تھی «تیرنے کے لئے» لیکن چونکہ وہ اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس نے اسے تیرتے ہوئے دیکھا تھا اس لئے اس کے بجائے «ٹہلنے کے لئے» کا فقرہ جوڑ دیا۔

«نہیں اکثر تو نہیں۔ بس جب چھٹی ہوتی ہے تبھی آتا ہوں» پاویل نے جواب دیا۔

«اچھا تو تم کہیں کام بھی کرتے ہو؟» تونیا نے اس سے مزید سوال کیا۔

«ہاں بجلی گھر میں بھٹی میں کوئلہ جھونکنے کا کام کرتا ہوں۔»

«اچھا یہ تو بتاؤ تم نے اتنا اچھا لڑنا کہاں سیکھا؟» تونیا اچانک پوچھ بیٹھی۔

«تمہیں میرے لڑنے سے کیا لینا ہے؟» پاویل بے ارادہ بول پڑا۔

«اچھا کورچاگن خفا نہ ہو» تونیا نے یہ دیکھ کر کہ وہ اس کے سوال پر جھنجھلا گیا ہے جلدی سے کہا۔ «بس یوں ہی جاننا

چاهتی هوں اور کیا؟ تم نے کیا گھونسہ مارا تھا! لیکن تمہیں اتنی بے رحمی سے نہیں مارنا چاہئے تھا» اتنا کہہ کر وہ کھل کھلاکر هنس پڑی۔

«تمہیں اس لڑکے پر بڑا ترس آتا ہے۔ ہوں؟» پاویل نے پوچھا۔

«نہیں نہیں ذرا بھی نہیں۔ بلکہ اس کے بر خلاف میں تو خود یہ سمجھتی ہوں کہ سخارکو کو اس کے کئے کی سزا ملی۔ مجھے تو بڑا مزا آیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تم اکثر لوگوں سے لڑ بیٹھتے ہو۔»

«کون کہتا ہے؟» پاویل کے کان کھڑے ہو گئے۔

«ارے وکٹر لیش‌چینسکی کا تو کہنا ہے کہ لڑنا ہی تمہارا پیشہ ہے۔»

پاویل کے چہرے پر غصہ کے بادل چھا گئے۔

«وکٹر بزدل اور بدمعاش ہے۔ اسے شکر کرنا چاہئے کہ اس وقت وہ بچ گیا۔ میں نے اس دن سنا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔ لیکن میں اپنے ہاتھ گندے نہیں کرنا چاہتا تھا۔»

«پاویل ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے» تونیا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

پاویل یہ سن کر تلملا اٹھا۔

وہ سوچنے لگا کہ «آخر اس بیوقوف لڑکی سے بات کرنے کی مجھے کیا مصیبت پڑی تھی؟ بیٹھی بیٹھی مجھ پر حکم چلا رہی ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ پاوکا نام مجھے پسند نہیں اور اب میرے بات کرنے کے انداز پر اعتراض کر رہی ہے۔»

«لیش‌چینسکی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے» تونیا نے پوچھا۔

«وہ بزدل ہے بالکل بدایوں کا للا! ذرا بھی دم نہیں ہے اس میں۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر میری انگلیاں کلبلانے لگتی ہیں۔

جب دیکھو رعب ہی جھاڑنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ سمجھتا ہے بڑے باپ کا بیٹا ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن مجھے اس کے پیسے کی رتی بھر بھی پرواہ نہیں ہے۔ مجھ سے ذرا بھی چوں چپڑ کی تو بس مزا ہی چکھا دوں گا۔ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ ایسے لوگوں کا علاج تو بس یہی ہے کہ منھ پر ایک گھونسہ جڑ دو، ساری شیخی بھول جاتے ہیں» پاویل طیش میں آکر بول رہا تھا۔

تونیا کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ناحق لیش‌چینسکی کا ذکر چھیڑا۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نوعمر لڑکے کو اس چھیلا قسم کے اسکول میں پڑھنے‌والے چھوکرے سے پرانا بغض تھا۔ گفتگو کو زیادہ نرم اور پرسکون بنانے کے لئے وہ پاویل سے اس کے گھروالوں اور اس کے کام کے بارے میں پوچھنے لگی۔

پاویل کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا اور یہ بھول کر کہ وہ چلا جانا چاہتا تھا اس لڑکی کے سوالوں کا جواب بڑی تفصیل سے دینے لگا۔

«تم نے پڑھائی کیوں چھوڑ دی؟» تونیا نے پوچھا۔

«میں اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔»

«کیوں؟»

پاویل شرم سے سرخ ہو گیا۔

«میں نے پادری کے کیک کے خمیر میں تھوڑا سا تمباکو ملا دیا تھا۔ اسی لئے مجھے اسکول سے نکال دیا گیا۔ بڑا کمینہ تھا وہ پادری جس سے ناراض ہو جاتا اس کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ جاتا۔» اور پھر پاویل نے اسے پورا قصہ سنایا۔

تونیا بڑی دلچسپی سے بیٹھی سنتی رہی۔ شروع شروع میں پاویل کو جو جھجھک محسوس ہو رہی تھی وہ رفتہ رفتہ غائب ہو گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ تونیا کے ساتھ اس طرح باتیں کر رہا تھا

جیسے اس کے ساتھہ پرانی جان پہچان ہو۔ مختلف باتوں کے دوران میں اس نے اسے اپنے بھائی کے فرار ہو جانے کے بارے میں بھی بتایا ۔ وہ دونوں اس نشیبی حصے میں بیٹھے ہوئے دوستانہ باتیں کرنے میں اتنے محو تھے کہ دونوں میں سے کسی کو یہ احساس نہیں ہوا کہ اس طرح بیٹھے بیٹھے کتنے گھنٹے گذر گئے تھے ۔ آخرکار پاویل اچھل کر کھڑا ہو گیا ۔

«ارے اس وقت تو مجھے کام پر پہنچ جانا چاھئے تھا ۔ یہاں بیٹھہ کر باتیں بنانے کے بجائے مجھے اس وقت بوائلر کے نیچے آگ سلگاتے ہونا چاھئے تھا ۔ اب ڈانیلو یقیناً ایک ہنگامہ برپا کر دے گا» کچھہ سٹ پٹا کر اس نے چلتے چلتے کہا ۔ «اچھا خدا حافظ. مجھے تو اب بھاگ کر شہر پہونچنا ہے ۔»

تونیا اچھل کر کھڑی ہو گئی اور اپنی جیکٹ پہننے لگی ۔

«مجھے بھی جانا ہے چلو ساتھہ چلیں گے ۔»

«نہیں نہیں یہ ممکن نہیں ہے ۔ مجھے بھاگ کر جانا ہوگا ۔»

«اچھی بات ہے ۔ میں تمہارے ساتھہ دوڑ لگاؤں گی ۔ دیکھیں کون پہلے پہنچتا ہے وہاں ۔»

پاویل نے اس کی طرف حقارت کی نظروں سے دیکھا ۔

«مجھہ سے دوڑ میں مقابلہ کروگی؟ عمر بھر نہیں جیت سکتیں!»

«خیر دیکھا جائے گا ۔ پہلے یہاں سے تو نکلو ۔»

پاویل چٹان کی کگر پر سے کود گیا اور پھر اس نے تونیا کو اپنے ھاتھہ کا سہارا دے کر اتار لیا ۔ اس کے بعد دونوں بھاگتے ہوئے اس چوڑی ہموار سڑک پر پہنچ گئے جو جنگل میں سے ہوتی ہوئی اسٹیشن کی طرف جاتی تھی ۔

تونیا سڑک کے بیچ میں رک گئی ۔

«اچھا تو آؤ ۔ ایک، دو، تین! دوڑو! کوشش کر کے مجھے پکڑو تو سہی!» وہ آندھی کی طرح سڑک پر دوڑنے لگی ۔ اس کے جوتوں

کے تلے چمک رہے تھے اور اس کی نیلی جیکٹ کا پیچھے والا حصہ ہوا میں اڑ رہا تھا ۔

پاویل اس کے پیچھے بھاگا ۔

پاویل نے اس اڑتی ہوئی جیکٹ کا پیچھا کرتے ہوئے سوچا: «ارے دو چھلانگوں میں اسے پکڑ لوں گا ۔» لیکن اسٹیشن کے بالکل قریب پہنچ کر گلی کے نکڑ پر ہی وہ اسے پکڑ پایا ۔ ایک آخری زور لگاکر وہ اس کے برابر پہنچ گیا اور اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کا شانہ پکڑ لیا ۔

«وہ مارا، چھو لیا!» وہ خوش ہوکر چلایا ۔ تکان سے اس کا دم پھول رہا تھا ۔

«مجھے چھوڑ دو! میرا کندھا دکھ رہا ہے» یہ کہتے ہوئے تونیا نے اپنا کندھا چھڑانے کی کوشش کی ۔

وہ دونوں وہاں کھڑے ہانپ رہے تھے ۔ دونوں کی نبضوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی ۔ اس زناٹے کی دوڑ سے تونیا بالکل شل ہو گئی تھی ۔ بڑی نزاکت کے ساتھ جھک کر اس نے پاویل کے جسم کا سہارا لے لیا ۔ کتنا حسین تھا لطیف بے تکلفی کا وہ ایک مختصر سا لمحہ کہ پاویل آسانی سے اسے نہ بھول سکتا تھا ۔

«آج تک مجھے دوڑ میں کوئی نہیں پکڑ پایا تھا» تونیا نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا ۔

اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے اور پاویل اپنی ٹوپی ہلاکر اسے الوداع کہتا ہؤا شہر کی طرف بھاگا ۔

جب پاویل نے دھکا دے کر بائلر روم کا دروازہ کھولا تو اس نے دیکھا کہ بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والا مزدور ڈینیلو پہلے ہی سے بوائلر کے نیچے آگ سلگانے میں مصروف تھا ۔

«ابھی جلدی کیا تھی اور دیر میں آتے؟» اس نے غراکر کہا ۔ «تمہارا خیال ہے کہ تمہارا کام میں ہی کروں گا ۔ کیوں؟»

پاویل نے اپنے ساتھی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کا کندھا تھپ تھپایا ۔

«ارے بڑے میاں ناراض کیوں ہوتے ہو۔ ابھی چٹکی بجاتے آگ دھکائے دیتا ہوں» اس نے خوش مزاجی سے کہا اور ایندھن جھونکنے میں جٹ گیا ۔

آدھی رات کے قریب جب ڈینیلو ایندھن کے ڈھیر پر بیٹھا مزے سے خراٹے لے رہا تھا، پاویل نے انجن میں تیل دیا، چیتھڑے سے اپنے ہاتھ صاف کئے، اوزاروں کے بکس میں سے «جیوسپ گیری بالڈی» کی باسٹھویں قسط نکالی اور ذرا سی دیر میں نیپلس کے «لال کرتے والوں» کے بے حد مشہور رہنما کے متعدد بہادرانہ کارناموں کی دلچسپ داستان پڑھنے میں محو ہو گیا ۔

«وہ ڈیوک کو اپنی خوبصورت نیلگوں آنکھوں سے تکنے لگی...»

«اس کی بھی تو آنکھیں نیلی ہیں» پاویل نے سوچا ۔ «اور وہ دوسروں سے کتنی مختلف ہے ۔ اس میں رئیسوں جیسی کوئی بات نہیں ہے ۔ اور دوڑتی کتنا تیز ہے بالکل طوفانی رفتار سے ۔»

دن میں تونیا کے ساتھ اپنی ملاقات کی یادوں میں پاویل اتنا کھو گیا تھا کہ اسے انجنوں کی رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی غوں غوں کی آواز بالکل سنائی ہی نہ دی ۔ بھاپ کی کثرت سے انجنوں پر ضرورت سے زیادہ زور پڑ رہا تھا ۔ انجن کا دیوھیکل فلائی وھیل تیزی سے گھوم رہا تھا اور سیمنٹ کا چبوترہ جس پر انجن لگا ہؤا تھا کانپ اٹھا ۔

بھاپ کا دباؤ بتانےوالی گھڑی پر نظر ڈالتے ہی پاویل نے دیکھا کہ اس کی سوئی خطرے کی سرخ لکیر سے کئی درجہ آگے نکل چکی تھی ۔

«لعنت ہے!» پاویل اچھل کر زائد بھاپ نکالنے والے والو کے پاس پہنچا ۔ جلدی سے اسے دوبارہ گھمایا ۔ اور سوں سوں کی تیز آواز

کرتی ہوئی بھاپ دریا میں جاکر کھلنےوالے نکاسی کے نل کے راستے بوائلر روم کے باہر نکل گئی ۔ ایک بیرم کھینچ کر پاویل نے پہیے کو چلانےوالا پٹہ پمپ کی گھرنی پر چڑھا دیا ۔

اس نے کنکھیوں سے ڈینیلو کی طرف دیکھا لیکن وہ گہری نیند میں سو رہا تھا ۔ اس کا منھہ کھلا ہؤا تھا اور اس کی ناک سے خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں ۔

آدھے منٹ کے اندر ہی بھاپ کا دباؤ بتانے والی گھڑی کی سوئی اپنی مناسب جگہ پر آ گئی تھی ۔

پاویل سے رخصت ہوکر تونیا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی ۔ وہ اس کالی آنکھوں‌والے نوجوان کے ساتھہ اپنی ملاقات کے بارے میں سوچ رہی تھی ۔ حالانکہ اسے خود بھی اس بات کا احساس نہیں تھا لیکن اس سے ملاقات ہو جانے پر وہ بہت خوش تھی ۔

«کیسا جیوٹ کا آدمی ہے ۔ کتنی زندہ‌دلی ہے اس میں اور میں نے اسے جس قسم کا غنڈہ تصور کیا تھا ویسا بالکل بھی نہیں ہے ۔ کچھہ بھی ہو وہ ان بیوقوف اسکول کے چھوکروں سے بالکل مختلف ہے...»

پاویل کسی اور ہی سانچے میں ڈھلا ہؤا تھا ۔ وہ ایسے ماحول سے آیا تھا جس سے تونیا قطعی ناواقف تھی ۔

«لیکن اسے راہ راست پر لایا جا سکتا ہے» تونیا نے سوچا ۔ «بڑا دلچسپ دوست رہےگا ۔»

گھر کے قریب پہنچ‌کر اس نے لیزا سخارکو، نیلی اور وکٹر لیش‌چینسکی کو باغ میں دیکھا ۔ وکٹر کچھہ پڑھہ رہا تھا ۔ ظاہر تھا کہ وہ لوگ اسی کا انتظار کر رہے تھے ۔

سب ایک دوسرے کا خیرمقدم کر چکے تو تونیا بھی ایک بنچ

پر بیٹھہ گئی ۔ بے معنی کھوکھلی گفتگو کے دوران میں وکٹر آکر اسکے پاس بیٹھہ گیا اور پوچھنے لگا:

«میں نے تمہیں جو ناول دیا تھا وہ تم نے پڑھہ ڈالا؟»

«ناول؟» تونیا نے اوپر دیکھا ۔ «ارے ھاں میں...» اس کے منھہ سے یہ بات نکلتے نکلتے رہ گئی کہ اس کتاب کو تو وہ جھیل کے کنارے ھی بھول آئی تھی ۔

«کیا تمہیں وہ محبت کی داستان پسند آئی؟» وکٹر نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا ۔

تونیا ایک لمحے کے لئے اپنے خیالات میں گم ھو گئی ۔ پھر باغیچے کے راستے کی ریت پر اپنے جوتے کی نوک سے ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچتے ھوئے اس نے اپنا سر اٹھاکر وکٹر کی طرف دیکھا ۔

«نہیں میں نے ایک اس سے بھی زیادہ دلچسپ محبت کی داستان شروع کر دی ھے ۔»

«سچ؟» وکٹر نے قدرے جھلاکر اپنی آواز کو کھینچ کر پوچھا ۔ «کس کی لکھی ھوئی ھے؟»

تونیا نے اپنی چمکدار مسکراتی ھوئی آنکھوں سے دیکھا ۔

«لکھی ھوئی تو کسی کی بھی نہیں...»

«تونیا اپنے دوستوں کو اندر بلا لو ۔ چائے لگ گئی ھے» تونیا کی ماں نے بالکونی پر سے پکارکر کہا ۔

دونوں لڑکیوں کا ھاتھہ پکڑکر تونیا انہیں گھر کی طرف لے چلی ۔ ان کے پیچھے پیچھے آتے ھوئے وکٹر تونیا کے الفاظ پر حیرت سے غور کر رھا تھا ۔ لیکن وہ ان کا کچھہ بھی مطلب نہیں سمجھہ پا رھا تھا ۔

اس عجیب و غریب نئے احساس نے، جو غیر معلوم طریقے پر پاویل کے اوپر غالب آ گیا تھا، اس کے دل میں ایک موھوم سی

اضطرابی کیفیت پیدا کر دی تھی جسے وہ بیان نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ اسے سمجھنے سے بھی قاصر تھا اور اس کی باغی روح میں ایک تلاطم سا برپا تھا ۔

تونیا کا باپ وہاں کا ناظم جنگلات تھا ۔ اور جہاں تک پاویل کا تعلق تھا اس کے نزدیک محض اس ایک بات کی بنیاد پر وہ بھی اسی طبقے کا فرد تھا جس کا کہ لیش‌چینسکی تھا ۔

پاویل نے غریبی اور مفلسی میں پرورش پائی تھی اور وہ ہر اس آدمی کو اپنا دشمن گردانتا تھا جسے وہ امیر سمجھتا تھا ۔ اس لئے تونیا کے لئے اس کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے تھے ان میں اندیشے اور تشویش کی بھی آمیزش تھی ۔ تونیا اس کے اپنے طبقے کی لڑکی نہیں تھی ۔ مثال کے طور پر نہ تو وہ سنگتراش کی بیٹی گالینا کی اتنی سادہ تھی اور نہ اسے سمجھنا ہی اتنا آسان تھا ۔ تونیا کے ساتھ وہ ہمیشہ محتاط رہتا تھا ۔ وہ ہمیشہ اس بات کے لئے تیار رہتا تھا کہ اگر اس کی کسی بھی بات میں تضحیک یا حقارت کی جھلک دکھائی دے تو وہ اس کا منھ توڑ جواب دے ۔ کیوں‌کہ اسے اندیشہ تھا کہ تونیا جیسی حسین اور تربیت‌یافتہ لڑکی اس جیسے ادنی بھٹی میں کوئلہ جھونکنے‌والے شخص کی طرف اس قسم کا رویہ اختیار کر سکتی ہے ۔

وہ ہفتے بھر سے اس سے نہیں ملا تھا ۔ اس لئے آج اس نے جھیل کی طرف جانے کا فیصلہ کیا ۔ اس نے جان بوجھ‌کر وہ راستہ پسند کیا جو تونیا کے گھر کے سامنے سے ہوکر جاتا تھا ۔ اسے امید تھی کہ شائد وہ وہیں کہیں مل جائے ۔ جب وہ چہار دیواری کے پاس سے چہل قدمی کرتا ہؤا جا رہا تھا اسے باغیچے کے دوسرے سرے پر وہی جانا پہچانا ملاحوں جیسا بلاؤز نظر آیا ۔ اس نے سڑک پر پڑا ہؤا ایک صنوبر کا پھل اٹھا لیا اور سفید بلاؤز کا نشانہ تاک‌کر اسے زور سے اس طرف پھینکا ۔

تونیا پھرتی کے ساتھ مڑی اور بھاگ کر اس کے پاس جا پہنچی، اس نے نہایت تپاک سے مسکرا کر چہار دیواری کے پار اپنا ھاتھ بڑھا دیا ـ

«آخر کار تم آ گئے» اس نے کہا، اس کے لہجے میں مسرت بھری ہوئی تھی ـ «اتنے دن سے کہاں تھے؟ میں اپنی کتاب جھیل کے پاس بھول آئی تھی اسے لینے میں وہاں گئی تھی ـ میں نے سوچا تھا کہ شاید تم بھی وہاں ہوگے ـ اندر آ جاؤ نا ـ»

پاویل نے اپنا سر ہلا دیا ـ

«نہیں ـ»

«کیوں نہیں؟» اس نے تعجب سے اپنی بھنویں چڑھا کر پوچھا ـ

«مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاپا کو یہ بات ناگوار ہوگی ـ شاید میرے جیسے آوارہ لڑکے کو باغ میں لانے کی وجہ سے وہ تمہیں بہت کچھ لعنت ملامت بھی کریں ـ»

«کیا بکواس کر رہے ہو پاویل» تونیا نے غصہ ہو کر کہا ـ «میں کہتی ہوں فوراً اندر آؤ ـ میرے پاپا کبھی بھی اس قسم کی بات نہیں کہیں گے ـ تم خود دیکھ لینا ـ اچھا اب اندر آ جاؤ ـ»

وہ اس کے لئے پھاٹک کھولنے کو بھاگی اور پاویل ھچکچاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ـ

جب وہ دونوں باغ میں پڑی ہوئی ایک گول میز کے قریب جا کر بیٹھ گئے تو تونیا نے اس سے پوچھا «تمہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟»

« بہت زیادہ» پاویل نے بڑے جوش اور اشتیاق سے جواب دیا ـ

«تمہیں کون سی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے؟»

پاویل چند لمحوں تک اس سوال پر غور کرتا رہا ـ پھر اس نے جواب دیا «جی‌زیپی گاری‌بالڈی ـ»

«جیوسپ گیری بالڈی» تونیا نے اس کا تلفظ درست کرتے ہوئے کہا - «تو تمہیں وہ کتاب خاص طور پر پسند ہے؟»

«ہاں میں نے اس کی اڑسٹھوں قسطیں پڑھ ڈالی ہیں - ہر مہینہ تنخواہ کے دن میں اس کی پانچ قسطیں خرید لاتا ہوں - گیری بالڈی بھی کیا آدمی تھا!» پاویل نے جوش کے ساتھ کہا - «اصلی ہیرو تھا وہ! میں ایسے ہی آدمی کا قائل ہوں - کیا کیا لڑائیاں لڑنی پڑیں اسے - اور ہمیشہ ہر لڑائی میں فتح اسی کی ہوئی - وہ تمام دنیا میں گھوما پھرا تھا - اگر وہ آج زندہ ہوتا تو میں یقیناً اُس کے ساتھ شریک ہو جاتا - میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں ضرور اس کی فوج میں بھرتی ہو جاتا - وہ نوجوان مزدوروں کو اپنے گروہ میں شامل کرتا تھا - اور وہ سب مل کر غریبوں کے لئے لڑتے تھے -»

«چلو تمہیں اپنی لائبریری دکھلائیں» اتنا کہہ کر تونیا نے اس کا بازو پکڑ لیا -

«نہیں نہیں میں گھر کے اندر نہیں جاؤں گا» پاویل نے اعتراض کرتے ہوئے کہا -

«آخر تم اتنے ضدی کیوں ہو؟ بھلا اس میں اتنا ڈرنے کی کیا بات ہے؟»

پاویل نے ایک نظر اپنے ننگے پاؤں پر ڈالی جو کچھ بہت زیادہ صاف نہیں تھے اور پھر اپنی گدی کھجلانے لگا -

«کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ تمہاری ماں یا تمہارے پاپا مجھے باہر نہیں نکال دیں گے؟»

«اگر تم نے اس قسم کی باتیں کرنا بند نہ کیا تو میں سچ مچ خفا ہو جاؤں گی» تونیا اس پر برس پڑی -

«خیر لیش چینسکی تو ہمارے ایسے لوگوں کو گھر میں گھسنے بھی نہیں دیتا - ہمیشہ ہم سے باورچی خانے میں ہی بات کرتا

ہے ـ میں ایک بار ان لوگوں کے یہاں کسی کام سے گیا تھا تو نیلی نے مجھے کمرے میں گھسنے تک نہیں دیا ـ شائد اسے یہ ڈر ہوگا کہ میں اس کا قالین یا کوئی دوسری چیز خراب کر دوں گا» پاویل نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ـ

«آؤ چلو نا» تونیا نے اس کا کندھا پکڑ لیا اور دوستانہ انداز میں اسے دھیرے سے برساتی کی طرف ٹھیلتے ہوئے اصرار کے ساتھہ کہا ـ

کھانے کے کمرے سے ہوتی ہوئی وہ اسے ایک اور کمرے میں لے گئی جہاں شاہ بلوط کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک بہت بڑی کتابوں کی الماری رکھی تھی ـ جب اسنے الماری کا دروازہ کھولا تو پاویل نے دیکھا کہ سینکڑوں کتابیں بہت سلیقے کے ساتھہ کئی قطاروں میں سجی ہوئی ہیں ـ اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی اتنا بڑا ذخیرہ نہیں دیکھا تھا ـ

«اچھا میں تمہارے لئے کوئی دلچسپ سی کتاب ڈھونڈھتی ہوں لیکن وعدہ کرو کہ تم اور کتابیں لینے کے لئے پابندی کے ساتھہ آیا کروگے ـ بولو آؤگے نا؟»

پاویل نے خوش ہوکر سر ہلا دیا ـ

«کتابوں کا تو میں دیوانہ ہوں» اس نے کہا ـ

اس دن انہوں نے کئی گھنٹے بہت خوشگوار طریقے سے ساتھہ گذارے ـ تونیا نے اپنی ماں سے پاویل کا تعارف بھی کرا دیا ـ یہ کچھہ اتنی سخت اور ہیبت ناک آزمائش تو نہیں ثابت ہوئی جتنا کہ اسے ڈر تھا ـ دراصل تونیا کی ماں اسے بہت اچھی لگی ـ

تونیا نے پاویل کو اپنے کمرے میں لے جاکر اسے اپنی کتابیں دکھائیں ـ

وہاں سنگارمیز پر ایک چھوٹا سا آئینہ رکھا ہؤا تھا ـ تونیا پاویل کا ہاتھہ پکڑکر اسے وہاں لے گئی اور پھر ہلکے سے ہنس کر بولی:

«آخر تم اپنے بال اس طرح کیوں بڑھائے رکھتے ہو؟ کبھی انہیں کٹواتے یا ان میں کنگھی کیوں نہیں کرتے؟»

«جب بہت بڑھ جاتے ہیں تو بالکل منڈوا دیتا ہوں – اور ان کا کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟» پاویل نے سٹ پٹاکر کہا –

تونیا ہنس پڑی اور اس نے سنگار میز پر سے ایک کنگھی اٹھاکر کئی بار جلدی جلدی پاویل کی الجھی ہوئی لٹوں میں پھیر دی –

«دیکھو نا اب پہلے سے کتنے بہتر معلوم ہوتے ہیں» اس نے اپنی فن‌کاری کا جائزہ لیتے ہوئے کہا – «بالوں کو سلیقے سے کٹواکر رکھنا چاھئے – بھلا کوئی ایسے گنواروں کی طرح پھرتا ہے –»

پھر اس نے پاویل کی بدرنگ بھوری قمیص اور اسکے بدنما پتلون پر ایک تنقیدی نظر ڈالی – لیکن کچھ کہا نہیں –

پاویل نے اس کی نظر کو دیکھا اور اپنے کپڑوں پر شرمندہ سا ہو گیا –

رخصت ہوتے وقت اسے تونیا نے پھر آنے کی دعوت دی – اس نے پاویل سے وعدہ لے لیا کہ وہ دو دن کے اندر آئےگا اور اس کے ساتھ مچھلی کے شکار کو جائےگا –

پاویل نے گھر سے باھر ہو جانے کے لئے کھڑکی سے کود جانے کا مختصر راستہ اختیار کیا – اس نے دوسرے کمروں میں سے ہوکر جانے اور تونیا کی ماں سے دوبارہ ملاقات کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی –

آرتیم کے چلے جانے سے کورچاگن کے کنبے کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی – پاویل کی مزدوری گھر کے خرچ کے لئے ناکافی تھی –

ماریا یاکوولیونا نے تجویز پیش کی کہ وہ دوبارہ کام کرنے کے لئے جانے لگے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ لیش‌چینسکی کے یہاں کھانا پکانےوالے کسی آدمی کی بہت ضرورت تھی – لیکن پاویل اس کے سخت خلاف تھا –

«نہیں ماں میں تھوڑا سا کام اور ڈھونڈھ لوں گا ـ سنا ہے کہ لکڑی چیرنے کے کارخانے میں شہتیر ڈھونے کے لئے کچھ آدمیوں کی ضرورت ہے ـ میں آدھے دن وہاں کام کر لیا کروں گا ـ بس پھر خرچ بھر کے لئے کافی ہو جائے گا ـ میں تمہیں کام کرنے کے لئے نہیں جانے دوں گا ـ نہیں تو آرتیم مجھ پر ناراض ہو گا کہ میں اس کے بغیر کام نہیں چلا پایا ـ»

اس کی ماں نے بہت زور دیا لیکن پاویل اپنی ضد پر اڑا رہا ـ

دوسرے ہی دن سے پاویل لکڑی چیرنے کے کارخانے میں کام کرنے لگا ـ اس کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ تازہ چیرے ہوئے تختوں کو سوکھنے کے لئے ڈھیر لگاکر رکھ دے ـ وہاں اس کی ملاقات کئی ایسے لڑکوں سے ہوئی جنہیں وہ پہلے سے جانتا تھا ـ مثلاً میشا لیوچکوف جو اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا اور وانیا کلیشوف ـ اس کی اور میشا کی جوڑی تھی اور انہیں ان کے کام کے حساب سے مزدوری ملتی تھی ـ اس طرح وہ کافی کما لیتے تھے ـ پاویل دن میں لکڑی چیرنے کے کارخانے میں کام کرتا تھا اور شام کے وقت بجلی گھر میں اپنے کام پر جاتا تھا ـ

کام شروع کرنے کے دسویں دن شام کو اس نے اپنی کمائی لاکر ماں کو دی ـ

ماں کو پیسے دینے کے بعد وہ کچھ عجیب سی اضطرابی کیفیت کے تحت پہلو بدلتا رہا پھر آخرکار اس نے شرماتے ہوئے کہا:

«ماں ایک بات کہوں ـ مجھے ایک ساٹن کی قمیص خرید دو، نیلے رنگ کی، ویسی ہی جیسی میرے پاس پار سال تھی تمہیں یاد ہے نا؟ اس میں اس کی آدھی رقم خرچ تو ضرور ہو جائے گی لیکن تم فکر نہ کرنا ـ میں اور پیسے کماکر لے آؤں گا ـ میری یہ قمیص بہت ہی بھدی ہو گئی ہے» اس نے مزید وضاحت کرتے ہوئے

کہا، جیسے کہ وہ اپنی اس فرمائش کے لئے معذرت پیش کر رہا ہو۔

«کیوں نہیں میں ضرور خرید دوں گی» اس کی ماں نے کہا۔ «پاولوشا میں آج ہی کپڑا لے آؤں گی اور کل سی دوں گی۔ تمہیں سچ مچ نئی قمیص کی ضرورت ہے۔» یہ کہہ کر اس نے بڑی ماءتا کے ساتھ اپنے بیٹے کو دیکھا۔

حجام کی دکان کے سامنے پہنچ کر پاویل ٹھہر گیا اور اپنی جیب میں پڑے ہوئے روبل کو ٹٹولنے کے بعد دروازہ کھول کر دکان میں داخل ہؤا۔

حجام نے جو ایک بہت ہی چست قسم کا نوجوان سا آدمی تھا اسے داخل ہوتے دیکھا اور اپنے سر سے خالی کرسی کی طرف اشارہ کر دیا۔

«اب آپ آئیے صاحب۔»

نرم لچکدار کرسی میں بیٹھکر پاویل نے اپنے سامنے والے آئینے میں ایک مبہوت گھبرائی ہوئی سی شکل دیکھی۔

«مشین پھیرنا ہے؟» حجام نے پوچھا۔

«ہاں۔ نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ دیکھو میں بال کٹوانا چاہتا ہوں۔ کیا کہتے ہیں اسے؟» پاویل کو جب اپنی بات سمجھانے کے لئے الفاظ نہیں ملے تو اس نے ہاتھ ہلاکر اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔

«سمجھ گیا۔ سمجھ گیا» حجام نے مسکراکر کہا۔

پندرہ منٹ کی اس اذیت کے بعد پاویل تھکا ہؤا پسینے میں تربتر حجام کی دوکان سے باہر نکلا لیکن اس کے بال بہت سلیقے کے ساتھ کٹے ہوئے تھے اور کنگھی سے انہیں سنوار بھی دیا گیا تھا۔ حجام کو اس کے وحشیانہ بالوں کے ساتھ کافی محنت کرنا پڑی تھی۔ لیکن آخرکار پانی اور کنگھی کے زور سے اس کے بال قابو میں آ گئے

تھے اور پہلے جو بال کھڑے ہوئے تھے وہ اب قاعدے سے اپنی جگہ پر جم گئے تھے۔

سڑک پر آکر پاویل نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی ٹوپی آنکھوں کے سامنے سرکا لی۔

«معلوم نہیں ماں مجھے دیکھ کر کیا کہے گی؟» اس نے سوچا۔

اس کے ساتھ مچھلی کے شکار کے لئے جانے کا وعدہ پورا نہ کرنے کی وجہ سے تونیا پاویل پر بہت جھنجھلائی ہوئی تھی۔

«وہ کوئلہ جھونکنے والا لڑکا میرا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھتا» اس نے اپنی جھنجھلاہٹ میں سوچا لیکن جب کئی دن اور بیت گئے اور پاویل پھر بھی نہ آیا تو وہ اس کی ملاقات کے لئے بے قرار رہنے لگی۔

ایک دن وہ گھومنے کے لئے باہر نکلنے ہی والی تھی کہ اس کی ماں نے کمرے میں جھانک کر کہا:

«کوئی تم سے ملنے آیا ہے تونیا۔ اندر بھیج دوں؟»

پاویل دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ اتنا تبدیل ہو گیا تھا کہ پہلے تو تونیا اسے پہچان بھی نہ پائی۔

وہ نیلے رنگ کی ایک بالکل نئی ساٹن کی قمیص اور ایک گہرے رنگ کا پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کے جوتے بھی پالش سے خوب چمک رہے تھے اور اس کے بال بھی کٹے ہوئے تھے۔ اس بات کو تونیا نے فوراً دیکھ لیا تھا۔ کوئلہ جھونکنے والے اس میلے کچیلے لڑکے کی بالکل کایاپلٹ ہی ہو گئی تھی۔

تونیا اپنے تعجب کا اظہار کرنے ہی والی تھی کہ اس نے بروقت اپنے آپ کو روک لیا کیوں کہ وہ اس لڑکے کو الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی وہ یوں ہی بہت کافی سٹپٹایا ہوا تھا۔ اس لئے تونیا نے یہ ظاہر کیا کہ اس نے پاویل کے حلیے میں پیدا ہونے والی

اس حیرت انگیز تبدیلی کو دیکھا ہی نہیں اور اس لئے اسے لعنت ملامت کرنے لگی۔

«تم اس دن مچھلی کا شکار کرنے کیوں نہیں آئے؟ شرم نہیں آتی تم کو! اس طرح اپنا وعدہ پورا کرتے ہو تم؟»

«ادھر کچھ دنوں سے میں لکڑی چیرنے کے کارخانے میں کام کرنے لگا ہوں۔ وہاں سے فرصت ہی نہیں ملی۔»

وہ اس سے یہ نہ کہہ سکا کہ اپنے واسطے یہ پتلون اور قمیص خریدنے کے لئے وہ پچھلے کئی دنوں سے جان توڑ محنت کر رہا تھا۔

لیکن تونیا خود ہی حقیقت کو تاڑ گئی اور پاویل سے اس کی خفگی یک لخت غائب ہو گئی۔

«آؤ تالاب کی طرف ٹہلنے چلیں» اس نے تجویز پیش کی اور وہ دونوں باغ میں ہوکر سڑک پر نکل آئے۔

تھوڑی ہی دیر کے اندر پاویل تونیا کو بتا رہا تھا کہ اس نے لفٹیننٹ کا ریوالور کس طرح چرایا تھا۔ وہ اسے اپنے اس بہت بڑے راز میں اس طرح شریک کر رہا تھا کہ جس طرح بہت ہی قریبی دوست کو کیا جاتا ہے۔ اس نے تونیا سے وعدہ کیا کہ جلد ہی کسی دن وہ دونوں گھنے جنگل میں جائیں گے اور ریوالور چلائیں گے۔

«لیکن دیکھو میرا یہ راز کسی کو بتا نہ دینا» پاویل نے یک بیک کہا۔

«میں کبھی بھی تمہارا راز کسی کو نہ بتاؤں گی» تونیا نے عہد کیا۔

چوتھا باب

یوکرین میں ایک خوفناک اور شدید طبقاتی جنگ چھڑی ہوئی تھی – روز افزوں، ہزاروں کی تعداد میں لوگ جنگ میں شریک ہوتے جا رہے تھے اور ہر نئے تصادم کے ساتھ نئے لڑنے والے میدان میں آتے تھے –

باعزت شہریوں کے لئے امن اور سکون کے دن ختم ہو چکے تھے – چھوٹے چھوٹے گرے پڑے مکان توپوں کی گھن گرج سے کانپ کانپ جاتے تھے – اور باعزت شہری خوف زدہ ہوکر اپنے تہ خانوں کی دیواروں کے پاس دبک جاتے تھے یا پھر اپنے مکانوں کے پیچھے بنی ہوئی خندقوں میں پناہ لیتے تھے –

ہر رنگ اور ہر طرح کے پیتلورا گروہ اس علاقے میں طوفان کی طرح چھائے ہوئے تھے اور متعدد چھوٹے بڑے سردار جن میں گولب، آرکینجل، اینجل اور گوردیوس کی قسم کے، اور متعدد دوسری قسم کے لٹیرے تھے ان گروہوں کی رہنمائی کر رہے تھے – زار کی فوج کے سابق افسران، دائیں اور بائیں بازو کے «یوکرینی سوشلسٹ انقلابی» غرض یہ کہ جس منچلے نے بھی قاتلوں کا ایک گروہ جمع کر لیا وہی عطامان بن بیٹھا – کچھ نے پیتلورا کا زرد اور نیلے رنگ کا پرچم اپنا لیا اور اپنی طاقت اور امکانات کے مطابق جو بھی جتنے علاقے پر قبضہ کر پایا اس نے اسی پر اپنا اقتدار قائم کر لیا –

ان مختلف گروہوں کی مدد سے جنہیں کولکوں (امیر کسانوں) کی پشت پناہی حاصل تھی اور عطامان کونووالیتس کی محاصرہ کرنے والی فوج کی گلیشیائی رجمنٹ کی مدد سے «عطامان اعلیٰ» پیتلورا نے اپنی فوج کی رجمنٹیں اور ڈویژنیں تیار کیں – جس وقت

سرخ چھاپہ مار دستے سوشلسٹ انقلابیوں اور کولکوں کی ان غیرمنظم فوجوں پر حملہ کرتے تھے تو سینکڑوں اور هزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اور مشین گنوں اور توپوں کی گاڑیوں کے پہیوں کی گڑگڑاهٹ سے زمین کانپ اٹھتی تھی۔

۱۹۱۹ء کے اس هنگامی سال کے اپریل کے مہینے میں باعزت شہری کا یہ حال تھا کہ وہ دهشت اور خوف سے صبح کے وقت چپکے سے جھلملیاں کھول کے اپنی نیند سے بوجھل آنکھوں سے باهر جھانک کر اپنے پڑوسی سے انتہائی تشویش کے انداز میں یہ سوال کرتا:

«آوتونوم پتروچ کیا تمہیں کچھ علم هے آج یہاں کس کا اقتدار هے؟»

اور آوتونوم پتروچ اپنا پتلون اوپر سرکاتے هوئے خوفزدہ هوکر ادهر ادهر نظر ڈالتا اور جواب دیتا:

«کہہ نہیں سکتا آفاناس کریلووچ۔ لیکن کل رات شہر میں کوئی داخل تو ضرور هؤا هے۔ خیر پتہ لگ جائےگا کہ کون لوگ هیں۔ اگر انہوں نے یہودیوں کو لوٹنا شروع کیا تو صاف ظاهر هو جائےگا کہ پیتلورا کے لوگ هیں اور اگر وہ «کامریڈ لوگ» هوئے تو ان کی گفتگو کے انداز سے فوراً پتہ لگ جائےگا۔ میں خود یہ معلوم کرنے کے چکر میں هوں کہ کون سی تصویر ٹانگی جائے۔ میں اپنے پڑوسی گیراسیم لیونتیوچ کی طرح مصیبت میں پھنسنا نہیں چاهتا۔ هؤا یہ کہ اس نے ٹھیک سے پتہ نہیں لگایا اور جاکر لینن کی تصویر دیوار پر لگائی هی تھی کہ تین آدمی دهڑدهڑاتے هوئے اس کے گھر میں داخل هوئے۔ معلوم یہ هؤا کہ وہ لوگ پیتلورا کے آدمی تھے۔ انہوں نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور پھر اس پر ٹوٹ پڑے۔ اسے کس کس کر بیس کوڑے لگائے گئے۔ ان لوگوں نے ڈپٹ کر اس سے کہا «سور کا بچہ بڑا کمیونسٹ بنا هے۔ هم

لوگ تیری کھال کھینچ لیں گے» اور اس نے انہیں سمجھانے کی بہتیری کوشش کی بہت رویا پیٹا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔»

سڑک پر ہتھیاربند سپاہیوں کی ٹولیوں کو آتے دیکھ کر باعزت شہری اپنی کھڑکیاں بند کر لیتے تھے اور جاکر چپ چاپ کہیں چھپ جاتے تھے۔ سوچتے تھے خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ دم دبائے پڑے رہو...

جہاں تک مزدوروں کا سوال تھا تو وہ پیتلورا کے ٹھگوں کے زرد اور نیلے رنگ کے پرچم کو ایک دبی ہوئی نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یوکرین کے بورژوا جارحانہ قوم پرستوں کی اس یلغار کے سامنے وہ بے بس تھے۔ اور ان کے حوصلے اس وقت بیدار ہوتے تھے جب سرخ دستے چاروں طرف سے حملہ کرنے والے زرد اور نیلے پرچم والوں کے خلاف بڑی جانبازی سے لڑتے ہوئے اور ان کی صفوں کو چیرتے ہوئے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ ایک یا دو دن تک مزدوروں کا محبوب سرخ پرچم ٹاؤن ہال پر لہراتا۔ لیکن اس کے بعد فوج آگے بڑھ جاتی اور دوبارہ بھیانک تاریکی کا غلبہ ہو جاتا۔

اس وقت شہر کرنل گولب کے قبضے میں تھا جسے ٹرانس دنیپر ڈویژن کا «فخر اور امیدوں کا مرکز» سمجھا جاتا تھا۔

ابھی ایک روز پہلے اس کے دو ہزار خونی سپاہیوں کے دستے نے بڑے فاتحانہ انداز میں شہر میں قدم رکھا تھا۔ سپاہیوں کی صفوں کے آگے حضور کرنل صاحب خود ایک شاندار سیاہ گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ اپریل کے سورج کی تپش کے باوجود ایک کاکیشیائی برقعہ، میمنے کی کھال کی بنی ہوئی زاپوروژئے کے قزاقوں جیسی ٹوپی جس پر زردی مائل سرخ رنگ کا ایک تاج لگا ہوا تھا اور ایک چرکیسکا پہنے ہوئے تھا۔ وہ ان تمام ہتھیاروں سے بھی لیس تھا جو اس لباس کے ساتھ عام طور پر لگائے جاتے ہیں۔ چاندی کے نقشین دستے والا خنجر اور تیغ۔ اس کے دانتوں میں خم دار نلی والا ایک پائپ بھی دبا ہؤا تھا۔

حضور کرنل گولب بہت خوبصورت انسان تھا - اس کی بھنویں سیاہ تھیں اور مسلسل مے نوشی کی وجہ سے ان کے چہرے کے زرد رنگ میں ایک ھلکے سے سبز رنگ کی آمیزش پیدا ھو گئی تھی -

انقلاب سے پہلے حضور کرنل صاحب شکر کے ایک کارخانے کے چقندر کے کھیتوں پر ماہر زراعت کی حیثیت سے کام کرتا تھا - لیکن وہ زندگی بالکل بےرنگ تھی - عطامان کے عہدے کے ساتھہ اس کا بھلا کیا مقابلہ! اس لئے اس طوفان کی سیاہ موجوں کے سہارے جن کی زد میں اس وقت تمام ملک آیا ھوا تھا یہی ماہر زراعت حضور کرنل گولب بن بیٹھا -

نوواردوں کے اعزاز میں شہر کے واحد تھیٹر میں ایک شاندار جشن کا انتظام کیا گیا - پیتلورا دانشوروں کے «بہترین نمونے» پوری تعداد اور طاقت کے ساتھہ وھاں موجود تھے: یوکرینی مدرس، پادری صاحب کی دونوں بیٹیاں — حسین آنیا اور اس کی چھوٹی بہن دینا، ان سے کم حیثیت والی چند خواتین، کاونٹ پتوتسکی کے گھرانے کے کچھہ سابق افراد، کچھہ چھوٹے موٹے معزز شہری، یوکرینی سوشلسٹ انقلابیوں کا کچرہ جو اپنے آپ کو «آزاد قزاق» کہتے تھے -

تھیٹر کا ھال کھچا کھچ بھرا ھؤا تھا - اپنی مہمیزوں کو ٹکرا کر چلنے والے افسر جو دیکھنے میں زاپوروژئے کے قزاقوں کی پرانی تصویروں کی نقل معلوم ھوتے تھے، شوخ رنگوں میں کاڑھے ھوئے پھولوں اور رنگ برنگے موتیوں اور فیتوں سے آراستہ یوکرینی قومی لباسوں میں ملبوس استانیوں، پادری کی بیٹیوں اور دوسری خواتین کے ارد گرد پھدک رھے تھے -

رجمنٹ کا بینڈ زور زور بج رھا تھا - اسٹیج پر «نازار استودولیا» نام کا ڈرامہ دکھانے کی تیاریاں بڑی سرگرمی کے ساتھہ جاری تھیں -

لیکن بجلی کا کوئی انتظام نہیں تھا - اس بات کی اطلاع باضابطہ طور پر حضور کرنل صاحب کو صدر دفتر میں ایڈ جوٹینٹ سب لفٹیننٹ

پولیانتسیف کی معرفت پہنچا دی گئی تھی۔ ایڈجوٹینٹ نے اب اپنے نام اور عہدے کو یوکرینی طرز کے مطابق تبدیل کر کے خورونژی پالیانتسیا کر لیا تھا۔ کرنل صاحب نے جو شام کے جلسے کو اپنی شرکت کا شرف بخشنے کا فیصلہ کر چکے تھے پالیانتسیا کی پوری بات سنی اور لاپرواہی کے ساتھہ لیکن تحکمانہ انداز میں کہا:

«روشنی کا انتظام کرانا تمہارا کام ہے۔ کسی بجلی والے کو پکڑکر بجلی گھر چالو کروا دو۔ چاہے اس کام میں تمہاری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔»

«بہت اچھا، حضور کرنل صاحب۔»

خورونژی پالیانتسیا کو بغیر اپنی جان دئے ہی کئی بجلی والے مل گئے۔ مسلح سنتریوں کی حراست میں ایک گھنٹے کے اندر ہی پاویل، بجلی کے ایک مستری اور ایک میکنیک کو بجلی گھر لے جایا گیا۔

«اگر سات بجے تک بجلی نہ آئی تو تم تینوں کو میں پھانسی پر لٹکا دوں گا» پالیانتسیا نے اوپر چھت پر لگے ہوئے لوہے کے ایک شہتیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان تینوں سے بڑی سختی کے ساتھہ کہا۔

صورت حال کی اس دو ٹوک تشریح کا ان تینوں پر بڑا اثر ہوا اور مقررہ وقت پر بجلی آ گئی۔

جشن کی محفل پورے شباب پر تھی جب حضور کرنل صاحب اپنی محبوبہ کو لئے ہوئے تشریف لائے۔ ان کی یہ محبوبہ شراب خانے کے مالک کی گداز جسم اور پیلے بالوں والی بیٹی تھی۔ اسی کے یہاں کرنل صاحب کا قیام تھا۔ چونکہ اس کا باپ پیسے والا آدمی تھا اس لئے اس نے اس صوبہ کے سب سے بڑے شہر کے کسی ثانوی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔

سامنے کی قطار میں معزز مہمانوں کی حیثیت سے ان کے لئے

دو جگہیں ریزرو تھیں ۔ جب وہ دونوں آرام سے بیٹھہ گئے تو حضور کرنل صاحب نے اشارہ کیا اور اس کا اشارہ پاتے ہی پردہ اتنے اچانک اٹھا دیا گیا کہ ناظرین نے جلدی سے اسٹیج سے بھاگتے ہوئے اسٹیج ڈائرکٹر کی پیٹھہ کی ایک جھلک بھی دیکھہ لی ۔

ڈرامے کے دوران میں افسران اپنی اپنی محبوباؤں کے ساتھہ باھر بار میں اپنا وقت گذار رہے تھے ۔ بار میں گھر کی بنی ہوئی کچی شراب کے دور چل رہے تھے جس کا انتظام کر کے پالیانتسیا نے اپنے رسوخ کا ثبوت دیا تھا ۔ شہر سے کھانے پینے کی جو لذیذ چیزیں زبردستی حاصل کی گئی تھیں ان پر یہ افسران لمبے لمبے ہاتھہ مار رہے تھے ۔ یہ پروگرام ختم ہوتے ہوتے وہ سب نشے میں غرق ہو چکے تھے ۔

ڈرامے کے آخری سین کے ختم ہوتے ہی پالیانتسیا کودکر اسٹیج پر جا پہنچا ۔

«حضرات اور خواتین! اب اس کے بعد فوراً ناچ شروع ہوگا» اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں ہاتھہ نچاکر اعلان کیا ۔

ہر طرف سے تالیوں کی آواز کے ساتھہ اس اعلان کا خیر مقدم کیا گیا ۔ تمام تماشبین ہال کے باہر صحن میں نکل آئے تاکہ پیتلورا کے سپاہی جنہیں مہمانوں کی حفاظت کے لئے تعینات کیا گیا تھا کرسیاں باہر نکالکر رقص کے لئے ہال خالی کر دیں ۔

آدھے گھنٹے کے اندر تھیٹر ہال میں رنگ رلیوں کا طوفان سا ابل پڑا ۔

پیتلورا فوج کے افسران ضبط اور قابو کی تمام حدیں توڑکر مقامی خواتین کے ساتھہ بڑی بے باکی سے «ہوپک ناچ» ناچنے میں مصروف تھے ۔ گرمی کی وجہ سے خواتین کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور افسروں کے وزنی بوٹوں کی دھمک سے تھیٹر کی فرسودہ عمارت کی دیواریں کانپ رہی تھیں ۔

اسی وقت آٹے کی چکی کی سمت سے مسلح گھوڑ سواروں کی ایک فوج شہر کی طرف آ رہی تھی۔ شہر کی سرحد پر پیتلورا فوج کے سنتریوں کی ایک چوکی قائم کر دی گئی تھی۔ گھوڑ سواروں کو دیکھتے ہی سنتریوں نے گھبرا کر اپنی مشین گن سنبھال لی اور رات کے سناٹے میں رائفلوں کے توڑے کھٹکنے کی آواز آئی۔ اسی وقت رات کی سیاہی کو چیرتی ہوئی کسی کی ڈپٹنے کی کرخت آواز سنائی دی:

«ٹھہرو! کون جاتا ہے؟ کون ہے؟»

تاریکی میں سے دو سیاہ سائے ابھر کر سامنے آئے اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر بیٹھی ہوئی بھاری آواز میں کہا:

«عطامان پاولیوک اپنے دستے کے ساتھ آ رہے ہیں۔ تم لوگ کون ہو؟ گولب کے آدمی ہو؟»

«ہاں ہم لوگ گولب کے آدمی ہیں» ایک افسر نے جواب دیا۔ وہ بھی بڑھ کر ایک قدم آگے آ گیا تھا۔

«میں اپنے آدمیوں کو کہاں ٹھہراؤں؟» پاولیوک نے پوچھا۔

«میں ابھی ہیڈ کوارٹر فون کر کے پوچھتا ہوں» اس افسر نے جواب دیا۔ اور پھر وہ سڑک کے کنارے ایک جھونپڑی میں غائب ہو گیا۔

ایک منٹ بعد ہی وہ باہر نکلا اور حکم دینے لگا:

«جوانوں مشین گن سڑک پر سے ہٹا لو۔ حضور عطامان کے لئے راستہ صاف کر دو!»

تیز روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے تھیٹر کے سامنے پہنچ کر پاولیوک نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ وہاں پر بہت سے لوگ کھلی ہوا میں چہل قدمی کر رہے تھے۔

«معلوم ہوتا ہے یہاں کوئی محفل جمی ہوئی ہے» اس نے پاس والے گھوڑ سوار کی طرف مڑ کر کہا۔ «گکاچ کیوں نہ ہم بھی

یہیں اتر کر ان رنگ رلیوں میں شریک ہو جائیں۔ یہیں سے کوئی دو چھوکریاں پکڑ لیں گے۔ چھوکریوں کی تو یہاں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اے، استالیڑکوا!» اس نے چلا کر کہا۔ «تم شہر کے لوگوں کے گھروں میں سپاھیوں کے ٹھہرنے کا انتظام کروا دو۔ ہم لوگ یہیں رکیں گے۔ اردلی، پیچھے پیچھے آؤ!» اتنا کہہ کر وہ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے گھوڑے پر سے دھم سے کود پڑا۔

تھیٹر کے پھاٹک پر پاولیوک کو پیتلورا کے دو مسلح جوانوں نے روک دیا۔

«ٹکٹ؟»

پاولیوک نے انہیں بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا اور ان میں سے ایک کو اپنے کندھے کا دھکا دے کر ایک طرف کو دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ کے ایک درجن سپاھیوں نے بھی ایسا ھی کیا۔ ان سب کے گھوڑے باھر جنگلے سے بندھے ہوئے تھے۔

سب کی نظریں ان نوواردوں کی طرف گھوم گئیں۔ پاولیوک کے لحیم شحیم جسم نے خاص طور پر سب کی توجہ اس پر مرکوز کر دی۔ وہ نہایت عمدہ کپڑے کا بنا ہؤا افسروں کا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے ساتھ وہ اس قسم کی نیلے رنگ کی برجس پہنے ہوئے تھا جیسی کہ گارڈ کے افسران پہنتے ھیں۔ اس کے سر پر ایک جھبری سی سور کی ٹوپی تھی۔ اس کے کندھے سے لٹکتی ہوئی چمڑے کی پیٹی میں ایک مازر پستول جھول رہا تھا۔ اور اس کی جیب سے ایک دستی بم باھر جھانک رہا تھا۔

«یہ کون ھے؟» رقص کے حلقے کے چاروں طرف کھڑے ہوئے مجمع میں ھر طرف کاناپھوسی شروع ھو گئی۔ رقص کے دائرے میں گولب کا نائب سپہ سالار بڑے جوش کے ساتھ دیوانہ‌وار ناچ رہا تھا۔

پادری کی بڑی بیٹی ناچ میں اس کے ساتھ شریک تھی۔ اور

ناچتے وقت وہ اتنی تیزی سے گھومتی تھی کہ اس کا سایہ بہت اونچا اٹھہ جاتا تھا اور ناچ سے لطف‌اندوز ہونے‌والے چاروں طرف کھڑے ہوئے سپاہیوں کو اس کا ریشمی جانگیا بالکل صاف نظر آنے لگتا تھا۔

اپنی کہنیوں سے مجمع کو چیرتا ہؤا پاولیوک رقص کے دائرے میں پہنچ گیا۔

اس نے پادری کی بیٹی کی پنڈلیوں کو اپنی دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کیا۔ اس کے بعد وہ رقص کے دائرے کو پار کرتا ہؤا اس چبوترے کے پاس پہنچ گیا جہاں سازندے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ‌کر وہ رکا اور اس نے اپنا گھوڑے‌والا چابک پھٹکارا جسے چمڑے کی پتلی پتلی پٹیوں کو بالوں کی چوٹی کی طرح گوندھ‌کر بنایا گیا تھا۔

«چلو فوراً ہوپک کی طرز چھیڑو!»

سازندوں کے ہدایت‌کار نے اس حکم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

پاولیوک کے ہاتھہ کی ایک تیز جنبش کے ساتھہ کوڑا کنڈکٹر کی پیٹھہ پر جاکر چپک گیا وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ موسیقی کا سلسلہ یک بیک ٹوٹ گیا اور سارے ہال پر سکوت طاری ہو گیا۔

«بدتمیز کہیں کا۔» شراب‌خانے کے مالک کی بیٹی آپے سے باہر ہو گئی۔ اپنے پاس بیٹھے ہوئے گولب کی کہنی پکڑکر اس نے چیخ کر کہا۔ «اور تم چپ چاپ بیٹھے دیکھہ رہے ہو۔»

گولب اپنا بھاری جسم لئے ہانپتا ہوا اٹھا اور ایک کرسی کو ٹھوکر مارکر ایک طرف سرکاتے ہوئے وہ تین قدم آگے بڑھا اور جاکر پاولیوک کے روبرو کھڑا ہوگیا۔ وہ اس نووارد کو فوراً پہچان گیا تھا۔ اسے اپنے اس رقیب کے ساتھہ جو اس کے ہاتھہ سے مقامی

اقتدار چھین لینا چاھتا تھا کئی پرانے جھگڑے نبٹانے تھے۔ ابھی ایک ھفتہ پہلے ھی پاولیوک نے حضور کرنل کے ساتھہ بڑی ذلیل حرکت کی تھی۔ ایسے وقت پر جب کہ وہ سرخ فوج کی ایک رجمنٹ کے ساتھہ گھمسان کی لڑائی میں مبتلا تھا — اور یہ رجمنٹ گولب کی فوجوں کو پہلے بھی کئی بار بری طرح شکست دے چکی تھی۔ پاولیوک نے بالشویکوں پر پیچھے سے حملہ کرنے کے بجائے ایک شہر پر ھلہ بول دیا تھا اور وھاں پر تعینات سرخ فوج کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی کو شکست دےکر وھاں اپنی حفاظت کے لئے اپنے سپاھیوں کا ایک دستہ تعینات کر دیا تھا اور پھر اس نے اس شہر میں جی بھرکر لوٹ مار کی تھی۔ یہ تو ظاھر ھی ھے کہ پیتلورا کی فوجوں کی روایات کے مطابق اس نے اس بات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی کہ یہودیوں کو حملے کا خاص نشانہ بنایا جائے۔ اسی اثناء میں سرخ فوجیں گولب کے مورچے کو داھنی طرف سے توڑکر اس کے چنگل سے نکل گئی تھیں۔

اور اب گھوڑ سوار فوجوں کے اس بددماغ کپتان کی اتنی مجال ھوئی تھی کہ وہ یہاں آکر حضور کرنل صاحب کی آنکھوں کے سامنے اس کے بینڈ ماسٹر پر ھاتھہ اٹھائے۔ نہیں اب تو بس حد ھو گئی تھی۔ گولب بخوبی سمجھہ گیا تھا کہ اگر اس نے اس مغرور لٹ پونجئیے عطامان کو اس کی اوقات سے بڑھنے دیا تو اس کی اپنی رجمنٹ میں اس کا سارا رعب خاک میں مل جائےگا۔

کئی سکنڈ تک وہ دونوں وھیں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو گھورتے رھے۔

ایک ھاتھہ سے تیغ کا دستہ پکڑکر اور دوسرے سے اپنی جیب میں ریوالور کو ٹٹولتے ھوئے گولب نے چیخ کر کہا:

«تیری یہ مجال کہ تو میرے سامنے میرے آدمیوں پر ھاتھہ اٹھائے، بدمعاش کہیں کا!»

پاولیوک کا ہاتھ بھی سرک کر اپنے مازر پستول کے دستے پر پہنچ گیا۔

«حضور گولب صاحب ذرا ہوش میں رہئے۔ زیادہ نہ اکڑئیے، نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ مجھ پر رعب جھاڑنے کی کوشش مت کیجئے، میرا غصہ بہت خراب ہے۔»

گولب کو اتنی بات کی برداشت نہیں تھی۔

«نکال دو انہیں اور پچیس پچیس کوڑے لگاؤ ان سب کو» اس نے چیخ کر کہا۔

تمام افسران پاولیوک اور اس کے سپاہیوں پر شکاری کتوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

اسی دوران میں گولی چلنے کی آواز آئی جیسے کسی نے فرش پر بجلی کا بلب توڑ دیا ہو اور سپاہی ہال کے فرش پر ایک دوسرے کو اس طرح پٹخنیاں دینے لگے اور قلابازیاں کھانے لگے کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کتوں کے دو گروہ لڑ رہے ہوں۔ اس ہنگامے میں لوگ ایک دوسرے پر تیغوں سے وار کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے بال نوچ رہے تھے اور ایک دوسرے کے گلے گھونٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عورتیں دہشت کے مارے، زخم خوردہ سور کی طرح چنچناکر لڑنے والوں سے دور بھاگ کر ادھر ادھر بکھر گئی تھیں۔

چند منٹ کے اندر ہی پاولیوک اور اس کے ساتھیوں کے تمام ہتھیار چھین لئے گئے تھے۔ ان کو شکست فاش ہو چکی تھی۔ انہیں گھسیٹ کر ہال کے باہر سڑک پر دھکیل دیا گیا تھا۔

اس مارپیٹ میں پاولیوک کی جھبری سمور والی ٹوپی کہیں گم ہو گئی، اس کے چہرے پر کئی زخم لگے اور اس کے تمام ہتھیار چھن گئے۔ اس وقت وہ مارے غصے کے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ اور اس کے تمام ساتھی کود کود کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور سڑک پر سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے دور نکل گئے۔

محفل درہم برہم ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد کسی کی طبیعت رنگ رلیاں منانے کو نہیں چاہ رہی تھی۔ عورتوں نے ناچنے سے انکار کر دیا اور گھر واپس جانے پر اصرار کرنے لگیں۔ لیکن گولب بھلا کب سننے والا تھا۔

«دروازوں پر سنتری بٹھا دو» اس نے حکم دیا۔ «کوئی بھی ہال سے باہر نہیں جائے گا۔»

پالیانتسیا نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

«حضرات اور خواتین ناچ صبح تک جاری رہے گا» گولب نے تمام لوگوں کے احتجاج کا جواب دیتے ہوئے فیصلہ‌کن انداز میں کہا۔ «پہلا ناچ میں خود شروع کرتا ہوں۔»

سازندوں نے پھر اپنے ساز چھیڑے لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی اس رات محفل دوبارہ رنگ پر نہ آ سکی۔

کرنل صاحب پادری کی بیٹی کے ساتھ ناچتے ہوئے ابھی ہال کا ایک پورا چکر بھی نہ لگا پائے تھے کہ کچھ سنتری بھاگتے ہوئے ہال میں آئے اور انہوں نے چلاکر اعلان کیا:

«پاولیوک تھیٹر کے چاروں طرف گھیرا ڈال رہا ہے!»

اسی وقت سڑک کی طرف والی ایک کھڑکی ٹوٹی اور اس ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے چوکھٹے میں سے مشین گن کی نکٹی سی نال اندر داخل کر دی گئی۔ مشین گن کی نال انتہائی احمقانہ انداز سے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں کا پیچھا کر رہی ہے جو اس کے ڈر سے بھاگ بھاگ کر — جس طرح کوئی بھوت کو دیکھ‌کر بھاگتا ہے — ہال کے بیچ میں جمع ہو رہے تھے۔

پالیانتسیا نے چھت سے لٹکتے ہوئے ہزار کینڈل پاور کے بجلی کے بلب پر گولی چلائی اور بلب بم کی طرح پھٹ گیا۔ ہال میں کھڑے ہوئے تمام لوگوں پر ٹوٹے ہوئے کانچ کی بارش سی ہو گئی۔

ہال میں اندھیرا چھا گیا ۔ کسی نے باہر صحن سے چیخ کر کہا: «سب لوگ باہر نکل جائیں!» اور اس کے بعد گندی گالیوں کی بوچھار ہونے لگی ۔ عورتیں دہشت زدہ ہوکر پاگلوں کی طرح چیخیں مار رہی تھیں ۔ گولب ہال میں ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا اور چیخ کر حکم دیتا ہوا اپنے افسروں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو پوری طرح اپنے دماغوں کا توازن کھو بیٹھے تھے ۔ گولیاں چل رہی تھیں اور باہر صحن میں چیخ پکار مچی ہوئی تھی ۔ ان تمام آوازوں کے خلط ملط ہو جانے سے ایک ایسا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا جو ناقابل بیان ہے ۔ اس افراتفری کے عالم میں کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ کس وقت پالیانتسیا پیچھے کے دروازے سے ایک سنسان سڑک پر نکل گیا اور اپنی پوری رفتار سے بھاگتا ہؤا گولب کے ہیڈکوارٹر جا پہنچا ۔

آدھے گھنٹے کے اندر شہر میں باقاعدہ لڑائی شروع ہو چکی تھی ۔ مسلسل رائفلیں چلنے کی آواز سے اور بیچ بیچ میں مشین گنوں کی گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے رات کا سکوت بالکل غارت ہو گیا تھا ۔ شہر کے باشندے حواس باختہ ہوکر اپنے گرم آرام دہ بستروں کو چھوڑکر اٹھ کھڑے ہؤے اور کھڑکیوں کے شیشوں سے منھ لگاکر باہر جھانکنے لگے ۔

آخرکار گولیاں چلنے کی آواز کم ہوئی، صرف شہر کے باہر کی طرف ایک مشین گن سے رہ رہ کر گولیوں کی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی کتا بھونک رہا ہو ۔

افق پر شفق کی سرخی جھلکنے لگی تھی ۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی ۔

سارے شہر میں رفتہ رفتہ افواہ پھیل گئی کہ یہودیوں پر منظم طور پر ظلم توڑنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔ اور پھیلتے پھیلتے

یہ افواہ یہودیوں کی نیچی چھتوں والی چھوٹی چھوٹی ان جھونپڑیوں تک پہنچ گئی جن کی ٹیڑھی میڑھی کھڑکیاں نہ جانے کس طرح کچی دیواروں میں ٹکی ہوئی تھیں ۔ یہ جھونپڑیاں دریا کے کنارے واقع تھیں اور ان کی کھڑکیاں دریا کی طرف کھلتی تھیں ۔ ان بلوں میں جن کو گھر کہا جاتا تھا غریب یہودی نہ جانے کیسے گھس پل کر رہتے تھے ۔

جس چھاپہ خانے میں سرگئی بروژاک سال بھر سے زیادہ سے کام کر رہا تھا وہاں کے کمپوزیٹر اور دوسرے مزدور یہودی تھے ۔ ان کے اور سرگئی کے درمیان دوستی کے گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے ۔ وہ تمام لوگ ایک منظم کنبے کی طرح مل کر اپنے مالک مسٹر بلمشٹین کے خلاف لڑتے تھے ۔ اس خبیث صورت شخص کے چہرے پر کھا کھا کر چربی چڑھ گئی تھی ۔ چھاپےخانے کے مالک اور مزدوروں کے درمیان مسلسل جھگڑا چلتا رہتا تھا ۔ بلمشٹین ہمیشہ اس چکر میں رہتا تھا کہ خود زیادہ سے زیادہ رقم ہتھیا لے اور مزدوروں کو کم سے کم مزدوری دے ۔ مزدور کئی بار ہڑتال کر چکے تھے اور چھاپہ‌خانہ لگاتار دو دو تین تین ہفتے تک بند پڑا رہا تھا ۔ چھاپہ خانے میں چودہ مزدور کام کرتے تھے ۔ سرگئی جو ان میں سب سے کم‌عمر تھا دن میں بارہ گھنٹے ایک دستی پریس کا پہیہ گھمانے کا کام کرتا تھا ۔

آج سرگئی کو مزدوروں میں ایک عجیب سی بےچینی نظر آ رہی تھی، جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت آنے والی ہو ۔ پچھلے کئی مہینے سے جو کہ بہت خلفشار کے مہینے تھے، اس چھاپےخانے میں وقتاً فوقتاً عطامان اعلی کے فرمان چھاپنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہؤا تھا ۔

مینڈل نام کا ایک کمپوزیٹر، جو دق کا مریض تھا، سرگئی کو بلاکر ایک کونے میں لے گیا ۔

«تمہیں معلوم ہے نا کہ یہودیوں کو منظم طور پر ستانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں» اس نے اپنی مغموم آنکھوں سے اس لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سرگئی نے حیرت سے اس کی طرف سر اٹھاکر دیکھا۔

«نہیں مجھے تو اس کی ذرا بھی خبر نہیں۔»

مینڈل نے اپنا سوکھا ہؤا مریل ہاتھ سرگئی کے کندھے پر رکھ دیا اور پدرانہ لہجے اور رازدارانہ انداز میں کہا:

«انہیں ستانے کی تیاریاں تو ہو رہی ہیں اس میں کسی قسم کا شبہہ نہیں ہے۔ یہودیوں کو بری طرح پیٹا جائے گا۔ میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس مصیبت کے وقت تم اپنے ساتھیوں کی مدد کر سکتے ہو؟»

«یقیناً مجھ سے جو بھی مدد ہو سکے گی میں ضرور کروں گا۔ مینڈل بتاؤ میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟»

باقی تمام کمپوزیٹر بھی ان کی باتیں سننے کے لئے آکر وہاں جمع ہو گئے۔

«سریوژا تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ ہمیں تم پر پورا بھروسہ ہے اور کیوں نہ ہو آخر تمہارا باپ بھی تو ہماری ہی طرح مزدور ہے۔ تم لپک کر ذرا اپنے گھر چلے جاؤ اور اس سے پوچھ آؤ کہ کیا وہ اپنے گھر میں کچھ بوڑھیوں کو چھپا لے گا، یہ فیصلہ ہم لوگ پھر بعد میں کر لیں گے کہ کسے کسے وہاں بھیجا جائے۔ اور اپنے گھر پر یہ بھی دریافت کر لینا کہ وہ کچھ اور ایسے لوگوں کو جانتے ہیں یا نہیں جو ہماری یہی مدد کر سکیں۔ ابھی کچھ عرصے کے لئے یہ لٹیرے روسیوں پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔ لپک تو جاؤ سریوژا ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔»

«مینڈل تم مجھ پر پوری طرح بھروسہ رکھو، میں ابھی جاکر پاوکا اور کلمکا سے ملتا ہوں، ان کے گھروالے بھی ضرور کچھ لوگوں کو رکھ لیں گے۔»

«ذرا ٹھہرو» مینڈل نے سرگئی کو جو چل پڑنے کو تیار تھا، کسی قدر بےاطمینانی کے ساتھ روک کر کہا۔ «یہ پاوکا اور کلمکا کون ہیں؟ کیا تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو؟»

سرگئی نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سر ہلا دیا۔

«جانتا کیوں نہیں ہوں وہ دونوں میرے دوست ہیں۔ پاوکا کورچاگن کا بھائی ریلوے میں مستری ہے۔»

«اچھا کورچاگن» مینڈل کو اطمینان ہو گیا۔ «اسے تو میں بھی جانتا ہوں۔ پہلے ہم لوگ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ ہاں ہاں تم کورچاگن کے یہاں بھی پوچھ لینا۔ جاؤ بیٹا سریوژا اور جتنی جلدی ہو سکے جواب لےکر لوٹنا۔»

سرگئی تیر کی طرح سڑک پر نکل گیا۔

جس دن پاولیوک کے دستے اور گولب کے سپاہیوں کے درمیان جم کر لڑائی ہوئی تھی اس کے تیسرے دن یہودیوں پر مظالم شروع ہوئے۔

بری طرح شکست کھانے اور شپیتووکا سے نکال دئے جانے کے بعد پاولیوک نے اس شہر کے پاس پڑوس کا علاقہ چھوڑ دیا اور قریب ہی کے ایک دوسرے قصبہ پر قبضہ جماکر بیٹھ گیا۔ رات کو شپیتووکا کی لڑائی میں اس کے بیس آدمی مارے گئے تھے۔ گولب کے گروہ کو بھی تقریباً اتنا ہی نقصان ہوا تھا۔

مردوں کو اسی دن گاڑی پر لاد کر جلدی جلدی قبرستان پہنچا دیا گیا اور بلا کسی اہتمام کے اسی دن دفنا بھی دیا گیا تھا۔ کیوںکہ اس واردات کے سلسلے میں کسی قسم کی ڈینگ مارنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ دو عطامان ایک دوسرے سے سڑک کے آوارہ کتوں کی طرح لڑے تھے۔ اس حالت میں جنازے کا کوئی اہتمام ہونا بہت بےتکی سی بات ہوتی۔ اتنا ضرور ہوا کہ پالیانتسیا

اس واقعه کو بهت بڑھا چڑھاکر پیش کرنا چاهتا تها اور پاولیوک کو کمیونسٹ لٹیرا قرار دینا چاهتا تها - لیکن کمیٹی نے جس کا صدر پادری واسلی تها، اس پر اعتراض کیا -

اس جهڑپ سے گولب کی رجمنٹ میں کچهه بےاطمینانی سی پهیل گئی تهی - خصوصاً اس کے باڈی گارڈوں میں جنهوں نے سب سے زیاده نقصان اٹهایا تها - اس بےاطمینانی کو ختم کرنے اور سپاهیوں میں همت اور جوش پیدا کرنے کے لئے پالیانتسیا نے یه تجویز رکهی که سپاهیوں کی «تفریح کا انتظام» کرنے کے سلسلے میں یهودیوں کے خلاف مظالم شروع کر دئے جائیں - اس نے جس ڈهنگ سے گولب کے سامنے یه مسئله چهیڑا وه انسانیت سے قطعی خارج تها - اس نے یه دلیل پیش کی که سپاهیوں کی بےاطمینانی کو دیکهتے هوئے یه قدم قطعی لازمی هے اور حالانکه کرنل شراب خانے کے مالک کی بیٹی کے ساتهه اپنی شادی سے ایک دن قبل شهر کے امن اور سکون میں کسی قسم کا خلل نهیں ڈالنا چاهتا تها، لیکن آخرکار اسے بهی راضی هونا پڑا -

یه بهی سچ هے که اس منصوبے کو عمل میں لانے میں اس کی هچکچاهٹ کی ایک وجه یه بهی تهی که وه ابهی حال هی میں سوشلسٹ انقلابی پارٹی میں شریک هوا تها - وه ڈرتا تها که اس کے دشمن پهر اس پر کیچڑ اچهالنے کی کوشش کریں گے اور اسے یهودیوں کا قاتل کهه‌کر بدنام کریں گے - اس بات میں تو اسے کوئی بهی شبهه نهیں تها که وه «عطامان اعلی» کے سامنے اس کی بدگوئی کریں گے - لیکن ابهی تک خیریت یهی تهی که گولب «عطامان اعلی» کا بهت زیاده دست‌نگر نهیں تها کیونکه وه خود اپنا خرچ اٹهاتا تها - اس کے علاوه «عطامان اعلی» کو یه بهی بخوبی معلوم تها که اس کے خادموں میں کیسے کیسے بدمعاش بهرے هوئے تهے - اور اس نے خود بارها یه مطالبه کیا تها که شهریوں

سے وصول کی ہوئی نام نہاد فوجی رسد کا ایک حصہ اسے اپنے صدر دفتر کا خرچ چلانے کے لئے دیا جایا کرے۔ اور جہاں تک یہودیوں پر مظالم توڑنے کا سوال تھا تو اس سلسلے میں تو گولب پہلے ہی بہت شہرت حاصل کرچکا تھا۔ اب اس میں کسی قسم کا اضافہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

یہودیوں کے خلاف مظالم صبح سویرے سے ہی شروع کر دئے گئے۔

طلوع صبح سے پہلے جو دھندلا سا کہرا نظر آتا ہے وہ اب تک شہر پر چھایا ہوا تھا۔ یہودیوں کی بستی کے بےترتیب مکانوں کے گرد جو ویران سڑکیں لنن کی گیلی پٹیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں ان پر کسی قسم کی چہل پہل نہیں نظر آ رہی تھی۔ مضبوطی سے بند کی ہوئی اور پردوں سے اچھی طرح ڈھکی ہوئی کھڑکیاں اپنی اندھی آنکھوں سے باہر گھور رہی تھیں۔

باہر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پوری بستی صبح کی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی ہے۔ لیکن گھروں کے اندر نیند کا نام نشان بھی نہ تھا۔ پورے کے پورے کنبے باقاعدہ کپڑے پہن کر اپنے اپنے مکانوں کے ایک کمرے میں گھس‌پل‌کر بیٹھے ہوئے آنےوالی آفت کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ صرف بہت ہی چھوٹے بچے جو صورت حال کو سمجھہ ہی نہیں سکتے تھے اپنی ماؤں کی گود میں سکھہ کی نیند سو رہے تھے۔

گولب کے باڈی گارڈوں کا سردار سالومیگا بالکل کالا بھجنگ آدمی تھا اس کا چہرہ بنجاروں کی طرح سیاہ تھا اور اس کے گال پر تیغ کے زخم کا ایک بہت ہی گھناؤنا نشان تھا۔ اس دن صبح گولب کے ایڈیکانگ کو جگانے میں اسے بڑی محنت کرنا پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پالیانتسیا کو جاگنے میں بڑی تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ وہ رات بھر جو خوفناک خواب دیکھتا رہا تھا اس

کے اثر سے وہ اپنے آپ کو آسانی سے آزاد نہیں کر پایا — وہ عجیب طرح سے منھ بنائے، دانت نکالے کبڑا دیو ابھی تک اس کی گردن میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھا — آخرکار اس نے اپنا درد سے پھٹتا ہوا سر اٹھاکر سالومیگا کو دیکھا —

«اٹھ بے شرابی» سالومیگا اس کے کندھے پکڑکر اسے جھنجھوڑ رہا تھا — «کام شروع کرنے کا وقت نکلا جا رہا ہے اور تم پڑے سو رہے ہو — لگتا ہے رات کو ذرا زیادہ چڑھا گئے تھے —»

پالیانتسیا پوری طرح جاگ چکا تھا — وہ اٹھ‌کر بیٹھ گیا — سوزش جگر سے اس کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آ رہے تھے — اس نے اپنے منھ میں بھرا ہوا بدذائقہ تلخ لعاب تھوک دیا —

«کون سا کام؟» اس نے بالکل انجان کی طرح سالومیگا کی طرف دیکھا —

«ارے وہی ان یہودیوں کا قیمہ بنانا ہے نا — اور کون سا کام؟ اتنی جلدی بھول بھی گئے نا؟»

پالیانتسیا کو تمام باتیں یک بیک یاد آ گئیں — ہاں وہ سچ مچ ہی بھول گیا تھا — پچھلی رات حضور کرنل صاحب اپنی منگیتر اور چند جگری دوستوں کو لےکر جس فارم پر شب گذارنے کے لئے گئے تھے وہاں خوب زوروں پر شراب کے دور چلے تھے — یہ اسی کا اثر تھا —

گولب نے سہولت اسی میں دیکھی کہ جتنے عرصے تک یہودیوں سے نبٹا جائے اتنے عرصے کے لئے وہ شہر چھوڑکر کہیں باہر چلا جائے — کیوں‌کہ ایسی صورت میں وہ بڑی آسانی کے ساتھ بعد میں یہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی عدم‌موجودگی میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہوگی — اور اس عرصے میں پالیانتسیا کو اس بات کا موقع بھی مل جائےگا کہ اس کام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے — جہاں تک «تفریح» کا انتظام کرنے کا سوال تھا پالیانتسیا اس کام میں مہارت رکھتا تھا —

پالیانتسیا نے اپنے سر پر ایک بالٹی پانی اونڈیل لیا اور اس طرح اپنے حواس درست کرنے کے بعد وہ فوراً ہیڈکوارٹر میں ادھر ادھر بھاگ کر مختلف لوگوں کو حکم دینے لگا۔

سو باڈی گارڈوں کا ایک دستہ گھوڑوں پر سوار بالکل تیار کھڑا تھا۔ ہر قسم کی گڑبڑ کے امکان سے بچنے کے لئے پالیانتسیا نے اپنی دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ حکم جاری کردیا کہ مزدوروں کی بستیوں اور اسٹیشن اور شہر کے درمیان سنتری تعینات کر دئے جائیں۔ لیش چینسکی کے باغ میں سڑک کی طرف منھہ کرکے ایک مشین گن لگا دی گئی تاکہ اگر مزدور کسی قسم کی دخل اندازی کرنے کی ہمت کریں تو انہیں گولیوں سے بھون دیا جائے۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ایڈیکانگ اور سالومیگا بھی کودکر اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

«ذرا ٹھہرو! میں تو بالکل بھول گیا» پالیانتسیا نے یک بیک هڑبڑاکر کہا۔ تمام لوگ اس وقت تک روانہ ہو چکے تھے۔ «گولب کی شادی کے تحفے لانے کے لئے دو گاڑیاں تو لے آؤ۔ ها ها! یہ تو پرانا دستور هے کہ لوٹ کا پہلا مال کمانڈر کو اور پہلی لڑکی ها ها! اس کے ایڈیکانگ کو۔ یعنی خاکسارکو۔ سمجھے بدھو؟»

یہ آخری فقرہ سالومیگا سے کہا گیا تھا اس نے بڑی خفگی کے ساتھہ پلٹ کر اسے گھورا۔

«ارے مال تو اتنا ہوگا کہ سب کے لئے کافی ہوگا۔»

انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگاکر سڑک پر دوڑا دیا۔ ایڈیکانگ اور سالومیگا گھوڑ سواروں کی اس بےترتیب بھیڑ کی رهنمائی کر رهے تھے۔

جس وقت پالیانتسیا نے ایک دومنزلے مکان کے سامنے جس پر «فوکس کپڑے کے بیوپاری» کا زنگ آلود سائن بورڈ لگا ہوا تھا، گھوڑا روکا اسوقت کہر چھٹ چکا تھا۔

اس کی پتلی پتلی ٹانگوں والی بھوری گھوڑی گھبراکر سڑک کے پتھروں پر اپنے سم پٹکنے لگی۔

«انشاءاللہ ہم لوگ یہیں سے شروعات کریں گے» پالیانتسیا نے گھوڑے سے زمین پر کودتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے ارد گرد کھڑے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا:

«جوانوں اپنے گھوڑوں سے اتر پڑو، اب تماشہ شروع ہوتا ہے۔ میں قطعی نہیں چاھتا کہ اسوقت خون خرابہ ہو، اس کا بھی وقت آئے گا۔ جہاں تک لڑکیوں کا سوال ہے اگر تم سے ممکن ہو سکے تو شام تک کے لئے صبر سے کام لینا۔»

ایک شخص نے کھیسیں نکال کر کہا:

«لیکن حضور خورونڑی اگر دونوں راضی ہوں تو کیا حرج ہے؟»

اس بات پر چاروں طرف قہقہہ پڑ گیا۔ جس شخص نے یہ بات کہی تھی اسے بڑی تعریف کی نظروں سے دیکھ کر پالیانتسیا نے کہا:

«وہ تو الگ بات ہے۔ دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔»

پالیانتسیا دکان کے بند دروازے پر گیا اور اس نے اس پر زور کی ٹھوکر ماری لیکن شاہ بلوط کے مضبوط تختوں کے بنے ہوئے دروازے میں جنبش تک نہ ہوئی۔

دراصل ابتدا کرنے کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ پالیانتسیا نے اس عمارت کے دوسرے حصے کا رخ کیا اور فوکس کے رہنے کے مکان کے دروازے کی طرف روانہ ہوا۔ تمام وقت اس کا ھاتھ تیغ کے دستے پر تھا۔ سالومیگا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

مکان کے اندر سے لوگوں نے باھر پکی سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن لی تھی۔ جب یہ آواز دوکان کے سامنے پھونچ کر رک گئی اور دیواروں کو پار کرکے آدمیوں کے بولنے کی آواز آنے لگی تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یک بیک ان کے دلوں کی دھڑکن رک گئی ہو اور ان کے جسم پتھرا گئے ہوں۔

فوکس پیسے والا آدمی تھا وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کو لے کر دو دن پہلے ھی شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اپنی نوکرانی ریوا کو جو انیس سال کی ایک سیدھی سادی نیک سی لڑکی تھی، اپنے سامان کی حفاظت کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اتنے بڑے ویران مکان میں اکیلے رھنے سے گھبرا رھی ھے تو اس نے لڑکی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ان لوگوں کی واپسی تک کے لئے وہ اپنے والدین کو وھاں اپنے ساتھ رھنے کے لئے بلوا لے۔

اس پر جب ریوا نے دبی زبان سے احتجاج کرنے کی کوشش کی تو اس چالاک تاجر نے اسے یقین دلایا کہ جہاں تک امکان ھے یہودیوں کے خلاف کسی قسم کے مظالم نہیں کئے جائیں گے۔ کیونکہ آخر ان فقیروں کے پاس سے انہیں حاصل ھی کیا ھوگا۔ اس کے علاوہ اس نے ریوا سے یہ بھی وعدہ کیا واپسی پر وہ اسے ایک نیا لباس سلوا دے گا۔

اس وقت وہ تینوں لرزاں و ترساں دم سادھے بیٹھے تھے اور گو بظاھر اس کی کوئی امید نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ امید لگائے ھوئے تھے کہ گھوڑ سوار ان کے گھر سے آگے چلے جائیں گے۔

وہ سوچ رھے تھے کہ شائد ان کے سننے میں غلطی ھوئی ھو۔ شائد انہیں غلط اندازہ ھوا ھو کہ گھوڑے انہیں کے مکان کے آگے آکر رکے تھے۔ لیکن جب دوکان کے دروازے پر ایک ضرب لگی اور اس کی گھٹی ھوئی سی گونج ان کے کانوں تک پہنچی تو ان کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔

بوڑھا سفید بالوں والا پیساخ دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں ایک سہمے ھوئے بچے کی آنکھوں کی طرح پھٹی ھوئی تھیں۔ وہ ایک کٹر معتقد کے تمام تر جذبۂ ایمان کے ساتھ بدبدا کر قادر مطلق سے دعا مانگ رھا تھا۔ اس نے خدا سے دعا مانگی

کہ وہ اس کے گھر کو ہر مصیبت سے محفوظ رکھے۔ اس کے پاس ہی اس کی بڑھیا کھڑی تھی۔ بوڑھے کی دعا مانگنے کی بدبداھٹ کی وجہ سے وہ کچھ دیر تک ان قریب آتے ہوئے قدموں کی آھٹ بھی نہ سن سکی۔

ریوا بھاگ کر سب سے دور والے کمرے میں شاہ بلوط کی لکڑی کی بڑی سی الماری کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

دروازے پر ایک زبردست چوٹ ہوئی اور بوڑھا بڑھیا دونوں کانپ اٹھے۔

«دروازہ کھولو۔» دروازے پر ایک اور چوٹ پڑی جو پہلے کے مقابلے میں زیادہ سخت تھی۔ اور اس کے بعد گالیوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔

لیکن مکان کے اندر بند لوگ خوف کی وجہ سے بالکل بےحس ہو گئے تھے۔ دروازے کا کنڈا کھولنے کے لئے ان کے ھاتھ نہیں اٹھہ رہے تھے۔

باھر سے دروازے پر رائفلوں کے کندوں کی چوٹیں پڑتی رھیں، یہاں تک کہ دروازے کی چٹخنیاں ٹوٹ گئیں اور دروازہ جس کی ایک ایک چول ڈھیلی ہو گئی تھی چرمراکر کھل گیا۔

سارا مکان ہتھیاربند سپاھیوں سے بھر گیا جنہوں نے مکان کا کونا کونا چھان مارا۔ رائفل کے کندے کے ایک ھی وار میں دوکان میں جانے والا دروازہ ٹوٹ گیا اور پھر اندر سے جاکر دوکان کے سامنے والے دروازے کی چٹخنیاں کھول دی گئیں۔

لوٹ مار شروع ہو گئی۔

جب گاڑیاں کپڑے کے تھانوں، جوتوں اور دوسرے سامان سے اوپر تک بھر گئیں تو سالومیگا لوٹ کا یہ مال لےکر گولب کے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ جس وقت وہ لوٹ‌کر آیا اسے گھر کے اندر سے ایک چیخ سنائی دی۔

اپنے آدمیوں کو دوکان لوٹنے کے لئے چھوڑ کر پالیانتسیا دوکان کے مالک کے کمرے میں چلا گیا ۔ وہاں اس نے بوڑھے، بڑھیا اور اس کی لڑکی کو کھڑے دیکھا ۔ اپنی بن بلاؤ جیسی سبز آنکھوں سے انہیں گھور کر اس نے بوڑھے بڑھیا سے ڈپٹ کر کہا:

«نکل جاؤ یہاں سے تم دونوں!»

لیکن نہ باپ اپنی جگہ سے ہلا نہ ماں ۔

پالیانتسیا نے ایک قدم آگے بڑھ کر آہستہ آہستہ اپنی تیغ کھینچی ۔

«ماں!» لڑکی کے منھ سے جگردوز چیخ نکل گئی ۔ سالومیگا نے اسی چیخ کی آواز باہر سے سنی تھی ۔

پالیانتسیا اپنے آدمیوں کی طرف مڑا جو چیخنے کی آواز سن کر بھاگے ہوئے اندر آ گئے تھے ۔ «انہیں باہر نکال دو!» اس نے بھونک کر کہا اور بوڑھے بڑھیا کی طرف اشارہ کیا ۔ جب یہ کام پورا ہو گیا تو اس نے سالومیگا کو جو اس وقت تک موقع پر پہنچ چکا تھا حکم دیا «تم ذرا یہاں دروازے پر کھڑے رہو ۔ میں تب تک اس چھوکری سے دو باتیں کر لوں!»

لڑکی پھر چیخی، بوڑھا بیساخ دوڑ کر کمرے کے دروازے کی طرف لپکا لیکن اس کے سینے پر ایک اتنے زور کا گھونسہ پڑا کہ وہ چکرا کر دیوار سے ٹکرا گیا ۔ وہ درد سے بے حال ہو گیا تھا ۔ لڑکی کی بوڑھی ماں ٹوئیبا جو ویسے تو بہت خاموش اور دبی ہوئی رہتی تھی یک بیک سالومیگا پر اس طرح ٹوٹ پڑی جیسے کسی بھیڑیے کی مادہ اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے دشمن پر ٹوٹ پڑتی ہے ۔

«مجھے اندر جانے دو! تم لوگ میری بچی کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟»

وہ دروازے تک پہنچنے کے لئے سخت جدوجہد کر رہی تھی
اور لاکھہ کوشش کرنے پر بھی سالومیگا اس کی ضعیف انگلیوں کی
تشنجی گرفت سے اپنا کوٹ نہ چھڑا سکا ۔

شدید درد اور دھکے کے اثر سے کم ہوتے ھی پیساخ بھی ٹوئی با
کی مدد کو لپکا ۔

«ھمیں اندر جانے دو! ھمیں اندر جانے دو! ھائے میری بچی!»

بوڑھے بڑھیا نے مل کر سالومیگا کو دروازے کے سامنے سے
ھٹا دیا ۔ غصے سے پاگل ھوکر سالومیگا نے جھٹکے کے ساتھہ اپنا
ریوالور پیٹی کے اندر سے نکال لیا اور اس کی فولاد کی موٹھہ
سے بوڑھے کے سفید بالوں والے سر پر ایک بھر پور وار کیا ۔
پیساخ وھیں فرش پر ڈھیر ھو گیا ۔

کمرے کے اندر ریوا چیخ رھی تھی ۔

جس وقت ٹوئی با کو گھسیٹ کر مکان سے باھر نکالا گیا اس
وقت تک وہ بالکل پاگل ھو چکی تھی اور ساری سڑک اس کی
دردناک چیخوں اور مدد کی فریادوں سے گونج رھی تھی ۔

مکان کے اندر بالکل خاموشی تھی ۔

پالیانتسیا کمرے سے باھر نکلا، سالومیگا پر نظر ڈالے بغیر
جس کا ھاتھہ اس کے باھر نکلتے ھی دروازے کے ھینڈل پر پہنچ
گیا تھا، اس نے اسے اندر جانے سے روک دیا :

«اندر جانے سے اب کوئی فائدہ نہیں ۔ میں نے تکیے سے اس کی
آواز گھونٹنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں اس کا دم نکل
گیا ۔» پیساخ کی لاش کو پار کرنے کے لئے جب اس نے آگے قدم
رکھا تو اس کا پاؤں ایک سیاہ چپ چپے ملبے پر پڑا ۔

«شروعات کچھہ اچھی نہیں ھوئی» اس نے باھر جاتے ھوئے
بڑبڑا کر کہا ۔

باقی تمام لوگ بھی بغیر ایک لفظ کہے اس کے پیچھے ھولئے

اور اپنے پیچھے فرش اور زینے پر خون آلود قدموں کے نشان چھوڑ گئے۔

شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ لٹیروں میں لوٹ کے مال کی تقسیم پر آپس میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ اور جابجا وہ ایک دوسرے سے جنگلی جانوروں کی طرح لڑنے لگتے تھے۔ کہیں کہیں تو تیغیں تک کھنچ جاتی تھیں۔ اور گھونسے بازی پر تو جیسے کوئی پابندی ھی نہیں تھی۔ بیر کی دوکان سے پچیس پچیس گیلن والے پیپے لڑھکا کر فٹ پاتھ پر لائے جا رہے تھے۔

کچھ عرصہ بعد لوٹنے والوں نے یہودیوں کے گھروں پر حملہ شروع کر دیا۔

کسی نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ انہوں نے کمروں کی تلاشی لی، جلدی جلدی ایک ایک کونا چھان مارا اور لوٹ کا مال لادکر چل دئے۔ اپنے پیچھے وہ کپڑوں اور چیتھڑوں کے انبار چھوڑ گئے۔ انہوں نے گدوں اور تکیوں تک کو پھاڑ پھاڑکر تلاشی لی تھی۔ ان گدوں اور تکیوں میں بھرے ہوئے چڑیوں کے پر ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ پہلے دن صرف دو جانیں گئیں: ایک ریوا کی اور ایک اس کے باپ کی۔ لیکن رات کی آمد کے ساتھ، کشت و خون کا لازمی خطرہ بھی قریب آتا جاتا تھا۔

شام ہوتے ہوتے ان گیدڑوں کا گروہ شراب کے نشے میں غرق ہو چکا تھا۔ پیتلورا کی فوج کے سپاھی پاگلوں کی طرح رات کا انتظار کر رہے تھے۔

رات کی تاریکی نے ان پر سے رھی سہی بندشیں بھی ھٹا دیں۔ رات کے گھپ اندھیرے میں انسانوں کا خون کرنا زیادہ آسان ہوتا ھے۔ گیدڑ بھی رات ھی کے وقت شکار کو نکلتے ھیں۔

شاید ھی کوئی ایسا شخص ھوگا جو ان دو خوفناک راتوں اور تین دنوں کے واقعات کو بھول سکے۔ وہ لوگ اپنے پیچھے نہ جانے کتنے لوگوں کو اپاھج اور شکستہ کر کے چھوڑ گئے تھے۔ کتنے

نوجوانوں کے بال خونریزی کے ان چند گھنٹوں میں سفید ہو گئے تھے۔ کتنے تلخ آنسو بہائے گئے تھے اس مختصر سے عرصے میں! یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ لوگ زیادہ خوش قسمت تھے جو خود تو ابھی تک زندہ تھے لیکن جن کی روحیں ویران ہو چکی تھیں، جو شرم اور ذلت کی اذیت برداشت کر رہے تھے، جنہیں ایک ناقابل بیان غم اندر ہی اندر کھوکھلا کئے دے رہا تھا۔ اپنے ان پیارے عزیزوں کا غم جو اب لوٹ کر نہ آ سکتے تھے۔ ان تمام باتوں سے بے خبر اور بے نیاز دوشیزہ لڑکیوں کی زخم خوردہ ستم آشنا اور شکستہ لاشیں شدید کرب کے انداز میں اپنے ہاتھ پیچھے کی طرف پھیلائے ہوئے تنگ گلیوں میں جابجا پڑی تھیں۔

دریا کے کنارے ایک جھونپڑی میں ناؤم لوہار رہتا تھا۔ ان گیلڑوں نے اس کی نوجوان بیوی سارا پر حملہ کیا۔ لیکن صرف وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ان موذیوں کے دانت کھٹے کر دئے گئے۔ وہ لوہار ایک چوبیس سالہ کڑیل جوان تھا۔ اس کے پٹھے فولاد کی طرح مضبوط تھے جیسے کہ صرف اسی شخص کے ہو سکتے ہیں جو اپنی روزی کمانے کے لئے ہتوڑا چلاتا ہو۔ اس نے انہیں اپنی بیوی کو ہاتھ تک لگانے نہیں دیا۔

اس چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک مختصر لیکن خوفناک ٹکر کے دوران میں دو پیتلورا سپاہیوں کی کھوپڑیاں سڑے ہوئے تربوزوں کی طرح کھول دی گئیں۔ ایک ایسے شخص کے انتہائی جلال کے ساتھ جس کا سب کچھ داؤ پر لگا ہو، وہ لوہار دو جانوں کی حفاظت کے لئے لڑ رہا تھا۔ دریا کے کنارے سے بڑی دیر تک رائفل کی گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دیتی رہی، جہاں اب یہ لٹیرے خطرے کا احساس کرکے بھاگ کر پہنچ لئے تھے۔ جب اس لوہار کے پاس صرف ایک گولی رہ گئی تو اس نے اپنی بیوی پر ترس کھاکر اسے گولی مار دی اور پھر ہاتھ میں سنگین لےکر اپنی

موت کا مقابلہ کرنے کو چل پڑا ۔ دفعتاً گولیوں کی بوچھار ہوئی اور اس کا طاقتور جسم اس کی جھونپڑی کے سامنےوالے دروازے کے باہر ڈھیر ہو گیا ۔

آس پاس کے گاؤں سے خوش حال کسان اپنی گاڑیوں پر شہر آئے ۔ ان گاڑیوں کو کھینچنےوالے گھوڑوں کی کھلائی پلائی اچھی کی گئی تھی ۔ انہیں جو بھی چیز پسند آئی انھوں نے اپنی گاڑی میں بھری اور گولب کی فوج میں ملازم اپنے بیٹوں یا رشتہداروں کے تحفظ میں جلدی جلدی گھر کی طرف روانہ ہوئے تاکہ شہر کا ایک آدھ چکر اور لگا سکیں ۔

سریوژا بروژاک نے اپنے باپ کی مدد سے اپنے چھاپہ خانے کے تقریباً آدھے مزدوروں کو تہ خانے اور اوپر والی کوٹھڑی میں چھپا دیا تھا ۔ وہ باغ کے راستے سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اتنے میں اس نے دیکھا کہ ایک شخص پیوند لگا ہؤا لمبا سا کوٹ پہنے ہوئے اپنے ہاتھوں کو تیزی سے جھلاتا ہوا سڑک پر بھاگا جا رہا ہے ۔

وہ ایک بوڑھا یہودی تھا ۔ اس ننگے سر ہانپتے ہوئے بوڑھے کے پیچھے جس کا چہرہ موت کے خوف سے بالکل زرد پڑ گیا تھا، پیتلورا فوج کا ایک سپاہی بھورے رنگ کے گھوڑے پر سوار سرپٹ بھاگا چلا آ رہا تھا ۔ ان کے درمیان کا فاصلہ بڑی تیزی کے ساتھ کم ہوتا گیا اور بوڑھے کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑ سوار زین پر بیٹھے بیٹھے ہی آگے کی طرف جھکا کہ اپنے شکار کا کام تمام کر دے ۔ اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر بوڑھے نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا دئے جیسے وہ وار کو روکنا چاہ رہا ہو ۔ اسی دم سریوژا لپک کر سڑک پر پہنچ گیا اور بوڑھے کی حفاظت کی غرض سے گھوڑے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ۔

«خبردار جو اس پر ہاتھ اٹھایا ۔ لٹیرے ذلیل کتے!»

گھوڑ سوار نے اپنی تیزی سے نیچے کی طرف آتی ہوئی تیغ کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی اور تیغ الٹی طرف سے لڑکے کے سنہرے بالوں والے سر پر جا گری۔

پانچواں باب ۵

سرخ فوجیں «عطامان اعلیٰ» پیتلورا کے دستوں پر تیزی کے ساتھ چڑھی آ رہی تھیں۔ اس لئے گولب کی رجمنٹ کو مورچہ پر طلب کر لیا گیا۔ شہر میں صرف ایک چھوٹا سا حفاظتی دستہ اور کمانڈینٹ کے ملازم چھوڑ دئے گئے۔

لوگوں میں حرکت پیدا ہو گئی۔ اس عارضی سکوت کا فائدہ اٹھا کر شہر کے یہودیوں نے اپنے عزیزوں کے کفن دفن کی رسم ادا کی اور یہودی بستیوں کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں ایک بار پھر زندگی لوٹ آئی۔

شام کی خاموشی میں کہیں دور سے ایک موہوم سی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہاں سے تھوڑی ہی دور پر کہیں لڑائی ہو رہی تھی۔

اسٹیشن پر ریلوے کے مزدور اپنی نوکریاں چھوڑ چھوڑ کر کام کی تلاش میں دیہات کی طرف جا رہے تھے۔

ثانوی مدرسہ بند کر دیا گیا تھا۔

شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔

وہ بہت ہی تاریک اور بھیانک رات تھی۔ ایسی رات جب کہ آنکھیں لاکھ کوشش کرنے پر بھی تاریکی کو نہیں چیر پاتیں اور آدمی اندھوں کی طرح اپنا راستہ ٹٹولتا ہے اور اسے ہر دم یہ

خدشہ لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب اس کا پاؤں کسی کھائی میں جا پڑے اور اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے۔

ہر باعزت شہری اس بات کو جانتا ہے کہ ایسے وقت گھر پر اندھیرے میں بیٹھے رہنا زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ اگر اس کا بس چلتا ہے تو وہ گھر میں روشنی بھی نہیں کرتا کہ کہیں روشنی دیکھ کر کوئی ناخوشگوار مہمان نہ آ جائے۔ اس سے تو اندھیرا ہی بہتر۔ اندھیرے میں آدمی زیادہ محفوظ رہتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاؤں میں چکر ہوتا ہے۔ خیر وہ جہاں جی چاہے گھومیں باعزت شہری کو اس سے کیا لینا۔ لیکن وہ خود باہر نکلنے کی جرائت نہیں کر سکتا، چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے۔

وہ ایسی ہی ایک رات تھی۔ لیکن ایک شخص اس وقت بھی اپنے گھر سے باہر تھا۔

کورچاگن کے گھر پہنچ کر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ کھڑکی پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آنے پر اس نے دوبارہ دستک دی، ابکی بار زیادہ زور اور اصرار کے ساتھ۔

پاویل خواب میں دیکھ رہا تھا کہ ایک عجیب مخلوق جسے کسی طرح انسان نہیں کہا جا سکتا تھا، اس پر مشین گن کا نشانہ لگا رہی ہے۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن بھاگ کر جانے کے لئے کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ اور مشین گن کی گولیوں کی ایک خوفناک تڑتڑاہٹ شروع ہو گئی تھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ کوئی شخص کھڑکی کو بھڑبھڑا رہا ہے۔ کوئی دستک دے رہا تھا۔

پاویل تیزی سے بستر سے اٹھا اور یہ دیکھنے کے لئے جلدی سے کھڑکی کے پاس گیا کہ وہ کون آدمی ہے۔ لیکن وہ صرف اتنا دیکھ پایا کہ ایک سیاہ مبہم سی شکل وہاں کھڑی ہے۔

وہ گھر میں اکیلا ہی تھا۔ اس کی ماں اس کی سب سے بڑی بہن سے ملنے گئی ہوئی تھی جس کا شوہر شکر کے کارخانے میں میکینک تھا۔ اور آرتیم قریب کے ایک گاؤں میں لوہار کا کام کرتا تھا۔ اپنا پیٹ پالنے کے لئے ہتوڑا چلاتا تھا۔

لیکن آرتیم کے علاوہ اور ہو بھی کون سکتا تھا۔

پاویل نے کھڑکی کھول دینے کا فیصلہ کیا۔

«کون ہے؟» اس نے اندھیرے میں پوچھا۔

کھڑکی کے باہر کچھ حرکت سی ہوئی اور ایک دبی ہوئی بھاری آواز نے جواب دیا:

«میں ہوں ژوخرائی۔»

دو ہاتھ آکر کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹک گئے اور پھر فیودور کا سر اوپر کی طرف اٹھتا ہؤا پاویل کے چہرے کی سطح میں آ گیا۔

«میں رات بھر کے لئے یہاں ٹھہرنے آیا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے دوست؟» ژوخرائی نے چپکے سے کہا۔

«اعتراض کیا ہو سکتا ہے» پاویل نے گرمجوشی سے جواب دیا۔ «تمہارا اپنا گھر ہے جب چاہو آ سکتے ہو۔ ادھر ہی سے اندر آ جاؤ۔»

فیودور نے بڑی مشکل سے کسی طرح اپنا بھاری بھرکم جسم کھڑکی کے راستے اندر داخل کیا۔

اس نے کھڑکی بند کر دی۔ لیکن فوراً کھڑکی کے پاس سے ہٹا نہیں۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ اور جب ایک بادل کے ٹکڑے کے پیچھے سے چاند باہر نکلا اور سڑک صاف نظر آنے لگی تو اس نے بڑے غور سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر وہ پاویل سے مخاطب ہوا:

«ہم لوگ تمہاری ماں کو نہیں جگائیں گے کیوں ٹھیک ہے نا؟»

پاویل نے اسے بتایا کہ گھر پر اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس بات سے اس ملاح کو اور بھی اطمینان ہو گیا اور وہ زیادہ زور سے بولنے لگا:

«یار یہ ظالم تو ہاتھ دھوکر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اس دن اسٹیشن والے واقعہ کے بعد سے انہوں نے مجھے تاک لیا ہے۔ اگر ہمارے ساتھی ذرا بھی منظم ہوکر مقابلہ کرتے تو یہودیوں پر ہونے والے حملے کے وقت ان سورماؤں کو مزا چکھا دیتے۔ لیکن تم جانتے ہی ہو کہ لوگ ابھی آگ میں کودنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے ہم کچھ بھی نہیں کر سکے۔ اب وہ مجھے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ دو بار وہ جال بچھا چکے ہیں۔ آج تو میں بالکل بال بال بچ گیا۔ بات یہ ہوئی کہ میں گھر جا رہا تھا، اس پیچھے والی سڑک سے۔ راستے میں بس یونہی ادھر ادھر ایک نظر ڈال لینے کی غرض سے میں شیڈ کے پاس ٹھہرا ہی تھا کہ اتنے میں دیکھتا کیا ہوں کہ ایک درخت کے پیچھے سے ایک سنگین باہر کی طرف نکلی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے میں دیوانہ وار بھاگا اور سیدھا تمہارے گھر کا رخ کیا۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کچھ دنوں کے لئے یہیں لنگر ڈال دوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ بہت اچھا۔»

ژوخرائی کا دم ابھی تک پھول رہا تھا اس نے اپنے کیچڑ میں سنے ہوئے بوٹ اتارنا شروع کئے۔

پاویل اس کے آنے سے بے حد خوش تھا۔ بجلی گھر پچھلے کچھ دنوں سے ٹھپ پڑا تھا۔ اور اس ویران گھر میں پاویل کو تنہائی بہت ستاتی تھی۔

وہ دونوں پلنگ پر لیٹ گئے۔ پاویل تو لیٹتے ہی سو گیا۔ لیکن فیودور لیٹے لیٹے بڑی دیر تک سگریٹ پیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور ننگے پاؤں پنجوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی کے پاس

جاکر بڑی دیر تک باہر سڑک کو تکتا رہا۔ آخرکار تھک کر وہ بھی لیٹ کر سو گیا۔ لیکن اس کا ایک ہاتھ مستقل اپنے بھاری «کولٹ» پستول کے دستے پر تھا۔ جسے اس نے اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اس کے جسم کی حرارت مسلسل پستول کو گرمی پہنچا رہی تھی۔

اس رات غیرمتوقع طور پر ژوخرائی کا آنا اور پاویل کے ساتھ آٹھ دن تک رہنا پاویل کی زندگی میں بہت اہم ثابت ہؤا۔ ان آٹھ دنوں نے پاویل کی زندگی کے دھارے کو بالکل ہی بدل دیا۔ اس ملاح نے پاویل کو پہلی بار ان باتوں سے آشنا کیا جو اس کے لئے بالکل نئی، اہم اور دل میں ہلچل پیدا کر دینے والی تھیں۔

ژوخرائی کو گرفتار کرنے کے لئے دو بار جو جال بچھایا گیا تھا اس کی وجہ سے اس کا حال چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کا سا ہو گیا تھا۔ اور اس نے اس جبری بیکاری کا فائدہ اٹھا کر پراشتیاق پاویل کے دل میں بھی زرد اور نیلے پرچم والوں کے خلاف جو اس علاقے کی گردن پر سوار ہوکر اس کا گلا گھونٹے دے رہے تھے، وہی شدید نفرت اور غصہ بھر دیا جو خود اس کے دل میں تھا۔

ژوخرائی اپنی بات بہت واضح، آسان اور سیدھے سادے الفاظ میں پیش کرتا تھا۔ اس کے ذہن میں کسی قسم کے شبہات نہیں تھے۔ اس کے سامنے اس کا راستہ بالکل صاف تھا۔ رفتہ رفتہ پاویل اس بات کو سمجھنے لگا کہ رعب دار ناموں والی سیاسی پارٹیوں کا یہ گورکھ دھندا — سوشلسٹ انقلابی، سوشلسٹ ڈیماکریٹ، پولستانی سوشلسٹ وغیرہ — محض مزدوروں کے بدترین دشمنوں کا ایک جمگھٹ تھا اور بالشویک پارٹی ہی وہ واحد انقلابی پارٹی تھی جو ڈٹ کر زرداروں کے خلاف لڑتی تھی۔

اس سے قبل پاویل کے ذہن میں ان تمام باتوں کے بارے میں شدید الجھاؤ تھے۔

اور اس طرح اس ثابت قدم شیردل بالٹک ملاح نے جو بحری طوفانوں کے تھپیڑے جھیل چکا تھا، جو پرانا منجھا ہؤا بالشویک تھا اور ۱۹۱۵ء سے روسی سوشل ڈیماکریٹک لیبر پارٹی (بالشویک) کا رکن تھا، پاویل کو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے روشناس کرایا اور بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والا وہ نوجوان مسحور سا ہوکر اس کی باتیں سنتا رہا۔

ژوخرائی نے کہا «دوست جب میں نوجوان تھا تب میں بھی کچھ کچھ تمہاری ہی طرح تھا۔ میری بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر میں اپنی قوت کہاں خرچ کروں۔ میں بہت ہی بےقرار قسم کا نوجوان تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں ٹانگ اڑائے رکھتا تھا۔ میں نے بہت ہی غریبی کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اور کبھی کبھی تو شہر کے شرفاء کے لاڈ میں بگڑے ہوئے ان پیٹ بھرے بیٹوں کو دیکھ‌کر ہی میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ اکثر میں اچھی طرح ان کی مرمت بھی کر دیتا تھا۔ لیکن اس سب کے بدلے میں مجھے اپنے باپ کی مار کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہ ہوتا تھا۔ اکیلے اپنے دم پر لڑکر حالات کو بدلا نہیں جا سکتا۔ پاولوشا تم میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کی مدد سے تم مزدوروں کے نصب العین کے لئے لڑنے والے ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ابھی تم بہت کم عمر ہو اور طبقاتی جدوجہد کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے ہو۔ لیکن دوست میں تمہیں صحیح راستے پر لگا دوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم بہت جلد سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔ مجھے مطمئن رہنے والے، خاموش قسم کے لوگوں سے سخت چڑ ہے۔ آج تمام دنیا میں آگ لگی ہؤی ہے۔ غلام بیدار ہو گئے ہیں اور اب پرانے نظام زندگی

کو جڑ سے اکھاڑ دینا ضروری ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں باہمت لوگوں کی ضرورت ہے، ایسے بزدلوں کی نہیں جو لڑائی شروع ہوتے ہی چوہوں کی طرح بھاگ کر اپنے بلوں میں چھپ جائیں گے۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن میں جرأت ہو اور جو بلا کسی مروت کے دشمن پر وار کر سکیں۔»

یہ کہہ کر اس نے میز پر مکا مارا۔

اس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنی دونوں جیبوں کی گہرائی میں ہاتھ ڈال کر کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگانے لگا۔

اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے وہ بہت نالاں تھا۔ اسے اس شہر میں رک جانے کا سخت افسوس تھا۔ اس لئے یہ سوچ کر کہ اب یہاں اور زیادہ دن تک پڑے رہنا بے سود تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جنگی مورچہ کو پار کرتا ہوا سرخ فوج کے دستے میں جا ملے گا۔

شہر میں کام جاری رکھنے کے لئے پارٹی کے نو عمر ممبروں کا ایک جتھہ رہ جائے گا۔

«وہ لوگ میرے بغیر بھی کام چلا سکتے ہیں۔ میں یہاں اب اور زیادہ دن تک بےکار نہیں پڑا رہ سکتا۔ یوں ہی دس مہینے خراب کر چکا ہوں» ژوخرائی نے جھنجھلا کر دل میں کہا۔

«ژوخرائی تم دراصل کیا ہو؟» پاویل نے اس سے ایک بار پوچھا۔

سوال سن کر ژوخرائی اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال لئے۔ شروع میں تو وہ اس سوال کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔

«تمہیں نہیں معلوم؟»

«میرا خیال ھے کہ تم یا تو بالشویک ھو یا کمیونسٹ» پاویل نے دبی زبان میں کہا —

ژوخرائی قہقہہ لگاکر ھنس پڑا اور اس نے کسی ھوئی دھاری دار جرسی میں ملبوس اپنے بھاری بھرکم سینے کو زور سے پیٹا —

«تم بالکل ٹھیک سمجھے دوست — تمہارا قیاس بالکل درست ھے — لیکن یہ بات بھی اتنی ھی درست ھے کہ کمیونسٹ اور بالشویک دونوں ایک ھی ھوتے ھیں —» یک بیک وہ سنجیدہ ھو گیا — «لیکن چوں‌کہ تم نے اتنا زیادہ اندازہ لگا لیا ھے تو یہ بھی یاد رکھنا کہ کسی سے یا کسی جگہ اس بات کا ذکر مت کرنا — نہیں تو میں پھنس جاؤں‌گا اور جیل میں بندکر دیا جاؤں‌گا — سمجھے؟»

«میں جانتا ھوں» پاویل نے مضبوطی سے جواب دیا —

اتنے میں صحن میں کچھہ آوازیں سنائی دیں اور دستک کے بغیر ھی دروازہ کھل گیا — ژوخرائی کا ھاتھہ فوراً اس کی جیب میں گیا — لیکن جب سرگئی بروزاک اور اس کے پیچھے والیا اور کلمکا کمرے میں داخل ھوئے تو اس نے اپنا ھاتھہ جیب سے نکال لیا — سرگئی بہت دبلا ھو گیا تھا اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا — اس کے سر پر ابھی تک پٹی بندھی ھوئی تھی —

«کہو استاد» سرگئی نے پاویل سے ھاتھہ ملاتے ھوئے مسکرا کر کہا — «ھم تینوں نے سوچا چلو تم سے مل آئیں — والیا مجھے اکیلے باھر آنے نہیں دیتی تھی اور کلمکا کو والیا کے اکیلے جانے سے ڈر لگتا تھا — کلمکا کا سر بھلے ھی لال ھو، لیکن وہ جانتا ھے کہ اسے کیا کرنا چاھئے!»

والیا نے انتہائی شوخی کے ساتھہ اپنا ھاتھہ سرگئی کے منھہ پر رکھہ دیا —

«چل باتونی کہیں کا» اس نے ھنس‌کر کہا — «نہ جانے آج

کیوں کلمکا کے پیچھے پڑ گیا ہے۔» کلمکا نے خوش مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے کھیسیں نکال دیں۔ اس کے موتیوں جیسے سفید دانتوں کی بتیسی چمک اٹھی۔

«ایسے بیمار آدمی کا کوئی کرے بھی کیا؟ دیکھو نا اس کا تو بھیجا ہی پلپلا ہو گیا ہے۔»

وہ سب ہنس پڑے۔

تیغ کے وار سے سرگئی کے جو زخم لگا تھا اس کے اثرات سے وہ ابھی پوری طرح پنپ نہیں پایا تھا۔ وہ پاویل کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ان نوجوانوں میں پرجوش گفتگو کا سلسلہ چھڑ گیا۔ سرگئی جو عموماً بہت ہنس مکھ اور بشاش رہتا تھا اس وقت خاموش اور بجھا بجھا سا تھا۔

اس نے ژوخرائی کو پیتلورا سپاہی کے ساتھ اپنی ٹکر کی پوری واردات سنائی۔

ژوخرائی ان تینوں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو جانتا تھا کیوں کہ وہ کئی بار بروژاک کے گھر جا چکا تھا۔ اسے یہ لوگ بہت پسند تھے۔ حالاں کہ جدوجہد کے اس گرداب میں وہ ابھی تک اپنی مناسب جگہ تلاش نہیں کر پائے تھے لیکن ان میں ان کے طبقے کی آرزوئیں بہت نمایاں طور پر موجود تھیں۔ اس نے بڑی دلچسپی سے ان نوجوانوں کی یہ داستان سنی کہ انہوں نے کس طرح یہودیوں کو مظالم سے بچانے کے لئے انہیں اپنے گھروں میں چھپا نے میں مدد دی تھی۔ اس دن شام کو اس نے ان نوجوانوں کو لینن اور بالشویکوں کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں اور اس طرح یہ سمجھنے میں ان کی مدد کی کہ ان کے چاروں طرف دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

پاویل نے جب اپنے مہمانوں کو رخصت کیا اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی۔

ژوخرائی روز شام کو کہیں باہر چلا جاتا تھا اور بہت رات گئے واپس لوٹتا تھا۔ شہر چھوڑنے سے پہلے اسے ان ساتھیوں سے جو اس کے پیچھے شہر میں رہنے والے تھے مشورہ کرکے یہ طے کرنا تھا کہ انہیں کیا کیا کام انجام دینے ہوں گے۔

اس دن رات کو ژوخرائی واپس نہیں لوٹا۔ صبح جب پاویل سوکر اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس ملاح کا بستر جوں کا توں پڑا تھا اور وہ ایک نظر میں سمجھ گیا کہ رات اس پر کوئی سویا نہیں تھا۔

ایک موہوم سے اندیشے سے پریشان ہوکر اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور گھر سے باہر نکل گیا۔ دروازے میں تالا لگاکر اس نے چابی مقررہ جگہ پر رکھ دی اور کلمکا کے گھر کی طرف روانہ ہوا کہ شاید اسے فیودور کی کچھ خبر ہو۔ کلمکا کی ماں جو گٹھے ہوئے بدن کی عورت تھی اور جس کے چوڑے چہرے پر چیچک کے داغ تھے، کپڑے دھو رہی تھی۔ پاویل کے اس سوال پر کہ کیا اسے اس بات کا علم ہے کہ فیودور کہاں ہے اس نے تنک کر جواب دیا:

«تمہارا خیال ہے کہ جیسے اس کے علاوہ مجھے کوئی کام ہی نہیں ہے کہ میں تمہارے فیودور کی خبر رکھتی پھروں۔ یہ سب اسی کا کارن ہے — خدا غارت کرے اسے — کہ زوزولیخا کے گھر کو تہ و بالا کر دیا گیا۔ تجھے اس سے کیا کام ہے؟ مجھے تو سچ پوچھو تو وہ عجیب سا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کلمکا اور تم اور باقی سب لوگ بھی بس...» وہ غصے سے پھر کپڑے دھونے کی ناند کی طرف متوجہ ہو گئی۔

کلمکا کی ماں ایک بدمزاج عورت تھی، اور اس کی زبان بھی بڑی تیز تھی...

کلاکا کے گھر سے پاویل سرگئی کے یہاں گیا۔ وہاں بھی اس نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

«تم اتنا پریشان کیوں ہوتے ہو؟» والیا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ «رات وہ شاید اپنے کسی دوست کے یہاں رہ گیا ہوگا۔» لیکن اس کے الفاظ میں اعتماد کی کمی تھی۔

پاویل اتنا بےقرار تھا کہ بروژاک کے یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا اس کے لئے قطعی ناممکن تھا۔ اور حالانکہ ان لوگوں نے اس سے کھانا کھانے کے لئے رکنے پر بہت اصرار کیا لیکن وہ وہاں سے چلا ہی آیا۔

اس امید پر وہ پھر گھر واپس آیا کہ شاید ژوخرائی لوٹ آیا ہو۔

دروازے میں تالا پڑا ہؤا تھا۔ کچھہ دیر تک پاویل باہر اداس کھڑا رہا۔ اس ویران گھر میں داخل ہونے کا تصور بھی اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

چند منٹ تک وہ باہر صحن میں اپنے خیالات میں گم کھڑا رہا پھر یک بیک کچھہ سوچ کر وہ سائبان میں چلا گیا اور اوپر چڑھہ کر چھت کے جالے صاف کرکے وہ اس خفیہ جگہ پہنچ گیا اور چیتھڑوں میں لپٹا ہؤا وزنی «مین لیکر» پستول نکال لایا۔

سائبان سے نکل کر وہ سیدھا اسٹیشن گیا۔ جیب میں رکھے ہوئے ریوالور کے بوجھہ سے وہ ایک عجیب سی مسرت محسوس کر رہا تھا۔

لیکن اسٹیشن پر بھی ژوخرائی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ واپس آتے وقت جب وہ ناظم جنگلات کے باغ کے قریب پہنچا جس سے وہ اب بخوبی واقف ہو چکا تھا تو اس کے قدم خود بخود دھیمے پڑ گئے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کس چیز کی توقع میں اس نے اس مکان کی کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ لیکن باغ ھی

کی طرح مکان میں بھی کسی قسم کی زندگی کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔ جب وہ باغ سے آگے نکل گیا تو اس نے پیچھے مڑ کر باغ کے راستوں پر ایک نظر ڈالی جس پر پچھلی خزاں کی گری ہوئی رنگ برنگ کی خشک پتیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ جگہ بالکل ویران تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت عرصے سے کسی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اب وہاں کسی کے محنتی ہاتھوں کا کوئی بھی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ اس بڑے سے پرانے مکان کی قبرستان جیسی ویرانی نے پاویل کو اور بھی اداس کر دیا۔

تونیا کے ساتھ اس کا آخری جھگڑا پہلے کے تمام جھگڑوں سے زیادہ سنگین تھا۔ وہ جھگڑا بہت ہی غیرمتوقع طور پر بس یوں ہی ہو گیا تھا۔ اب تو اس واقعہ کو ایک مہینہ ہو چکا تھا۔

اپنی جیبوں میں اندر تک ہاتھ ڈالے ہوئے پاویل جب آہستہ آہستہ شہر کی طرف چلا تو اسے یاد آنے لگا کہ اس جھگڑے کی ابتدا کس طرح ہوئی تھی۔

سڑک پر بالکل اتفاق سے ان دونوں کی ملاقات ہو گئی تھی اور تونیا نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

«ڈیڈی اور ماں بولشانسکی کے گھر کسی کی سالگرہ کی دعوت میں جا رہے ہیں، میں گھر پر اکیلی ہی ہوں گی۔ پاولوشا تم اسوقت آ کیوں نہ جاؤ؟ میرے پاس ایک بہت دلچسپ کتاب ہے۔ ہم دونوں مل کر اسے پڑھیں گے — لیونڈ آنڈریےایف کی «ساشکا ژیگولیوف» — میں تو اسے ایک بار پڑھ چکی ہوں لیکن تمہارے ساتھ میں ایک دفعہ پھر پڑھنا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری شام اچھی کٹ جائےگی۔ تم آؤ گے نا؟»

گھنے سرخی مائل بالوں پر پہنی ہوئی سفید ٹوپی کے نیچے سے اس کی بڑی بڑی پوری کھلی ہوئی آنکھیں بڑی امید کے ساتھ پاویل کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

«میں آ جاؤں گا۔»
اس کے بعد وہ دونوں رخصت ہوئے۔
پاویل جلدی جلدی بھاگا ہوا بجلی گھر پہنچا۔ محض اس تصور سے کہ وہ ایک پوری شام تونیا کے گھر گذارنے والا ہے اسے بھٹی میں آگ کے شعلے آج ہمیشہ سے زیادہ روشن نظر آ رہے تھے اور سلگتی ہوئی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز بھی اسے آج پہلے سے زیادہ پرمسرت معلوم ہو رہی تھی۔
لیکن شام کو جب اس نے تونیا کے گھر کے سامنے والے کشادہ دروازے پر دستک دی تو جواب میں جو تونیا دروازہ کھولنے آئی وہ کچھ پریشان حال سی نظر آ رہی تھی۔
«آج تو میرے پاس کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں، پاولوشا مجھے ان کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی لیکن پھر بھی تم اندر تو آؤ» تونیا نے کہا۔
پاویل وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا اس لئے وہ دروازے کی طرف مڑا۔
«آؤ نہ اندر» تونیا نے اس کا بازو پکڑکر کہا۔ «تم سے مل کر انہیں کافی فائدہ ہوگا۔» پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر تونیا کھانے کے کمرے میں سے ہوتی ہوئی اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔
کمرے میں داخل ہوکر وہ وہاں پر بیٹھے ہوئے اپنے دوستوں سے مخاطب ہوکر مسکرائی۔
«آپ لوگ میرے دوست پاویل کورچاگن سے ملئے۔»
کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی میز کے گرد تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تھی لیزا سوخارکو، وہ ایک بہت خوبصورت سانولے رنگ کی غنچہ دہن اسکول کی طالبہ تھی۔ اس کے بالوں کی سجاوٹ بہت ہی دلفریب تھی۔ دوسرا تھا ایک دبلا پتلا سا نوجوان جو بہت عمدہ سلا ہؤا کالا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے

نرم اور چکنے بال تیل سے چمک رہے تھے اور اس کی بھوری آنکھیں بالکل ویران معلوم ہو رہی تھیں۔ ان دونوں کے بیچ میں بہت ہی بھڑکیلے قسم کا اسکول کا کوٹ پہنے ہوئے وکٹر ایش چینسکی بیٹھا ہوا تھا۔ تونیا کے دروازہ کھولتے ہی پاویل کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑی تھی۔

لیش چینسکی بھی پاویل کو فوراً پہچان گیا اور اس کے خوبصورت کمان جیسے ابرو تعجب سے اوپر کی طرف اٹھ گئے۔

چند سکنڈ تک پاویل دروازے کے قریب خاموش کھڑا رہا اور وکٹر کو اس انداز سے گھورتا رہا جس سے ان دونوں کی مخاصمت صاف ظاہر ہوتی تھی۔ تونیا نے اس بے تکے سکوت کو توڑنے کی غرض سے پاویل سے اندر آنے کو کہا اور لیزا کا تعارف کرانے کے لئے جلدی سے اس کی طرف مڑی۔

لیزا سوخارکو بڑی دلچسپی سے اس نووارد شخصیت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

لیکن پاویل پھرتی سے پیچھے مڑا اور لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا کھانے کے نیم تاریک کمرے کو پار کرکے سامنے والے دروازے کی طرف چلدیا۔ تونیا اس کے پیچھے بھاگی لیکن جب تک وہ اس کے قریب پہنچے پہنچے وہ برساتی میں پہنچ چکا تھا۔ تونیا نے اس کے دونوں کندھے پکڑ لئے۔

«آخر تم بھاگے کیوں جا رہے ہو؟ میں خاص طور پر ان لوگوں کو تم سے ملانا چاہتی تھی» اس نے خفگی آمیز تعجب کے ساتھ کہا۔

پاویل نے جھٹک کر اس کے ہاتھ اپنے کندھوں پر سے ہٹا دئے اور ترشی کے ساتھ جواب دیا:

«میں اس بدھو کے سامنے تماشہ بناکر پیش کیا جانا پسند نہیں کرتا۔ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ لوگ تمہیں پسند ہوں تو ہوں لیکن میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔ اگر مجھے

یہ معلوم ہوتا کہ تمہارے دوست یہ لوگ ہیں تو میں کبھی بھی نہ آتا ۔"

تونیا نے اپنے بڑھتے ہوئے غصے کو دباکر اسے ٹوک کر کہا:

"تمہیں مجھ سے اس قسم کی گفتگو کرنے کا کیا حق ہے؟ میں تو تم سے کبھی نہیں پوچھتی کہ تمہارے دوست کون ہیں اور تم سے ملنے کون آتا ہے ۔"

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کس سے ملتی ہو، بس میں اب کبھی نہیں یہاں آنے کا" پاویل نے سامنے والے زینے سے اترتے ہوئے اسے تڑسے جواب دیا اور باغیچے کے پھاٹک کی طرف بھاگ گیا ۔

اس وقت سے وہ تونیا سے نہیں ملا تھا ۔ یہودیوں پر کئے جانے والے مظالم کے دوران میں بجلی کے مستری کی مدد سے جب اس نے یہودیوں کے کنبوں کو بجلی گھر میں پناہ دی تھی اس عرصے میں وہ اس جھگڑے کو بھول گیا تھا اور آج پھر اسے تونیا سے ملنے کی خواہش ہو رہی تھی ۔

ژوخرائی کے اس طرح غائب ہو جانے سے اور اس احساس سے کہ گھر پر کوئی نہیں ہے پاویل کچھ مضمحل سا تھا ۔ سڑک کی خاکستری وسعت اس کے سامنے داھنی طرف دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ موسم بہار میں جو کیچڑ ہو گئی تھی وہ ابھی تک سوکھی نہیں تھی ۔ اور سڑک پر جابجا چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے تھے، جن میں گھرے کتھئی رنگ کا کیچڑ بھرا ہوا تھا ۔ کچھ دور پر ایک مکان کے آگے جاکر سڑک دو شاخوں میں تقسیم ہو گئی تھی ۔ اس مکان کا بدنما بدرنگ چھجہ جس کا پلستر جابجا گر گیا تھا سڑک پر آگے کی طرف نکلا ہوا تھا ۔

سڑک کے چوراھے پر وکٹر لیش‌چینسکی لیزا سے رخصت ہو رہا تھا ۔ وہ دونوں ایک شکستہ دکان کے سامنے کھڑے تھے جس کا

دروازہ بالکل ھی خستہ حال تھا اور دکان پر «سوڈا لیمن» کا ایک سائن بورڈ الٹا ٹنگا ھوا تھا۔

وہ لیزا کا ھاتھ اپنے ھاتھ میں لئے تھا اور انتہائی التجا کے انداز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے باتیں کر رھا تھا:

«تم آؤ گی نا؟ مجھے دھوکا تو نہیں دو گی؟»

«آوں گی کیوں نہیں۔ تم میرا انتظار کرنا» لیزا نے بڑے نخرے کے ساتھ جواب دیا۔

وکٹر سے رخصت ھوتے وقت وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی بھورے رنگ، کی خمار آلود آنکھوں میں خوش آئند وعدہ جھلک رھا تھا۔

سڑک پر چند گز آگے لیزا نے دو آدمیوں کو ایک مکان کے کونے کے پیچھے سے نکل کر سڑک پر آتے دیکھا۔ ان میں سے پہلا بہت ھٹا کٹا چوڑے سینے والا آدمی تھا جو مزدوروں کا لباس پہنے ھوئے تھا۔ اس کے کوٹ کے بٹن کھلے ھوئے تھے جس کے نیچے ایک دھاری دار جرسی نظر آ رھی تھی۔ سیاہ رنگ کی ٹوپی اس کے ماتھے پر آگے کی طرف سرکی ھوئی تھی۔ اس کے پاؤں میں کتھئی رنگ کے چھوٹے بوٹ تھے اور اس کی آنکھ کے نیچے ایک گہرے نیلے رنگ کا چوٹ کا نشان تھا۔

وہ آدمی بہت ثابت قدمی کے ساتھ چل رھا تھا لیکن اس کی چال میں ایک خفیف سا جھٹکا بھی تھا۔

اس کے تین قدم پیچھے بھورے رنگ کا ایک لمبا سا اوورکوٹ پہنے اور اپنی پیٹی میں کارتوس کی دو تھیلیاں لٹکائے پیتلورا فوج کا ایک سپاھی آ رھا تھا۔ سپاھی کی سنگین آگے والے آدمی کی پیٹھ سے تقریباً اڑی ھوئی تھی۔ اس کے لمبے بالوں والی بھیڑ کی کھال کی ٹوپی کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی محتاط آنکھیں قیدی کی

گدی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کے دونوں طرف زرد مونچھوں کے سخت بال پھیلے ہوئے تھے جن پر تمباکو کی پیک کے دھبے تھے۔

لیزا نے اپنے قدم ذرا دھیمے کر دئے اور سڑک پار کرکے دوسری طرف چلی گئی۔ اسی وقت اس کے پیچھے پاویل بڑی سڑک پر آ نکلا۔

جیسے ھی وہ اس پرانے مکان کے سامنے سے گذر کے سڑک کے موڑ پر داھنی طرف مڑا اس نے بھی ان دونوں آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

پاویل ایک دم چونک کر ٹھٹک گیا۔ اور کچھ دیر تک وھاں اس طرح کھڑا رھا جیسے اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے ھوں۔ وہ قیدی ژوخرائی تھا۔

«اچھا تو یہ وجہ تھی اس کے واپس نہ آنے کی!»

ژوخرائی لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آتا جا رھا تھا۔ پاویل کا دل اتنے زور سے دھڑک رھا تھا کہ لگتا تھا کہ ابھی پھٹ جائےگا۔ اس کے خیالات دیوانہوار ادھر ادھر بھٹک رھے تھے اور اس کا ذھن صورت حال کو سمجھنے کی ناکام کوشش کر رھا تھا۔ سوچ بچار کرنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ صرف ایک بات اس کے سامنے واضح تھی کہ ژوخرائی کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔

حیران اور حواس باختہ ھوکر پاویل ان دونوں کو قریب آتے دیکھ رھا تھا۔ اب کیا کیا جائے؟

آخری وقت یک بیک اسے اپنی جیب میں پڑے ھوئے پستول کا خیال آیا۔ «جوں ھی وہ دونوں اس کے پاس سے گذریںگے وہ رائفل والے سپاھی کی پیٹھ میں گولی مار دےگا اور فیودور آزاد ھو جائیگا۔» عین وقت پر یہ فیصلہ کرکے اس کے ذھن کا بار ھلکا

ہو گیا۔ ابھی کل ہی تو فیودور نے اس سے کہا تھا: «اس کے لئے ہمیں باہمت لوگوں کی ضرورت ہے...»

پاویل نے پھرتی سے اپنے پیچھے نظر ڈالی۔ شہر کو جانے والی سڑک بالکل ویران تھی۔ دور تک کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک عورت ہلکا سا کوٹ پہنے سڑک پر تیزی سے چلی جا رہی تھی — وہ کوئی مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ نکڑ کے پاس سے جو دوسری سڑک جاتی تھی وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف اسٹیشن جانے والی سڑک پر بہت دور کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔

پاویل ہٹ کر سڑک کے کنارے آ گیا۔ جب ان کے درمیان صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تب ژوخرائی کی نظر اس پر پڑی۔

ژوخرائی نے کنکھیوں سے اسے دیکھا اور اس کی گھنی بھنویں پھڑکنے لگیں۔ اس طرح غیرمتوقع طور پر مٹ بھیڑ ہو جانے کی وجہ سے اس کے قدم کچھ دھیمے پڑ گئے۔ سنگین اس کی پیٹھ میں چبھ گئی۔

«ابے ٹھیک سے چل، نہیں تو میں ابھی تیری رفتار رائفل کے کندے سے ٹھیک کر دونگا!» سپاہی نے باریک آواز میں چیخ کر کہا۔

ژوخرائی نے اپنے قدم تیز کر دئے۔ وہ پاویل سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے صرف اپنا ہاتھ ہلایا جیسے سلام کر رہا ہو۔

اس خوف سے کہ کہیں زرد مونچھوں والے سپاہی کی نظر اس پر نہ پڑ جائے، پاویل ژوخرائی کے قریب سے ہو کر گذرتے وقت دوسری طرف دیکھنے لگا جیسے اسے اس تمام قصے میں کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

لیکن یہ خیال مستقل اسے پریشان کر رہا تھا کہ «اگر نشانہ چوک گیا اور گولی اس کے نہ لگ کر ژوخرائی کے لگ گئی تو...»

اب جب کہ پیتلورا فوج کا سپاہی اس کے بالکل قریب آ چکا تھا سوچنے کا وقت نہیں رہ گیا تھا۔

جب وہ زرد مونچھوں والا سپاہی اس کے برابر آ گیا تو پاویل یک بیک اس پر ٹوٹ پڑا اور رائفل پکڑ کر اس کی نال زمین کی طرف کر دی۔

رائفل کی سنگین ایک کرخت آواز نکالتی ہوئی سڑک کے پتھر سے ٹکرائی۔

سپاہی اس حملے کے لئے قطعی تیار نہ تھا اور ایک لمحے کے لئے تو وہ بالکل چکرا ہی گیا۔ پھر اس نے زور سے جھٹکا دے کر رائفل کو اپنی طرف کھینچا۔ پاویل نے بھی اپنے جسم کا پورا بوجھ ڈال کر رائفل پر سے اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی۔ ایک گولی دغنے کی آواز آئی۔ گولی ایک پتھر سے ٹکرائی اور کراہنے کی سی آواز پیدا کرتی ہوئی چھٹک کر قریب کی ایک خندق میں جا گری۔

گولی کی آواز سن کر ژوخرائی اچھل کر ایک طرف کو ہٹ گیا اور پھرتی کے ساتھ پیچھے گھوما۔ رائفل کو پاویل کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش میں سپاہی پوری طاقت کے ساتھ رائفل کو اینٹھ رہا تھا۔ اس کھینچاتانی میں پاویل کے ہاتھ اتنی بری طرح بل کھا گئے تھے کہ درد کے مارے اس کا برا حال تھا۔ لیکن اس نے رائفل نہ چھوڑی۔ پھر غصے سے پاگل ہو کر پیتلورا فوج کے اس سپاہی نے ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ پاویل کو زمین پر گرا دیا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے ہاتھ سے رائفل نہ چھڑا سکا۔ پاویل زمین پر گر پڑا لیکن اپنے ساتھ ہی اس نے اس سپاہی کو بھی

گرا لیا۔ اس نازک موقعہ پر دنیا کی کوئی بھی طاقت اس سے وہ رائفل نہیں چھڑا سکتی تھی۔

دو چھلانگیں مار کر ژوخرائی ان دونوں کے قریب جا پہنچا جو ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ اس نے اپنا آہنی گھونسہ ہوا میں پورے زور سے گھماکر سپاھی کے سر پر بھرپور وار کیا۔ ایک سکنڈ بعد پیتلورا فوج کا وہ سپاھی پاویل کے قریب سے ھٹایا جا چکا تھا۔ اپنے چہرے پر دو سیسے جیسی بھاری چوٹیں کھانے کی وجہ سے اسے غش سا آ رہا تھا۔ اور تھوڑی ھی دیر بعد اس کا بےحس و حرکت جسم پاس والی خندق میں ڈھیر ھو چکا تھا۔

جن دو مضبوط ھاتھوں نے اس سپاھی کی مرمت کی تھی انہیں ھاتھوں نے پاویل کو زمین سے اٹھاکر اسکے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔

اس وقت تک وکٹر اس سڑک کے نکڑ سے تقریباً سو قدم آگے پہنچ چکا تھا۔ چلتے چلتے وہ «او چنچل چھوری» قسم کے کسی گانے کی دھن پر سیٹی بجاتا جا رہا تھا۔ لیزا سے ملاقات کرکے اور اس کے اس وعدے کی وجہ سے کہ دوسرے دن وہ اس سے پرانے ویران کارخانے کے قریب ملےگی، وکٹر کا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔

اسکول کے چھٹے ھوئے بدمعاش لڑکوں میں یہ افواہ عام تھی کہ لیزا سوخارکو عشق لڑانے کے معاملے میں بہت بےباک ھے۔ مغرور اور بر خود غلط سیمیان زالیوانوف نے تو ایک بار یہاں تک کہا تھا کہ وہ لیزا کو زیر کر چکا تھا۔ حالانکہ وکٹر کو سیمیان کی بات پر پورا یقین نہیں تھا، پھر بھی لیزا نے اسے مسحور سا کر دیا تھا۔ خیر کل معلوم ھو جائےگا کہ زالیوانوف سچ کہتا تھا یا جھوٹ۔

«اگر وہ آئی تو میں ذرا بھی نہیں جھجکوں‌گا۔ آخر بوسہ دینے میں تو وہ کسی قسم کا اعتراض نہیں کرتی۔ اور اگر کہیں

سیمیان کا کہنا سچ ہوا تب تو...» اتنے میں پیتلورا فوج کے
دو سپاہیوں کو راستہ دینے کے لئے وہ ایک طرف کو ہٹا اور اس
کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا ـ ان میں سے ایک سپاہی ہاتھہ میں
کرمچ کی ایک بالٹی جھلاتا ہؤا ایک دم کٹے گھوڑے پر سوار
چلا جا رہا تھا ـ ظاہر تھا وہ گھوڑے کو پانی پلانے جا رہا تھا ـ
دوسرا سپاہی جو ایک چھوٹا کوٹ اور ڈھیلی ڈھالی نیلے رنگ کی
پتلون پہنے ہوئے تھا اس کے برابر پیدل چل رہا تھا ـ وہ
اپنا ہاتھہ گھوڑ سوار کے گھٹنے پر رکھے ہوئے اسے کوئی دلچسپ
قصہ سنا رہا تھا ـ

وکٹر نے ان دونوں کو گذر جانے دیا اور وہ آگے بڑھنے ہی
کو تھا کہ بڑی سڑک کی طرف سے گولی چلنے کی آواز سنکر وہ
ایک دم ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ـ اس نے مڑکر دیکھا کہ وہ گھوڑ سوار
اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاکر اسی سمت بھاگا جا رہا ہے جدھر سے
آواز آئی تھی ـ دوسرا سپاہی ایک ہاتھہ سے اپنی تیغ سنبھالے اس
کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا ـ

وکٹر بھی ان کے پیچھے بھاگا ـ وہ بڑی سڑک کے بالکل قریب
پہنچ گیا تھا کہ اتنے میں دوسری گولی دغنے کی آواز آئی ـ اور
اس نے دیکھا کہ سڑک کے موڑ پر وہ گھوڑسوار گھوڑا دوڑائے
ہوئے بے تحاشہ بھاگا چلا آ رہا ہے ـ وہ اپنی ایڑیوں سے اور کرمچ
کی بالٹی کی مدد سے گھوڑے کو اور تیز بھگانے کی کوشش
کر رہا تھا ـ پہلے ہی پھاٹک کے پاس وہ گھوڑے پر سے زمین
پر کود پڑا اور اندر صحن میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے اس نے
چیخ کر کہا:

«فوراً مسلح ہو جاؤ! کسی نے ہمارے ایک آدمی کو مار
دیا ہے!»

ایک منٹ کے اندر ہی کئی آدمی صحن سے باہر نکل پڑے ـ
بھاگتے ہوئے وہ اپنی رائفلوں کے توڑے چڑھاتے جا رہے تھے ـ

وکٹر گرفتار کر لیا گیا۔
اس وقت تک سڑک پر کئی آدمی جمع ہو گئے تھے۔ انہیں میں وکٹر اور لیزا بھی تھے۔ لیزا کو بھی گواهی دینے کے لئے روک لیا گیا۔
اس واقعہ کے وقت لیزا دهشت کے مارے اپنی جگہ پر پتھر کی طرح گڑی رہ گئی تھی۔ اس لئے جب ژوخرائی اور پاویل بھاگتے ہوئے اس کے قریب سے گذرے تھے اس وقت اس نے انہیں اچھی طرح دیکھا تھا۔ یہ دیکھ‌کر اسے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ جس لڑکے نے پیتلورا فوج کے اس سپاهی پر حملہ کیا تھا وہ وهی لڑکا تھا جس سے تونیا اس کا تعارف کرانا چاهتی تھی۔
وہ دونوں ایک چہاردیواری پھاند‌کر ایک باغ میں کودے هی تھے کہ وہ گھوڑ سوار سڑک پر اپنا گھوڑا دوڑاتا هؤا وهاں آ پہنچا تھا۔ جب گھوڑ سوار نے دیکھا کہ ژوخرائی هاتھ میں رائفل لئے ہوئے بھاگا جا رها هے اور وہ مبہوت سپاهی اٹھ‌کر کھڑے ہونے کی مسلسل جدوجہد میں مبتلا هے تو اس نے اپنا گھوڑا باغ کی چہاردیواری کی طرف بڑھایا۔
لیکن ژوخرائی نے پیچھے مڑکر اپنی رائفل تان لی اور تعاقب کرنے والے پر گولی چلا دی۔ گھوڑ سوار جلدی سے گھوڑا موڑکر اپنی جان بچاکے بھاگا۔
وہ سپاهی جس کے بری طرح زخم کھائے ہوئے ہونٹوں سے آواز بھی اچھی طرح نہیں نکل رهی تھی اس گھوڑ سوار سے پورا واقعہ بیان کر رها تھا۔
«گدھے کہیں کے، آخر تمہارے دیکھتے دیکھتے وہ آدمی بھاگ کیسے گیا۔ جب چوتڑ پر پچیس کوڑے پڑیں گے تب معلوم ہو جائے گا۔»

«تم تو بڑے ہوشیار ہو نا؟» سپاہی نے غصہ ہو کر تڑ سے جواب دیا ۔ «میرے دیکھتے دیکھتے، ہوں؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ حرامی میرے اوپر دیوانوں کی طرح ٹوٹ پڑے گا ۔»

لیزا سے بھی سوال جواب کیا گیا ۔ اس نے بھی وہی قصہ بیان کیا جو قیدی کو لے جانے والے اس سپاہی نے بتایا تھا ۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ حملہ کرنے والے اس لڑکے کو جانتی ہے ۔ پھر بھی ان سب کو کمانڈینٹ کے دفتر لے جایا گیا اور شام تک نہیں چھوڑا گیا ۔

کمانڈینٹ لیزا کو خود اس کے گھر تک چھوڑ آنے پر مصر تھا ۔ لیکن لیزا نے انکار کر دیا ۔ اس کے منھہ سے شراب کی بو آ رہی تھی ۔ اس لئے اس کی تجویز چنداں خوش‌آئند نہیں تھی بلکہ کسی خطرے کا پیش خیمہ تھی ۔

وکٹر لیزا کو گھر تک چھوڑنے گیا ۔

اسٹیشن وہاں سے کافی دور تھا اور جب وہ بانہوں میں باہیں ڈالے چلے جا رہے تھے تو وکٹر دل ہی دل میں اس حادثہ کا بہت ممنون ہو رہا تھا ۔

«تمہیں بھلا کچھہ اندازہ ہے کہ جس شخص نے اس قیدی کو چھڑایا وہ کون تھا» لیزا نے اپنے گھر کے قریب پہنچ کر وکٹر سے پوچھا ۔

«قطعی نہیں، مجھے کیسے اندازہ ہو سکتا ہے؟»

«تمہیں یاد ہے اس دن شام کو تونیا ایک لڑکے کو ہم سے ملانے کے لئے لائی تھی؟»

وکٹر یک لخت رک گیا ۔

«پاویل کورچاگن؟» اس نے حیرت سے پوچھا ۔

«ہاں میرا خیال ہے اس کا نام کورچاگن ہی تھا ۔ تمہیں یاد ہے وہ کتنے عجیب طریقے سے کمرے سے باہر چلا گیا تھا؟ بس وہی تھا ۔»

وکٹر بالکل ھکا بکا رہ گیا ۔
«تمہیں پکا یقین ھے؟» اس نے لیزا سے پوچھا ۔
«ھاں مجھے اس کی صورت اچھی طرح یاد ھے ۔»
«تو تم نے یہ بات کمانڈینٹ کو کیوں نہیں بتلائی؟»
لیزا کو غصہ آ گیا ۔
«کیا تم سمجھتے ھو میں اتنی ذلیل حرکت کر سکتی ھوں؟»
«ذلیل؟ تمہارے نزدیک یہ بتا دینا کہ قیدی کو لے جانے والے سپاھی پر حملہ کس نے کیا تھا، ذلیل حرکت ھے؟»
«اور تم کیا اسے بڑی شرافت کی بات سمجھتے ھو؟ تم شاید ان لوگوں کے کرتوتوں کو بھول گئے ھو۔ تمہیں کچھہ خبر بھی ھے کہ ثانوی اسکول میں یہودیوں کے کتنے یتیم بچے ھیں ۔ پھر بھی تم چاھتے ھو کہ میں انہیں کورچاگن کے بارے میں بتا دیتی ۔ مجھے بڑا افسوس ھے ۔ مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی ۔»
لیش چینسکی کو لیزا کا جواب سن کر بہت تعجب ھوا ۔ لیکن چونکہ اسے لیزا سے جھگڑا کرنا مصلحتاً منظور نہ تھا، اس لئے اس نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کی ۔
«خفا نہ ھو لیزا ۔ میں تو مذاق کر رھا تھا ۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی ایماندار ھو ۔»
«اگر یہ مذاق تھا تو بہت ھی گھٹیا قسم کا مذاق تھا» لیزا نے روکھے پن سے جواب دیا ۔
سوخارکو کے گھر کے باھر لیزا سے رخصت ھوتے وقت وکٹر نے اس سے پوچھا:
«تو لیزا تم آوگی نا؟»
«معلوم نہیں» اس نے گول مول جواب دیا ۔
شہر واپس جاتے وقت وکٹر نے اپنے ذھن میں اس مسئلے پر کافی غور کیا ۔ «خیر میم صاحب آپ اسے ذلیل حرکت سمجھتی ھوں

تو سمجھیں - لیکن اس مسئلہ کے بارے میں میری رائے کچھ اور ہی ہے - جہاں تک میرا سوال ہے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کس نے کسے چھڑایا -»

لیش چینسکی خاندان کا ایک فرد ہونے کے ناتے اور پولینڈ کے ایک قدیم خاندان کا روشن چراغ ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے دونوں فریقین یکساں طور پر قابل نفرت تھے - وہ صرف ایک حکومت تسلیم کرتا تھا - اور وہ تھی «ریز پوسپولیٹا» — پولینڈ کے اشرافیہ کی حکومت اور اسے پورا یقین تھا کہ وہ حکومت جلد ہی پولینڈ کی فوجیں لےکر وہاں پہنچ جائےگی - لیکن اس بدمعاش کورچاگن سے نجات پانے کا یہ بہترین موقعہ تھا - وہ لوگ یقیناً اس کی گردن مڑوڑ ڈالیں گے -

اپنے خاندان میں وکٹر ہی اکیلا اس شہر میں رہ گیا تھا - وہ اپنی ایک خالہ کے ساتھہ رہتا تھا، جس کا شوہر شکر کے کارخانے کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا - وکٹر کے کنبے والے کچھہ عرصے سے وارسا میں رہنے لگے تھے - وہاں اس کا باپ سگسمنڈ لیش چینسکی کسی خاصے بڑے عہدے پر تعینات ہو گیا تھا -

وکٹر سیدھا کمانڈینٹ کے دفتر گیا اور دروازہ کھلا پاکر اندر داخل ہو گیا -

تھوڑی ہی دیر کے بعد پیتلورا فوج کے چار سپاہیوں کے ساتھہ وہ کورچاگن کے گھر کی طرف جاتا ہوا دیکھا گیا -

«یہی گھر ہے» اس نے دھیرے سے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جس میں روشنی ہو رہی تھی - «اب تو میں جا سکتا ہوں نا؟» اس نے پاس والے افسر سے پوچھا -

«ہاں ہاں، اب ہم نبٹ لیں گے، اس اطلاع کے لئے بہت بہت شکریہ -»

وکٹر سڑک کے کنارے والی پٹری پر تیزی سے چل دیا -

اپنی پیٹھ پر پڑنے والے آخری گھونسے سے پاویل چکرا کر اس اندھیرے کمرے میں جا پڑا، جہاں وہ لوگ اسے گھسیٹ لائے تھے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گرا اور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئے۔ ادھر ادھر ٹٹولنے پر اسے دیوار سے لگا ہوا ایک تختہ ملا، وہ اسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا جسم اور اس کی روح دونوں ہی بری طرح زخمی ہوئے تھے اور دونوں ہی میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

وہ اپنی گرفتاری پر بالکل حیران تھا۔ پیتلورا فوج کے سپاہیوں کو اس کے بارے میں پتہ کیسے چلا؟ اسے پورا یقین تھا کہ اسے کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اور ژوخرائی کہاں ہوگا؟

وہ ملاح کو کلمکا کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ وہاں سے وہ خود تو سرگئی کے یہاں چلا گیا تھا اور ژوخرائی شام کے انتظار میں وہیں رک گیا تھا کہ شام ہوتے ہی چپکے سے شہر سے کھسک جائے گا۔

«اچھا ہی ہؤا کہ ریوالور میں نے کوے کے گھونسلے میں چھپا دیا تھا» پاویل نے سوچا۔ «اگر کہیں وہ ان کے ہاتھ لگ جاتا تب تو میرا خاتمہ ہی تھا۔ لیکن میرے بارے میں انہیں خبر کیسے لگی؟» اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اور یہ سوال اسے مسلسل پریشان کر رہا تھا۔

حالانکہ پیتلورا فوج کے سپاہیوں نے کورچاگن کے گھر کا کونا کونا چھان مارا لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ آرتیم اپنے بہترین کپڑے اور اپنا ایکارڈین باجہ اپنے ساتھ گاؤں لے گیا تھا۔ اور اس کی ماں اپنا صندوق اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس لئے گھر میں ایسی کوئی خاص چیز رہی نہیں تھی جسے سپاہی لے جاتے۔

لیکن حوالات کی کوٹھڑی تک کا سفر ایک ایسا تجربہ تھا جسے پاویل کبھی بھول نہ سکتا تھا۔ بالکل اندھیری گھپ رات تھی۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاروں طرف سے اسے بے رحمی سے ٹھوکریں ماری جا رہی تھیں اور ان ٹھوکروں کی چوٹ سے تلملاکر وہ اندھوں کی طرح گرتا پڑتا بدحواس کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔

پاس کے کمرے میں کھلنے والے دروازے کے پیچھے سے آنے والی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کمرہ کمانڈینٹ کی گارڈ کے سپاہیوں کے قبضے میں تھا۔ دروازے کے نیچے سے روشنی کی ایک چمکدار پٹی نظر آ رہی تھی۔ پاویل اٹھ کھڑا ہوا اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اس نے پوری کوٹھڑی کا چکر لگایا۔ تختے کے مقابل اس نے ایک کھڑکی دریافت کی جس میں تیز نوکوں والی مضبوط چھڑیں لگی ہوئی تھیں اپنے ہاتھ سے اس نے انہیں ہلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔ ظاہر تھا کہ وہ جگہ پہلے گودام کے کام آتی تھی۔

وہ ٹٹولتا ٹٹولتا دروازہ کی طرف گیا اور ایک لمحہ تک وہاں کھڑے کھڑے باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے دروازے کے ہینڈل کو دھیرے سے دبایا۔ دروازہ سے ایک تکلیف دہ چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور پاویل نے دانت پیس کر دو چار موٹی موٹی گالیاں سنا دیں۔

اس کے سامنے دروازے میں جو پتلی سی درز پیدا ہو گئی تھی اس میں سے جھانک کر اس نے پاس والے کمرے میں دیکھا تو اسے دو بدھیئت سے پاؤں، جن کی انگلیاں بہت ٹیڑھی میڑھی تھیں، ایک سونے کے تختے کی کگر سے باہر کی طرف پھیلے ہوئے نظر آئے۔ اس نے ہینڈل پر ایک ہلکا سا دھکا اور دیا لیکن اس بار دروازے نے اور زور سے احتجاج کیا۔ ملے دلے کپڑے پہنے ایک شخص اٹھ کر تختے پر بیٹھ گیا اور اپنے جوں بھرے سر کو پانچوں انگلیوں سے زور زور سے کھجا کر مسلسل گندی گندی گالیاں بکنے لگا۔ اس

کے چہرے پر ابھی تک نیند کا خمار باقی تھا ۔ جب گندی گالیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اس شخص نے تختے کے سرہانے رکھی ہوئی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور کھنکھار کر بولا:

«بند کرو دروازہ ۔ اور خبردار اب کی بار اگر میں نے تجھے ادھر جھانکتے دیکھا تو میں تیری...»

پاویل نے دروازہ بند کر دیا ۔ دوسرے کمرے میں ایک قہقہہ گونج اٹھا ۔

اس رات پاویل نے کافی وقت غور و فکر میں گذارا ۔ جدوجہد میں شرکت کرنے کی اس کی پہلی ہی کوشش اس کے لئے بہت بری ثابت ہوئی تھی ۔ پہلے ہی قدم پر وہ گرفتار کر لیا گیا تھا اور اب وہ یہاں چوہے کی طرح پھنسا پڑا تھا ۔

وہ ابھی تک بیٹھا ہؤا تھا ۔ رفتہ رفتہ اس پر ایک بیچین سی غنودگی طاری ہونے لگی ۔ اور پھر دھیرے دھیرے اسکی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کی شکل ابھر آئی ۔ اس کے جھریوں دار چہرے کے نمایاں خطوط اور اس کی وہ آنکھیں جن سے وہ بے حد محبت کرتا تھا اسے صاف نظر آنے لگیں ۔ اس نے سوچا «اچھا ہی ہوا کہ وہ گھر پر نہیں تھیں ۔ اب انہیں اتنی تکلیف نہیں ہو گی ۔»

کھڑکی سے داخل ہونے والی روشنی نے کوٹھڑی کے فرش پر ایک ملگجے رنگ کا مربع سا بنا دیا ۔

تاریکی رفتہ رفتہ چھٹ رہی ۔ صبح ہونے والی تھی ۔

چھٹا باب

اس بڑے سے پرانے مکان کی صرف ایک کھڑکی میں روشنی چمک رہی تھی ۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا ۔ باہر ٹریزور جسے رات بھر کے لئے زنجیر سے باندھ دیا گیا تھا یک‌بیک اپنی گونجتی ہوئی بھاری آواز میں بھونک اٹھا ۔

غنودگی کے عالم میں تونیا نے اپنی ماں کو دھیمی آواز میں کہتے سنا:

«نہیں ابھی نہیں سوئی ہے۔ اندر آ جاؤ لیزا۔»

اپنی سہیلی کے ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ سے اور پھر گرمجوشی اور شدت جذبات کے ساتھہ اس کے گلے ملنے کی وجہ سے آخرکار تونیا کی نیند غائب ہو گئی۔

تونیا کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

«لیزا مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم اس وقت یہاں آ گئیں۔ پاپا کی حالت کل خطرے سے باہر ہو گئی تھی اور آج تو وہ دن بھر گہری نیند سوتے رہے۔ اتنی راتیں بغیر سوئے بتانے کے بعد مجھے اور ماں کو بھی آج آرام کرنے کا کچھہ موقع مل گیا۔ سناؤ یہاں کی کیا خبریں ہیں؟» تونیا نے اپنی سہیلی کو کوچ پر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

«ارے یوں تو خبریں بہت سی ہیں۔ لیکن کچھہ خبریں صرف تمہارے سننے کی ہیں » لیزا نے شرارت بھری نظروں سے یکاترینا مخائیلونا کی طرف دیکھہ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

تونیا کی ماں بھی مسکرا دی۔ اس کی عمر تقریباً چھتیس سال کی تھی اور اس کا انداز کافی بھاری بھرکم قسم کا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں پھرتی نوجوان لڑکیوں جیسی تھی۔ اس کی بھوری انکھوں میں ہوشیاری جھلکتی تھی اور اس کا چہرہ بہت خوبصورت نہ ہوتے ہوئے بھی کافی دلکش تھا۔

«میں تھوڑی دیر میں بڑی خوشی سے تم دونوں کو اکیلا چھوڑکر چلی جاؤں گی۔ لیکن پہلے وہ خبریں تو سنا تو دو جو سب کے سننے کی ہیں» اس نے دیوان کے قریب ایک کرسی کھینچتے ہوئے مذاق کے انداز میں کہا۔

«اچھا پہلی خبر تو یہ ہے کہ ہماری اسکول کی پڑھائی ختم۔ بورڈ نے ساتویں جماعت کے طالب علموں کی سندیں تقسیم کر دینے

کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اور میں بےحد خوش ہوں۔ اس الجبرا اور جیومیٹری سے تو میں عاجز آ گئی تھی۔ آخر ان چیزوں کے پڑھنے سے کسی کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ لڑکے ممکن ہے اپنی پڑھائی آگے بھی جاری رکھیں۔ لیکن چاروں طرف جنگ ہو رہی ہے اس لئے وہ خود بھی نہیں جانتے کہ وہ آگے کہاں پڑھیں گے۔ بڑی مصیبت ہے... جہاں تک ہم لوگوں کا سوال ہے، ہم لوگوں کی تو شادیاں ہو جائیں گی۔ اور بیویوں کو الجبرا سے کیا لینا» یہ کہہ کر لیزا ہنس دی۔

کچھ دیر لڑکیوں کے پاس بیٹھنے کے بعد یکاترینا مخائیلونا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

لیزا کھسک کر تونیا کے اور قریب آ گئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس نے چپکے چپکے اسے سڑک کے نکڑ والا اس دن کا سارا واقعہ کہہ سنایا۔

«تونیچکا تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے اس وقت کتنی حیرت ہوئی جب میں نے یہ دیکھا کہ جو لڑکا قیدی کے ساتھ بھاگا جا رہا تھا... بتاؤ کون تھا؟»

تونیا نے جو بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ داستان سن رہی تھی، اپنے کندھے جھٹک دئے۔

«کورچاگن!» لیزا نے جلدی سے سانس روک کر کہا۔

تونیا چونک پڑی اور اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

«کورچاگن؟»

تونیا پر اپنی داستان‌گوئی کا اثر دیکھ کر لیزا بہت خوش تھی۔ اس کے بعد اس نے وکٹر کے ساتھ اپنے جھگڑے کی تفصیل اسے سنائی۔

لیزا اپنا قصہ سنانے میں اتنی محو تھی کہ اس نے یہ غور بھی نہیں کیا کہ تونیا کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ اپنی انگلیوں سے

بڑی بے قراری کے ساتھ اپنے نیلے رنگ کے بلاؤز کو نوچ رھی تھی ـ لیزا کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ پریشانی کی وجہ سے تونیا کے دل میں کتنا شدید ھیجان برپا تھا ـ اور نہ ھی اس کو اس بات کا احساس تھا کہ تونیا کی خوبصورت آنکھوں کے گرد اس کی لمبی لمبی پلکیں اس طرح کیوں کانپ رھی تھیں ـ

تونیا نے اس شرابی فوجی افسر کے بارے میں لیزا کی گفتگو کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ـ ایک ھی خیال اس کے دماغ کو مسلسل برما رھا تھا: «تو وکٹر لیش چینسکی کو اس بات کی اطلاع ھے کہ سپاھی پر حملہ کس نے کیا تھا ـ اف! لیزا نے اسے یہ کیوں بتایا؟» اور غیردانستہ طور پر یہ الفاظ اس کے منھہ سے نکل ھی گئے ـ

«کیا کہا تم نے؟» لیزا فوراً اس بات کا مطلب نہیں سمجھہ پائی ـ

«تم نے لیش چینسکی کو پاولوشا... میرا مطلب ھے کورچاگن کے بارے میں کیوں بتایا؟ وہ اسے ضرور گرفتار کرا دے گا...»

«جاؤ بھی وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا» لیزا نے احتجاج کرتے ھوئے کہا ـ «میں تو نہیں سمجھتی کہ وہ کبھی بھی ایسی حرکت کرے گا ـ آخر اس سے اسے کیا فائدہ ھو سکتا ھے؟»

تونیا یک بیک تن کر بیٹھہ گئی اور اس نے اپنے گھٹنے اتنے کس کر بھینچ لئے کہ ان میں درد ھونے لگا ـ

«تم نہیں جانتیں لیزا! وہ اور کورچاگن ایک دوسرے کے جانی دشمن ھیں ـ اور اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ھے... تم نے پاولوشا کے بارے میں وکٹر کو بتاکر بڑی غلطی کی ـ»

اب جاکر لیزا کو تونیا کے اضطراب کا احساس ھؤا ـ اور اس کے غیر شعوری طور پر اتنی بےتکلفی کے ساتھہ کورچاگن کا پیار کا نام لینے سے لیزا پر وہ حقیقت پوری طرح واضح ھو گئی جس کا ابھی تک وہ صرف موھوم سا قیاس ھی کر سکی تھی ـ

اس میں ایک احساس جرم پیدا ہؤا اور وہ کھسیا کر بالکل خاموش ہو گئی۔

«تو یہ بات سچ ہے» اس نے سوچا۔ «غور کرنے کی بات ہے کہ تونیا ایک ایسے... ایک معمولی مزدور کے عشق میں مبتلا ہو جائے۔» لیزا کو اس مسئلے کے بارے میں بات چیت کرنے کی بہت خواہش ہو رہی تھی لیکن اپنی سہیلی کے جذبات کا احساس کرکے وہ باز رہی۔ کسی نہ کسی طرح اپنے جرم کا تاوان بھرنے کے لئے بے چین ہوکر اس نے تونیا کے ہاتھہ اپنے ہاتھوں میں کس کر دبا لئے۔

«تونیا کیا تم بہت پریشان ہو؟»

«نہیں شاید وکٹر کو جیسا میں سمجھتی ہوں، ممکن ہے وہ اس سے زیادہ شریف ہو» تونیا نے کھوئی کھوئی سی آواز میں جواب دیا۔

اس کے بعد ایک بے ربط سی خاموشی طاری ہو گئی جو ان کے اسکول کے ایک ساتھی دیمیانوف کے آنے پر ہی ٹوٹی۔ دیمیانوف بہت ہی شرمیلا جھینپو سا لڑکا تھا۔

اپنے دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد تونیا بڑی دیر تک باغیچے کے پھاٹک کا سہارا لئے کھڑی شہر جانے والی سڑک کی سیاہ پٹی کو گھورتی رہی۔ اس ابدی آوارہ‌گرد، یعنی خنک نمی سے بوجھل اور موسم بہار کی گیلی مٹی کے سوندھے‌پن میں بسی ہوئی ہوا کے جھونکے اس کے چہرے کو پنکھا جھل رہے تھے۔ دور شہر کے مکانوں کی کھڑکیوں میں سرخ رنگ کی مدھم روشنیاں اپنی آنکھیں جھپکا رہی تھیں۔ اس کی نظروں کے سامنے شہر کی وسعت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ شہر جس کی زندگی اس کی زندگی سے بالکل مختلف تھی اور اسی شہر میں کہیں انہیں مکانوں میں سے کسی مکان میں اس کا باغی دوست پاویل بھی ہوگا۔ اس خطرے سے قطعی بےخبر جو اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ شاید اب تک وہ اسے بھول بھی چکا ہوگا۔ ان کی آخری ملاقات کو دن بھی تو کتنے ہو چکے

تھے؟ اس موقعہ پر غلطی پاویل کی ہی تھی لیکن وہ بات تو کب کی بھلائی بھی جا چکی تھی۔ کل وہ اس سے ملنے جائےگی، اور ان کی دوستی پھر تازہ ہو جائےگی، ایک دل‌گداز لطیف سی دوستی۔ ان کی دوستی پھر قائم ہو جائےگی۔ اس کے بارے میں تونیا کو ذرا بھی شبہہ نہیں تھا۔ بس ایک شرط تھی کہ رات کی تاریکی اس کے پاویل کے ساتھہ غداری نہ کرے۔ وہ رات جس میں تمام دنیا کی بدی چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گویا وہ پاویل کی ہی گھات میں ہو... ہوا کافی سرد ہو چلی تھی۔ سڑک پر ایک آخری نظر ڈال‌کر تونیا اندر چلی گئی۔ یہ خیال کہ «رات کی تاریکی اس کے پاویل کے ساتھہ غداری نہ کرے» مستقل اس کے دماغ میں چکر کاٹ رہا تھا۔ اسی خیال کو لئے ہوئے وہ نرم کمبلوں میں لپٹی ہوئی اپنے بستر پر سو گئی۔

صبح اور لوگوں کے اٹھنے سے پہلے تونیا کی آنکھہ کھل گئی اور وہ جلدی سے کپڑے پہن کر تیار ہو گئی۔ وہ دبے پاؤں گھر سے باہر نکلی تاکہ گھر کے اور لوگ نہ جاگ جائیں۔ باہر نکل کر اس نے جھبرے بالوں والے اس بڑے سے کتے ٹریزور کو کھولا اور اسے ساتھہ لیکر وہ شہر کی طرف چلدی۔ کورچاگن کے مکان کے سامنے پہنچ‌کر وہ ایک لمحے کے لئے جھجکی اور پھر پھاٹک کھول کر صحن میں داخل ہو گئی۔ ٹریزور اپنی دم ہلاتا ہؤا اس کے آگے بھاگا...

آرتیم اسی دن صبح سویرے گاؤں سے آیا تھا۔ جس لوہار کے یہاں وہ کام کرتا تھا وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھاکر شہر چھوڑ گیا تھا۔ گھر پہنچ‌کر آرتیم نے اپنی کمائی سے خریدا ہؤا آٹے کا بورا کندھے پر اٹھا لیا اور صحن میں داخل ہوا۔ وہ لوہار اس کا باقی سامان لئے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بورا کھلے ہوئے دروازے کے باہر رکھہ‌کر آرتیم نے پکارا:

«پاوکا!»

لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

«آخر یہاں کیوں کھڑے ہو؟ اندر کیوں نہیں جاتے؟» لوہار نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

اپنا سامان باورچی خانے میں رکھ‌کر آرتیم دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا اسے دیکھ‌کر اسکے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ کمرے کی تمام چیزیں الٹی پلٹی پڑی تھیں اور فرش پر پرانے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔

«آخر یہ کیا ہنگامہ ہے؟» آرتیم نے بالکل ہی بوکھلا کر زیرلب کہا۔

«ہنگامہ تو اچھا خاصہ ہے، اس میں شبہہ نہیں» لوہار نے اس کی تائید کی۔

«آخر یہ چھوکرا گیا کہاں؟» آرتیم کو غصہ آ رہا تھا۔ لیکن مکان بالکل ویران پڑا تھا۔ اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

لوہار اسے سلام کرکے رخصت ہؤا۔

آرتیم صحن میں آیا اور اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

«میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ تمام دروازے بھاڑ جیسے کھلے ہیں اور پاوکا کا کہیں پتہ نہیں ہے۔»

اتنے میں اپنے پیچھے اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑکر دیکھا کہ ایک بڑا سا کتا اپنے کان اٹھائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک لڑکی پھاٹک سے گھر کی طرف چلی آ رہی تھی۔

«مجھے پاویل کورچاگن سے ملنا ہے» اس نے آرتیم کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر نیچی سی آواز میں کہا۔

«ملنا تو مجھے بھی ہے مگر خدا جانے کہاں چلا گیا ہے وہ۔ میں یہاں آیا تو مکان کھلا پڑا تھا اور پاوکا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

«تو تم بھی اسی کو ڈھونڈھ رہی ہو؟» اس نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

جواب میں لڑکی نے اس سے ایک اور سوال کیا:

«کیا آپ کورچاگن کے بھائی آرتیم ہیں؟»

«ہوں تو سہی۔ کیوں؟»

جواب دینے کے بجائے لڑکی کھلے ہوئے دروازے کو دہشت سے دیکھتی رہی۔ «میں کل رات ہی کیوں نہیں آئی؟» اس نے سوچا۔ «یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا...» اور اس کا دل اور بھی اداس اور بوجھل ہو گیا۔

«آپ جب آئے تب دروازہ کھلا تھا اور پاویل یہاں نہیں تھا؟» اس نے آرتیم سے پوچھا جو اسے تعجب سے گھور رہا تھا۔

«کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں پاویل سے کیا کام ہے؟»

تونیا اس کے اور قریب آ گئی اور چاروں طرف نظر ڈال کر رک رک کر بولی:

«مجھے یقینی طور پر تو نہیں معلوم لیکن اگر پاویل گھر پر نہیں ہے تو وہ ضرور گرفتار کر لیا گیا ہو گا۔»

آرتیم گھبرا کر چونک پڑا «گرفتار کس لئے؟»

«آئیے اندر چل کر باتیں کریں گے» تونیا نے کہا۔

تونیا کو جو کچھ بھی معلوم تھا اس نے سب بیان کر دیا اور آرتیم خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ جس وقت تونیا نے اپنا قصہ ختم کیا، آرتیم پر پوری طرح مایوسی چھا چکی تھی۔

«کیا مصیبت ہے! ایسے ہی کیا کم پریشانیاں تھیں کہ یہ ایک نیا بکھیڑا اور کھڑا ہو گیا۔» وہ اداس ہو کر بڑبڑایا۔ «اب میں سمجھا کہ گھر کی تمام چیزیں اس طرح الٹی پلٹی کیوں پڑی تھیں۔ نہ جانے اس چھوکرے کو اس جھگڑے میں جا کر پھنس جانے کی کیا

ضرورت تھی... اب میں اسے کہاں تلاش کروں؟ اچھا مس صاحب کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟»

«میں یہاں کے ناظم جنگلات تمانوف کی بیٹی ہوں۔ پاویل میرا دوست ہے۔»

«اچھا» آرتیم نے مبہم سے انداز میں اپنی آواز کھینچ کر کہا۔ «میں تو آٹا لایا تھا کہ کھلا پلاکر اس چھوکرے کو ذرا تگڑا بناؤں گا اور یہاں یہ...»

تونیا اور آرتیم ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔

«اچھا تو میں اب چلوں گی» تونیا نے جانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ «شاید آپ کو اس کا پتہ لگ جائے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آپ کو کیا پتہ چلا میں شام کے وقت پھر آؤں گی۔»

آرتیم نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

ایک منحنی سی مکھی سردی کی آرام‌دہ نیند سے جاگ کر کھڑکی کے کونے میں بھنبھنا رہی تھی۔ ایک پرانی شکستہ سی کوچ کی کگر پر ایک نوجوان کسان عورت اپنے گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے بیٹھی تھی۔ اور اس کی ویران آنکھیں گندے فرش پر جمی ہوئی تھیں۔

کمانڈینٹ جو اپنے منھ کے ایک کونے میں لگی ہوئی سگریٹ کو چبا رہا تھا بڑے زناٹے کے ساتھ کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہا تھا۔ تحریر ختم کرکے اور ظاہراً اپنے اس کارنامے پر خوش ہوکر اس نے اس جگہ کے نیچے جہاں اس کا عہدہ لکھا ہؤا تھا «شیپیتووکا شہر کا کمانڈینٹ، خورونژی۔» اپنے بہت ہی سجاوٹی دستخط کئے جس کے آخر میں خط ایک عجیب انداز سے خم کھا گیا تھا۔ دروازے کے باہر مہمیزوں کے جھنکنے کی آواز آئی۔ کمانڈینٹ نے سر اٹھاکر اوپر دیکھا۔

اس کے سامنے سولومیگا کھڑا تھا۔ اس کے بازو پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔

«ہلو تم کہاں سے آ ٹپکے؟» کمانڈینٹ نے اس کا استقبال کرتے ہوئے پوچھا۔

«آثار کچھ اچھے نہیں نظر آتے۔ ایک بوگونیتس* نے میرا ہاتھ ہڈی تک کاٹ کر رکھ دیا۔»

اس عورت کی موجودگی کا کوئی لحاظ کئے بغیر سالومیگا بےتحاشہ گالیاں بکنے لگا۔

«تو یہاں کیسے آنا ہوا؟ کیا بیماری کے بعد آرام کرنے آئے ہو؟»

«آرام کرنے کا وقت تو اب عاقبت میں نصیب ہوگا۔ مورچے پر وہ لوگ بڑی تیزی سے ہمارے خلاف بڑھتے آ رہے ہیں۔»

کمانڈینٹ نے اپنے سر سے اس عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بیچ ہی میں ٹوک دیا۔

«خیر یہ سب باتیں بعد میں کریں گے۔»

سالومیگا دھم سے ایک تپائی پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی ٹوپی اتار لی جس پر ایک بلا لگا ہوا تھا۔ بلے پر میناکاری کے کام میں ایک ترشول بنا ہوا تھا جو کہ، یوکرینی قومی جمہوریت، کا نشان تھا۔

«مجھے گولب نے بھیجا ہے» اس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ «باقاعدہ سپاہیوں کی ایک ڈویژن جلد ہی تبدیل ہوکر یہاں آئے گی۔ عام طور پر یہاں شہر میں کوئی نہ کوئی بکھیڑا

---

* بوگونیتس۔ سرخ فوج کی بوگون ریجمنٹ کا سپاہی۔ بوگون سترھویں صدی میں یوکرینی عوام کی آزادی کی جدوجہد کا ہیرو تھا۔

کھڑا ہوتا ہی رہے گا، اور مجھے ان سب چیزوں کا انتظام کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی غیر ملکی اعلی شخصیت کے ساتھ، حضور عالی، خود یہاں تشریف لائیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ، «تفریح» وغیرہ کے سلسلے میں کسی قسم کا ذکر نہ ہونے پائے۔ کیا لکھ رہے تھے تم؟»

کمانڈینٹ نے سگریٹ سرکا کر منھ کے دوسرے کونے میں دبا لی۔

«ایک بلا کے بدمعاش لڑکے سے پالا پڑ گیا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا یہاں ژوخرائی نام کا ایک شخص تھا۔ وہی جس نے ریلوے کے مزدوروں کو ہمارے خلاف بھڑکایا تھا۔ یاد ہے نا؟ ہاں تو ایک دن اسے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔»

«گرفتار کر لیا گیا۔ بڑا اچھا ہوا۔ پھر کیا ہوا» سالومیگا نے بڑی دلچسپی دکھاتے ہوئے اپنی تپائی اور قریب کھینچ لی۔

«ہوتا کیا۔ وہ اپنا اسٹیشن کمانڈینٹ اومیل چینکو بدھو تو ہے ہی، اس نے ایک قزاق کی نگرانی میں قیدی کو یہاں بھجوا دیا۔ راستے میں اس لونڈے نے جو اب یہاں بند ہے اس قیدی کو دن دھاڑے اس سپاہی سے چھڑا لیا۔ اس قزاق کے ہتھیار چھین لئے گئے اور دانت توڑ دئے گئے، اور قیدی نو دو گیارہ ہو گیا۔ ژوخرائی تو نکل گیا لیکن یہ چھوکرا ہم لوگوں کے ہاتھ آ گیا۔ ساری داستان میں نے اس کاغذ پر لکھ دی ہے، لو پڑھ لو» یہ کہہ کر اس نے لکھے ہوئے کاغذوں کی ایک گڈی سالومیگا کی طرف بڑھا دی۔

سالومیگا سرسری طریقے سے رپورٹ پڑھ رہا تھا اور بیچ بیچ میں وہ اپنے بائیں ہاتھ سے ورق الٹتا جاتا تھا۔

رپورٹ ختم کرکے اس نے کمانڈینٹ کی طرف دیکھا۔

«تو اس سے کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے؟»

کمانڈینٹ نے گھبرائے ہوئے انداز میں اپنی ٹوپی کا چھجہ آگے کو سرکا لیا۔

«پچھلے پانچ دنوں سے میں اس کے پیچھے پڑا ہوں۔ لیکن وہ صرف یہی کہتا ہے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے اسے نہیں چھڑایا۔ بدمعاش چھوکرا! ہوا یہ کہ جو سپاہی قیدی کو لا رہا تھا اس نے اس چھوکرے کو پہچان لیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس پر ٹوٹ پڑا اور اگر اس کا بس چلتا تو وہیں اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ بڑی مشکل سے میں اس قزاق کو الگ کر پایا۔ اور اس کا غصہ جائز بھی تھا کیوں کہ اسٹیشن پہنچنے پر اومیل چینکو نے اسے قیدی کو ہاتھ سے کھو دینے کے جرم میں پچیس ڈنڈے لگوائے تھے۔ اب اس چھوکرے کو یہاں بند رکھنے کا کوئی تک نہیں ہے۔ اس لئے میں یہ رپورٹ ہیڈکوارٹر بھیجے دے رہا ہوں اور میں نے ان لوگوں سے اجازت مانگی ہے کہ اس چھوکرے کا کام تمام کروا دیا جائے۔»

سالومیگا نے حقارت کے ساتھ فرش پر تھوکا۔

«میرے ہتھے چڑھتا تو میں اس سے سب قبول کرا لیتا۔ تم جانچ پڑتال کے معاملے میں کچھ کچے معلوم ہوتے ہو۔ بھلا آج تک کسی نے سنا ہے کہ دینیات کا طالب علم کامیاب کمانڈینٹ بن سکا ہو! بھلا تم نے ڈنڈے سے بھی کام لیا؟»

کمانڈینٹ آپے سے باہر ہو گیا۔

«تم حد سے آگے بڑھے جا رہے ہو۔ بس اپنا طنز اپنے ہی پاس رکھو۔ یہاں کا کمانڈینٹ میں ہوں اور میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ تم میرے معاملات میں دخل مت دو۔»

سالومیگا نے غصے سے بپھرتے ہوئے کمانڈینٹ کی طرف دیکھا اور زور کا قہقہہ لگاکر ہنسنے لگا۔

«ہا ہا ہا... بہت زیادہ نہ پھولو پادری کے بیٹے، نہیں تو

پھٹ جاؤ گے ۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمھارے معاملات ۔ مجھے یہ تو بتاؤ کہ یہاں ساموگون* کی دو بوتلوں کا بھی کچھہ انتظام ہو سکتا ہے؟»

کمانڈینٹ کھسیانی سی ہنسی ہنسا اور بولا:

«انتظام ہو تو سکتا ہے ۔»

«جہاں تک اس کا تعلق ہے» سالومیگا کاغذوں کی گڈی پر کئی بار انگلی مارکر کہا۔ «اگر تم سچ مچ اس کا کام تمام کرنا چاہتے ہو تو اس کی عمر سولہ کے بجائے اٹھارہ کر دو۔ بس چھہ کا ہندسہ اوپر سے گول کر دو۔ ورنہ ممکن ہے وہ لوگ اسے منظور نہ کریں ۔»

اس گودام میں تین شخص تھے ۔ ایک ڈاڑھی والا بوڑھا اپنا پھٹا ہوا کوٹ پہنے کروٹ کے بل تختے پر لیٹا ہوا تھا ۔ اس کی تکلی جیسی پتلی ٹانگوں پر، جنھیں اس نے سکیڑ رکھا تھا، لنن کا ایک ڈھیلا ڈھالا پتلون تھا ۔ وہ اس جرم میں گرفتار کیا گیا تھا کہ پیتلورا فوج کے جس سپاہی کو اس کے گھر پر ٹھہرایا گیا تھا اس کا گھوڑا اس کے سائبان سے چوری ہو گیا تھا ۔ اس کے علاوہ ادھیڑ عمر کی نوکیلی ٹھوڑی والی ایک عورت جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں عیاری سے پر تھیں فرش پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ وہ ساموگون بیچ کر اپنا پیٹ پالتی تھی ۔ اسے اس جرم میں لاکر یہاں بند کر دیا گیا تھا کہ اس نے ایک گھڑی اور کچھہ زیورات چرائے تھے ۔ تیسرا شخص تھا پاویل کورچاگن جو نیم بیہوشی کی حالت میں اپنی ملگجی ٹوپی پر سر رکھے کھڑکی کے نیچے ایک کونے میں لیٹا ہوا تھا ۔

---

* خانہ ساز شراب ۔

ایک نوجوان عورت، جس کے سر پر ایک رنگین رومال بندھا ہوا تھا اور جس کی آنکھیں دهشت کے مارے پھٹی ہوئی تھیں، اس گودام میں لائی گئی۔

ایک آدھہ لمحے تک تو وہ کھڑی رہی۔ پھر سامو گون بیچنے والی اس عورت کے پاس بیٹھہ گئی۔

«اے چھوکری تو بھی پکڑی گئی» اس عورت نے بڑی دلچسپی کے ساتھہ اس نووارد کا جائزہ لیتے ہوئے تیزی سے کہا۔

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن ساموگون بیچنے والی وہ عورت بھلا کب ہار ماننے والی تھی۔

«اے تجھے کیوں پکڑا ہے؟» خدا نخواستہ ساموگون کے سلسلے میں تو نہیں پکڑی گئی ہے؟»

وہ کسان لڑکی اٹھہ کھڑی ہوئی اور اس خبیث عورت کی طرف دیکھنے لگی جو مستقل اس کا بھیجا کھائے جا رہی تھی۔

«نہیں ان لوگوں نے مجھے میرے بھائی کی وجہ سے پکڑا ہے» اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

«کون ہے تمہارا بھائی؟» وہ بڑھیا اس کے پیچھے پڑی رہی۔

اتنے میں بوڑھا بول اٹھا۔

«ارے اسے چین کیوں نہیں لینے دیتی؟ اسے ایسے ہی کیا کم پریشانی ہوگی کہ تو اور بک بک کے اس کا بھیجا کھائے جا رہی ہے۔»

وہ عورت فوراً تختے کی طرف مڑی اور چمک کر بولی:

«تم کون ہوتے ہو مجھے نصیحت کرنے والے کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ میں تم سے تو بات نہیں کر رہی ہوں؟»

بوڑھے نے زور سے فرش پر تھوکا۔

«میں کہے دیتا ہوں اسے پریشان مت کرو۔»

ایک بار پھر گودام میں خاموشی چھا گئی وہ کسان لڑکی ایک بڑی سی شال بچھاکر اپنے بازو کا تکیہ لگاکر لیٹ گئی۔

ساموگون بیچنے والی عورت نے کھانا شروع کیا - بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے پاؤں تختے سے نیچے لٹکا کر فرش پر ٹکا دئیے - پھر اس نے دھیرے دھیرے ایک بیڑی لپیٹ کر تیار کی اور اسے سلگا کر پینے لگا - کمرے میں چاروں طرف کڑوے دھوئیں کے بادل چھا گئے -

« ایسی بدبو میں آدمی چین سے کہا بھی تو نہیں سکتا » بڑھیا بڑبڑائی - لیکن اس کے جبڑے حسب دستور تیزی سے چل رہے تھے - « بیڑی پی پی کے تم نے کمرے میں دھواں ھی دھواں کر دیا ھے - »

بوڑھے نے تضحیک کے انداز میں جواب دیا:

« کیوں کیا تمہیں اپنے دبلے ھو جانے کا خطرہ ھے؟ ویسے ھی کچھ دنوں میں تمہارا دروازے سے نکلنا دشوار ھو جائے گا - اور سب اپنے ھی پیٹ میں ٹھونس لینے کے بجائے تھوڑا سا اس لڑکے کو دے دوگی تو کیا حرج ھو جائے گا - »

عورت نے غصے سے اسے دیکھا -

« میں نے تو دینے کی کوشش کی تھی لیکن تمہیں اس سے کیا بحث؟ تم اپنا منھ کیوں نہیں بند رکھتے - میں تمہارا کھانا تو کھا نہیں رھی ھوں - »

وہ لڑکی ساموگون بیچنے والی اس عورت کی طرف مڑی اور کورچاگن کی طرف اشارہ کرکے اس نے اس سے پوچھا:

« بھلا تمہیں کچھ معلوم ھے کہ اسے یہاں کیوں لاکر بند کر دیا گیا ھے؟ »

اس بات پر کہ اس سے بھی کچھ پوچھا گیا ھے وہ عورت کھل اٹھی اور اس نے فوراً جواب دیا:

« یہ یہیں اسی شہر کا لڑکا ھے - کورچاگنا کا چھوٹا بیٹا ھے - اس کی ماں کھانا پکانے کا کام کرتی ھے - »

پھر لڑکی کے کان کے قریب منھ لاکر اس نے چپکے سے اس کے کان میں کہا:

«اس نے ایک بالشویک کو رہا کرا دیا تھا ــ یہیں ایک ملاح تھا ہمارے پڑوس میں زوزولیخا کے یہاں رہا کرتا تھا ــ»

اس نوجوان عورت کو وہ الفاظ یاد آئے جو دفتر میں اتفاق سے اس نے سن لئے تھے ــ «میں یہ رپورٹ ہیڈکوارٹر بھیجے دے رہا ہوں اور میں نے ان لوگوں سے اجازت مانگی ہے کہ اس چھوکرے کا کام تمام کروا دیا جائے ــ»

ایک کے بعد ایک سپاہیوں سے لدی ہوئی متعدد گاڑیاں اسٹیشن پر آتی جا رہی تھیں ــ اور باقاعدہ سپاہیوں کی بٹالینیں بھیڑوں کی طرح بھد بھد کرکے پلیٹ فارم پر اتر رہی تھیں ــ «زاپوروژیتس» نام کی زرہ بند گاڑی ایک بغلی ریلوے لائن پر دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی ــ اس گاڑی میں چار ڈبے تھے اور اس کی فولاد کی دیواروں میں دو نوکی کیلیں جڑی ہوئی تھیں ــ کھلے ہوئے ڈبوں پر سے توپیں اتاری گئیں اور جنگلے دار بند ڈبوں میں سے گھوڑے باہر لائے گئے ــ وہیں پر گھوڑوں پر زینیں کس دی گئیں اور گھوڑسوار سپاہی پیدل سپاہیوں کے بےپناہ انبوہ کو چیرتے ہوئے اسٹیشن کے باہر والے میدان میں پہنچ گئے جہاں گھوڑسواروں کا دستہ صفوں میں کھڑا کیا جا رہا تھا ــ

فوجی افسر اپنے اپنے دستوں کے نمبر پکارتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے ــ

اسٹیشن شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہا تھا ــ انسانوں کے اس شور و غوغا کرتے اور ادھر سے ادھر چکر کاٹتے ہوئے غیرمنظم مجمع کو ٹھونک پیٹ کر رفتہ رفتہ، باترتیب مربعوں کی شکل میں الگ الگ پلٹنوں میں کھڑا کر دیا گیا ــ اور تھوڑی ہی

دیر کے اندر فوجی سپاہیوں کا ایک سیلاب شہر میں امنڈ پڑا۔ شام کو بڑی دیر تک گاڑیوں کی چرچراہٹ، گڑگڑاہٹ سنائی دیتی رہی اور رائفل ڈویژن کی آخری ٹکڑی جو بہت پیچھے رہ گئی تھی، کافی دیر بعد شاہراہ پر دھیرے دھیرے آتی ہوئی دیکھی گئی۔

اس جلوس میں سب سے پیچھے ھیڈکوارٹر کی کمپنی بڑی چستی کے ساتھہ قدم ملاکر مارچ کرتی ہوئی چلی آ رہی تھی اور ایک سو بیس گلے سر میں سر ملاکر چلا رہے تھے:

یہ شور و غل کیسا
یہ دھوم دھام کیوں
یہ پیتلورا اور اسکی فوج ھے
اس میں شک ھی کیا ھے...

پاویل کورچاگن کھڑکی سے باہر جھانکنے کے لئے اٹھہ کھڑا ہوا۔ شفق شام کے دھندلکے میں اسے سڑک پر پہیوں کی گڑگڑاہٹ، متعدد قدموں کی دھمک اور گانا گاتی ہوئی سینکڑوں آوازوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

اس کے پیچھے سے نرم آواز میں کسی نے کہا:

«شہر میں فوج آئی ہوئی ھے۔»

کورچاگن نے مڑکر دیکھا۔

یہ آواز اسی لڑکی کی تھی جو وھاں ایک روز پہلے لائی گئی تھی۔

پاویل اس کی ساری داستان پہلے ھی سن چکا تھا۔ سامو گون بیچنے والی عورت نے کھود کھودکر اس لڑکی سے سب کچھہ معلوم کر لیا تھا۔ وہ اس شہر سے تقریباً ۷ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں رھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی گریٹسکو جو اب ایک سرخ

چھاپہ مار تھا، سوویتوں کے اقتدار کے زمانے میں غریب کسانوں کی کمیٹی کا صدر تھا ـ

جب سرخ فوجیں وہاں سے جانے لگیں تو گریٹسکو بھی اپنی کمر میں مشین گن کی ایک پیٹی باندھ کر ان کے ساتھ ہو لیا ـ اب اس کے گھر والوں کو مسلسل ستایا جا رہا تھا ـ ان کے پاس جو صرف ایک گھوڑا تھا وہ بھی ان سے چھین لیا گیا تھا ـ اس کے باپ کو کچھ دنوں کے لئے قید بھی کر لیا گیا تھا ـ اور جیل میں اسے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑی تھیں ـ گاؤں کا مکھیا، جو ان لوگوں میں سے تھا جنہیں گریٹسکو نے اچھی طرح مزا چکھایا تھا، اب محض ان لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی اجنبی کو ان کے گھر پر ٹھہرا دیتا تھا ـ وہ کنبہ بالکل تباہ ہو چکا تھا ـ اور ایک دن قبل جب کمانڈینٹ کسی تلاشی کے سلسلے میں اس گاؤں میں گیا ہوا تھا، تو مکھیا انہیں ساتھ لے کر اس لڑکی کے یہاں پہنچا ـ وہ لڑکی کمانڈینٹ کو پسند آ گئی تھی اور دوسرے ہی دن صبح وہ اس کو کچھ «پوچھ گچھ کرنے کے لئے» شہر لے آیا تھا ـ

کورچاگن کو بالکل نیند نہیں آ رہی تھی ـ لاکھ کوشش کرنے پر بھی اسے ایک لمحہ کے لئے سکون میسر نہیں تھا ـ اور ایک ہی خیال مسلسل اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا اور وہ کسی طرح اس خیال سے نجات نہیں حاصل کر پا رہا تھا اور وہ خیال یہ تھا کہ «اب کیا ہوگا؟»

اس کے زخم میں شدید درد ہو رہا تھا ـ کیوں کہ اس سپاہی نے جس سے اس نے قیدی کو چھڑایا تھا، اسے بڑی وحشیانہ بے رحمی کے ساتھ پیٹا تھا ـ

اس کے ذہن میں جو قابلِ نفرت خیال جمع ہوتے جا رہے تھے ان سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ ان دونوں عورتوں کی کھسر پھسر سننے لگا ـ

بہت ہی دھیمی آواز میں جسے آسانی سے سنا بھی نہ جا سکتا تھا وہ لڑکی اس عورت کو بتا رہی تھی کہ کمانڈینٹ نے اسے کتنی بری طرح ستایا تھا — وہ کبھی اسے دھمکاتا اور کبھی اس کی منت کرتا تھا — لیکن جب اس نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا تب وہ غصہ ہوکر اس پر برس پڑا تھا — اس نے کہا تھا: «میں تمہیں ایک کوٹھڑی میں بندکر دوں‌گا جہاں تم مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتیں — »

اس کوٹھڑی کے کونے کونے میں اندھیرا چوروں کی طرح چھپا بیٹھا تھا — ان لوگوں کے سامنے ایک اور رات منھ پھاڑے کھڑی تھی — گھٹن اور بےچینی کی رات — قید میں پاویل کی یہ ساتویں رات تھی لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں مہینوں گذر گئے ہوں — کوٹھڑی کا فرش بہت سخت تھا اور درد سے اس کا تمام جسم ٹوٹ رہا تھا — اب اس گودام میں وہ صرف تین ہی رہ گئے تھے — ساموگون بیچنے والی عورت کو خورونژی نے وادکا مہیا کرنے کے لئے رہا کر دیا تھا — بڑھئو تختے پر لیٹے خراٹے بھر رہے تھے جیسے اپنے گھر میں انگیٹھی کے پاس آرام سے سو رہے ہوں — وہ بوڑھا اپنی مصیبت کو انتہائی ضبط کے ساتھ، راحت و غم کے احساس سے بےنیاز ہوکر، برداشت کر رہا تھا — اور وہ رات بھر غفلت کی نیند سوتا تھا — خرستینا اور پاویل فرش پر تقریباً پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے — کل پاویل نے کھڑکی میں سے سرگئی کو دیکھا تھا — وہ بڑی دیر تک باہر سڑک پر کھڑا، بڑی افسردگی کے ساتھ ان مکانوں کی کھڑکیوں کو تکتا رہا تھا —

«شائد اسے معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں» پاویل کو خیال ہوا تھا —

پچھلے تین دنوں سے متواتر کوئی شخص اس کے لئے کھٹی کالی روٹی لاکر دے جاتا تھا — لیکن سنتریوں نے اسے یہ نہ بتایا

کہ کون لاتا تھا ۔ اور پچھلے دو دنوں میں کمانڈینٹ نے بار بار اس سے سوال کئے تھے ۔

آخر اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟

سوالات کے دوران اس نے کسی بھی بات کا اقرار نہیں کیا تھا بلکہ الٹے ہر بات سے انکار ہی کیا تھا ۔ وہ خاموش کیوں رہا تھا یہ تو وہ خود بھی نہ جانتا تھا ۔ وہ مضبوط، بہادر اور باہمت بننا چاہتا تھا ۔ ان لوگوں کی طرح جن کے بارے میں اس نے کتابوں میں پڑھا تھا ۔ لیکن پھر بھی اس رات کو جب اسے جیل خانے لے جایا جا رہا تھا اور اس پر پہرا رکھنے والے سپاہیوں میں سے ایک نے کہا تھا «حضور خورونڑی اسے اس طرح ساتھ گھسیٹے پھرنے سے کیا فائدہ ۔ ایک گولی میں سارا جھگڑا پاک ہو سکتا ہے ۔» تب وہ خوف سے کانپ گیا تھا ۔ سچ مچ، سولہ سال کی عمر میں مر جانے کا تصور بہت ہی ہولناک تھا ۔ موت کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ زندہ نہیں رہ جائےگا ۔

خرستینا بھی کچھ سوچ رہی تھی ۔ وہ اس نو عمر لڑکے سے زیادہ جانتی تھی ۔ شاید وہ خود بھی ابھی تک اپنے انجام سے آگاہ نہیں تھا... لیکن وہ تو دفتر میں سب کچھ سن چکی تھی ۔

وہ رات بھر بےچینی سے کروٹیں بدلتا رہا ۔ اسے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی ۔ خرستینا کو اس پر بڑا ترس آتا تھا ۔ اور اس کا دل پاویل کے لئے رحم کے جذبے سے لبریز تھا ۔ حالانکہ خود اپنے انجام کی دھشت اس کے دل پر ایک بوجھ بنی ہوئی تھی ۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی اس کے لئے کمانڈینٹ کے دھمکی بھرے الفاظ کو فراموش کر دینا نا ممکن تھا: «میں کل ہی تمھارا فیصلہ کردوںگا ۔ اگر تم مجھ سے راضی نہ ہوئیں تو میں تمہیں حوالات بھیج دوںگا ۔ وہاں قزاق تمہیں نہیں بخشیںگے ۔ اس لئے تم خود فیصلہ کر لو کہ ان دونوں باتوں میں سے تمہیں کیا پسند ہے ۔»

اف! وہ کس مشکل میں پھنس گئی تھی ۔ اور اسے کہیں سے رحم کی امید نہیں تھی ۔ اگر گریٹسکو جاکر سرخ فوجوں میں مل گیا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ زندگی بھی کتنی بےرحم ہے!

ایک دھیمے دھیمے درد سے اس کا گلا گھٹنے سا لگا اور ایک خوف مجبور اور بے بس مایوسی کے کرب کی وجہ سے اس کا تمام جسم گھٹی ہوئی خاموش سسکیوں سے کانپ اٹھا ۔

دیوار کے قریب کونے میں ایک سایہ هلتا هؤا نظر آیا ۔

«تم کیوں رو رهی هو؟»

امنڈتے هوئے جذبات کے طوفان میں خرستینا نے اپنا سارا دکھ درد اس تاریک کوٹھڑی کے اپنے خاموش رفیق کو چپکے چپکے سناکر اپنے دل کا بوجھ هلکا کیا ۔ وہ کچھ بھی نہ بولا ۔ صرف اس نے اپنے هاتھ بڑی نرمی سے اس کے هاتھوں پر رکھ دئے ۔

«خدا غارت کرے انہیں وہ مجھے ایذا پہنچا پہنچاکر مار ڈالیں گے» اس نے اپنے آنسو پی کر دهشت کے عالم میں دبی آواز میں کہا ۔ «اب مجھے کوئی نہیں بچا سکتا ۔»

پاویل اس لڑکی سے کہتا بھی تو کیا کہتا؟ کہنے کو تھا هی کیا ۔ زندگی ان دونوں کو ایک آهنی شکنجے میں جکڑکر پیسے ڈال رهی تھی ۔

کل جب وہ خرستینا کو لینے آئیں تو اسے شاید ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرنا چاهئے؟ لیکن اس سے کیا فائدہ هوگا ۔ وہ لوگ مارتے مارتے اس کا دم نکال دیں گے یا تلوار کے ایک هی وار میں اس کا کام تمام کر دیا جائے ۔ کسی طرح اس مصیبت زدہ لڑکی کو تسلی دینے کے خیال سے وہ اس کے هاتھوں کو بڑی محبت کے ساتھ تھپکنے لگا ۔ سسکیاں تھم گئیں ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر کھڑے هوئے سنتری کی ادھر سے گذرنے والوں کو للکارنے

کی آواز آتی تھی: «کون جا رہا ہے؟» اور پھر چاروں طرف وہی خاموشی چھا جاتی تھی۔ بڑھئو گھری نیند میں سوئے ہوئے تھے۔ وقت کا لامتناھی سلسلہ بہت دھیرے دھیرے رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد انتہائی حیرت کے ساتھ پاویل نے محسوس کیا کہ اس لڑکی نے اپنی باھوں میں اسے بھینچ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

«سنو» اسکے گرم ھونٹ اس کے کان میں کہہ رہے تھے۔ «میرے بچنے کا اب کوئی راستہ نہیں ھے۔ اگر افسر نہیں ھوگا تو وہ دوسرے لوگ ھونگے۔ آج کی رات تم مجھے اپنا لو میری جان! تاکہ میں اس کتے کو کنواری نہ ملوں۔»

«کیا کہہ رہی ھو تم خرستینا؟»

لیکن اس کی مضبوط باھوں نے اس کو نہ چھوڑا۔ اس کے گداز دھکتے ھوئے ھونٹ پاویل کے ھونٹوں کو دبانے لگے۔ ان سے چھٹکارا پانا مشکل تھا۔ لڑکی کے الفاظ میں سادگی اور محبت بھری ھوئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔

اس کے بعد وہ اپنے آس پاس کی ھر چیز سے بےخبر ھو گیا۔ دروازے پر لگا ھوا تالا، سرخ بالوں والا قزاق، کمانڈینٹ، بےرحمانہ پٹائی، آنکھوں آنکھوں میں بسر کی ھوئی وہ سات گھٹی ھوئی راتیں۔ وہ ان تمام باتوں کو بھول گیا اور ایک لمحہ کے لئے اس کے نزدیک صرف ان دھکتے ھوئے ھونٹوں اور آنسوؤں سے تر چہرے کا وجود باقی رہ گیا۔

دفعتاً اسے تونیا کی یاد آئی۔

وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی وہ پیاری پیاری دلفریب آنکھیں!

اپنی پوری طاقت مجتمع کرکے وہ خرستینا کی آغوش سے نکل آیا۔ وہ شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ھوا اٹھا اور جاکر جنگلہ پکڑ کے کھڑا ھو گیا۔ خرستینا کے ھاتھوں نے اسے پھر تلاش کر لیا۔

«کیوں، کیا بات ہے؟»

اس ایک سوال میں خرستینا کے تمام جذبات پنہاں تھے۔ پاویل اس کی طرف جھکا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر بولا:

«نہیں خرستینا یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ تم کتنی... اچھی ہو۔» اسے خود بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کے علاوہ اس نے لڑکی سے اور کیا کیا کہا۔

اس ناقابل برداشت سکوت کو توڑنے کے لئے وہ پھر سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا اور لکڑی کے تختے کی طرف چلا گیا۔ تختے کی کگر پر بیٹھ کر اسنے بوڑھے کو جگایا۔

«بابا مجھے ایک سگریٹ تو پلاؤ بڑی مہربانی ہوگی۔»

لڑکی اپنی شال میں لپٹی ہوئی کونے میں بیٹھی رو رہی تھی۔

دوسرے دن کمانڈینٹ کچھ قزاقوں کو ساتھ لے کر آیا اور خرستینا کو لے گیا۔ اس کی آنکھیں الوداع کہنے کے لئے پاویل کی آنکھوں کی متلاشی تھیں۔ ان میں الزام کی جھلک تھی۔ اور جب خرستینا کے چلے جانے کے بعد دروازہ بند ہو گیا تو پاویل کی روح پہلے سے بھی زیادہ ویران اور سونی ہو گئی۔

تمام دن کوشش کرنے پر بھی بابا پاویل سے ایک حرف نہ بلوا سکے۔ سنتری اور کمانڈینٹ کی گارڈ تبدیل ہو گئی۔ شام کے قریب اس کوٹھڑی میں ایک نیا قیدی لایا گیا۔ پاویل نے اسے پہچان لیا: وہ دولینیک تھا جو شکر صاف کرنے کے کارخانے میں بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا ناٹا سا آدمی تھا۔ اور وہ ایک پھٹے ہوئے کوٹ کے نیچے جو بالکل تارتار ہو گیا تھا پیلے رنگ کی ایک قمیص پہنے ہوئے تھا جس کا رنگ جابجا اڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی تیز نگاہوں سے پورے گودام کا جائزہ لیا۔

فروری ۱۹۱۷ ء میں جب انقلاب کی لہر اسکے شہر تک پہونچی تھی اس وقت پاویل نے اسے دیکھا تھا۔ اس زمانے کے ہنگامہ خیز

مظاہروں کے دوران میں پاویل نے صرف ایک بالشویک کی تقریر سنی تھی اور وہ بالشویک تھا دولینیک ۔ اس نے سڑک کے کنارے کے ایک مکان کی چہاردیواری پر چڑھکر فوجیوں کے سامنے تقریر کی تھی ۔ پاویل کو اس کی تقریر کے آخری الفاظ ابھی تک یاد تھے:

«جوانوں بالشویکوں کا ساتھ دو ۔ وہ تمہارے ساتھ کبھی غداری نہیں کریں گے!»

اس کے بعد سے اس نے اس بڑھئی کو نہیں دیکھا تھا ۔

بوڑھے کو اس کوٹھڑی میں ایک نیا ساتھی مل جانے کی بہت خوشی تھی ۔ کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ اس کے لئے دن بھر خاموش بیٹھے رہنا بہت دشوار تھا ۔ دولینیک تختے کی کگر پر بوڑھے کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ایک سگریٹ پی اور ہر چیز کے بارے میں اس سے متعدد سوال کئے ۔

اس کے بعد وہ نووارد کورچاگن کے پاس چلا گیا ۔

«کہو میرے نوجوان دوست کیا حال ہے؟» اس نے پاویل سے پوچھا ۔ «اور تم یہاں کس جرم میں لائے گئے ہو؟»

پاویل اس کے سوالوں کا جواب ،ہاں، ۔ ،نا، میں دیتا رہا ۔ دولینیک سمجھ گیا کہ وہ نوعمر لڑکا شبہہ کی وجہ سے ہی اتنے اختصار کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دے رہا ہے ۔ جب اس بڑھئی کو معلوم ہوا کہ پاویل کے خلاف کیا الزام لگایا گیا ہے تو اس کی ذہین آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ جاکر اس لڑکے کے پاس بیٹھ گیا ۔

«اچھا تو تم کہتے ہو کہ تم نے ہی ژوخرائی کو چھڑایا تھا؟ یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے ۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ انہوں نے تمہیں دھر لیا ہے ۔»

پاویل تعجب سے چونک کر اپنی کہنیوں کے بل بیٹھ گیا ۔

«میں کسی ژوخرائی کو نہیں جانتا ـ یہاں جس پر جو جی چاھتا ھے وہ الزام ٹھونک دیا جاتا ھے ـ»

دولینیک مسکراتا ھؤا کھسک کر اور قریب آ گیا ـ

«گھبراؤ نہیں میرے دوست، تمہیں مجھہ سے محتاط رھنے کی کوئی ضرورت نہیں ـ میں تم سے زیادہ جانتا ھوں ـ»

اس خیال سے کہ اس کی باتیں بوڑھے کے کان میں نہ پڑ جائیں وہ بہت دھیمی آواز سے بولتا رھا:

«یہاں سے ژوخرائی کو میں نے ھی رخصت کیا تھا وہ شاید اب اپنی منزل تک پہنچ بھی گیا ھوگا ـ فیودور نے بڑی تفصیل کے ساتھہ مجھے پورا واقعہ بتایا تھا ـ»

ایک لمحہ تک خاموشی سے سوچنے کے بعد دولینیک نے پھر کہا:

«دوست تم ھو بہت ھی جیوٹ کے آدمی ـ حالانکہ یہ برا ھؤا بلکہ کہنا چاھئے کہ بہت ھی برا ھؤا کہ انہوں نے تمہیں پکڑ لیا ھے اور انہیں تمام باتوں کا علم ھو گیا ھے ـ»

دولینیک نے اپنا کوٹ اتارا اور اسے فرش پر بچھاکر وہ دیوار کا سہارا لگاکر اس پر بیٹھہ گیا اور ایک دوسری سگریٹ تیار کرنے لگا ـ

دولینیک کے آخری فقرے سے پاویل پر حقیقت پوری طرح واضح ھو گئی ـ اب اس میں کسی قسم کا شبہہ نہیں رہ گیا تھا کہ دولینیک غلط قسم کا آدمی نہیں تھا ـ اس نے ژوخرائی کو رخصت کیا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ...

اسی دن شام کو پاویل کو یہ معلوم ھؤا کہ دولینیک کو پیتلورا فوج کے قزاقوں کو بھڑکانے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا ـ اس وقت وہ علاقائی انقلابی کمیٹی کی جاری‌کردہ ایک اپیل تقسیم کر رھا تھا جس میں سپاھیوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ھتھیار ڈال دیں اور جاکر سرخ فوج میں شریک ھو جائیں ـ

دولینیک اس بارے میں بہت محتاط تھا کہ کہیں وہ پاویل کو بہت زیادہ باتیں نہ بتا دے۔

«کون جانے» اس نے اپنے دل میں سوچا۔ «ممکن ہے وہ ڈنڈے سے اس لڑکے کی مرمت کریں۔ یہ ابھی بہت کم عمر ہے۔»

بہت رات گئے جب وہ لوگ سونے کے لئے لیٹ رہے تھے تب اس نے اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے ہوئے صرف اتنا کہا:

«لیکن کورچاگن معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ بہت برے پھنس گئے ہیں۔ دیکھو اب اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔»

دوسرے دن وہاں ایک نیا قیدی لایا گیا۔ لمبے لمبے کانوں اور پتلی سی گردن والا حجام شلیوما زلٹسر جسے شہر کے تمام لوگ جانتے تھے۔

«فوکس، بلووشٹین اور ٹریختنبرگ نمک اور روٹی لےکر اس کا استقبال کریں گے» وہ بڑے جوش کے ساتھ ہاتھ ہلا ہلاکر دولینیک کو بتا رہا تھا۔ «میں نے کہا کہ اگر ان کا جی چاہے تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا شہر کے باقی یہودی بھی ان کا ساتھ دیں گے؟ نہیں وہ کبھی ان کا ساتھ نہیں دیں گے میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ درحقیقت انہیں تو اپنا الو سیدھا کرنا ہے۔ فوکس کی دوکان ہے اور ٹریختنبرگ کی بھی آٹے کی چکی چلتی ہے۔ لیکن میرے پاس کیا ہے؟ ہم جیسے بھوکے مرنے والے لوگوں کے پاس کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں لوگ کنگال ہیں بالکل کنگال۔ خیر میری زبان تو کم بخت بہت چلتی ہی ہے۔ آج جب میں ایک افسر کی ڈاڑھی بنا رہا۔ ابھی جو حال میں یہاں آئے ہیں انہیں میں سے کوئی تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا: «آپ کا کیا خیال ہے کیا عطامان پیتلورا کو یہودیوں پر ڈھائے جانے والے ان مظالم کا علم نہیں ہے؟ وہ ہم لوگوں کے وفد سے ملاقات کریں گے یا نہیں؟» اوہ! اپنی اس کم بخت زبان کی وجہ سے کتنی بار مصیبت میں پھنس چکا

ہوں۔ جب میں اس کی ڈاڑھی بنا چکا اور اس کے چہرے پر پاؤڈر لگا چکا، اور یہ سب میں نے کیا بھی بڑے اسٹائل کے ساتھ، تو تم جانتے ہو اس افسر نے کیا کیا؟ وہ اٹھا اور مجھے پیسے دینے کے بجائے حاکموں کے خلاف بغاوت پھیلانے کے جرم میں گرفتار کر لیا۔» زلٹسر نے اپنے سینے پر گھونسہ مار کر کہا «میں پوچھتا ہوں اس میں بغاوت کی کیا بات تھی؟ آخر میں نے ایسی کیا بات کہی تھی؟ میں نے تو صرف اس سے پوچھا تھا... اتنی سی بات پر مجھے حوالات میں بندکر دیا گیا...»

بات کرنے کے جوش میں اس نے دولینیک کی قمیص کا ایک بٹن پکڑکر اینٹھہ دیا اور کئی بار اس کے ہاتھوں کو پکڑکر جھٹکا۔

شلیوما کی باتیں سن کر، جو غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا، دولینیک بےساختہ مسکرانے لگا۔

جب حجام اپنی بات ختم کر چکا تو اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: «لیکن شلیوما ایک بات ہے۔ تمہارے جیسے ہوشیار آدمی کو ایسی حماقت کرنا زیب نہیں دیتا۔ تم نے اپنی زبان کو ایک غلط موقع پر چھوٹ دے دی۔ میں تو کبھی بھی تم کو یہ مشورہ نہ دیتا کہ تم آکر یہاں پھنس جاؤ۔»

زلٹسر نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے اپنا سر ہلایا اور اپنے دونوں ہاتھہ بےبسی کے انداز میں پھیلا دئیے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ساموگون بیچنے والی عورت کو اندر دھکیل دیا گیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اس قزاق کو جو اسے وہاں لایا تھا بری بری گالیاں اور کوسنے دینے لگی۔

«تمہیں اور تمہارے کمانڈینٹ کو تو نمک مرچ لگاکر دھیمی آنچ پر بھونا جائے! خدا کرے وہ میری شراب پی کر چرمراکر رہ جائے اور اس کا دم نکل جائے!»

سنتری نے دھڑ سے دروازہ بند کر لیا اور ان لوگوں کو اس کے باہر سے تالا لگانے کی آواز سنائی دی۔

وہ عورت ایک تختے کی کگر پر بیٹھہ ہی رہی تھی کہ بوڑھے نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا:

«اچھا تو تو پھر ہمارے پاس لوٹ آئی۔ کیوں بکی بڑھیا؟ بیٹھو بیٹھو آرام سے بیٹھہ جاؤ۔»

ساموگون بیچنے والی عورت نے بوڑھے پر ایک تیر جیسی خفگی کی نظر ڈالی اور اپنی گٹھڑی اٹھاکر وہ دولینیک کے قریب فرش پر اتر کر بیٹھہ گئی۔

معلوم یہ ہؤا کہ اسے صرف اتنے عرصے تک کے لئے چھوڑا گیا تھا کہ وہ اپنے صیادوں کے لئے ساموگون کی کچھہ بوتلیں مہیا کر دے۔

یک بیک پاس والے گارڈ روم سے چیخ پکار کی آواز اور بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی، کوئی شخص کتوں کی طرح بھونک کر حکم دے رہا تھا۔ قیدی اپنی باتیں بند کر کے غور سے سننے لگے۔

قدیم گھنٹہ گھر والے بدنما گرجا گھر کے سامنے والے میدان میں عجیب و غریب واقعات ہو رہے تھے۔ اس چوک میں تین طرف صف بستہ فوجوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ باقاعدہ پیدل سپاہیوں کی ڈویژن کے دستے تمام جنگی لوازمات سے لیس وہاں پر جمع تھے۔

گرجا گھر کے صدر پھاٹک کی طرف رخ کئے سامنے کی طرف پیدل سپاہیوں کی تین ریجمنٹیں شطرنج کی بساط کے چارخانوں کے انداز میں کھڑی تھیں۔ ان کی صفیں اسکول کی چار دیواری تک پھیلی ہوئی تھیں۔

پیتلورا فوج کے سپاہیوں کا یہ مٹیالے رنگ کا، گندا سا ڈھیر، جس کے سپاہی اپنی رائفلیں زمین پر ٹکائے، اپنے سروں پر بیچ میں

سے کٹے ہوئے کدوؤں کی شکل کے بے تکے سے روسی خود پہنے اور کارتوس کی وزنی پیٹیوں کے بوجھ سے دبے کھڑے تھے، «صدر کمان» کی بہترین ڈویژن سمجھا جاتا تھا۔

زار کی پرانی فوج کے گوداموں کی حاصل کی ہوئی وردیوں اور فوجی بوٹوں سے پوری طرح لیس یہ ڈویژن اس فوجی اہمیت رکھنے والے ریلوے جنکشن کی حفاظت کے لئے یہاں بھیجی گئی تھی۔ اس کے بیشتر سپاہی کولک تھے جو پورے شعور کے ساتھ سوویتوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ شپیتووکا سے پانچ مختلف سمتوں میں ریل کی پٹڑیوں کی چمک دار آہنی پٹیاں بچھی ہوئی تھیں اور اگر پیتلورا کے ہاتھ سے یہ اسٹیشن نکل جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کا بیڑا بالکل ہی غرق ہو گیا۔ یوں بھی «صدر کمان» کے قبضے میں بہت ہی تھوڑا سا علاقہ رہ گیا تھا اور پیتلورا کا دارالسلطنت آجکل وینیتسا کا چھوٹا سا قصبہ بنا ہوا تھا۔

«عطامان اعلی» نے خود فوجوں کا معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس لئے ان کی تشریف آوری کے انتظار میں ہر چیز کیل کانٹے سے درست کر دی گئی تھی۔

چوک میں بالکل پیچھے کی طرف دور ایک کونے میں جہاں ان کے دیکھے جانے کا سب سے کم امکان تھا نئے رنگروٹوں کی ایک رجمنٹ کھڑی تھی۔ اس رجمنٹ میں طرح طرح کے بھدے غیر فوجی لباس پہنے ہوئے نوجوان تھے جن کے پاؤں میں جوتے تک نہ تھے۔ یہ سب کسانوں کے لڑکے تھے جنہیں بھرتی کرنے والے گروہ آدھی رات کے وقت سوتے سے اٹھاکر لائے تھے اور کچھ سڑکوں پر پھرتے ہوئے پکڑ لئے گئے تھے اور ان میں سے کسی کا بھی لڑائی میں حصہ لینے کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا۔

«ہمیں کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے» وہ آپس میں کہتے تھے۔ پیتلورا کے افسر حد سے حد یہی تو کر سکتے تھے کہ وہ ان

رنگروٹوں کو سنتریوں کی نگرانی میں شہر لاکر انہیں کمپنیوں اور بٹالینوں میں تقسیم کر دیں اور انہیں ہتھیار دے دیں۔ لیکن اس طرح جانوروں کے گلے کی طرح لائے ہوئے رنگروٹوں میں سے تقریباً ایک تہائی تو بھرتی کے دوسرے ہی دن غائب ہو جاتے تھے، اور جیسے جیسے دن گذرتے جاتے تھے ان کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی تھی۔

انہیں بوٹ تقسیم کرنا تو انتہائی حماقت کی بات ہوتی۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ بوٹوں کا ذخیرہ یوں ہی بہت کم تھا۔ پھر بھی یہ حکم جاری کیا گیا کہ ہر شخص جوتے پہن کر جبری فوجی بھرتی کے لئے حاضر ہو۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ رسی یا تار کے ٹکڑوں سے بندھے ہوئے عجیب و غریب قسم کے پھٹے پرانے جوتوں کی ایک اچھی خاصی نمائش سی لگ گئی۔

آخرکار انہیں ننگے پاؤں ہی مارچ کراکے پریڈ کے لئے لا کھڑا کیا گیا۔

پیدل سپاہیوں کے پیچھے گولب کی گھوڑسوار رجمنٹ تھی۔

گھوڑسوار سپاہی پریڈ دیکھنے کے لئے آئے ہوئے متجسس شہریوں کی بےپناہ بھیڑ کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھے۔

اور بھیڑ ہوئی بھی کیوں نہ۔ «عطامان اعلی» خود جو تشریف لانے والے تھے۔ اس قسم کے واقعات شہر میں کوئی آئے دن تو ہوتے نہیں تھے پھر اس مفت کے تماشے کو دیکھنے کا موقع کون ہاتھہ سے جانے دیتا۔

گرجا گھر کی سیڑھیوں پر فوج کے تمام کرنیل اور کپتان، پادری کی دونوں بیٹیاں، چند یوکرینی معلم، «آزاد قزاقوں» کا ایک گروہ اور شہر کا کبڑا سا میئر کھڑے تھے— غرض کہ «عوام» کی نمائندگی کرنے والی شہر کی تمام ممتاز شخصیتیں وہاں پر موجود تھیں۔ پیدل فوج کا انسپکٹر جنرل بھی ایک قفقازی چرکیسکا پہنے

انہیں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس پریڈ کا کمان اسی کے ہاتھہ میں تھا۔

گرجا کے اندر گرجا کا پادری واسیلی اپنے آپ کو ایسٹر کی نماز کے موقع پر پہنی جانے والی پوشاک اور دیگر لوازمات میں سجا رہا تھا۔

پیتلورا کا استقبال بہت ھی شاندار انداز سے کرنے کی تیاریاں تھیں۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ نئے بھرتی کئے ہوئے رنگروٹوں کو حلف وفاداری اٹھانا تھا اور اس غرض سے ایک زرد اور نیلا پرچم بھی مہیا کر لیا گیا تھا۔

ڈویژن کا کمانڈر ایک چھکڑا قسم کی پرانی فورڈ موٹر میں پیتلورا کا استقبال کرنے کے لئے اسٹیشن کو روانہ ھؤا۔

جب وہ چلا گیا تو پیدل فوج کے انسپکٹر نے کرنیل چرنیاک کو طلب کیا۔ وہ لمبے قد کا ھٹاکٹا چھیلاپن کے انداز میں اینٹھی ہوئی مونچھوں والا افسر تھا۔

«کسی کو اپنے ساتھہ لےکر چلے جاؤ اور اچھی طرح دیکھہ لو کہ کمانڈینٹ کا دفتر اور عقبی فوجیں بالکل ٹھیک ٹھاک ھوں۔ اگر وھاں تمہیں کوئی قیدی ملیں تو ان کا معائنہ کرکے ان میں سے جو فضول نظر آئیں انہیں رفوچکر کر دو۔»

چرنیاک نے ایڑیاں کھڑکاکر سلام کیا اور سب سے پہلے جس قزاق کپتان پر اس کی نظر پڑی اس کو ساتھہ لےکر گھوڑا دوڑاتا ھؤا وھاں سے روانہ ھو گیا۔

اس کے بعد انسپکٹر مہذبانہ انداز میں پادری کی بڑی بیٹی سے مخاطب ھوا:

«دعوت کا کیا انتظام ھے۔ سب ٹھیک ھے نا؟»

«ھاں ھاں کمانڈینٹ صاحب بڑی بھاگ دوڑ کر رھے ھیں» اس لڑکی نے اس خوبصورت انسپکٹر کو بڑی حریصانہ نظروں سے تکتے ہوئے جواب دیا۔

دفعتاً مجمع میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ایک گھوڑسوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے سڑک پر بےتحاشہ چلا آ رہا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کی گردن پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہلاکر چلاکر کہا:

«وہ لوگ آ رہے ہیں!»

«فال ان!» انسپکٹر نے کتے کی طرح بھونک‌کر کہا۔

تمام افسران اپنی اپنی جگہوں کی طرف لپکے۔

جوں ہی فورڈ گاڑی گرجا گھر کی برساتی میں پہنچی بینڈ نے «زندہ باد، یوکرین زندہ باد» کی دھن چھیڑ دی۔

دویژن کمانڈر کے بعد «عطامان اعلی» نے اپنا بھاری بھرکم جسم بڑی مصیبت سے موٹر کے باہر نکالا۔ پیتلورا اوسط قد کا آدمی تھا۔ اس کا نکیلا سر بہت مضبوطی سے اس کی لال، سانڈ جیسی گردن پر جما ہؤا تھا۔ وہ بہت ہی عمدہ قسم کے اونی کپڑے کا بنا ہؤا نیلے رنگ کا فوجی کوٹ پہنے ہوئے تھا جو کمر پر زرد رنگ کی پیٹی سے کس کر بندھا تھا۔ نہایت نرم اور نازک سانبھر کے چمڑے کے خول میں رکھا ہؤا ایک چھوٹا سا براؤننگ ریوالور پیٹی سے لٹک رہا تھا۔ اس کے سر پر خاکی رنگ کی چھجےدار فوجی ٹوپی تھی جس پر میناکاری کے کام میں بنے ہوئے ترشوں والا ایک بلا لگا تھا۔

سائمن پیتلورا کی شخصیت میں کوئی خاص جنگجویانہ بات نہیں تھی۔ دراصل وہ کسی اعتبار سے بھی فوجی آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اس نے بڑی ناپسندیدگی کے ساتھ انسپکٹر کی رپورٹ سنی۔ اس کے بعد میئر نے اس کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے چند الفاظ کہے۔

پیتلورا اپنے خیالات میں گم بڑی بے دلی سے سنتا رہا، اور

وہاں پر کھڑی ہوئی رجمینٹوں کو میٹر کے سر کے اوپر سے غور سے گھورتا رہا۔

«اچھا شروع کرو» اس نے انسپکٹر کو اشارہ کیا۔

پرچم کے قریب والے چھوٹے سے چبوترے پر کھڑے ہوکر پیتلورا نے فوجیوں کے سامنے دس منٹ تک تقریر کی۔

تقریر قطعی بےاثر ثابت ہوئی۔ پیتلورا نے جو ظاہر بظاہر سفر کی وجہ سے تھکا ہؤا تھا، بغیر کسی جوش اور ولولے کے تقریر کی۔ جب اس نے تقریر ختم کی تو فوجی دستور کے مطابق تمام سپاہیوں نے «سلاوا! سلاوا!» کے نعرے لگائے۔ اور وہ رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ اس کے بعد اس نے انسپکٹر اور ڈویژن کمانڈر کے ساتھہ فوجی دستوں کا معائنہ کیا۔

جس وقت وہ نئے رنگروٹوں کی صفوں کے سامنے سے گذرا تو حقارت آمیز خفگی سے اس کی تیوریوں پر بل آ گئے۔ اور جھنجھلاکر وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

معائنے کے اختتام کے قریب نئے رنگروٹوں کی پلٹنیں ایک ایک کرکے ٹیڑھی میڑھی قطاروں میں مارچ کرتی ہوئی پرچم کے قریب آئیں، جہاں گرجا گھر کا پادری واسیلی ہاتھہ میں انجیل لئے کھڑا تھا۔ وہ سب پہلے انجیل کو چومتے تھے اور پھر پرچم کے ایک کونے کو۔ اسی وقت ایک خلاف توقع واقعہ پیش آیا۔

ایک وفد جو نہ جانے وہاں کس طرح پہنچ گیا تھا، پیتلورا کی طرف بڑھا۔ اس گروہ کے آگے آگے اپنے ہاتھہ میں روٹی اور نمک کا تحفہ لئے ہوئے لکڑیوں کا رئیس بیوپاری بلووشٹین تھا۔ اس کے پیچھے کپڑوں کا تاجر فوکس اور تین دیگر باعزت بیوپاری تھے۔

بلووشٹین نے انتہائی خوشامد کے انداز میں جھک کر طشت پیتلورا کی طرف بڑھا دیا۔ قریب کھڑے ہوئے ایک افسر نے طشت اس کے ھاتھہ سے لے لیا۔

«اس شہر کے یہودی باشندے آپ کی خدمت میں اس ریاست کے سب سے اعلی حاکم ہونے کی حیثیت سے اپنا خلوص، تشکر اور تعظیم پیش کرتے ھیں۔ آپ سے التجا ھے کہ آپ ھمارے اس خراج تحسین کو قبول کیجئے۔»

«اچھا اچھا» پیتلورا نے اس کاغذ پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے بدبداکر کہا۔

پھر فوکس آگے بڑھا۔

«هم نہایت ادب کے ساتھہ آپ سے درخواست کرتے ھیں کہ آپ ھمیں اپنا روزگار پہلے کی طرح جاری کرنے کی اجازت دیں اور ھم آپ سے التجا کرتے ھیں کہ ھمیں یہودیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم سے پناہ عطا کی جائے۔» آخری الفاظ کہتے وقت فوکس کی زبان کچھہ لڑکھڑا گئی۔

پیتلورا کے چہرے پر غصے کی سیاھی چھا گئی۔

«میری فوج یہودیوں پر کوئی ظلم نہیں ڈھاتی۔ تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاھئے۔»

فوکس نے لاچاری کے انداز میں اپنے دونوں ھاتھہ پھیلا دئے۔

پیتلورا کے کندھے گھبراھٹ کی وجہ سے ایک عجیب انداز سے پھڑک رھے تھے۔ اس وفد کے اس طرح بےوقت آ جانے پر وہ بہت جھنجھلایا ھؤا تھا۔ وہ گولب کی طرف مڑا جو پیچھے کھڑا اپنی سیاہ مونچھوں کے بال چبا رھا تھا۔

«کرنیل صاحب آپ کے قزاقوں کے خلاف جو شکایت آئی ھے اس کی تحقیقات کر کے مناسب کاروائی کی جائے» پیتلورا نے کہا۔ پھر انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے روکھے پن سے کہا:

«اب تم پریڈ شروع کر سکتے ہو۔»

اس بدنصیب وفد کو اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ وہاں گولب سے مٹ بھیڑ ہو جائے گی۔ اس لئے وہ لوگ اب جلدی سے وہاں سے کھسک گئے۔

تمام تماشبینوں کی توجہ اب پوری طرح اس شاندار رسمی پریڈ کی تیاریوں پر مرکوز تھی۔ بڑی چستی کے ساتھ تڑاتڑ فوجی حکم دئے جا رہے تھے۔

گولب کے چہرے پر بظاہر کسی قسم کے اشتعال کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے وہ بلووشٹین کے قریب گیا اور کافی اونچی آواز میں اس کے کان میں کہا:

«دھریوں نکل جاؤ یہاں سے، نہیں تو میں یہیں تمہارا قیمہ بنوا دوں گا!»

بینڈ بج اٹھا اور پہلے دستے مارچ کرتے ہوئے چوک سے گزرے۔ جس وقت وہ پیتلورا کے مقابل پہنچے تو انہوں نے ایک ساتھ بالکل مشینی انداز میں «سلاوا» کا نعرہ لگایا اور پھر بڑی پھرتی کے ساتھ گھوم کر بڑی سڑک پر ہوتے ہوئے ادھر ادھر کی سڑکوں پر غائب ہو گئے۔ بالکل نئی خاکی وردیوں میں ملبوس سپاہیوں کی کمپنیوں کے آگے آگے افسران نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے بید ہلاتے ہوئے مارچ کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ چہل قدمی کے لئے نکلے ہوں۔ جس طرح فوج میں عام سپاہیوں کے لئے بندوق کے گز رائج کئے گئے تھے اسی طرح اس ڈویژن کے افسروں کے لئے یہ بیدوالا طریقہ بھی ابھی حال ھی میں رائج کیا گیا تھا۔

نئے رنگروٹ پریڈ میں سب سے پیچھے تھے۔ وہ بالکل ھی غیر منظم مجمع کی شکل میں آ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے بھی قدم نہیں مل رہے تھے اور ان میں ایک عجیب سی دھکا پیلی مچی ہوئی تھی۔

زبردستی بھرتی کئے ہوئے سپاہی جسوقت پیر گھسیٹتے ہوئے ادھر سے گذرے تو ان کے ننگے پاؤں سے ہلکی سی سرسراہٹ کی ایک آواز پیدا ہوئی ۔ افسر انہیں پیچھے سے ٹھیل رہے تھے اور اس بات کی انتہائی کوشش کر رہے تھے کہ ان میں کم سے کم نام ہی کے لئے تھوڑی سی ترتیب پیدا ہو جائے ۔ لیکن ان کی تمام کوششیں بیکار تھیں ۔ جس وقت ان لوگوں کی دوسری کمپنی ادھر سے گذر رہی تھی تو ایک کسان لڑکا جو لنن کی قمیص پہنے ہوئے تھا اور اس چبوترے سے سب سے قریب تھا، جس پر کھڑے ہوکر تمام افسران پریڈ کا معائنہ کر رہے تھے، «عطامان اعلی» کو پھٹی ہوئی آنکھوں سے منہہ کھولے ہوئے اس قدر حیرت کے ساتھہ دیکھنے لگا کہ اس کا پاؤں سڑک سے ایک گڑھے میں پڑ گیا اور وہ منہہ کے بل زمین پر گر پڑا ۔ اس کی رائفل ایک تیز آواز پیدا کرتی ہوئی سڑک کے پتھروں پر گری ۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے پیچھے والے سپاہی نے اس کو پھر گرا دیا ۔

کچھہ تماشبین قہقہہ لگاکر ہنس پڑے ۔ ساری کمپنی درہم برہم ہوگئی اور انتہائی بدنظمی کے ساتھہ چوک کو پار کرتی ہوئی باہر نکل گئی ۔ اس بدقسمت لڑکے نے اپنی رائفل اٹھائی اور باقی لوگوں کے پیچھے بھاگا ۔

پیتلورا نے اس گھٹیا منظر کی طرف سے منہہ پھیر لیا اور پریڈ ختم ہونے کا انتظار کئے بغیر ہی موٹر کی طرف چل دیا ۔ انسپکٹر بھی اس کے پیچھے لپکا اور بہت ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھا:

«کیا حضور عطامان کھانے پر تشریف نہیں لائیں گے؟»

«نہیں» پیتلورا نے سختی کے ساتھہ اسے جھڑک دیا ۔

سرگئی بروزاک، والیا اور کلمکا تماشبینوں کے مجمع میں گرجا گھر کی اونچی چہار دیواری سے سٹ کر کھڑے پریڈ دیکھہ رہے تھے ۔ سرگئی نے چہار دیواری کے جنگلے کی چھڑوں کو زور سے

پکڑ کر نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کے چہرے کی طرف نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔

«آؤ چلیں والیا۔ تماشا دکھاکر مداری گئے» اس نے جان بوجھ کر بلند آواز میں گستاخانہ انداز سے کہا اور چلنے کے لئے مڑا۔ لوگ اسے تعجب سے گھورنے لگے۔

کسی کی طرف توجہ نہ کرکے وہ پھاٹک کی طرف چل دیا۔ اس کی بہن اور کلمکا دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

کرنل چرنیاک اور کپتان سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے کمانڈینٹ کے دفتر پہنچے اور فوراً اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔ گھوڑوں کو ایک چپراسی کے حوالے کرکے وہ لوگ لمبے لمبے ڈگ بھرتے تیزی سے گارڈ ہاؤس میں داخل ہوئے۔

«کمانڈینٹ کہاں ہے؟» چرنیاک نے کڑک کر چپراسی سے پوچھا۔

«معلوم نہیں» اس آدمی نے ھکلاکر کہا۔ «کہیں گئے ہوئے ہیں۔»

چرنیاک نے اس گندے کمرے پر چاروں طرف نظر دوڑائی جس میں تمام چیزیں ادھر ادھر بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں۔ حتی کہ بستر تک نہیں لپیٹے گئے تھے۔ اس نے کمانڈینٹ کی گارڈ کے ان قزاقوں کے اوپر بھی نظر ڈالی جو ٹانگیں پھیلائے بستروں پر لیٹے ہوئے تھے اور جنھوں نے افسروں کے داخل ہونے پر اٹھنے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی۔

«یہ کیا سوؤروں کا باڑہ بنا رکھا ہے اس جگہ کو؟» چیرنیاک نے گرج کر کہا۔ «اور تمہیں سوؤروں کی طرح دن بھر لوٹتے رہنے کی اجازت کس نے دی؟» اس نے ان سپاہیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا جو نہایت آرام کے ساتھ اپنے بستروں پر چت لیٹے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک قزاق اٹھ‌کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ایک زور کی ڈکار لی اور غرا کر بولا:

«تم کیوں ٹیں ٹیں لگا رہے ہو؟ یہاں ہم سے ٹیں ٹیں کرنے والے آدمی کا انتظام ہے۔»

«کیا کہا؟» چرنیاک اس آدمی پر جھپٹا۔ «جانتا ہے کس سے باتیں کر رہا ہے حرامی کہیں کا؟ میرا نام کرنل چرنیاک ہے۔ سنا تو نے سور کے بچے! سب لوگ فوراً اٹھو، نہیں تو میں سب کی کھال کھنچوا لوں‌گا!» غصے سے پاگل ہوکر کرنل گارڈ ہاؤس میں تیزی سے ادھر ادھر چکر لگانے لگا۔ «میں تمہیں ایک منٹ کا وقت دیتا ہوں اس عرصے میں جھاڑو دےکر تمام کوڑا کرکٹ صاف ہو جائے۔ اور تم لوگ اپنے بستر سلیقے سے رکھ‌کر اپنے گندے تھوبڑے کسی کو دکھانے کے لائق بنا لو۔ نہیں تو تمہاری خیر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قزاق نہیں ڈاکوؤں کا گروہ رہتا ہے!»

غصے سے آپے سے باہر ہوکر کرنل نے ایک کوڑے کی بالٹی پر زور کی ٹھوکر ماری جو اس کی راہ میں حائل تھی۔

کپتان کا مزاج بھی کچھ کم گرم نہیں تھا۔ اور اس نے اپنے تین لڑوں والے کوڑے کو پھٹکارکر اپنی گالیوں کو اور زیادہ موثر بناتے ہوئے تمام لوگوں کو ان کے بستروں پر سے اٹھا دیا۔

«عطامان اعلی پریڈ کا معائنہ کر رہے ہیں، وہ یہاں کسی بھی لمحے آ سکتے ہیں۔ چلو جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ!»

جب قزاقوں نے دیکھا کہ معاملہ بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے اور انہیں سچ مچ کوڑے لگائے جانے کا خطرہ ہے تو وہ جلدی سے اٹھ‌کر بڑی پھرتی سے کام میں جٹ گئے۔ کیوں‌کہ اس معاملے میں چرنیاک کی شہرت سے وہ بخوبی واقف تھے۔

دیکھتے دیکھتے کام پورے زور شور سے شروع ہو گیا۔

«اب چل کر ذرا ایک نظر قیدیوں کو بھی دیکھ لینا چاہئے» کپتان نے تجویز پیش کی۔ «کچھ خبر نہیں یہاں ان لوگوں نے نہ جانے کسے کسے بند کر رکھا ہوگا۔ اگر کہیں عطامان اعلی معائنہ کے لئے آ گئے تو مصیبت ہو جائے گی۔»

«یہاں کی چابی کس کے پاس ہے؟» چرنیاک نے سنتری سے پوچھا «دروازہ فوراً کھولو۔»

ایک سارجنٹ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور چٹ پٹ اس نے تالا کھول دیا۔

«کمانڈینٹ کہاں ہے؟ آخر میں کب تک یہاں کھڑے کھڑے اس کا انتظار کرتا رہوں گا؟ اسے تلاش کر کے فوراً یہاں میرے پاس بھیجو» چرنیاک نے حکم دیا۔ «اور گارڈ کے تمام سپاہیوں کو باہر صحن میں جمع کرو۔ آخر یہ رائفلوں پر سنگینیں کیوں نہیں ہیں؟»

«ہم لوگ ابھی کل ہی یہاں آئے ہیں» سارجنٹ نے جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ کمانڈینٹ کی تلاش میں نکل گیا۔

کپتان نے ایک ٹھوکر مار کر گودام کا دروازہ کھول دیا۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کئی تو فرش سے اٹھ کھڑے ہوئے باقی بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔

«دروازہ اور کھول دو» چرنیاک نے حکم دیا۔ «یہاں روشنی کتنی کم ہے۔»

اس نے قیدیوں کے چہروں کا غور سے معائنہ کیا۔

«تمہیں یہاں کیوں بند کیا گیا ہے؟» اس نے لکڑی کے تختے کی کگر پر بیٹھے ہوئے بوڑھے سے ڈپٹ کر پوچھا۔

بوڑھا ذرا سا اٹھا پھر اس نے اپنی پتلون اوپر سرکائی اور افسر کی ڈانٹ سے خوفزدہ ہو کر وہ زیرلب بولا:

«یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ بس انہوں نے پکڑ کر

بند کر دیا تب سے یہیں بند ہوں۔ میرے مکان کے صحن سے ایک گھوڑا چوری ہو گیا تھا لیکن اس میں میرا کوئی ہاتھہ نہیں تھا۔»

«کس کا گھوڑا تھا؟» کپتان نے ٹوک کر پوچھا۔

«ظاہر ہے فوج کا گھوڑا تھا۔ میرے یہاں جو سپاہی ٹھہرائے گئے تھے انہوں نے اسے بیچ کر ساری رقم شراب میں اڑا دی اور اب سارا الزام میرے سر تھوپ دیا ہے۔»

چرنیاک نے بوڑھے پر جلدی سے ایک نظر دوڑائی اور بڑی بےصبری کے ساتھہ اپنے کندھے کو جھٹکتے ہوئے چلاکر کہا «اٹھاؤ اپنا سامان اور بھاگ جاؤ یہاں سے!» اس کے بعد وہ ساموگون بیچنے والی عورت سے مخاطب ہؤا:

بوڑھے کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اپنی چند ہی آنکھیں جھپکاتے ہوئے وہ کپتان سے مخاطب ہؤا:

«تو کیا اس کا مطلب ہے کہ میں سچ مچ یہاں سے جا سکتا ہوں؟»

کپتان نے اپنا سر اس انداز سے ہلایا کہ جیسے کہہ رہا ہو «جتنی جلدی یہاں سے دفع ہو جاؤ اتنا ہی اچھا ہے۔»

بوڑھے نے جلدی سے اپنی گٹھڑی اٹھائی جو تختے کی کگر پر لٹکی ہوئی تھی اور تیر کی طرح دروازے سے باہر ہو گیا۔

«اور تم کس جرم میں پکڑی گئی تھیں؟» چرنیاک نے ساموگون بیچنے والی اس عورت سے سوال کیا۔

اپنے منھہ کا گوشت بھری روٹی کا نوالہ نگل کر اس عورت نے جھٹ سے جواب دیا:

«بڑی بےانصافی ہے حضور، میرے مالک! مجھے بالکل ہی بے قصور یہاں لاکر بندکر دیا گیا ہے۔ آپ ہی انصاف کیجئے، ایک بےچاری بیوہ سے پہلے تو شراب پی لینا اور پھر اسے حوالات میں بند کر دینا کہاں تک مناسب ہے۔»

«تو تم ساموگون کا روزگار کرتی ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟» چرنیاک نے پوچھا۔

«روزگار؟ نہیں سرکار روزگار کیسا» اس عورت نے مظلومی کے انداز میں کہا۔ «کمانڈینٹ صاحب آکر چار بوتلیں لے گئے اور ایک دمڑی بھی نہیں دی۔ سرکار یہاں تو یہی حال ہے۔ شراب تو آکر پی جاتے ہیں مگر دام کبھی نہیں دیتے۔ آپ ہی بتلایئے بھلا یہ بھی کوئی روزگار ہے؟»

«بس بس بھاگ یہاں سے پھر چاہے بھاڑ میں جائے میری بلا سے!»

عورت نے حکم دھرائے جانے کا انتظار نہیں کیا۔ اس نے اپنی ٹوکری اٹھائی اور الٹے پاؤں چلتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی۔ بیچ بیچ میں وہ جھک جھک کر کرنل کا شکریہ ادا کرتی جاتی تھی۔ «خدا آپ لوگوں کو سلامت رکھے۔ مالک آپ کی صحت بنی رہے۔»

دولینیک یہ سارا تماشا آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ کسی بھی قیدی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ ان کی سمجھ میں صرف اتنی بات آ رہی تھی کہ یہ لوگ جو آئے ہیں وہ کسی قسم کے بڑے حاکم ہیں جنہیں اس بات کا اختیار ہے کہ ان کے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کر دیں۔

«اور تم؟» چرنیاک نے دولینیک سے مخاطب ہو کر کہا۔

«جب حضور کرنل صاحب تجھ سے باتیں کر رہے ہیں تو تجھ کو فوراً کھڑا ہو جانا چاہئے!» کپتان نے کتے کی طرح بھونک کر کہا۔

دولینیک بہت دھیرے دھیرے فرش پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

«کس لئے پکڑا گیا ہے تو؟» چرنیاک نے اپنا سوال دھرایا۔

چند سیکنڈ تک دولینیک کی آنکھیں کرنل صاحب کی نہایت صفائی کے ساتھ اینٹھی ہوئی مونچھوں اور ان کے صفاچٹ چہرے

پر اور پھر اس کے بعد ان کی نئی فوجی ٹوپی کے چھجے پر جمی رهیں جس پر میناکاری کے کام کا ایک بلا لگا ھوٗا تھا ۔ دفعتاً بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذھن میں کوند گیا: «شاید ترکیب کام کر جائے!»

«مجھے آٹھہ بجے کے بعد سڑک پر نکلنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا» اس کے دماغ میں جو بات سب سے پہلے آئی وھی اس نے کہھ دی ۔

وہ امید و بیم کے عالم میں بڑی بے قراری سے جواب کا منتظر تھا ۔

«رات کے وقت تم سڑک پر کیا کر رھے تھے؟»

«ایسی کوئی بہت رات بھی نہیں تھی یہی کوئی گیارہ بجے ھوں گے ۔» کہنے کو تو اس نے کہھ دیا لیکن اب اسے یقین نہیں رہ گیا تھا کہ اس کا یہ تکا نشانے پر ٹھیک بیٹھے گا ۔

جس وقت اس نے یہ حکم سنا: «نکل جاؤ یہاں سے» اس وقت اس کے پاؤں تھر تھر کانپ رھے تھے ۔

دولینیک جلدی سے دروازے سے باھر ھو گیا اور گھبراھٹ میں اپنا کوٹ بھی لینا بھول گیا ۔ کپتان نے دوسرے قیدی سے سوال کرنا شروع کر دیا تھا ۔

کورچاگن سے سب سے آخر میں سوالات کئے گئے ۔ وہ فرش پر بالکل ھکا بکا بیٹھا ھوٗا اس تمام کارروائی کو دیکھھ رھا تھا ۔ شروع میں تو اسے یقین نہیں آیا کہ دولینیک چھوڑ دیا گیا ھے ۔ آخر وہ لوگ سب کو اس طرح چھوڑے کیوں دے رھے ھیں؟ لیکن دولینیک... دولینیک نے تو ان سے یہ کہا تھا کہ وہ کرفیو توڑنے کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا... یک بیک تمام باتیں اس کی سمجھھ میں آ گئیں ۔

کرنل نے اس دبلے پتلے حجام زلٹسر سے اپنا وھی پرانا سوال کیا:

«تمہیں کس جرم میں پکڑا گیا تھا؟»

حجام نے جس کا چہرہ بوکھلاہٹ کے مارے زرد پڑ گیا تھا، سب کچھ سچ سچ قبول دیا:

«انہوں نے مجھ سے کہا میں لوگوں کو بھڑکا رہا تھا۔ لیکن مجھے اس بات کا قطعی علم نہیں ہے کہ آخر لوگوں کو بھڑکانے کے لئے میں نے ایسی کیا بات کی؟»

چرنیاک کے کان کھڑے ہوئے۔

«کیا کہا؟ بھڑکا رہے تھے۔ تم لوگوں کو کس سلسلے میں بھڑکا رہے تھے؟»

زلٹسر نے لاچاری اور حیرت کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دئے۔

«یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ عطامان اعلی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک عرضداشت پر یہودیوں کے دستخط جمع کئے جا رہے ہیں۔»

«کیسی عرضداشت؟» چرنیاک اور کپتان دونوں خطرناک انداز میں زلٹسر کی طرف بڑھے۔

«یہی عرضداشت کہ یہودیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر پابندی لگا دی جائے۔ آپ کو تو علم ہوگا کہ یہاں منظم طور پر یہودیوں پر بہت خوفناک مظالم ڈھائے گئے تھے۔ بستی کے تمام لوگوں کے دلوں میں دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔»

«بس بس بہت ہو چکا» چرنیاک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ «ہم تمہیں عرضداشت کا ایسا مزا چکھائیں گے کہ عمر بھر یاد رکھوگے۔ ذلیل یہودی کہیں کا۔» پھر کپتان کی طرف مڑکر اس نے کڑک کر کہا: «اس کا ذرا معقول انتظام کروا دو۔ تم اسے ہیڈ کوارٹر بھجوا دو۔ میں وہاں اس سے خود نبٹوں گا۔ سب معلوم ہو جائے گا کہ یہ عرضداشت کا جھگڑا کس نے کھڑا کیا ہے۔»

زلٹسر نے احتجاج کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کپتان نے اس کی پیٹھ پر گھوڑے والی چابک کا ایک ہاتھ کس کر رسید کر دیا ۔

«چپ رہ حرامی!»»

تکلیف سے تلملاکر زلٹسر لڑکھڑاتا ہؤا پیچھے ایک کونے کی طرف چلا گیا ۔ شدید تکلیف سے اس کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آ رہے تھے ۔ اس کے هونٹ کانپ رہے تھے اور وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں روک رہا تھا ، جس کی وجہ سے اس کا گلا رندھا جا رہا تھا ۔

جس وقت یہ سب کچھ هو رہا تھا اسی دوران میں پاویل اٹھ کر کھڑا هوگیا ۔ گودام میں زلٹسر کے علاوہ اب وہ اکیلا قیدی رہ گیا تھا ۔

چرنیاک اس لڑکے کے سامنے کھڑا اپنی تیز سیاہ پتلیوں والی آنکھوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا ۔

«تم یہاں کیا کر رہے هو بولو؟»

کرنل کے سوال کا فوراً جواب ملا:

«میں نے جوتے میں تلا لگانے کے لئے گھوڑے کی زین سے تھوڑا سا چمڑا کاٹ لیا تھا ۔»

«زین کس کی تھی؟» کرنل نے پوچھا ۔

«میرے گھر پر دو قزاق ٹھہرائے گئے هیں ۔ میں نے انہیں کی ایک پرانی زین سے جوتے کے تلے کے لئے چمڑا کاٹ لیا تھا ۔ اسی لئے ان قزاقوں نے مجھے پکڑ کر یہاں بند کروا دیا ۔» اپنی آزادی پھر حاصل کرنے کی مضطربانہ امید میں اس نے یہ بھی بتا دینا مناسب سمجھا ۔ «مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کی اجازت نہیں ہے ۔»

کرنل نے پاویل پر غصے اور تعجب کی نظر ڈالی ۔

«اس کمانڈینٹ کو بھی کیا کیا باتیں سوجھتی هیں ۔ خدا غارت کرے اسے ، چھانٹ چھانٹ کر کیسے کیسے قیدی جمع کر رکھے هیں

اس نے!» پھر دروازے کی طرف مڑتے ہوئے اس نے بلند آواز میں کہا: «تم گھر جا سکتے ہو اور اپنے باپ سے کہنا وہی تمہاری پٹائی کرے گا جس کے تم مستحق ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے!»

پاویل کو اب بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی باہر نکل آئے گا۔ پاویل نے جھپٹ کر فرش پر سے دولینیک کا کوٹ اٹھا لیا اور دروازے کی طرف لپکا۔ بھاگ کر گارڈ روم کو پار کرتا ہؤا کرنل کی پیٹھ کے پیچھے سے، جو اس وقت نکل کر صحن میں آ رہا تھا، وہ کھلے میدان میں پہنچ گیا۔ ایک لمحہ بعد ہی پاویل چھوٹی سی چور کھڑکی کو پار کرکے سڑک پر پہنچ گیا۔

بیچارہ زلٹسر اس گودام میں اکیلا رہ گیا۔ مظلوم نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر وہ بے ارادہ دروازے کی طرف دوچار قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اتنے میں ایک سنتری گارڈ ہاؤس میں داخل ہؤا۔ دروازہ بند کرکے سنتری نے اس میں ایک بڑا سا تالا ٹھونک دیا اور دروازے کے قریب اسٹول ڈال کر بیٹھ گیا۔

چرنیاک اپنے اس کارنامے پر بہت خوش تھا۔ باہر برساتی میں پہنچ کر اس نے کپتان سے کہا:

«اچھا ہی ہؤا جو ہم لوگوں نے جاکر دیکھ لیا۔ ذرا سوچو تو کیا کیا کچرا لوگ اس نے وہاں بھر رکھے تھے۔ اس کمانڈینٹ کو خود دو ہفتے تک حوالات میں بند رکھنا پڑے گا۔ چلو اب چلنا چاھئے کافی وقت ہو گیا۔»

سارجنٹ نے اپنے سپاھیوں کو میدان میں جمع کر دیا تھا۔ کرنل کو دیکھتے ہی وہ بھاگا ہؤا آیا اور اطلاع دی:

«حضور کرنل صاحب سب درست ہے۔»

چرنیاک گھوڑے کی ایک رکاب میں اپنا بوٹ ڈال کر بڑی صفائی سے اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ کپتان کا گھوڑا بدک کر

کچھ اچھل کود مچا رہا تھا۔ اپنے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے کرنل نے سارجنٹ سے کہا:

«کمانڈینٹ صاحب سے کہہ دینا کہ انہوں نے جو کچرا یہاں جمع کر رکھا تھا وہ سب میں نے صاف کروا دیا ہے۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ جس طرح انہوں نے یہاں کا انتظام چلایا ہے اس کی سزا کے طور پر میں انہیں دو ہفتے کے لئے گارڈ ہاوس میں بند کرواؤں گا اور جو ایک آدمی وہاں رہ گیا ہے اسے فوراً ہیڈکوارٹر بھجوا دو۔ اور دیکھو گارڈ بالکل تیار کھڑی رہے۔»

«جو حکم حضور کرنل صاحب» سارجنٹ نے فوجی سلام جھاڑتے ہوئے کہا۔

ایڑ لگاکر اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے کرنل اور کپتان چوک میں واپس پہنچ گئے جہاں پریڈ تقریباً ختم ہونے والی تھی۔

پاویل نے اچک کر ساتویں باڑ پار کی اور تھکن سے چور ہوکر کھڑا ہو گیا۔ اب اس میں آگے بڑھنے کا دم نہیں رہ گیا تھا۔ اس گھٹے ہوئے گودام میں اس نے کچھ کھائے بغیر جو دن کاٹے تھے اس کی وجہ سے اس کی ساری طاقت نچڑ گئی تھی۔

اب وہ کہاں جائے؟ گھر جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اگر وہ بروزاک کے یہاں گیا اور کسی نے اسے وہاں دیکھ لیا تو اس کے پورے کنبے پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بغیر کچھ سوچے وہ پھر اندھوں کی طرح بھاگا۔ شہر کے سرے والے سبزیوں کے کھیت اور چھوٹے چھوٹے باغیچے پیچھے چھوڑتا ہؤا وہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ ایک باڑ سے زور سے ٹکراکر وہ چونک پڑا اور اپنے ہوش سنبھال‌کر جب اس نے تعجب سے ادھر ادھر نظر ڈالی تو دیکھتا کیا ہے کہ اس اونچی سی باڑ کے پیچھے

ناظم جنگلات کا باغیچہ تھا ۔ تو اس کے تھکے ہوئے قدم اسے یہاں لے آئے تھے ۔ وہ قسم کھاکر کہہ سکتا تھا کہ ادھر آنے کا اس کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا ۔ لیکن وہ وہاں پہنچ کیسے گیا؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا ۔

پھر بھی اس کے لئے تھوڑی دیر آرام کرنا قطعی ضروری تھا ۔ صورت حال پر غور کرکے اسے اپنے اگلے قدم کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا ۔ اسے یاد آیا کہ باغ کے سرے پر ایک سمر ہاوس تھا ۔ وہاں اس پر کسی کی نظر نہیں پڑے گی ۔

وہ اچک کر باڑ کے اوپر چڑھ گیا اور پھر سرکتا ہوا نیچے باغ میں جا اترا ۔ مکان پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر جو درختوں کے بیچ سے مشکل سے ہی نظر آتا تھا وہ سمر ہاوس کی طرف روانہ ہوا ۔ یہ دیکھ کر اسکے چھکے چھوٹ گئے کہ وہ جگہ تقریباً ہر طرف سے کھلی ہوئی تھی ۔ گرمیوں کے زمانے میں اس کے چاروں طرف جنگلی انگور کی جو بیل پھیلی ہوئی تھی وہ مرجھا گئی تھی اور اب وہاں پر کچھ بھی نہیں تھا ۔

وہ واپس جانے کے لئے مڑا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی ۔ اس کے پیچھے ایک کتے کے بھونکنے کی خوفناک آواز آ رہی تھی ۔ اس نے پھرتی سے پیچھے مڑکر دیکھا کہ ایک بڑا سا کتا مکان کی سمت سے باغ میں آنے والے پتیوں سے ڈھکے ہوئے راستے پر ہوتا ہوا سیدھا اس کی طرف لپکا ہوا آ رہا ہے ۔ اس کی خونخوار غراہٹ سے باغ کا تمام سکوت درہم برہم ہو گیا تھا ۔

پاویل اپنی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہو گیا ۔ کتے کے پہلے حملے کا مقابلہ تو اس نے ایک زور کی ٹھوکر مارکر بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ۔ لیکن وہ جانور دوبارہ حملہ کرنے کے لئے دبک کر پیچھے ہٹ گیا ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس معرکے کا کیا انجام ہوتا

اگر اسی وقت ایک مانوس آواز میں کسی نے اس کتے کو بلا نہ لیا ہوتا: «چلو ادھر آو۔ ٹریزور! ادھر چلو!»

تونیا راستے پر بھاگی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اس نے ٹریزور کا پٹا پکڑکر اسے پیچھے کھینچ لیا اور باڑ کے قریب کھڑے ہوئے نوجوان سے کچھ کہنے کے لئے مڑی:

«تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ابھی کتا تمہیں بری طرح زخمی کر دیتا وہ تو خیریت ہوئی کہ میں...»

وہ کہتے کہتے دفعتاً رک گئی اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ اجنبی جو بھٹکتا ہوا اس کے باغ میں آ نکلا تھا اس کی شکل کورچاگن سے کتنی غیرمعمولی حد تک ملتی تھی۔

باڑ کے قریب کھڑے ہوئے شخص کے جسم میں حرکت سی ہوئی۔

«تونیا» اس نوجوان نے نرم لہجے میں کہا۔ «پہچانا نہیں مجھے؟»

تونیا چیخ پڑی اور شدید جذبات کے ساتھ لپک کر اس کے قریب پہنچ گئی۔

«پاویل تم؟»

ٹریزور اس کی چیخ کو حملہ کرنے کا اشارہ سمجھ کر آگے جھپٹا۔

«خبردار ٹریزور نیچے بیٹھو!» تونیا نے اس کے دو چار تھپڑ رسید کئے اور وہ برا مان کر اپنی ٹانگوں میں دم دبائے بہت غمگین ہو کر گھر کی طرف چل دیا۔

«تو تم چھوٹ گئے؟» تونیا نے پاویل کے ہاتھوں کو کس کر دباتے ہوئے کہا۔

«تو تمہیں اس کی اطلاع تھی؟»

«مجھے سب معلوم ہے» تونیا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ «لیزا نے مجھے سب بتا دیا۔ لیکن آخر تم یہاں پہنچے کیسے؟ کیا ان لوگوں نے تمہیں چھوڑ دیا؟»

«ہاں۔ لیکن غلطی سے» پاویل نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ «میں وہاں سے بھاگ آیا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ لوگ اب میری تلاش میں ہوں گے۔ مجھے واقعی نہیں معلوم کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا۔ لیکن یہاں پہنچ کر میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر تمہارے سمر ہاؤس میں آرام کر لوں۔ میں بری طرح تھک گیا ہوں» اس نے معذرتی انداز سے کہا۔

وہ اسے چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اور اس کے جسم میں رحم اور محبت کی ایک لہر دوڑ گئی، جس میں تشویش کی آمیزش بھی تھی اور مسرت کی بھی۔

«پاویل! میرے پیارے پاویل!» اس نے پاویل کے ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر زیرلب کہا۔ «میں تم سے محبت کرتی ہوں... سنتے ہو میری بات؟ لیکن میرے دوست تم اتنے ضدی کیوں ہو؟ اس بار تم اس طرح چلے کیوں گئے تھے؟ اب تم ہمارے پاس واپس آ رہے ہو میرے پاس... سمجھے؟ اب چاہے کچھ بھی ہو میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ ہمارا گھر بہت آرام دہ اور پرسکون ہے۔ یہاں تم جب تک چاہو رہ سکتے ہو۔»

پاویل نے سر ہلاکر انکار کیا۔

«اگر میں یہاں پکڑا گیا تو؟ نہیں میں تمہارے یہاں نہیں رہ سکتا۔»

تونیا کے ہاتھ پاویل کی انگلیوں کو کس کر دبا رہے تھے۔ اس کی پلکیں کانپ رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں ایک غیرمعمولی چمک تھی۔

«اگر تم نے انکار کیا تو میں تم سے پھر کبھی نہ بولوں گی۔

آرتیم یہاں نہیں ہے۔ اسے وہ لوگ فوجی بیڑے میں انجن چلانے کے لئے پکڑکے لے گئے ہیں۔ ریلوے کے تمام مزدوروں کو زبردستی فوج میں بھرتی کیا جا رہا ہے۔ آخر تم کہاں جاؤگے؟»

پاویل کو بھی یہی فکر تھی اور محض اس خیال سے کہ کہیں وہ اس لڑکی کو، جو اسے اتنی عزیز ہو گئی تھی، خطرے میں نہ ڈال دے۔ وہ وہاں رہنے سے انکار کرتا رہا۔ لیکن اپنے ہولناک تجربات کی وجہ سے وہ اتنا شل ہو چکا تھا اور بھوک اور تھکن اسے اتنا ستا رہی تھی کہ آخرکار وہ راضی ہو گیا۔

وہ تونیا کے کمرے میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی عرصے میں باورچی‌خانے میں ماں اور بیٹی کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہو رہی تھی۔

«ماں ایک بات سنو! کورچاگن میرے کمرے میں بیٹھا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا۔ وہی لڑکا جو مجھ سے پڑھنے آیا کرتا تھا؟ میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ ایک بالشویک ملاح کو قید سے چھڑانے کے جرم میں اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اب وہ جیل سے بھاگ آیا ہے۔ لیکن اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔» اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ «میری اچھی ماں اسے کچھ عرصے کے لئے یہاں رہنے کی اجازت دے دو۔»

ماں نے اپنی بیٹی کی التجا بھری آنکھوں کو بڑے تجسس کے ساتھ دیکھا۔

«اچھی بات ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن تم اسے رکھوگی کہاں؟»

تونیا کا چہرہ شرم سے عنابی ہو گیا۔ «وہ میرے کمرے میں صوفے پر سو جایا کرے گا» اس نے بہت سٹ‌پٹاکر کہا۔ «ابھی پاپا کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔»

اس کی ماں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال‌کر دیکھا۔

«اچھا تو کیا اسی وجہ سے تم ادھر کچھ دنوں سے اتنی پریشان اور رنجیدہ تھیں» اس نے پوچھا ۔

«ہاں ۔»

«لیکن وہ تو ابھی بالکل لڑکا ہی ہے ۔»

«مجھے معلوم ہے» تونیا نے بوکھلاہٹ میں اپنے بلاؤز کی آستین میں انگلی پھنساتے ہوئے جواب دیا ۔ «لیکن اگر وہ بھاگ نہ آیا ہوتا تو وہ لوگ یقیناً اسے گولی مار دیتے ۔»

یہ صاف ظاہر تھا کہ یکاترینا مخایلوونا گھر میں کورچاگن کی موجودگی سے بہت گھبرائی ہوئی تھی ۔ پاویل کی گرفتاری اور اپنی بیٹی کی ایک ایسے لڑکے کے ساتھ، جسے وہ اچھی طرح جانتی بھی نہیں تھی، اتنی نمایاں فریفتگی یہ دونوں ہی باتیں اس کی پریشانی کا باعث تھیں ۔

لیکن تونیا یہ سمجھ‌کر کہ معاملے کا فیصلہ ہو چکا ہے، اپنے مہمان کے آرام کا انتظام کرنے کے بارے میں سوچنے لگی تھی ۔

«ماں سب سے پہلے تو اسے نہا لینا چاہئے ۔ میں ابھی اس کا انتظام کئے دیتی ہوں ۔ وہ بہت ہی گندہ ہو رہا ہے ۔ بالکل چمنی کی کالک صاف کرنے والا چھوکرا معلوم ہوتا ہے ۔ نہ جانے کتنی مدت سے اس کے منھہ پر پانی کا چھینٹا بھی نہیں پڑا ہے ۔»

اتنا کہہ‌کر وہ پاویل کے نہانے کا پانی گرم کرنے اور اس کے لئے کچھہ صاف کپڑے تلاش کرنے کے واسطے پھرتی سے وہاں سے چلی گئی ۔ سب انتظام مکمل کر کے وہ بھاگی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور اس نے پاویل کا بازو پکڑ کر اسے اٹھا دیا اور زیادہ کچھہ کہے سنے بغیر اسے سیدھا غسل خانے میں لے جاکر کھڑا کر دیا ۔

«تم اپنے سب کپڑے بدل ڈالو ۔ تمہارے پہننے کے لئے میں نے یہ کپڑے نکال دئے ہیں ۔ تمہارے کپڑے تو دھلوانا ہوں گے ۔ تب تک کے لئے تم انہیں پہن لو» اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا - کرسی پر دھاری دار سفید کالر والی نیلے رنگ کی ایک ملاحوں جیسی قمیص اور ایک پتلون جس کے پائنچوں میں نیچے کی طرف جھول پڑا ہوا تھا، بڑے سلیقے کے ساتھ رکھے ہوئے تھے -

پاویل کو بڑی حیرت ہو رہی تھی - تونیا مسکرا دی -

«میں نے ایک بار ایک نقابی ناچ کے موقعہ پر اسے پہنا تھا» اس نے پاویل کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا - «تمہارے بالکل ٹھیک آئے گا - بس چٹ پٹ نہا ڈالو - جتنی دیر میں تم نہاؤگے اتنی دیر میں میں تمہارے لئے کھانے کا کچھ انتظام کئے دیتی ہوں -»

اس نے باہر نکل کر دروازہ بند کر لیا - پاویل کے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ وہ کپڑے اتار کر نہانے کے ٹب میں گھس جائے -

گھنٹے بھر بعد وہ تینوں ماں، بیٹی اور پاویل باورچی‌خانہ میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے -

پاویل کو شدید بھوک لگی ہوئی تھی - کافی عرصے کے بعد اسے اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے سامنے تین بار کھانا نکال کر رکھا جا چکا تھا اور وہ سب صاف کر گیا تھا - شروع میں تو وہ یکاترینا مخایلوونا سے کچھ شرماتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ کتنی بامحبت ہیں تو وہ بھی ان سے جلد ہی گھل مل گیا -

کھانا کھاکر وہ تینوں تونیا کے کمرے میں چلے گئے اور یکاترینا مخایلوونا کی درخواست پر پاویل نے اپنے تمام تجربات کہہ سنائے -

«اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟» اس کی بات ختم ہونے پر یکاترینا مخایلوونا نے پوچھا -

پاویل نے ایک لمحہ سوال پر غور کرنے کے بعد کہا «پہلے تو میں آرتیم سے ملنا چاہتا ہوں - اس کے بعد مجھے یہاں سے نکلنے کا کوئی انتظام کرنا ہوگا -»

«لیکن تم جاؤ گے کہاں؟»

«میرا خیال ہے کہ میں کسی طرح اومان تو پہنچ ہی جاؤں گا یا شاید کیئف چلا جاؤں ۔ اس بارے میں میں نے ابھی خود بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے ۔ لیکن مجھے یہاں سے جلدی سے جلدی نکل جانا چاہئے ۔»

پاویل کو کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا کہ حالات اتنی جلدی بالکل تبدیل ہو گئے ہیں ۔ ابھی صبح تک وہ ایک گندی سی کوٹھڑی میں بند تھا اور اب وہ اجلے صاف کپڑے پہنے یہاں تونیا کے پاس بیٹھا ہؤا تھا اور سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ وہ آزاد تھا ۔

وہ سوچنے لگا کہ زندگی بھی کیسی کیسی عجیب و غریب کروٹیں لے سکتی ہے ۔ ایک لمحہ آسمان تاریک رات کی طرح سیاہ نظر آتا ہے اور پھر دفعتاً سورج چمکنے لگتا ہے ۔ اگر اسے دوبارہ گرفتار کر لئے جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو اس وقت اس سے زیادہ خوش نصیب نوجوان دوسرا نہیں ہو سکتا تھا ۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ اس وقت بھی جب کہ وہ اس وسیع، پرسکون مکان میں بیٹھا ہوا تھا اس کے پکڑے جانے کا خطرہ باقی تھا ۔ یہاں اب اور زیادہ ٹھہرنے کے بجائے یہاں سے اسے جلد چلا جانا چاہئے، کہیں بھی چلا جانا چاہئے ۔ لیکن پھر بھی وہاں سے چلے جانے کا تصور اسکے لئے قطعی خوش گوار نہ تھا ۔ گیری بالڈی کی دلیری کی داستانیں پڑھنے میں اسے کتنا مزا آتا تھا! اسے گیری بالڈی پر رشک ہوتا تھا ۔ لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا تھا کہ گیری بالڈی کی زندگی بھی انتہائی دشواریوں میں گذری ہو گی ۔ کیوں کہ اپنے دشمنوں سے بچ کر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرنا پڑتا تھا ۔ اور اس نے تو ابھی مصیبت اور اذیت کے صرف سات ہی دن گذارے تھے لیکن وہ سات دن بھی اسے ایک سال کے برابر معلوم ہوئے تھے ۔

نہیں اس میں کوئی شبہہ نہیں تھا کہ وہ اس سانچے میں ہی ڈھلا ہؤا نہیں تھا جس میں ہیرو ڈھالے جاتے ہیں۔

«کیا سوچ رہے ہو؟» تونیا نے اس کی طرف جھک کر پوچھا۔ اس کی آنکھوں کی نیلگوں گہرائیاں اتھاہ معلوم ہو رہی تھیں۔

«تونیا تمہیں خرستینا کے بارے میں بتاؤں۔ سنو گی؟»

«ہاں ہاں ضرور» تونیا نے اس سے اصرار کے ساتھہ کہا۔

پاویل نے اسے اپنی اس ہم‌قفس لڑکی کی دردناک داستان سنائی۔

جس وقت اس نے اپنی داستان ختم کی اس وقت کمرے کی خاموشی میں گھڑی بڑے زور سے ٹک ٹک کر رہی تھی۔ «... اور اس کے بعد پھر ہم لوگوں نے اسے دوبارہ نہ دیکھا۔» اس کے الفاظ بڑی مشکل سے اس کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے۔ تونیا نے اپنا سر جھکا لیا اور امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کے لئے جن سے اس کا گلا رندھا جا رہا تھا، وہ اپنے ہونٹوں کو چبانے لگی۔

پاویل نے اس کی طرف دیکھا۔ «مجھے آج رات ہی یہاں سے چلا جانا ہوگا» اس نے فیصلہ‌کن انداز میں کہا۔

«نہیں نہیں آج رات تو میں تمہیں کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔»

وہ اس کے سخت بالوں میں بڑی محبت کے ساتھہ اپنی گرم اور نازک انگلیاں پھیرنے لگی...

«تونیا تمہیں میری مدد کرنی ہوگی۔ کسی کو اسٹیشن جاکر یہ پتہ لگانا ہوگا کہ آرتیم کا کیا حشر ہوا اور اس کے علاوہ سریوژا کے پاس میرا ایک پرچہ بھی لے جانا ہوگا۔ میں نے کوے کے ایک گھونسلے میں اپنا ریوالور چھپا رکھا ہے۔ میں تو اسے لینے کے لئے جانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ لیکن سریوژا مجھے لاکر دے سکتا ہے۔ تم میرا اتنا کام کر دو گی نا؟»

تونیا اٹھ کھڑی ہوئی۔

«میں ابھی لیزا سخار کو کے یہاں جاتی ہوں۔ ہم دونوں ساتھ اسٹیشن چلے جائیں گے۔ تب تک تم وہ پرچہ لکھ رکھو۔ میں اسے سریوژا کے یہاں دے آؤں گی۔ کہاں رہتا ہے وہ؟ اور اگر وہ تم سے ملنا چاہے تو کیا میں اسے یہ بتا سکتی ہوں کہ تم کہاں ہو؟»

پاویل نے جواب دینے سے پہلے ایک لمحہ کے لئے غور کیا۔

«اس سے کہہ دینا کہ آج شام کو یہاں تمہارے باغ میں ریوالور لے آئے۔»

تونیا بہت دیر بعد لوٹ کر آئی۔ پاویل گہری نیند سو رہا تھا۔ تونیا کے ہاتھ کے لمس نے اسے جگا دیا اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ تونیا اس کے اوپر جھکی کھڑی ہے اور مسرت سے مسکرا رہی ہے۔

«آرتیم ابھی تھوڑی دیر میں یہاں آئے گا۔ وہ ابھی لوٹ کر آیا ہے۔ لیزا کے باپ اس کی ضمانت لینے کو تیار ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ اسے ایک گھنٹے کی چھٹی دیں گے۔ اس کا انجن اسٹیشن پر کھڑا ہے۔ اسے میں یہ نہیں بتا سکی کہ تم یہاں ہو۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہہ دیا ہے کہ مجھے اس سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔ لو وہ آ ہی گیا!»

تونیا دروازہ کھولنے کے لئے بھاگی۔ آرتیم دروازے پر کھڑا حیرت سے ہکابکا دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آرتیم کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد تونیا نے دروازہ بند کر لیا، تاکہ اس کے پاپا جو مطالعہ کے کمرے میں ٹائی فس کے بخار میں مبتلا پڑے تھے، ان لوگوں کی باتیں نہ سن پائیں۔

ایک لمحہ اور گذرا اور پھر آرتیم نے پاویل کو اپنی بانہوں میں اتنا کس کر بھینچ لیا کہ اس کی ہڈیاں چرمرا گئیں۔ آرتیم چیخ اٹھا «پاویل! میرا بھیا!»

آخر کار یہ فیصلہ ہو گیا کہ پاویل کو دوسرے دن وہاں سے چلا جانا ہے۔ آرتیم نے اس کا ذمہ لے لیا کہ وہ اس بات کا انتظام کر دےگا کہ بروژاک اسے کازاتن جانےوالی گاڑی پر اپنے ساتھہ لیتا جائے۔

آرتیم جو عام طور پر بہت سنجیدہ اور خاموش طبیعت آدمی تھا اس وقت خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا، کیوں‌کہ اتنے دنوں کے بعد اسے اس کا بھائی پھر مل گیا تھا، جس کے انجام کے بارے میں سوچ سوچ‌کر اس نے شدید پریشانی میں اتنے دن گذارے تھے۔

«تو یہ طے رہا۔ کل صبح پانچ بجے مال گودام پہنچ جاؤگے۔ جس وقت انجن میں کوئلہ اور پانی بھرا جانے لگے تم چپکے سے اس پر چڑھہ جانا۔ میرا جی تو بہت چاہ رہا ہے کہ میں کچھہ دیر یہاں بیٹھہ‌کر تم سے باتیں کروں لیکن مجھے اب واپس جانا ہی ہوگا۔ میں کل تمہیں چھوڑنے آؤں‌گا۔ وہ لوگ ریلوے مزدوروں کی ایک بٹالین تیار کر رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو ہتھیاربند سنتریوں کے پہرے میں جانا پڑتا ہے۔ بالکل ویسی ہی حالت ہے جیسی کہ جرمنوں کے زمانے میں تھی۔»

آرتیم اپنے بھائی سے رخصت ہوکر چلا گیا۔

شام کا دھندلکا بڑی تیزی سے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سرگئی اب پستول لےکر آتا ہی ہوگا۔ اس کے انتظار میں پاویل اس تاریک کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بےقراری سے چکر لگا رہا تھا۔ تونیا اور اس کی ماں تونیا کے باپ کے پاس بیٹھی تھیں۔

چہاردیواری کے قریب اندھیرے میں سرگئی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اور دونوں دوستوں نے بڑی گرم‌جوشی کے ساتھہ ہاتھہ ملائے۔ سرگئی اپنے ساتھہ والیا کو بھی لایا تھا۔ وہ سب لوگ بہت ہی دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

«پستول تو میں نہیں لایا» سرگئی نے کہا۔ «تمہارے مکان کے پیچھے والے صحن میں پیتلورا فوج کے سپاہیوں نے اڈہ جما رکھا ہے۔ چاروں طرف ان کی گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں، اور اس کے علاوہ ان لوگوں نے الاؤ بھی جلا رکھا تھا۔ اس لئے پستول اتارنے کے لئے مجھے پیڑ پر چڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے بڑی شرمندگی ہے۔» سرگئی کو بہت ندامت محسوس ہو رہی تھی۔

«خیر کوئی بات نہیں» پاویل نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ «شاید یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اگر راستے میں، میں اس پستول کے ساتھ پکڑا جاتا تو بہت ہی برا ہوتا۔ لیکن خیال رکھنا موقع ملتے ہی تم اسے لے ضرور لینا۔»

والیا سرک کر پاویل کے اور قریب آ گئی۔

«کب جا رہے ہو تم؟»

«کل صبح منھ اندھیرے۔»

«اچھا یہ تو بتاؤ تم وہاں سے بھاگ کیسے نکلے؟»

دبی زبان بڑی تیزی سے بولتے ہوئے پاویل نے انہیں اپنی ساری داستان سنا دی۔ اس کے بعد وہ اپنے ان دونوں ساتھیوں سے رخصت ہؤا۔ سرگئی کی غیر معمولی سنجیدگی اس کے جذبات کی شدت کی غمازی کر رہی تھی۔

«اچھا پاویل ہمیں بھول نہ جانا۔ خدا حافظ» والیا نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہوئے اور دیکھتے دیکھتے رات کی تاریکی انہیں نگل گئی۔

مکان کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ اس مکمل سکوت میں صرف گھڑی کی مسلسل ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔

اس رات اس مکان کے دو مکینوں سے نیند کوسوں دور تھی اور وہ سوتے بھی تو کیسے جب کہ چھ گھنٹے بعد ہی وہ ایک

دوسرے سے جدا ہونے والے تھے اور اس کا بھی امکان تھا کہ وہ پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ اس مختصر سے عرصے میں کیا ان بےشمار خیالات اور جذبات کے اظہار کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا جو ان کے دلوں میں طوفان کی طرح امنڈ رہے تھے۔

شباب! پاکیزہ شباب! جبکہ نئے، انجانے، جذبے کا محض ایک مبہم سا احساس نبض کی تیز ہوتی ہوئی رفتار میں ہوتا ہے۔ جب آپ کا ہاتھ اتفاقاً اپنی محبوبہ کے سینے سے مس ہوکر دفعتاً خوف زدہ ہوکر کانپنے لگتا ہے اور ادھر ادھر بھٹکنے لگتا ہے۔ اور جب نوجوانی کی مقدس دوستی آپ کو اس آخری قدم سے باز رکھتی ہے! آپ کی گردن کے چاروں طرف محبوبہ کی بانہوں کے لمس اور آپ کے ہونٹوں پر اس کے دھکتے ہوئے بوسے سے زیادہ لطیف احساس اور کون سا ہو سکتا ہے!

اپنی دوستی کے دوران میں یہ صرف دوسری بار تھی کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا تھا۔ پاویل نے مار تو بہت ہاتھوں کی کھائی تھی لیکن پیار اسے اپنی ماں کے علاوہ کسی سے نصیب نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے اس کے وجود کی گہرائیوں تک میں شدت جذبات سے تلاطم سا برپا ہو گیا۔ زندگی نے ابھی تک اسے اپنا ظالمانہ پہلو ہی دکھایا تھا اور اسے اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ زندگی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت اس لڑکی نے اس کو سکھا دیا تھا کہ اصلی مسرت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

پاویل نے اس کی عطربار زلفوں کی خوشبو سونگھی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اندھیرے میں بھی اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی ہیں۔

«مجھے تم سے کس قدر محبت ہے تونیا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ

میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کیسے بتاؤں ۔»

اس کے دماغ میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا ۔ اس کے لچک‌دار جسم میں کتنی خود سپردگی تھی... لیکن نوجوانی کی دوستی ایک مقدس امانت ہے ۔

«تونیا جب یہ سب ہنگامہ ختم ہو جائے گا، تو مجھے یقیناً کہیں نہ کہیں میکینک کا کام مل جائے گا اور اگر تم واقعی مجھے چاہتی ہو اور اگر تم واقعی سنجیدہ ہو اور میرے جذبات کے ساتھ کھیل نہیں رہی ہو تو میں تم سے شادی کر لوں گا ۔ میں بہت اچھا شوہر ثابت ہوں گا ۔ میں تمہیں کبھی نہیں ماروں گا ۔ کبھی کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس سے تمہارے دل کو تکلیف ہو ۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں ۔»

اس ڈر سے کہ کہیں وہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں ہی نہ سو جائیں اور پھر تونیا کی ماں انہیں اس عالم میں دیکھ کر ان کے بارے میں بدگمان نہ ہونے لگے، وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ۔

ایک دوسرے کو کبھی نہ بھولنے کا سنجیدہ عہد کر کے جس وقت وہ دونوں سوئے اس وقت افق پر سحر کے آثار نمودار ہونے لگے تھے ۔

یکاترینا مخایلوونا نے پاویل کو بہت سویرے جگا دیا ۔ وہ اچھل کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا ۔ غسل خانے میں جاکر اس نے اپنے کپڑے اور جوتے پہنے اور اوپر سے دولینیک کا کوٹ پہن لیا ۔ اسی عرصے میں یکاترینا مخایلوونا نے تونیا کو بھی جگا دیا ۔

صبح کے کہرے کی دودھیا چادر کو چیرتے ہوئے وہ جلدی جلدی اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے ۔ جس وقت وہ دونوں پیچھے کے راستے سے لکڑی جمع کرنے کے یارڈ میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا

کہ آرتیم کوئلے سے لدے ہوئے انجن کے ڈبے کے پاس کھڑا بے قراری سے ان کا انتظار کر رہا ہے۔

سن سن کرتی ہوئی بھاپ کے بادلوں میں چھپا ہوا ایک دیوھیکل ریل کا انجن دھیرے دھیرے ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ بروزاک نے انجن کے باہر جھانک کر دیکھا۔

پاویل جلدی جلدی تونیا اور آرتیم سے رخصت ہوا اور پھر انجن کے دروازے پر لگا ہوا لوہے کا ڈنڈا پکڑ کر اوپر چڑھ گیا۔ پیچھے مڑ کر اس نے دیکھا کہ ریل کی کراسنگ کے پاس دو جانی پہچانی صورتیں کھڑی ہیں۔ اسے آرتیم کا بلند و بالا جسم اور اس کے برابر ہی تونیا کا چھوٹا سا نازک اور دل فریب جسم صاف نظر آ رہا تھا۔ ہوا کے تند جھونکے غیظ کے عالم میں تونیا کے بلاؤز کے کالر اور اس کے سرخی مائل بھورے بالوں کو اڑا رہے تھے۔ اس نے پاویل کی طرف ہاتھ ہلایا۔

آرتیم نے کنکھیوں سے تونیا پر ایک نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر کہ وہ بالکل روھانسی ہو رہی ہے اس نے ایک سرد آہ بھری۔

«ان دونوں کے درمیان اگر کوئی معاملہ نہ چل رہا ہو تو میں اپنا نام بدل دوں» اس نے اپنے دل میں کہا۔ «اور یہاں میں یہ سمجھتا تھا کہ پاویل ابھی ننھا بچہ ہی ہے۔»

موڑ پر پہنچ کر جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو آرتیم نے تونیا کی طرف مڑ کر کہا «تو ہم دونوں کی دوستی آئندہ بھی قائم رہے گی نا؟» اور تونیا کا ایک چھوٹا سا نازک ہاتھ اس کے بڑے سے پنجے میں کھو گیا۔

دور سے گاڑی کے تیز ہونے کی گڑگڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔

ساتواں باب

چاروں طرف سے کھائیوں کے محاصرے سے گھرے ہوئے اور کانٹےدار تاروں کے جال میں پھنسے ہوئے اس شہر کا ہفتہ بھر تک یہ عالم رہا کہ لوگ راتوں کو توپوں کی گھن گرج اور رائفل کی گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی لوریاں سنتے ہوئے سو جاتے اور صبح کے وقت انہیں سازوں کی دھن پر آنکھ کھولتے۔ صرف رات کے پچھلے پہر کچھ دیر کے لئے یہ شور و غوغا دھیما پڑتا تھا۔ لیکن اس دوران میں بھی گولوں کی دھمک سے یہ سکوت تھوڑی دیر بعد ٹوٹ جاتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت مورچوں پر قائم شدہ چوکیاں ایک دوسرے کی تھاہ لینے کی کوشش کرتی تھیں۔ بڑے تڑکے سے ہی سپاہی ریل کے اسٹیشن پر لگی ہوئی توپوں کے گرد اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ جوں ہی کوئی توپ انتہائی وحشیانہ انداز مین ڈکار لےکر ایک گولہ اپنے سیاہ دھانے سے اگل دیتی ویسے ہی سپاہی اسے بارود اور آہن کا دوسرا نوالہ کھلانے کے لئے لپک پڑتے۔ ہر بار جب کوئی توپچی توپ کا کھٹکا دباتا اس کے قدموں کے نیچے زمین کانپ اٹھتی۔ شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع اس گاؤں کے اوپر سے ہوکر توپ کے گولے سنسناتے ہوئے گذر رہے تھے۔ اس گاؤں پر سرخ فوجوں کا قبضہ تھا۔ گولوں کی آواز میں باقی تمام آوازیں گم ہو جاتی تھیں، اور ان کے گرتے ہی مٹی کے فوارے سے چھوٹنے لگتے تھے۔

سرخ فوجوں کا توپ‌خانہ ایک پرانی پولستانی خانقاہ کے میدان میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ خانقاہ گاؤں کے بیچوں بیچ ایک اونچی سی پہاڑی پر واقع تھی۔

توپ خانے کا فوجی کمیسار کامریڈ زاموستین اچھل کر کھڑا ہو گیا ـ وہ ایک توپ کے پچھلے حصے پر سر ٹکائے سو رہا تھا ـ اپنی پیٹی کو کستے ہوئے جس سے ایک بھاری ماؤزر پستول لٹک رہا تھا، اس نے گولے کی پرواز کی آواز سنی اور اس کے دھماکے کا انتظار کرنے لگا ـ اس کے بعد خانقاہ کا میدان اس کی پاٹ‌دار آواز سے گونج اٹھا:

«کامریڈ ہم اپنی باقی نیند اب کل پوری کریں گے ـ اب اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے!»

تمام توپچی اپنی اپنی توپوں کے پاس پڑے سو رہے تھے اور وہ سب بھی کمیسار کی ہی طرح پھرتی سے اٹھ کھڑے ہوئے ـ صرف ایک شخص نہیں اٹھا اور وہ تھا سدورچک، اس نے بڑی بےدلی سے اپنا سر اٹھایا اور نیند سے بوجھل آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا ـ

«سالے سور کہیں کے، ابھی ٹھیک سے اجالا بھی نہیں ہؤا اور یہ پھر چالو ہو گئے ـ محض ہمیں جلانے کے لئے حرامی کہیں کے ـ»

زاموستین ہنس دیا ـ

«ہاں سدورچک یہ لوگ ہیں بڑے بداخلاق ـ ٹھیک ہے نا؟ یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ اس وقت تمہارے سونے کا وقت ہے ـ»

وہ توپچی بڑبڑاتا ہؤا اٹھ کھڑا ہؤا ـ

چند منٹ بعد خانقاہ کے میدان میں لگی ہوئی توپیں چالو ہو گئیں اور شہر میں گولے پھٹنے لگے ـ

شکر کے کارخانے کی اونچی چمنی پر ایک تختے جوڑ کر تیار کئے ہوئے مچان پر پیتلورا فوج کا ایک افسر اور ایک ٹیلیفون کرنےوالا آدمی تعینات تھا ـ وہ لوگ چمنی کے اندروالی لوہے کی سیڑھی سے اوپر چڑھے تھے ـ

اس اونچی جگہ بیٹھ کر جہاں سے انہیں پورا شہر دکھائی دیتا تھا وہ اپنے توپچیوں کو ہدایات دے رہے تھے ـ شہر کا محاصرہ

کرنےوالی سرخ فوج کی ہر نقل و حرکت کو وہ اپنی دوربینوں
سے بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ آج بالشویکوں کی فوج خاص طور پر
سرگرم عمل تھی۔ ایک زرہ‌بند ریل گاڑی رفتہ رفتہ پودولسک
اسٹیشن کے قریب پہنچ رہی تھی، اور راستے بھر گاڑی کے اوپر
سے مسلسل گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ گاڑی کے اس پار پیدل
سپاہیوں کی حملہ‌آور صفوں کا مورچہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کئی
بار سرخ فوجوں نے طوفانی حملے کے ساتھ شہر پر قبضہ کرلینے
کی کوشش کی لیکن شہر کے اطراف کی خندقوں پر پیتلورا کی
فوجیں بڑی مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔ خندقوں سے گولیوں کی
بوچھار ہوتی اور ساری فضا ایک وحشیانہ شور سے گونج اٹھتی جو
بڑھتے بڑھتے ایک مسلسل دھاڑ کی شکل اختیار کر لیتی۔ حملے کے
وقت یہ شور اپنی انتہائی حد پر پہنچ جاتا۔ سیسے کی گولیوں کے
اس بےپناہ سیلاب کے آگے قدم ٹکانا ناممکن تھا۔ اور اس
ناقابل برداشت یلغار کی شدت کی تاب نہ لاکر بالشویکوں کی صفیں
پیچھے ہٹ جاتیں، اور جنگ کے میدان میں اپنے پیچھے جابجا بےحس
و حرکت لاشیں چھوڑ جاتی تھیں۔

آج شہر پر پہلے کے مقابلے میں زیادہ شدید اور پے درپے
حملے ہو رہے تھے۔ توپ کے گولوں کی صدائے بازگشت سے ساری
فضا مرتعش تھی۔ دھوئیں کی چمنی کے اوپر سے بالشویکوں کی
صفیں متواتر آگے بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دفعتاً سپاہی
زمین پر اوندھے لیٹ جاتے تھے اور پھر دوسرے لمحہ اٹھ‌کر کچھ
اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ یہ سلسلہ برابر جاری تھا اور انہیں
روکنا ناممکن تھا۔ اب کسی بھی دم اسٹیشن پر ان کا قبضہ ہونے
والا تھا۔ پیتلورا فوج کی اس ڈویژن کے پاس سپاہیوں کی جتنی
محفوظ طاقت تھی وہ بھی لڑائی میں جھونک دی گئی لیکن ان کے
مورچہ میں جو شگاف ڈال دیا گیا تھا اسے پر کرنا ان کے بس کی

بات نہیں تھی ۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگاکر پورے عزم کے ساتھ بالشویکوں کی حملہ‌آور صفیں اسٹیشن کے آس پاس کی سڑکوں پر جوق در جوق داخل ہونے لگیں ۔ اسٹیشن کی حفاظت کرنے والی پیتلورا ڈویژن کی تیسری ریجمنٹ کو ایک مختصر لیکن زبردست حملے کے بعد شہر کے سرے والے باغیچوں اور باغوں میں واقع اس کے آخری مورچے پر کراری شکست دی جا چکی تھی اور اب اس کے سپاہی تمام شہر میں تتربتر ہو گئے تھے ۔ قبل اس کے کہ وہ اس حملے کے اثرات پر کسی قدر قابو پاکر کسی نئے مقام پر اپنا مورچہ جماتے سرخ فوج کے سپاہی ایک سیلاب کی طرح سڑکوں میں داخل ہونے لگے اور انہوں نے پیتلورا فوج کے بچے کھچے دستوں کو بھی سنگینوں سے حملہ کرکے پسپا کر دیا ۔ یہ دستے پیچھے ہٹتی ہوئی فوج کو بھاگ نکلنے کا موقع دینے کے لئے تعینات کئے گئے تھے ۔

سرگئی بروژاک کے گھروالوں اور اس کے سب سے قریبی پڑوسیوں نے ایک تہہ خانے میں پناہ لے رکھی تھی ۔ لیکن سرگئی بروژاک کو وہاں ٹھہرنے کے لئے کوئی بھی قوت مجبور نہیں کر سکتی تھی ۔ اپنی ماں کی منتوں کے باوجود وہ اس سرد تہہ خانے سے باہر نکل آیا ۔ ایک زرہ بند فوجی موٹر اندھادھند گولیاں چلاتی ہوئی اس کے مکان کے قریب سے گڑگڑاتی ہوئی گذری ۔ موٹر پر ایک طرف اس کا نام لکھا ہؤا تھا: «ساگائی داچنی ۔» موٹر کے پیچھے پیچھے پیتلورا فوج کے سپاہی بوکھلائے ہوئے لشتم پشتم بھاگے آ رہے تھے ۔ ان میں سے ایک سپاہی چپکے سے کھسک کر سرگئی کے مکان کے باہر والے صحن میں بھاگ گیا اور وہاں پہنچ کر اس نے جلدی جلدی اپنی کارتوسوں کی پیٹی، خود اور رائفل پھینک دی اور پھر چہاردیواری پھاندکر ترکاریوں کے باغیچوں میں غائب ہو گیا ۔ سرگئی نے سڑک پر ادھر ادھر نظر

دوڑا کر دیکھا ـ جنوب مغربی اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر پیتلورا فوج کے سپاہی بھاگے چلے آ رہے تھے ـ انہیں بھاگنے کا موقع دینے کے لئے ایک زرہ بند موٹر دشمنوں سے ان کی حفاظت کر رہا تھا ـ شہر جانے والی سڑک بالکل ویران پڑی تھی ـ اتنے میں سرخ فوج کا ایک سپاہی اس سڑک پر تیزی سے بھاگ کر آتا ہؤا نظر آیا ـ وہ جھٹ سے زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور سڑک کی سمت گولیاں چلانے لگا ـ اس کے پیچھے سرخ فوج کا ایک دوسرا سپاہی نظر آیا اور پھر تیسرا اور... سرگئی انہیں آتا ہوا دیکھہ رہا تھا ـ وہ کمر دوہری کئے بھاگے آ رہے تھے، اور دوڑتے ہوئے بھی گولیاں چلا رہے تھے ـ ایک چینی سپاہی دونوں ہاتھوں میں دستی بم لئے سیدھا تن کر بغیر جھکے بھاگا چلا آ رہا تھا ـ اس کے چہرے کا رنگ کانسے کا سا تھا اور اس کی آنکھیں خون آلود تھیں ـ وہ صرف ایک بنیان پہنے تھا اور اس کی کمر کے گرد مشین گن کے کارتوسوں کی پیٹیاں لپٹی ہوئی تھیں ـ ان سب کے آگے سرخ فوج کا ایک سپاہی چھوٹی مشین گن لئے چلا آ رہا تھا ـ وہ بھی بالکل لڑکا ہی سا تھا ـ شہر میں داخل ہونے والی پہلی سرخ فوجوں کو دیکھہ کر سرگئی کا دل خوشی سے ناچ اٹھا ـ وہ لپک کر سڑک پر آ گیا اور اپنی پوری آواز کے ساتھہ چلایا:

«کامریڈ زندہ باد!»

وہ اتنے اچانک جھپٹ کر باہر نکلا تھا کہ چینی سپاہی کی ٹکر سے وہ زمین پر گرتے گرتے بچا ـ سرخ فوج کے اس سپاہی کا پہلا رد عمل تو یہ ہؤا کہ وہ اس لڑکے پر ٹوٹ پڑے لیکن پھر اس کے چہرے پر انتہائی مسرت کے جذبات دیکھہ کر وہ رک گیا ـ

«پیتلورا کہاں ہے؟» اس چینی نے زور سے ہانپتے ہوئے اس سے چلا کر پوچھا ـ

لیکن سرگئی نے اس کی بات نہیں سنی ۔ وہ بھاگ کر اپنے مکان کے باہروالے صحن میں گیا اور کارتوسوں کی پیٹی اور رائفل اٹھاکر جو پیتلورا فوج کا سپاہی وہاں چھوڑکر بھاگ گیا تھا، تیز قدم رکھتا ہؤا سرخ فوج کے سپاہیوں کے پیچھے ہو لیا ۔ جنوب مغربی اسٹیشن پر یلغار کرنے کے وقت تک اس پر کسی کی نظر بھی نہ پڑی ۔ اس اسٹیشن پر گولا بارود اور دوسرے رسد کے سامان سے لدی ہوئی کئی ریل گاڑیوں کو دشمن کے ہاتھہ سے چھڑاکر انہوں نے دشمن کی فوج کو جنگل میں کھدیڑ دیا ۔ اس کے بعد وہ آرام کرنے اور اپنی صفوں کو دوبارہ منظم کرنے کے لئے وہاں رک گئے ۔ مشین گن چلانے والے اس نوجوان نے سرگئی کے قریب آکر تعجب کے ساتھہ اس سے پوچھا :

«کامریڈ تم کہاں رہتے ہو؟»

«میں یہیں اسی شہر میں رہتا ہوں ۔ میں عرصے سے آپ لوگوں کے آنے کا انتظار کر رہا تھا ۔»

تھوڑی ھی دیر میں سرخ فوج کے سپاھی سرگئی کے گرد جمع ہو گئے ۔

«میں اسے جانتا ہوں» چینی نے ٹوٹی پھوٹی روسی میں کہا ۔ «اسی نے،کامریڈ زندہباد!، کا نعرہ لگایا تھا ۔ یہ بالشویک ھے ۔ ھمارا ساتھی ھے ۔ بڑا نیک لڑکا ھے» اس نے تعریف کے انداز میں سرگئی کے کندھے پر ھاتھہ مارکر مسکراتے ہوئے کہا ۔

خوشی کے مارے سرگئی کا دل بلیوں اچھل رہا تھا ۔ ان لوگوں نے اسے فوراً اپنی صفوں میں شامل کر لیا تھا، اسے اپنے ھی ایک ساتھی کی طرح ساتھہ لے لیا تھا ۔ اور ان کے دوش بدوش لڑتے ہوئے اس نے سنگینوں کی لڑائی میں اسٹیشن پر قبضہ کیا تھا ۔

شہر میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے ۔ سخت آزمائش کے دور سے اکتائے ہوئے شہری کوٹھڑیوں اور تہہ‌خانوں سے نکل

نکل کر شہر میں سرخ فوج کے دستوں کو آتے دیکھنے کے لئے اپنے اپنے مکانوں کے سامنے پھاٹکوں پر آ کھڑے ہوئے۔ یہیں سے سرگئی کی ماں اور اس کی بہن والیا نے اسے سرخ فوج کی صفوں میں دوسرے سپاہیوں کے ساتھہ قدم ملاکر مارچ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے سر پر ٹوپی تو نہیں تھی لیکن کمر میں کارتوسوں کی پیٹی پڑی ہوئی تھی اور اس کے کندھے پر ایک رائفل لٹک رہی تھی۔

آنتونینا واسیلیونا نے شدید خفگی کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھہ آسمان کی طرف اٹھا دئے۔

تو اس کا سریوژا بھی اس لڑائی کے جھمیلے میں پھنس گیا تھا! اسے اس حرکت کا خمیازہ بھگتنا پڑےگا! ذرا سوچنے کی بات ہے سارے شہر میں سب کے سامنے رائفل لئے اتراتا پھر رہا ہے! بعد میں یقیناً کوئی مصیبت آئےگی۔ آنتونینا واسیلیونا اپنے اوپر اور زیادہ قابو نہ رکھہ سکی۔

«سریوژا میں کہتی ہوں اسی دم گھر واپس آ جاؤ» اس نے چلاکر کہا۔ «بدمعاش آوارہ چھوکرے میں ابھی تیرا دماغ درست کئے دیتی ہوں۔ ابھی لڑائی کا سارا مزا معلوم ہو جائےگا!» یہ کہتی ہوئی وہ اپنے بیٹے کو واپس لے آنے کے پختہ ارادے سے سڑک پر جا پہنچی۔

لیکن اس بار سرگئی نے، اس کے سریوژا نے جس کے کان وہ بارہا اینٹھہ چکی تھی۔ اپنی ماں کو سختی کی نظروں سے دیکھا اور شرم اور توہین کے احساس سے تلملاکر اسے جھڑک کر کہا:

«چلا کیوں رہی ہو۔ میں یہیں رہوں‌گا جہاں ہوں۔» اور بغیر رکے ہوئے وہ آگے بڑھہ گیا۔

آنتونینا واسیلیونا غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گئی۔

«ماں کے ساتھہ ایسے برتاؤ کیا جاتا ہے! خبردار اب گھر میں قدم رکھنے کی ہمت نہ کرنا!»

«اچھا نہیں رکھوں گا» سرگئی نے مڑے بغیر ھی چلاکر کہا ـ
آنتونینا واسیلیونا بالکل بوکھلائی ہوئی سڑک پر کھڑی رھی ـ سر سے پاؤں تک گرد میں اٹے ہوئے سرد و گرم چشیدہ سپاھی صف بہ صف اس کے قریب سے ھوکر گذر رہے تھے ـ

«اماں روؤ نہیں! ہم تمہارے بیٹے کو کمیسار بنا دیں گے!» کسی نے خوش مزاجی سے مضبوط گونجتی ہوئی آواز میں کہا ـ ساری پلٹن میں بےساختہ ھنسی کی لہر دوڑ گئی ـ کمپنی کے آگے کچھہ آوازوں نے سر ملاکر ترانہ چھیڑا:

ساتھیوں، ڈھل بج رہے ھیں
جنگ کے لئے اپنے ھتھیار اٹھا لو
بہادری کے ساتھہ لڑتے ہوئے
ہم لوگ
آزادی کے دیس میں پہنچ
جائیں گے ـ

تمام سپاھی اس پرجوش کورس میں شریک ھو گئے ـ اور سرگئی کی گونجتی ہوئی آواز بھی اس تیز تر ہوتی ہوئی لے میں شامل ھو گئی ـ اسے ایک نیا کنبہ مل گیا تھا ـ اس کنبے میں ایک سنگین اس کی، سرگئی کی، بھی تھی ـ

لیش چینسکی کے مکان کے پھاٹک پر سفید دفتی کی ایک چھوٹی سی تختی لٹک رھی تھی جس پر یہ مختصر عبارت لکھی ہوئی تھی: «انقلابی کمیٹی ـ» تختی کے برابر ایک پرکشش پوسٹر لگا ھوا تھا، جس میں ایک سرخ فوج کا سپاھی ھر پڑھنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھہ رھا اور اس کی طرف اشارہ کر رھا تھا ـ وھاں مندرجۂ ذیل الفاظ لکھے تھے:

«کیا آپ سرخ فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں؟»

سیاسی محکمہ کے لوگوں نے رات بھر محنت کرکے تمام شہر میں یہ پوسٹر چپکائے تھے۔ پوسٹر کے قریب ہی شپیتووکا کے محنت‌کش عوام کے نام انقلابی کمیٹی کا پہلا اعلان نامہ چپکا ہؤا تھا :

«ساتھیوں! مزدوروں کی فوج نے اب اس شہر پر قبضہ کر لیا ہے! سوویت اقتدار دوبارہ قائم ہو گیا ہے۔ ہم آپ سے امن‌وامان قائم رکھنے کی درخواست کرتے ہیں۔ خونخوار قاتلوں کو بھگا دیا گیا ہے۔ لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ اب پھر کبھی لوٹ‌کر نہ آنے پائیں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے نیست ونابود کر دیا جائے تو سرخ فوج میں بھرتی ہو جائیے۔ محنت کشوں کی حکومت کو اپنا پورا تعاون دیجئے۔ اس شہر کا فوجی اقتدار محافظ شہر فوج کے سپہ‌سالار کے ہاتھہ میں ہے۔ غیر فوجی شہری معاملات کا انتظام انقلابی کمیٹی کرے گی۔

بقلم: دولینیک

صدر انقلابی کمیٹی۔»

لیش‌چینسکی کے مکان میں ایک نئی قسم کے لوگ نظر آنے لگے۔ اب ہر شخص کی زبان پر وہی لفظ «کامریڈ» تھا جسے کہنے کے جرم میں ابھی کل تک لوگوں کو اپنی جان سے ہاتھہ دھونا پڑتا تھا۔ کتنا ناقابل بیان حد تک دل گداز تھا یہ لفظ «کامریڈ»!

ان دنوں دولینیک کو آرام کرنے یا سونے کے لئے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ بڑھئی انقلابی حکومت قائم کرنے میں مصروف تھا۔

ایک چھوٹے سے کمرے کے دروازے پر کاغذ کا ایک ٹکڑا چپکا ہوا تھا ۔ جس پر پینسل سے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا: «پارٹی کمیٹی» ۔ اس کمرے میں کامریڈ اگناتئیوا بیٹھی ہوئی تھی ۔ وہ ہمیشہ کی طرح پرسکون اور مطمئن تھی ۔ سیاسی محکمے نے اس کے اور دولینیک کے ذمے سوویت اقتدار کے مختلف ادارے قائم کرنے کا کام سپرد کیا تھا ۔

ایک ہی دن بعد وہاں میزوں پر دفتر کے کارکن بیٹھے ہوئے تھے، اور ایک ٹائپ رائٹر بڑی تیزی سے کھٹ کھٹ کر رہا تھا ۔ پژتسکی یوں تو بہت جلدی گھبرا جاتا تھا لیکن اس کی دوڑ بھاگ کرنے کی صلاحیت اور سوجھہ بوجھہ سے کسی کو بھی انکار نہیں تھا ۔ اس کے ماتحت غذا اور رسد کا محکمہ قائم کیا گیا تھا ۔ اب چونکہ شہر میں سوویت اقتدار کے قدم مضبوطی سے جم چکے تھے، اس لئے پژتسکی نے جو اس سے پہلے شکر کے مقامی کارخانے میں مستری کا مددگار تھا، پختہ ارادے کے ساتھہ اس کارخانے کے بڑے عہدیداروں کے خلاف جہاد بول دیا ۔ کارخانے کے عہدیداروں کے دلوں میں بالشویکوں کے لئے شدید نفرت تھی اور وہ موقع کی تاک میں چپ چاپ دم دبائے اپنے دن پھرنے کا انتظار کر رہے تھے ۔

شکر کے کارخانے کے مزدوروں کی ایک میٹنگ میں اس نے بلاکسی لحاظ اور مروت کے بہت ہی سخت الفاظ میں صورت حال کا خلاصہ بیان کیا:

«اب وہ دن ہمیشہ کے لئے گذر گئے اور کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے» اس نے پولستانی زبان میں بولتے ہوئے اعلان کیا ۔ اپنے الفاظ کو زیادہ موثر بنانے کے لئے وہ بیچ بیچ میں منبر پر کس کر مکا مارتا تھا ۔ «اتنا ہی کیا کم ہے کہ ہم لوگ اور ہمارے آباؤ اجداد عمر بھر پوتوتسکیوں کی غلامی کرتے رہے ۔ ہم نے ان کے لئے محل تعمیر کئے اور اس کے معاوضے میں ہز ہائی نیس کاؤنٹ

صاحب نے ہمیں جو کچھ دیا وہ صرف اتنا تھا کہ ہم بھوک سے مرنے نہ پائیں۔

«کتنے عرصے تک پوتوتسکی گھرانے کے کاؤنٹ اور سانگوشکو گھرانے کے شہزادے ہماری گردنوں پر سوار رہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ پوتوتسکی گھرانوں کے حکمرانوں نے جس طرح روسیوں اور یوکرینیوں کو کچلا اسی طرح انہوں نے لاتعداد پولستانی مزدوروں کو بھی پیس ڈالا؟ لیکن پھر بھی کاؤنٹ کے گرگوں نے اب انہیں مزدوروں کے درمیان یہ افواہ پھیلا رکھی ہے کہ سوویت طاقت ان سب پر بہت سخت گیری اور استبداد کے ساتھ حکومت کرے گی۔

«ساتھیوں، یہ سراسر جھوٹ ہے! مختلف قوموں کے محنت کشوں کو اب سے پہلے کبھی بھی اتنی آزادی میسر نہ تھی۔ تمام مزدور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ جہاں تک ان رئیس زادوں کا سوال ہے ہم ان کا سر کچل کر رکھ دیں گے۔ آپ کو اس کے بارے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں ہونا چاہئے۔» اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ زور سے گھماکر منبر کے سرے پر مکا مارا۔ «وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے بھائی کو بھائی کا خون بہانے پر مجبور کیا؟ صدیوں تک بادشاہ اور نواب پولستانی کسانوں کو ترکوں کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجتے رہے۔ انہوں نے ہمیشہ ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف بھڑکایا ہے۔ ذرا سوچئے ان لوگوں کی وجہ سے کتنی خون ریزی اور تباہی ہوئی ہے۔ اور ان سب چیزوں سے فائدہ کسے پہنچا؟ لیکن اب یہ سلسلہ جلد ختم ہو جائے گا۔ ان نابدان کے کیڑوں کا اب آخری وقت آ گیا ہے۔ بالشویکوں کے اس ایک نعرے نے «دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ!» سرمایہداروں کے دلوں میں دہشت بٹھا دی ہے۔ اس نعرے میں ہماری نجات کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی نعرے میں ہمارے روشن مستقبل کی امید پنہاں ہے۔ اس دن کی امید جب

دنیا کے تمام محنت‌کش ایک دوسرے کے بھائی ہوں گے۔ ساتھیوں! کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیے!

«ایک دن وہ آئے گا جب پولینڈ میں بھی جمہوریت قائم ہو گی۔ لیکن وہ سوویت جمہوریت ہو گی، جس میں پوتوتسکیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ کیوں‌کہ ہم انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں گے اور اس سوویت پولینڈ کے مالک ہم خود ہوں گے۔ آپ سب لوگ برونک پتاشنسکی کو تو جانتے ہی ہوں گے؟ انقلابی کمیٹی نے اسے ہمارے کارخانے کا کمیسار مقرر کیا ہے، اب تک ہم کچھ بھی نہیں تھے۔ لیکن اب سب کچھ ہمیں ہوں گے۔ ساتھیوں ہمارا بھی جی کھول کر خوشیاں منانے کا وقت جلد آئے گا۔ صرف ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ ان چھپے ہوئے ناگوں کی زہریلی باتوں پر کان نہ دھرئے گا۔ آئیے ہم محنت‌کشوں کے نصب‌العین کو ہی اپنا عقیدہ بنا لیں، اور پھر ہم دنیا کی تمام قوموں کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم کر سکیں گے!»

یہ الفاظ بڑے خلوص اور جوش کے ساتھ کہے گئے تھے اور وہ اس سیدھے سادے مزدور کے دل کی گہرائی سے نکلے تھے۔ مجمع کے نوجوان افراد کی پرجوش صدائے تحسین و آفرین کے ساتھ وہ ڈائس سے نیچے اترا۔ لیکن نسبتاً معمر مزدور کچھ کہنے سے ہچکچا رہے تھے۔ کون جانے کس دن بالشویکوں کو شہر چھوڑ دینا پڑے اور پھر جو لوگ وہاں رہ جائیں گے انہیں جلدبازی میں کہے ہوئے ایک ایک لفظ کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اگر پھانسی نہ بھی دی گئی تب بھی نوکری سے تو ضرور ہی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

چھریرے سڈول جسم والا چرنوپزسکی جو محکمۂ تعلیم کا کمیسار مقرر کیا گیا تھا، اس وقت تک اس علاقے کا واحد مدرس تھا جو بالشویکوں کے ساتھ آیا تھا۔

انقلابی کمیٹی کے دفتر کے سامنے اسپشل ڈیوٹی کمپنی کا ڈیرہ جما تھا۔ اس کمپنی کے سپاھیوں کی ڈیوٹی انقلابی کمیٹی میں لگی تھی۔ رات کے وقت انقلابی کمیٹی کے دفتر کے پھاٹک کے قریب باغ میں ایک مشین گن ھر وقت تیار رکھی جاتی تھی، جس کی نال کے بعدوالے حصے سے گولیوں کی ایک لمبی پیٹی لٹکتی رھتی تھی۔ دو سپاھی رائفلیں لےکر رات بھر اس کے قریب کھڑے پہرہ دیتے تھے۔

انقلابی کمیٹی کے دفتر جاتے وقت کامریڈ اگناتیئوا ان میں سے ایک کے پاس گئی جو کہ سرخ فوج کا نوجوان سپاھی تھا، اور اس سے پوچھا:

«کامریڈ تمہاری عمر کیا ھے؟»

«یہی تقریباً سترہ سال ہے۔»

«کیا تم یہیں رھتے ھو؟»

سرخ فوج کے سپاھی نے مسکراکر کہا «ھاں میں ابھی پرسوں ھی لڑائی کے دوران میں فوج میں بھرتی ھوا ھوں۔»

اگناتیئوا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

«تمہارے باپ کیا کرتے ھیں؟»

«وہ ایک انجن ڈرائیور کے مددگار ھیں۔»

اسی وقت دولینیک وھاں آیا اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا جو فوجی وردی پہنے ھوئے تھا۔

«اچھا ھؤا کہ تم آ گئے» اگناتیئوا نے دولینیک سے مخاطب ھوکر کہا۔ «کومسومول کی ضلع کمیٹی کے کام کی ذمہ‌داری سونپنے کے لئے مجھے نہایت معقول لڑکا مل گیا ھے۔ یہ یہیں کا رھنے والا ھے۔»

دولینیک نے تیزی سے سرگئی پر ایک نظر ڈالی کیونکہ اگناتیئوا کی مراد اسی سے تھی۔

«ارے ہاں۔ تم زاخار کے لڑکے ہو نا؟ اچھی بات ہے بس کام شروع کر دو۔ نوجوانوں کو ذرا جوش دلا دو۔»

سرگئی نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔ «لیکن اس کمپنی میں میرے کام کا کیا ہوگا؟»

«وہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم اس کا انتظام کر لیں گے» دولینیک نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے گردن گھماکر کہا۔

دو ہی دن بعد شام کے وقت یوکرین کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مقامی کمیٹی کی داغ بیل پڑ گئی۔

سرگئی اپنی اس نئی زندگی کے طوفان میں دل و جان سے کود پڑا، جس نے اچانک بڑی تیزرفتاری سے پورے شہر کو اپنے گرداب میں لے لیا تھا۔ یہ نئی زندگی اس کے پورے وجود میں اتنے مکمل طور پر سرائت کر گئی تھی کہ وہ اپنے گھروالوں کو بالکل ہی بھول گیا، حالانکہ وہ اس کے اتنا قریب رہتے تھے۔

وہ، سرگئی بروزاک، اب ایک بالشویک تھا۔ تقریباً سویں بار اس نے اپنی جیب سے یوکرینی کمیونسٹ پارٹی کی کمیٹی کا جاری کیا ہوا وہ کاغذ نکالا جس پر یہ سند درج تھی کہ وہ یعنی سرگئی کومسومول ہے اور کومسومول کمیٹی کا سکریٹری ہے۔ اور اگر کسی کو اس بات پر شبہہ ہو تو اس کی تسکین کے لئے اس کے پاس وہ مین‌لیکر پستول تھا، اس کے عزیز دوست پاویل کا تحفہ، جو کرمچ کے ایک کام چلاؤ خول میں اس کے فوجی کوٹ کی پیٹی سے ہر وقت لٹکتا رہتا تھا۔ اس رعب دار پستول کے آگے اور کسی سند کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس وقت پاولوشکا بھی وہاں ہوتا!

سرگئی کا تمام‌تر وقت انقلابی کمیٹی کے سپرد کئے ہوئے فرائض کو پورا کرنے میں نکل جاتا تھا۔ آج بھی اگناتیئوا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس ڈویژن کے سیاسی محکمے سے انقلابی

کمیٹی کے لئے اخبارات اور کتابیں لانے کے لئے ان دونوں کو اسٹیشن جانا تھا۔ سرگئی جلدی سے اس عمارت سے نکل کر سڑک پر آیا، جہاں سیاسی محکمے کا ایک آدمی موٹر لئے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

پہلی سوویت یوکرینی ڈویژن کا سیاسی محکمہ اور اس کا ہیڈکوارٹر اسٹیشن پر ریل کے کچھ ڈبوں میں قائم کیا گیا تھا۔ اسٹیشن تک کا طویل راستہ طے کرنے کے دوران میں اگناتیشوا نے سرگئی سے بہت سے سوال پوچھے:

«تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟ کیا تم نے اپنی تنظیم بنا لی ہے؟ تمہیں اپنے دوستوں، مزدوروں کے بچوں، کو کومسومول میں شریک ہونے کے لئے تیار کرنا چاہئے۔ ہمیں بہت جلدی کمیونسٹ نوجوانوں کی ایک ٹولی کی ضرورت ہوگی۔ کل ہم کومسومول کی طرف سے ایک پرچہ لکھ‌کر شائع کروائیں گے۔ پھر ہم تھیٹر کے ہال میں نوجوانوں کی ایک بہت بڑی میٹنگ کریں گے۔ سیاسی محکمے میں پہنچ کر میں ابھی تمہارا تعارف استینووچ سے کرا دوں گی۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو وہ بھی نوجوانوں کے درمیان کام کر رہی ہے۔»

وہاں پہنچ کر معلوم ہؤا کہ استینووچ کٹے ہوئے سیاہ بالوں والی ایک اٹھارہ سالہ لڑکی ہے۔ وہ ایک خاکی رنگ کی نئی ٹیونک پہنے ہوئے تھی جس کی کمر پر چمڑے کی ایک پتلی سی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سرگئی کو اس کے کام کے متعلق بہت سی مفید باتیں بتائیں اور آئندہ بھی اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے رخصت ہونے سے پہلے اس نے اسے اخباروں اور کتابوں کا ایک بڑا سا بنڈل دیا جس میں ایک کتابچہ خاص طور پر اہم تھا جس میں کومسومول کا پروگرام اور قواعد و ضوابط درج تھے۔

اس دن بہت رات گئے جب سرگئی انقلابی کمیٹی کے دفتر واپس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ والیا باہر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی ـ

«تمہیں شرم نہیں آتی!» وہ چلا پڑی ـ «آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ اتنے دنوں سے اس طرح گھر سے غائب ہو؟ ماں رو روکر اپنا کلیجہ نکالے دے رہی ہے ـ اور بابا بھی تم سے بہت خفا ہیں ـ گھر چلو دیکھو کیسا جھگڑا ہوتا ہے؟»

«خیر سو تو نہیں ہونے کا» اس نے والیا کو یقین دلاتے ہوئے کہا ـ «میرے پاس گھر جانے کا بالکل وقت نہیں ہے ـ سچ کہتا ہوں ذرا بھی فرصت نہیں ہے ـ آج رات بھی میں گھر نہ آ سکوں گا ـ لیکن بڑا اچھا ہؤا کہ تم آ گئیں کیونکہ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں ـ آؤ اندر چلیں ـ»

والیا اپنے بھائی کو مشکل ہی سے پہچان سکی ـ وہ بالکل بدل گیا تھا ـ اس میں جوش ابلا پڑ رہا تھا ـ

جوں ہی وہ اندر جاکر بیٹھی سرگئی نے فوراً کام کی بات شروع کر دی:

«والیا دیکھو بات یہ ہے کہ تمہیں کومسومول میں شامل ہونا ہے ـ تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ یہ ہے کیا چیز؟ میرا مطلب ہے نوجوان کمیونسٹ لیگ ـ یہاں اس جماعت کا کام میرے ہی ذمہ ہے ـ کیوں تمہیں یقیں نہیں آ رہا ہے؟ اچھا تو لو یہ دیکھو!»

والیا نے وہ کاغذ پڑھا اور حیرت‌زدہ ہوکر اپنے بھائی کو دیکھنے لگی ـ

«کومسومول میں میں کیا کروں گی؟»

سرگئی نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلاکر کہا «میری پیاری بہن، کام تو ڈھیروں ہے ـ مجھے ہی دیکھو، میں کام میں اتنا پھنسا رہتا

هوں کہ مجھے رات کو سونے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ ہمیں پروپیگنڈا کا کام کرنا ہے۔ اگناتیئوا کہتی ہے کہ جلد ہی ہم لوگ تھیٹر کے ہال میں ایک میٹنگ کریں گے جس میں سوویت اقتدار کے بارے میں بتایا جائے گا۔ اس نے کہا ہے کہ مجھے وہاں تقریر کرنی ہوگی۔ میری رائے میں تو یہ غلط ہوگا کیوں کہ مجھے تقریر کرنی آتی ہی نہیں۔ میں یقیناً سب کچھ گوڑ کے رکھ دوں گا۔ اچھا تو بتاؤ کومسومول میں شریک ہونے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟»

«میں کیا بتاؤں میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اگر میں شامل ہو گئی تو ماں مجھ پر بہت ناراض ہوگی۔»

«والیا تم ماں کی فکر نہ کرو» سرگئی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ «وہ بات سمجھتی نہیں ہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی ہے کہ اس کے تمام بچے دن بھر اسی کے پاس بیٹھے رہیں۔ لیکن وہ سوویت حکومت کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے برخلاف وہ پوری طرح اس کے حق میں ہے۔ لیکن وہ چاہتی یہ ہے کہ لڑنے کا کام دوسروں کے بیٹے کریں۔ تم ہی بتاؤ بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے؟ تمہیں یاد ہے ژوخرائی نے ہمیں کیا بتایا تھا؟ اور پاویل کو ہی دیکھو وہ اپنی ماں کے متعلق سوچنے کے لئے رک نہیں گیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم نوجوان اپنے اس حق کے لئے لڑیں کہ ہم اپنی زندگی کو کسی لائق بنا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کروگی۔ کیوں والیا؟ ذرا سوچو تو کتنا اچھا رہے گا۔ تم لڑکیوں کے بیچ میں کام کرنا اور میں لڑکوں میں کام کروں گا۔ ہاں اچھا یاد آیا۔ میں اس لال بالوں والے شیطان کلمکا کو آج ہی گھیروں گا۔ اچھا والیا تو تم کیا کہتی ہو؟ تم ہمارے ساتھ ہو یا نہیں؟ میرے پاس

یہ ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے، جس سے تمہیں اس کی بابت سب کچھہ معلوم ہو جائے گا۔»

اس نے کومسومول کے قواعد و ضوابط کی کتاب اپنی جیب سے نکال کر اسے دے دی۔

«لیکن اگر پیتلورا پھر واپس آ گیا تو؟» والیا نے اس سے دبی زبان میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں اپنے بھائی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

یہ خیال تو سرگئی کے دماغ میں بھی ابھی تک نہیں آیا تھا اور وہ ایک لمحے تک اس سوال کے بارے میں سوچتا رہا۔

«مجھے تو خیر اوروں کے ساتھہ یہاں سے چلا ہی جانا پڑے گا» اس نے کہا۔ «لیکن تمہارا کیا ہوگا؟ ہاں اس سے ماں کو دکھہ تو بہت ہوگا۔» یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

«سریوژا، کیا تم مجھے اس طرح ممبر نہیں بنا سکتے کہ ماں کو یا کسی اور کو کچھہ پتہ نہ چلے؟ صرف تم کو اور مجھہ کو یہ بات معلوم ہو؟ مدد تو میں تب بھی اتنی ہی کر سکونگی۔ وہی سب سے اچھا طریقہ ہوگا۔»

«والیا میں بھی سمجھتا ہوں کہ تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔»

اسی وقت اگناتیئوا کمرے میں داخل ہوئی۔

«کامریڈ اگناتیئوا یہ میری چھوٹی بہن والیا ہے۔ میں ابھی اس سے کومسومول میں شامل ہونے کی بات کر رہا تھا۔ یہ ہماری جماعت کے لئے نہایت معقول ممبر ہوگی۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہماری ماں شاید کچھہ رکاوٹ ڈالے۔ کیا ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ ہم والیا کو ممبر بنا لیں اور کسی کو اس کی اطلاع نہ ہونے پائے؟ دیکھئے بات یہ ہے کہ شاید ہمیں کبھی یہ شہر چھوڑنا پڑے، میں تو خیر فوج کے ساتھہ چلا ہی جاؤں گا لیکن والیا کو ڈر ہے کہ اس صورت میں ماں کو بڑی تکلیف ہوگی۔»

اگناتیئوا ایک میز کے سرے پر بیٹھی ہوئی بڑی سنجیدگی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

«ہاں» اس نے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ «یہی سب سے اچھا ہوگا۔»

شہر بھر میں جو اعلان چپکائے گئے تھے انہیں پڑھ کر بہت سے نوجوان تھیٹر میں جمع ہو گئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ان نوجوانوں کی پرجوش گفتگو سے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح گونج رہا تھا۔ شکر کے کارخانے کے مزدوروں کا ایک دستہ بینڈ بجا رہا تھا۔ سامعین کو جن میں بیشتر شہر کے ہائی اسکول اور ثانوی اسکول کے طالب علم تھے میٹنگ سے زیادہ دلچسپی گانے بجانے کے اس پروگرام سے تھی جو میٹنگ کے بعد ہونے والا تھا۔

آخرکار پردہ اٹھا۔ اویزد کمیٹی کے سکریٹری کامریڈ رازین جو اسی وقت وہاں پہنچے تھے، اسٹیج پر آئے۔

سب کی نظریں اس پستہ قد دبلے پتلے اور چھوٹی سی نکیلی ناک والے شخص کی طرف اٹھ گئیں اور سب نے اس کی تقریر بڑے غور سے سنی۔ اس نے ان لوگوں کو جدوجہد کی اس طوفانی لہر کے بارے میں بتایا جو تمام ملک پر چھا گئی تھی، اور اس نے نوجوانوں کو کمیونسٹ پارٹی کی مدد کے لئے مجتمع ہونے کی دعوت دی۔ اس نے ایک کہنہ مشق مقرر کی طرح تقریر کی۔ لیکن اپنی تقریر کے دوران میں اس نے «تقلید پسند مارکسٹ»، «سوشل جارحانہ وطن پرست» وغیرہ قسم کی اصطلاحوں کا بڑی کثرت سے استعمال کیا جنہیں اس کے سننے والے بالکل ہی نہیں سمجھتے تھے۔ پھر بھی جس وقت اس نے اپنی تقریر ختم کی ان سب نے

بڑے جوش کے ساتھ تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد دوسرے مقرر کا تعارف کراکے وہ چلا گیا۔ یہ دوسرا مقرر سرگئی تھا۔

وہی ہوا جس کا سرگئی کو ڈر تھا۔ اس وقت جب کہ وہ سامعین کے سامنے کھڑا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ کچھ دیر تک تو وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا رہا لیکن اگناتیئوا نے اس کی پریشانی دور کر دی۔ مجلس صدارت میں اپنی جگہ بیٹھے ہی بیٹھے اس نے چپکے سے اشارہ دیا: «انہیں مرکزہ کی تنظیم کے بارے میں بتاؤ۔»

اشارہ پاتے ہی سرگئی مطلب کی بات پر آ گیا۔

«ساتھیوں اس سلسلے میں جو کچھ کہنا تھا وہ تو سب کچھ آپ کے سامنے کہا جا چکا ہے۔ اب ہمیں جو کام کرنا ہے وہ ایک مرکزہ کی تنظیم ہے۔ کون کون اس کے حق میں ہے؟»

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ اس جمود کو توڑنے کے لئے استینووچ تقریر کرنے آئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے وہاں بیٹھے ہوئے نوجوانوں کو بتایا کہ ماسکو میں نوجوانوں کو کس طرح منظم کیا جا رہا تھا۔ اس دوران میں سرگئی الجھن اور پریشانی کے عالم میں ایک طرف کھڑا رہا۔

مرکزہ کی تنظیم کے سوال پر مجمع کے ردعمل پر وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور اس نے مجمع پر ایک غصے کی نظر ڈالی۔ مجمع میں استینووچ کی بات تقریباً بالکل ہی نہیں سنی گئی۔ سرگئی نے زالیوانوف کو لیزا سخارکو کے کان میں کچھ کہتے دیکھا۔ زالیوانوف اسٹیج پر کھڑی ہوئی مقررہ کو بڑی حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اگلی قطار میں ثانوی اسکول کی سینئر لڑکیاں چہروں پر پوڈر تھوپے مصنوعی شرم کے ساتھ ادھر ادھر نظریں ڈال رہی تھیں اور آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ دور کونے میں اسٹیج کے پیچھے جانے والے دروازے کے قریب

سرخ فوج کے نوجوان سپاہیوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی ۔ ان لوگوں میں سرگئی نے مشین گن چلانے والے نوجوان کو بھی دیکھا ۔ وہ اسٹیج کی کگر پر بیٹھا ہؤا گھبراہٹ میں پہلو بدل رہا تھا اور شوخ پوشاک میں ملبوس لیزا سخارکو اور آنا آدموفسکایا کو کھلی ہوئی نفرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا ۔ یہ دونوں لڑکیاں بڑی بے حیائی سے ان لڑکوں کے ساتھ محو گفتگو تھیں جو ان کے ساتھ وہاں آئے تھے ۔

یہ محسوس کرکے کہ اس کی بات کوئی نہیں سن رہا ہے استینووچ جلدی سے اپنی تقریر ختم کرکے بیٹھ گئی ۔ اس کے بعد اگناتیئوا بولنے کے لئے کھڑی ہوئی ۔ اس کے پرسکون باوقار انداز کو دیکھ کر بے چین مجمع خاموش ہو گیا ۔

«ساتھیوں!» اس نے بولنا شروع کیا ۔ «میں آپ سب سے درخواست کروں گی کہ آج شام یہاں جو باتیں کہی گئی ہیں ان پر آپ غور کریں ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے جو صرف تماشبین نہیں رہیں گے بلکہ انقلاب میں سرگرمی سے حصہ لیں گے ۔ آپ سب کا استقبال کرنے کے لئے دروازے کھلے ہیں ۔ فیصلہ آپ پر منحصر ہے ۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم آپ لوگوں کو بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے سنیں ۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ میں سے جس کسی کو بھی کچھ کہنا ہو وہ یہاں ڈائس پر آ جائے ۔»

ہال میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی ۔ اتنے میں پیچھے سے کسی کی آواز آئی:

«میں بولنا چاہتا ہوں!»

میشا لیوچوکوف، جو ذرا بھینگا سا لڑکا تھا اور اپنے مٹاپے کی وجہ سے بالکل بھالو کا بچہ معلوم ہوتا تھا، مجمع میں سے ہوتا ہؤا ڈائس کی طرف بڑھا ۔

«موجودہ حالات میں» اس نے کہنا شروع کیا «ہمیں بالشویکوں کی مدد کرنی ہی چاہئے ۔ میں پورے طور پر اس کے حق میں ہوں ۔ سریوژکا مجھے جانتا ہے ۔ میں کومسومول میں شامل ہو جاؤں گا ۔»

سرگئی کا چہرہ کھل اٹھا ۔ وہ لپک کر ڈائس کے بیچ میں پہنچ گیا ۔

«ساتھیوں، دیکھا آپ نے!» اس نے خوشی سے چلاکر کہا ۔ «میں تو ہمیشہ سے کہتا تھا کہ میشا ہمارے ساتھ ہے ۔ اس کا باپ ریلوے میں سوئچ‌مین تھا، اور ریل گاڑی کے ڈبے کے نیچے کچل کر مر گیا تھا ۔ اس لئے میشا تعلیم حاصل نہیں کر سکا ۔ لیکن یہ سمجھنے کے لئے کہ آج کے حالات میں کس چیز کی ضرورت ہے اسے کالج کی تعلیم کی ضرورت نہیں پڑی ۔»

تمام ہال میں شور مچنے لگا ۔ ایک نوجوان نے، جس کے بال بڑے سلیقے کے ساتھ سنورے ہوئے تھے، بولنے کی اجازت مانگی ۔ اس کا نام آکوشیف تھا ۔ وہ ثانوی مدرسے میں پڑھتا تھا اور مقامی دوافروش کا بیٹا تھا ۔ اپنا کوٹ درست کرتے ہوئے اس نے بولنا شروع کیا:

«ساتھیوں! آپ مجھے معاف کیجئے گا ۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ہم سے آخر کس چیز کی توقع کی جا رہی ہے؟ کیا ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم سیاست میں حصہ لینے لگیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہم لوگ پڑھیں گے کب؟ ہمیں اپنی ثانوی تعلیم بھی تو پوری کرنی ہے ۔ اگر کوئی کھیل کود کی انجمن ہوتی یا کوئی ایسا کلب منظم کیا جا رہا ہوتا جہاں ہم سب لوگ جمع ہو کر پڑھتے تو وہ دوسری بات تھی ۔ لیکن سیاست میں حصہ لینے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم آگے چل کر پھانسی پر لٹکا دئے جانے کا خطرہ مول رہے ہیں ۔ آپ میری بات کا برا نہ مانیں ۔ لیکن میرے خیال میں کوئی بھی آپ سے اتفاق نہیں کرے گا ۔»

اسٹیج سے کود کر جوں ہی آکوشیف اپنی جگہ پر بیٹھا ہال میں قہقہہ پڑ گیا ۔ اس کے بعد اس مشین گن چلانے والے نوجوان کی باری تھی ۔ ایک جھٹکے کے ساتھہ اپنی ٹوپی غصے سے ماتھے پر آگے کی طرف کھینچ کر اور مجمع کو غصے سے گھور کر وہ چلایا:

«موذیوں، ذلیل آدمیوں تم ہنس کس بات پر رہے ہو؟»

اس کی آنکھیں دو دھکتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور غصے کے مارے اس کا تمام جسم سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا ۔ ایک گہرا سانس لےکر اس نے بولنا شروع کیا:

«میرا نام ایوان ژارکی ہے ۔ میں یتیم ہوں ۔ مجھے کبھی اپنے ماں باپ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی اور میرا کبھی کوئی گھر بھی نہیں رہا ۔ مجھے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے بھیک مانگنا پڑا اور اکثر تو فاقے کر کے ہی میں سڑکوں پر پلا بڑھا ۔ کتوں کی سی زندگی تھی میری اور اس چیز کو تم ماؤں کے لاڈلے کیا جانو ۔ مجھہ سے سنو میں بتا سکتا ہوں ۔ پھر سوویت اقتدار کا زمانہ آیا اور سرخ فوج کے سپاہیوں نے مجھے لے جاکر میری اچھی طرح دیکھہ بھال کی ۔ فوج کی ایک پوری پلٹن نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا ۔ انہوں نے مجھے پہننے کو کپڑے دئے اور لکھنا پڑھنا سکھایا ۔ لیکن سب سے اہم بات جو انہوں نے مجھے سکھائی وہ یہ تھی کہ انسان ہونے کے کیا معنی ہیں! انہیں کی بدولت میں بالشویک بنا اور مرتے دم تک بالشویک رہوں گا ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم لوگ کس مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں ۔ ہم لوگ اپنے جیسے غریبوں کے لئے لڑ رہے ہیں ۔ ہم مزدوروں کی حکومت قائم کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں ۔ تم لوگ یہاں بیٹھے ہنسی مذاق کر رہے ہو لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ اس شہر پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں ہمارے دو سو ساتھی لڑائی میں مارے گئے ۔ ان لوگوں نے موت کا سامنا کیا ...» ژارکی کی آواز ساز کے تنے ہوئے تار کی طرح

کانپ رھی تھی – «ان لوگوں نے خوشی خوشی اپنی جانیں دیں، تاکہ ھم لوگ خوش و خرم رہ سکیں، تاکہ ھم اپنے مقصد میں کامیاب ھوں... ملک بھر میں، جنگ کے ھر مورچے پر، لوگ اپنی جانیں دے رھے ھیں – اور تم ھو کہ یہاں بیٹھے مزے اڑا رھے ھو– ساتھیوں» وہ یک بیک مجلس صدارت سے مخاطب ھوکر بولا «ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش میں آپ اپنا وقت ضائع کر رھے ھیں – » یہ کہہ کر اس نے ھال میں بیٹھے ھوئے لوگوں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا – «کیا آپ کا خیال ھے کہ یہ لوگ آپ کی باتیں سمجھیں گے؟ ھرگز نہیں! بھرا ھؤا پیٹ کبھی خالی پیٹ کا ساتھہ نہیں دے سکتا – اتنے لوگوں میں صرف ایک شخص کام کا نکلا اور وہ بھی اس لئے کہ وہ غریب ھے – یتیم ھے – لیکن کوئی پرواہ نہیں» وہ مجمع کی طرف دیکھہ کر غصے کے ساتھہ گرج کر بولا – «ھم تمہارے بنا بھی اپنا کام چلا لیں گے – ھم تمہاری خوشامد کرنے نہیں جائیں گے کہ تم ھمارے ساتھہ شریک ھو جاؤ – تم سب کے سب جہنم میں جاؤ! ھماری بلا سے – تم جیسے لوگوں سے تو بات کرنے کا صرف ایک طریقہ ھے اور وہ ھے مشین گن سے!» اور یہ آخری وار کر کے وہ ڈائس سے اترا اور دائیں بائیں دیکھے بغیر سیدھا باھر جانے والے دروازے کی طرف چل دیا –

جو لوگ جلسے کی صدارت کر رھے تھے ان میں سے کوئی بھی ناچ گانے کے پروگرام کے لئے نہیں رکا –

«سب کچھہ چوپٹ ھو گیا!» سرگئی نے انقلابی کمیٹی کے دفتر واپس جاتے وقت جھنجھلا کر کہا – «ژارکی نے ٹھیک ھی کہا – اسکول کے ان چھوکروں کے ساتھہ ھم کچھہ نہیں کر سکتے – ان لوگوں کو تو دیکھہ کر بس غصہ ھی آتا ھے!»

«اس میں تعجب کی کیا بات ھے» اگناتیئوا نے اس کی بات کاٹتے ھوئے کہا – «اس مجمع میں مزدور طبقے کے نوجوان تو تھے

ھی نہیں ـ مشکل سے ایک آدھ رہے ہوں گے ـ زیادہ‌تر یا تو متوسط طبقے کے لوگوں کے لڑکے تھے یا مقامی دانش‌وروں کے ـ سب کے سب نکمے ھیں ـ تمہیں لکڑی چیرنے کے کارخانے اور شکر کے کارخانے کے مزدوروں کے درمیان کام کرنا ھوگا ـ لیکن یہ میٹنگ بالکل ھی رائیگاں نہ جائے گی ـ آگے چل کر تمہیں پتہ چلے گا کہ طالب علموں میں بھی بعض بہت اچھے ساتھی ھیں ـ »

استیپنووچ نے بھی اگناتیئوا سے اتفاق کیا ـ

اس نے کہا «سریوژا ھمارا کام یہ ھے کہ ھم اپنے خیالات اور اپنے نعرے تمام لوگوں کے ذھن نشین کر دیں ـ پارٹی ھر نئے واقعے کی طرف تمام محنت‌کش عوام کی توجہ مرکوز کرے گی ـ ھم بہت سے جلسے، کانفرنسیں اور کانگریسیں کریں گے ـ ھمارا سیاسی محکمہ اسٹیشن پر گرمیوں کے لئے ایک تھیٹر کھول رہا ھے ـ کچھ ھی دنوں میں ایک پروپیگنڈا ٹرین آنے والی ھے ـ تب ھم اپنا کام پورے زور شور سے شروع کر سکیں گے ـ لینن کا یہ مقولہ یاد رکھو کہ جب تک ھم عوام کو، کروڑوں محنت‌کش لوگوں کو، جدوجہد میں اپنے ساتھ نہیں لائیں گے تب تک ھماری فتح نہیں ھو سکتی ـ »

سرگئی اس شام کو بڑی دیر بعد استیپنووچ کو اسٹیشن چھوڑنے گیا ـ رخصت ھوتے وقت اس نے اس کا ھاتھ کس کر دبایا اور معمول سے کچھ زیادہ دیر تک ھی وہ اس کا ھاتھ پکڑے رہا ـ اس لڑکی کے چہرے پر ایک ھلکی سی مسکراھٹ دوڑ گئی ـ

واپسی پر سرگئی اپنے عزیزوں سے ملنے گھر گیا ـ اس نے اپنی ماں کی ڈانٹ تو چپ چاپ سن لی ـ لیکن جب اس کا باپ بھی اس کی ھاں میں ھاں ملانے لگا تو سرگئی نے بجائے مدافعانہ کے جارحانہ انداز اختیار کیا، اور اس نے تھوڑی سی دیر میں زاخار واسیلوچ کو خاموش کر دیا ـ

«اچھا بابا اب میری بات سن لیجئے ۔ جب آپ نے جرمنوں کے اقتدار کے زمانے میں ہڑتال کی تھی اور انجن پر سنتری کو مارا تھا، تب آپ نے بھی تو اپنے گھروالوں کے بارے میں سوچا ہوگا ۔ سوچا تھا یا نہیں؟ ضرور سوچا ہوگا ۔ لیکن پھر بھی آپ نے اپنا کام پورا کیا، کیوں‌کہ آپ مزدور تھے اور آپ کے ضمیر نے آپ سے ایسا کرنے کو کہا ۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میں نے اپنے گھروالوں کے بارے میں نہ سوچا ہو ۔ میں جانتا ہوں کہ اگر ہم لوگوں کو یہ جگہ چھوڑکر پیچھے ہٹنا پڑا تو میری وجہ سے آپ لوگوں کو ستایا جائےگا ۔ اس کے علاوہ میں گھر پر تو بیٹھا رہ نہیں سکتا ۔ بابا آپ تو خود سمجھتے ہیں ان سب باتوں کو، پھر یہ سب جھگڑا کیوں؟ میں ایک اچھے مقصد کے لئے کام کر رہا ہوں ۔ آپ کو رکاوٹیں پیدا کرنے کے بجائے میری حوصلہ افزائی کرنی چاہئے ۔ بابا آپ میری بات اگر مان لیں تو ماں بھی مجھے ڈانٹنا پھٹکارنا چھوڑ دےگی ۔» وہ اپنی شفاف نیلگوں آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھ کر بڑی محبت کے ساتھ مسکرایا ۔ اسے یقین تھا کہ وہ حق بجانب ہے ۔

زاخار واسیلووچ کچھ گھبراکر بنچ پر پہلو بدل‌کر بیٹھ گیا اور مسکرا دیا ۔ اس کی گھنی مونچھوں اور چھوٹی الجھی ہوئی ڈاڑھی کے بیچ میں سے اس کے زردی مائل دانت دکھائی دینے لگے ۔

«اچھا تو مجھ سے طبقاتی شعور کی باتیں کرنے چلا ہے ۔ کیوں نٹ‌کھٹ بدمعاش کہیں کا؟ تو سمجھتا ہے کہ تو جو یہ پستول لگائے اتراتا پھرتا ہے اس کے ڈر سے میں تیری اچھی طرح مرمت نہیں کر سکتا؟»

لیکن اس کے لہجے میں غصہ کا ذرا بھی شائبہ نہیں تھا ۔ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاکر اس نے اپنا کھردرا ہاتھ اپنے بیٹے کی طرف بڑھا دیا ۔ «سریوژا تم بڑی خوشی سے اپنا کام کرتے رہو ۔ ایسے وقت جب کہ تم نے بلندی کی طرف رخ کیا ہے میں

تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا - لیکن ہم لوگوں کو کہیں بالکل ہی نہ بھول جانا - کبھی کبھی ادھر بھی آتے رہا کرو -»

رات کا وقت تھا - ادھہ کھلے دروازے کی درز میں سے نکل کر روشنی کی ایک پتلی سی لکیر سیڑھیوں پر پڑ رہی تھی - اس بڑے کمرے میں جو مخملی گدوں والی کرسیوں اور دیگر فرنیچر سے آراستہ تھا، وکیل کی لمبی چوڑی میز کے گرد پانچ افراد بیٹھے ہوئے تھے: دولینیک، اگناتیئوا، چیکا کا اعلی افسر تموشنکو جو قزاقوں جیسی سمور کی ٹوپی پہنے ہوئے بالکل کرغیز معلوم ہو رہا تھا، دیوھیکل ریلوے مزدور شودک اور ریلوے کے یارڈ میں کام کرنے والا چپٹی ناک کا آستاپچک - انقلابی کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی -

دولینیک نے میز پر جھک کر اور اپنی تیز نگاہیں اگناتیئوا پر جماکر بیٹھی ہوئی آواز میں الفاظ پر زور دے کر کہنا شروع کیا:

«مورچے پر رسد پہنچانا بہت ضروری ہے - مزدوروں کے کھانے کا بھی کچھہ انتظام ہونا چاھئے - جیسے ہی ہم لوگوں نے یہاں قدم رکھا دوکانداروں اور نفع خوروں نے قیمتیں چڑھا دیں - زارشاہی کے یا کرنسکی کے زمانے کے پرانے نوٹ ہی یہاں چلتے ہیں - وہ لوگ سوویت سکے لینے پر راضی نہیں ہوتے - آج ہمیں یہاں بیٹھہ کر چیزوں کی قیمتیں مقرر کر دینی ہوں گی - ہم اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ کوئی نفع خور اپنا مال مقررہ قیمتوں پر نہیں بیچے گا - ان کے پاس جو کچھہ بھی ہے وہ چھپا دیں گے - ایسی صورت میں ہمیں ان لوگوں کی تلاشی لینا ہوگی اور خون چوسنے والی ان جونکوں کا سامان ضبط کر لینا ہوگا - یہ وقت حد سے زیادہ محتاط ہونے کا نہیں ہے - کامریڈ ہم اب اور زیادہ

عرصے تک مزدوروں کو فاقے نہیں کرنے دے سکتے۔ اگناتیئوا کا کہنا ہے کہ ہمیں بہت آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو مجھے تو یہ ردعمل ایک بزدل دانشور کا سا معلوم ہوتا ہے۔ زویا میری بات کا برا مت ماننا، میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں پوری طرح سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ اور پھر یہ چھوٹے موٹے تاجروں کا معاملہ تو ہے نہیں۔ مجھے آج اطلاع ملی ہے کہ سرائے کے مالک بوریس زان کے یہاں ایک خفیہ تہہ خانہ ہے۔ پیتلورا کی فوجوں کے یہاں آنے سے پہلے بھی بڑے بڑے دوکانداروں نے اپنا بےشمار مال یہاں چھپا رکھا تھا۔» یہ کہہ کر وہ رکا اور اس نے تموشنکو کی طرف ایک شرارت آمیز طنزیہ نظر ڈالی۔

تموشنکو نے حیرت سے پوچھا «تمہیں اس بات کا پتہ کیسے چلا؟» وہ دولینیک کی اس بات سے کچھ چڑھ سا گیا تھا کہ جس بات کا پتہ لگانے کی ذمہ‌داری دراصل اس پر تھی وہ اطلاع اس سے پہلے دولینیک کو کیسے مل گئی۔

دولینیک زیرلب مسکرایا۔ «مجھے ہر چیز کا پتہ ہے برادر۔ اس تہہ خانے کے علاوہ مجھے یہ بھی اطلاع ہے کہ کل تم نے اور ڈویژن کمانڈر کے ڈرائیور نے مل‌کر ساموگون کی آدھی بوتل صاف کر دی تھی۔»

تموشنکو اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگا اور اس کے زرد چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

«تم نے تو کمال کر دیا» خواہش نہ ہونے کے باوجود اس نے دولینیک کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ لیکن ناپسندیدگی سے اگناتیئوا کی تیوریاں چڑھتی ہوئی دیکھ‌کر اس نے اس کے آگے کچھ نہ کہا۔ «اس کمبخت بڑھئی کے پاس اپنا نجی جیکا ہے» اس نے انقلابی کمیٹی کے صدر کو دیکھتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔

«مجھے یہ اطلاع سرگئی بروژاک نے دی» دوانینیک کہتا رہا ۔ «وہ کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جو پہلے اس سرائے کے شراب خانے میں ملازم تھا ۔ ہاں تو اس لڑکے کو وہاں کے باورچیوں سے معلوم ہوا کہ زان ان لوگوں کو ان کی ضرورت کی تمام چیزیں منھہ مانگی مقدار میں سپلائی کیا کرتا تھا ۔ کل سرگئی کو اس تہہ خانے کے بارے میں پکے طور پر اطلاع ملی ہے ۔ اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس تہہ خانے کا صحیح مقام معلوم کیا جائے ۔ تموشنکو تم اپنے آدمیوں کو فوراً اس کام پر لگا دو ۔ سرگئی کو بھی ساتھہ لے لینا ۔ اگر ہم اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے تو ہم مزدوروں کے لئے اور پوری ڈویژن کے لئے کافی رسد مہیا کر لیں گے ۔»

آدھے گھنٹے بعد آٹھہ ہتھیاربند سپاہی سرائے کے مالک کے گھر میں داخل ہوئے ۔ دو سپاہی باہر دروازے پر پہرہ دینے کے لئے چھوڑ دئے گئے ۔

سرائے کا مالک ایک پستہ قد موٹا تازہ انسان تھا ۔ دیکھنے میں وہ بالکل ڈھول کی طرح گول تھا ۔ اس کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی، اس لئے وہ لکڑی کی ایک مصنوعی ٹانگ لگائے رھتا تھا ۔ اس کے چہرے پر سرخ رنگ کے سخت بال اگے ہوئے تھے ۔ انتہائی بناوٹی خلوص اور انکسار کے ساتھہ اس نے ان نوواردوں کا استقبال کیا :

«کامریڈ کیا بات ہے؟» اس نے اپنی پھٹی ہوئی بھاری آوار میں پوچھا ۔ «آپ لوگ بڑی رات گئے آئے ہیں؟»

زان کے پیچھے اس کی بیٹیاں کھڑی ہوئی تھیں جنھوں نے جلدی میں اپنے ڈریسنگ گاؤن پہن لئے تھے ۔ تموشنکو کی ٹارچ کی تیز روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں ۔ پاس والے کمرے سے زان کی بھرے ہوئے جسم والی بیوی کے آہیں بھرنے

اور کراھنے کی آواز آ رھی تھی — وہ جلدی جلدی اپنے کپڑے بدل رھی تھی —

«ھم تمہارے گھر کی تلاشی لینے آئے ھیں» تموشنکو نے سختی سے کہا —

فرش کی چپہ چپہ زمین کا اچھی طرح معائنہ کیا گیا — اس بہت بڑے گودام جس میں لکڑی کے چیرے ھوئے تختوں کا انبار لگا تھا، کھانے پینے کا سامان رکھنے کی متعدد کوٹھڑیوں، باورچی خانے، ایک کشادہ تہہ خانے — غرض کہ ھر جگہ کی اچھی طرح تلاشی لی گئی — لیکن اس خفیہ تہہ خانے کا کہیں پتہ نہ چلا —

باورچی خانے سے ملی ھوئی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک نوکرانی گہری نیند میں سو رھی تھی — وہ اتنی بے خبر سو رھی تھی کہ اس نے ان لوگوں کے اندر آنے کی آھٹ تک نہ سنی — سرگئی نے آھستہ سے اسے جگایا —

«تم یہیں کام کرتی ھو؟» اس نے پوچھا — خمار آلود آنکھوں والی اس لڑکی نے بوکھلاکر اپنا کمبل اپنے کندھوں پر گھسیٹ لیا اور روشنی کی طرف سے آڑ کرنے کے لئے اپنا ھاتھہ آنکھوں کے سامنے رکھہ لیا —

«ھاں» اس نے جواب دیا — «تم کون ھو؟»

سرگئی نے اسے بتا دیا اور اسے اچھی طرح کپڑے پہن کر تیار ھونے کی ھدایت دےکر وہ باھر چلا گیا —

کھانے والے کشادہ کمرے میں تموشنکو سرائے کے مالک سے سوال کر رھا تھا، اور آخرالذکر ھیجان اور اشتعال کے عالم میں بےربط باتیں کر رھا تھا —

«آپ آخر مجھہ سے کیا چاھتے ھیں؟ میرے پاس اور کوئی تہہ خانے نہیں ھیں — میں آپ کو یقین دلاتا ھوں کہ آپ محض اپنا وقت ضائع کر رھے ھیں — یہ سچ ھے کہ کسی زمانے میں میں سرائے

چلاتا تھا ۔ لیکن اب میں ایک بالکل ھی غریب آدمی ھوں۔ میرے پاس جو کچھہ تھا وہ سب پیتلورا کی فوجوں نے لوٹ لیا ۔ انہوں نے تو تقریباً میری جان بھی لے لی تھی۔ میں بہت خوش ھوں کہ سوویتوں کی حکومت قائم ھو گئی ھے۔ میرے پاس جو کچھہ ھے آپ کی نظروں کے سامنے ھے۔» یہ کہہ‌کر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے گدبدے ھاتھہ پھیلا دئے۔ اس کی خون آلود آنکھیں برابر تیر کی طرح چیکا کے اس اعلی افسر کے چہرے سے سرگئی کے چہرے پر اور سرگئی کے چہرے سے کمرے کے کونے میں اور چھت پر دوڑ رھی تھیں۔

تموشنکو اپنے ھونٹ کاٹ رھا تھا۔

«تو تم نہیں بتاؤگے؟ میں تمہیں آخری بار حکم دیتا ھوں کہ بتا دو وہ تہہ خانہ کہاں ھے؟»

«لیکن کامریڈ داروغہ صاحب ھمارے پاس خود کھانے کو کچھہ نہیں ھے» سرائے کے مالک کی بیوی نے رونی آواز میں کہا۔ «ھمارے پاس جو کچھہ تھا وہ تو وہ لوگ لوٹ لے گئے۔» اس نے رونے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ھو سکی۔

«کہتی ھو کہ بھوکوں مر رھے ھیں لیکن نوکرانی کے بغیر کام نہیں چلتا» سرگئی بیچ میں بول اٹھا۔

«وہ نوکرانی تھوڑا ھی ھے۔ وہ تو بیچاری ایک غریب لڑکی ھے۔ ھم لوگوں کے ساتھہ رھتی ھے کیوں کہ اس کا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ھے۔ خرستینا سے پوچھہ لو وہ خود ھی بتا دے‌گی۔»

تموشنکو کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ «اچھی بات ھے» اس نے چلاکر کہا۔ «تو اب ھمیں اچھی طرح کام شروع کرنا ھوگا!»

صبح ھو گئی تھی لیکن تلاشی ابھی تک جاری تھی۔ تیرہ گھنٹے کی نا کام کوششوں کے بعد مشتعل ھوکر تموشنکو تو ھمت ھار بیٹھا تھا، اور وھاں سے چل دینے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ اتنے

عرصے میں سرگئی نوکرانی کی کوٹھڑی سے باہر نکلا جس کی وہ تلاشی لے رہا تھا۔ نکلتے وقت اس نے پیچھے سے لڑکی کے کھس پھس کرنے کی آواز سنی۔ «باورچی خانے میں بھٹی کے اندر جاکر دیکھو۔»

دس منٹ کے اندر ہی روسی ڈھنگ کی بنی ہوئی وہ بھٹی اکھاڑ دی گئی، اور اس کے اندر لوہے کا ایک چور دروازہ نظر آیا۔ گھنٹے بھر کے اندر دو ٹن والی ایک ٹرک پیپوں اور بوریوں سے لدی ہوئی سرائے سے روانہ ہوئی۔ سرائے کے گرد بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھہ رہے تھے۔

ایک دن جب کہ سخت گرمی پڑ رہی تھی، ماریا یاکوولیونا کورچاگنا اپنی چھوٹی سی گٹھڑی لئے ہوئے گھر واپس آئی۔ جب آرتیم نے اسے پاویل کا سارا قصہ بتایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے اب اپنی زندگی میں ایک خلا اور ہولناک ویرانی کا احساس ہونے لگا۔ اسے اپنے لئے کوئی کام تلاش کرنا لازمی ہو گیا تھا۔ اور کچھہ ہی عرصے بعد وہ سرخ فوج کے سپاہیوں کے کپڑے دھونے کے لئے لانے لگی۔ اور اس کام کے معاوضہ کے طور پر اس کے لئے سپاہیوں کا راشن منظور کر دیا گیا۔

ایک دن شام کو اسے کھڑکی کے باہر آرتیم کے قدموں کی آہٹ معمول سے کچھہ زیادہ تیز معلوم ہوئی۔ اس نے جھٹکا دے کر دروازہ کھولا اور دہلیز پر سے ہی چلاکر اعلان کیا «پاوکا کا خط آیا ہے۔» پاویل نے لکھا تھا:

«پیارے بھائی آرتیم

میں یہ خط آپ کو یہ اطلاع دینے کے لئے لکھہ رہا ہوں کہ میں زندہ ہوں حالانکہ میری صحت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔

میرے کولھے میں ایک گولی لگ گئی تھی۔ لیکن اب رفتہ رفتہ ٹھیک ہو رہا ہوں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ہڈی کو چوٹ نہیں پہنچی۔ اس لئے میرے لئے پریشان مت ہونا، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ہسپتال سے فراغت پانے پر شاید مجھے کچھ دن کی چھٹی ملے گی۔ اس وقت میں کچھ عرصے کے لئے گھر آؤں گا۔ میں ماں کے پاس نہیں پہنچ پایا۔ بات یہ ہوئی کہ میں ایک گھوڑسوار رسالے میں بھرتی ہو گیا جس کے سپہ سالار کامریڈ کوتووسکی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے ان کے بارے میں ضرور سنا ہوگا کیونکہ ان کی بہادری کی دور دور تک شہرت ہے۔ میں نے آج تک ان کا سا آدمی ہی نہیں دیکھا، اور میرے دل میں اپنے سپہ سالار کے لئے بڑی عزت ہے۔ کیا ماں گھر واپس آ گئی ہیں؟ اگر آ گئی ہوں تو ان سے میرا بہت بہت پیار کہئے گا۔ میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف ہوئی ہے اس کے لئے میں معافی چاھتا ہوں۔

آپ کا بھائی

پاویل

آرتیم بھیا ذرا ناظم جنگلات کے یہاں جاکر ان لوگوں کو اس خط کی اطلاع دے دیجئے گا۔»

پاویل کا خط سن کر ماریا یاکوولیونا نے بہت آنسو بہائے۔ اس خبط الحواس چھوکرے نے اپنا پتہ بھی تو نہیں لکھا تھا۔

اسٹیشن پر ہرے رنگ کا ایک ریل کا ڈبہ ایک بغلی پٹڑی پر کھڑا تھا جس پر یہ سائن بورڈ لگا ہؤا تھا: «ڈویژن کا پروپیگنڈا اور ایجی ٹیشن کا سیاسی محکمہ»۔ سرگئی اکثر اس ڈبے کے چکر لگانے لگا تھا۔ پروپیگنڈا اور پرچار کے محکمے کی اس بوگی کے ایک ڈبے میں استینووچ اور اگناتیئوا کا دفتر تھا۔ جب کبھی بھی

سرگئی وہاں جاتا اگناتیئوا، جس کے ہونٹوں میں ہر وقت لازمی طور پر سگریٹ دبی رہتی تھی، بڑے معنی‌خیز انداز سے مسکرا دیتی تھی۔

کومسومول کی ضلع کمیٹی کے سکریٹری کی ریتا استینووچ کے ساتھہ کافی دوستی ہو گئی تھی۔ اور اس کے ساتھہ ہونے‌والی ہر مختصر ملاقات کے بعد اسٹیشن سے واپس جاتے وقت وہ کتابوں اور اخباروں کے بنڈلوں کے علاوہ اپنے ساتھہ مسرت کا ایک مبہم سا احساس بھی لے جاتا تھا۔

اس ڈویژن کے سیاسی محکمے نے کھلے میدان میں جو تھیٹر قائم کیا تھا وہاں ہر روز بڑی تعداد میں مزدور اور سرخ فوج کے سپاہی جمع ہوتے تھے۔ بارھویں فوج کی پرچار گاڑی رنگ برنگ کے پوسٹروں سے سجی ہوئی ایک بغلی پٹڑی پر کھڑی تھی۔ وہاں چوبیس گھنٹے زوروں پر کام جاری رہتا تھا۔ اس گاڑی میں ایک چھاپہ‌خانہ بھی قائم کر لیا گیا تھا، جہاں سے مسلسل اخبار، پرچے اور اعلانات شائع ہوتے رہتے تھے، یہ مقام جنگ کے مورچے سے بہت قریب تھا۔

ایک دن شام کو اتفاق سے سرگئی بھی تھیٹر پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ریتا کو سرخ فوج کے سپاہیوں کے ایک گروہ میں کھڑا دیکھا۔ اس دن بہت رات گئے جب وہ اسے گھر چھوڑنے کے لئے اسٹیشن جا رہا تھا، جہاں کہ سیاسی محکمے کے تمام کارکن رہتے تھے، اس نے بے‌اختیار کہہ دیا «کامریڈ ریتا نہ جانے کیوں میرا ہر وقت تم سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔» اور پھر اس نے کہا «جتنی دیر میں تمہارے ساتھہ رہتا ہوں مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تم سے مل‌کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان‌تھک اور متواتر کام کرتا رہ سکتا ہوں۔»

ریتا رک‌کر کھڑی ہو گئی۔ «دیکھو کامریڈ بروزاک» اس

نے کہا – «ہم لوگ یہاں اسی وقت یہ معاہدہ کر لیں کہ تم اب کبھی مجھہ سے اس طرح کی شاعرانہ گفتگو نہیں کروگے – مجھے اس قسم کی باتیں قطعی پسند نہیں ہیں –»

سرگئی ڈانٹ کھائے ہوئے اسکول کے لڑکے کی طرح کھسیا گیا –

«میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا» اس نے کہا – «میں نے سوچا کہ ہم دونوں دوست ہیں... میں نے کوئی ایسی انقلاب دشمن بات تو نہیں کہی – یا کہی؟ اچھی بات ہے کامریڈ استینووچ – اب میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا!»

اور بڑی جلدی سے ریتا سے ہاتھہ ملاکر اسے وہیں چھوڑکر وہ تقریباً بھاگتا ہوا شہر واپس لوٹا –

اس کے بعد کئی دن تک سرگئی نے اسٹیشن کا رخ نہیں کیا – جب اگناتیئوا نے بلایا بھی تو وہ مصروفیت کا بہانہ کرکے ٹال گیا – اور دراصل وہ مصروف تھا بھی –

ایک دفعہ رات کے وقت گھر واپس جاتے ہوئے جب شودک ایک ایسی سڑک سے ہوکر گذر رہا تھا، جس پر زیادہ تر شکر کے کارخانے میں انتظامیہ عہدوں پر کام کرنےوالے پولستانی رہتے تھے، کسی نے اس پر گولی چلائی – اس کے بعد جو تلاشیاں ہوئیں، ان میں کچھہ ہتھیار اور «استریلتس» نامی ایک پل‌سدسکی تنظیم کی کچھہ دستاویزات برآمد ہوئیں –

انقلابی کمیٹی کے دفتر میں ایک کانفرنس بلائی گئی – استینووچ بھی وہاں موجود تھی –

اس نے سرگئی کو الگ لے جاکر انتہائی پرسکون لہجے میں اس سے کہا «تو تمہاری عامیانہ خودداری کو میری بات سے ٹھیس

لگ گئی؟ تم اپنے ذاتی معاملات کو اپنے کام میں حائل کر رہے ہو؟ اس طرح کام نہیں چلے گا کامریڈ۔»

اور اس کے بعد سرگئی نے ریل گاڑی کے اس ہرے ڈبے کے چکروں کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔

اس نے ضلع کی ایک کانفرنس میں شرکت کی اور اس کی گرما گرم بحثوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ یہ کانفرنس دو روز تک چلتی رہی۔ تیسرے دن کانفرنس میں شریک ہونے والے دوسرے نمائندوں کے ساتھ وہ دریا کے اس پار والے جنگل میں گیا اور وہاں اس نے تمام دن اور تمام رات زارودنی کی رہنمائی میں لوٹ مار کرنے والے ڈاکوؤں سے لڑنے میں گذاری۔ زارودنی پیتلورا کی فوج کا ایک افسر تھا جو ابھی تک چھٹے سانڈ کی طرح پھرتا تھا۔

وہاں سے واپسی پر وہ اگناتیئوا سے ملنے گیا۔ استینووچ بھی وہاں موجود تھی۔ بعد میں وہ اسے گھر چھوڑنے اسٹیشن تک گیا اور رخصت ہوتے وقت اس کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا۔ استینووچ نے خفا ہوکر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے بعد پھر سرگئی کئی دن تک پروپیگنڈا اور پرچار والے ریل کے ڈبے کے قریب نہیں گیا۔ اور کام پڑنے پر بھی وہ ریتا سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ جب وہ اس کے اس رویہ کا سبب پوچھتی تو وہ روکھے پن سے جواب دے دیتا «تم سے بات کرنے سے کیا فائدہ۔ تم مجھ پر عامیانہ پن یا مزدور طبقے کے ساتھ غداری یا اسی قسم کا کوئی اور الزام لگا دو گی۔»

قفقازی سرخ پرچم ڈویژن کے فوجیوں سے لدی ہوئی ریل گاڑیاں آکر اسٹیشن پر رکیں۔ تین سیاہ فام کمانڈر انقلابی کمیٹی کے دفتر

پہنچے۔ ان میں سے ایک جو لمبا سا چھریرے جسم کا آدمی تھا اور چاندی کی نقشین پیٹی لگائے ہوئے تھا، سیدھا دولینیک کے پاس گیا اور بڑے فیصلہ کن انداز میں اس نے مطالبہ کیا «بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ سو گاڑی گھاس سیدھے سیدھے میرے حوالے کر دو۔ میرے گھوڑے مرے جا رہے ہیں۔» اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس مطالبے کا جواب نفی میں سننے کو تیار نہیں ہے۔

سرگئی کو سرخ فوج کے دو سپاہیوں کے ساتھہ گھاس مہیا کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ ایک گاؤں میں کولکوں کے گروہ نے ان پر حملہ کر دیا۔ سرخ فوج کے ان سپاہیوں کے ہتھیار چھین لئے گئے اور انہیں بڑی بے رحمی سے پیٹا گیا۔ سرگئی اپنی کم عمری کی وجہ سے نسبتاً سستا چھوٹا۔ غریب کسانوں کی کمیٹی کے کارکنوں نے ان تینوں کو گاڑی پر بٹھاکر شہر پہنچا دیا۔

مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ اس گاؤں میں بھیجا گیا، اور دوسرے ہی دن گھاس لادکر پہنچا دی گئی۔

سرگئی اپنے گھروالوں کو پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لئے جب تک وہ اس سانحہ کے اثرات سے پوری طرح اچھا نہیں ہو گیا تب تک وہ اگناتیئوا کے گھر پر ہی رہا۔ وہاں ریتا استینووچ اس کی عیادت کو آئی اور پہلی بار اس نے سرگئی کے ہاتھہ کو اتنے خلوص اور محبت کے ساتھہ دبایا کہ سرگئی خود بھی کبھی اس کی جرائت نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن تیسرے پہر جب خاصی گرمی پڑ رہی تھی، سرگئی ریتا سے ملنے کی غرض سے پرچار والے ریل کے ڈبے میں گیا۔ اس نے اسے پاویل کا خط پڑھہ کر سنایا اور اپنے دوست کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ وہاں سے باہر نکلتے وقت اس نے گردن

گھماکر کہا «میرا تو ارادہ ہے کہ جنگل کی طرف جاکر ذرا جھیل میں ایک آدھ ڈبکی لگا لوں۔»

ریتا نے کام روک کر اس کی طرف سر اٹھاکر دیکھا۔ «ذرا ٹھہرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔»

جھیل کی سطح آئینے کی طرح صاف اور پرسکون تھی۔ اس کے گن گنے نیم شفاف پانی کی تازگی میں ایک بےساختہ کشش تھی۔

«تم سڑک پر جاکر میرا انتظار کرو۔ میں نہانے جا رہی ہوں» ریتا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

سرگئی پل کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنا چہرہ سورج کی طرف اٹھا دیا۔ پیچھے سے اسے پانی میں چھپ چھپ کرنے کی آوار سنائی دے رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد پیڑوں کے بیچ سے اس نے تونیا تمانووا اور چوژانن کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑک پر آتے دیکھا۔ چوژانن پرچار والی گاڑی کا فوجی کمیسار تھا۔ بہت ہی عمدہ نفیس سلی ہوئی افسروں والی وردی، شاندار چمڑے کی پیٹی اور متعدد تسموں اور کروم کے چرمر کرتے ہوئے بوٹوں میں چوژانن اس وقت بہت ہی شان دار آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تونیا کے ساتھ گفتگو میں محو تھا۔

سرگئی نے تونیا کو فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو اس کے پاس پاویل کا رقعہ لےکر آئی تھی۔ قریب پہنچ کر تونیا نے بھی اسے بڑے غور سے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ دونوں سرگئی کے مقابل پہنچے تو وہ اپنی جیب سے پاویل کا تازہ‌ترین خط نکال‌کر اس کے پاس گیا۔

«کامریڈ ذرا بات سنئےگا۔ میرے پاس یہ ایک خط آیا ہے جس کا کچھ حصہ آپ سے تعلق رکھتا ہے۔»

چوژانن کے ھاتھ سے اپنا ھاتھ چھڑاکر تونیا نے خط لے لیا۔ پڑھتے وقت کاغذ کا وہ پرزہ اس کے ھاتھ میں کچھ کانپ سا گیا۔

«آپ کے پاس پاویل کی اور بھی کوئی خبر ہے؟» اس نے خط سرگئی کو واپس کرتے ھوئے پوچھا۔

«نہیں» اس نے جواب دیا۔

اتنے میں ریتا کے قدموں کے نیچے بجری کے دبنے کی آواز آئی۔ چوژانن کو اب تک وھاں اس کی موجودگی کی خبر نہیں تھی۔ اس نے سر جھکاکر تونیا کے کان میں کہا۔ «چلو ھم لوگ یہاں سے چلیں۔»

لیکن ریتا کی تضحیک آمیز اور پرحقارت آواز سن‌کر وہ رک گیا۔

«کامریڈ چوژانن! وھاں ریل گاڑی پر آج دن بھر آپ کی تلاش ھوتی رھی۔»

چوژانن نے بڑی ناپسندیدگی سے اسکی طرف دیکھا۔

«کوئی بات نہیں» اس نے بد مزاجی سے جواب دیا۔ «وہ ھمارے بغیر ھی کام چلا لیں گے۔»

ریتا فوجی کمیسار اور تونیا کو وھاں سے جاتے ھوئے دیکھتی رھی۔

«اس نکمے کا تو بوریا بستر باندھ دینا ھی اچھا ھوگا!» اس نے بڑے طنز کے ساتھ کہا۔

ھوا کے جھونکوں سے تن آور شاہ‌بلوط کے درختوں کی چوٹیاں جھوم رھی تھیں۔ اور تمام جنگل ایک عجیب سی گنگناھٹ سے گونج رھا تھا۔ جھیل کی سطح سے ایک لطیف سی تازگی اٹھ‌کر فضا میں تحلیل ھو رھی تھی۔ سرگئی نے جھیل کے پانی میں اترنے کا فیصلہ کیا۔

جب وہ تیر کر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ ریتا سڑک سے تھوڑی ھی دور پر ایک درخت کے تنے پر بیٹھی ہوئی ھے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں گھومتے پھرتے بہت دور جنگل کے اندر جا نکلے۔ ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی جگہ پر پہنچ کر جہاں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی وہ آرام کرنے کے لئے رک گئے۔ جنگل میں مکمل سکوت تھا۔ شاہ بلوط کے درخت آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ریتا نرم گھاس پر لیٹ گئی اور اپنے دونوں ھاتھوں کو آپس میں پھنساکر اس نے سر کے نیچے تکیہ لگا لیا۔ اس کی سڈول ٹانگیں جن پر پرانے پیوند لگے ہوئے بوٹ چڑھے ہوئے تھے، لمبی لمبی گھاس میں چھپ گئی تھیں۔

سرگئی کی نظریں اتفاق سے اس کے پاؤں پر پڑیں۔ اس نے بوٹوں پر صفائی کے ساتھ لگے ہوئے پیوندوں کو دیکھا اور پھر اپنے بوٹ پر ایک نظر ڈالی جس کے ایک سوراخ میں سے اس کا انگوٹھا باہر جھانک رہا تھا اور وہ ھنسنے لگا۔

«ھنس کس بات پر رہے ہو؟» ریتا نے پوچھا۔

سرگئی نے اپنے بوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا «ایسے بوٹوں میں ھم لوگ لڑیں گے کس طرح؟»

ریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گھاس کا ایک تنکا چبا رہی تھی اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کے خیالات اس وقت کہیں اور ھی تھے۔

«چوژانن بہت ھی گھٹیا قسم کا پارٹی ممبر ھے» اس نے آخر کہا۔ «ھمارے تمام سیاسی کارکن چیتھڑے لگائے گھومتے ھیں۔ لیکن اسے اپنے علاوہ اور کسی کی فکر نہیں ھے۔ دراصل اس کی جگہ پارٹی میں نہیں ھے... جہاں تک جنگ کے مورچے کا سوال ھے وہاں کی صورت حال بہت ھی نازک ھے۔ ھمارے ملک کو ابھی

بہت طویل عرصے تک سخت لڑائی لڑنی ہوگی۔» کچھ دیر رک کر اس نے پھر کہا «سرگئی ہم لوگوں کو الفاظ اور رائفلوں دونوں ہی کی مدد سے لڑنا ہوگا۔ کیا تم نے مرکزی کمیٹی کے اس فیصلے کے بارے میں سنا ہے۔ کومسومول کے ایک چوتھائی ممبر فوج میں بھرتی کئے جائیں گے؟ سرگئی میرا خیال تو یہ کہ ہم لوگ اب یہاں زیادہ نہیں رہیں گے۔»

اس وقت اس کی باتیں سنتے ہوئے سرگئی کو یہ دیکھ‌کر تعجب ہؤا کہ اس کی آواز میں ایک نئے لہجے کی آمیزش تھی۔ اس کی سیاہ شفاف آنکھوں کو اپنے چہرے پر گڑا ہوا دیکھ کر اس کے جی میں تو آیا کہ احتیاط کو بالائے طاق رکھ‌کر وہ ریتا سے کہہ دے کہ اس کی آنکھیں آئینے کی طرح ہیں۔ لیکن اس نے بروقت اپنے آپ کو روک لیا۔

ریتا اٹھ‌کر کہنیوں کے بل بیٹھ گئی۔ «تمہارا پستول کہاں ہے؟»

سرگئی نے بڑی مایوسی کے ساتھ اپنی پیٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا «وہ تو کولکوں کے گروہ نے مجھ سے چھین لیا۔»

ریتا نے اپنی ٹیونک کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چمکتا ہوا آٹومیٹک پستول نکالا۔

«سرگئی وہ شاہ‌بلوط کا پیڑ دیکھتے ہو نا؟» جس جگہ پر وہ دونوں لیٹے ہوئے تھے، وہاں سے تقریباً پچیس قدم کے فاصلے پر لگے ہوئے ایک شاہ‌بلوط کے پیڑ کے ناہموار تنے کی طرف پستول سے اشارہ کرتے ہوئے ریتا نے پوچھا اور پھر پستول کو اپنی آنکھوں کی سطح میں لاکر اس نے کم و بیش بغیر نشانہ لئے ہوئے ہی گولی چلا دی۔ درخت کی چھال ٹکڑے ٹکڑے ہوکر زمین پر بکھر گئی۔

«دیکھا؟» اس نے اپنی کامیابی پر بےحد خوش ہوکر کہا اور دوبارہ گولی چلائی۔ ایک بار پھر درخت کی چھال پرزے پرزے ہوکر گھاس پر گر پڑی۔

«لو» اس نے چڑانے کے انداز میں مسکرا کر پستول سرگئی کی طرف بڑھا دی۔ «اچھا دیکھیں تم کہاں نشانہ لگاتے ہو۔»

سرگئی کے تین نشانوں میں سے ایک نشانہ بالکل ہی خالی گیا۔ ریتا بڑے سرپرستانہ انداز میں مسکرا دی «مجھے تو تم سے اتنے کی بھی توقع نہیں تھی۔»

اس نے پستول زمین پر رکھہ دیا اور گھاس پر لیٹ گئی۔ اس کی ٹیونک اس کی سخت چھاتیوں پر کس کر تن گئی۔

«سرگئی» اس نے بڑی نرمی سے کہا۔ «ادھر آؤ۔»

سرگئی کھسک کر اس کے اور قریب چلا گیا۔

«دیکھو تو آسمان کیسا نیلا ہے۔ تمہاری آنکھیں بھی اسی رنگ کی ہیں۔ لیکن یہ تو بری بات ہے۔ آنکھوں کا رنگ سرمئی ہونا چاھئے، بالکل فولاد کا ایسا۔ نیلا تو بہت ہی نازک رنگ ہوتا ہے۔»

اور پھر یکایک ریتا نے اس کے سنہرے بالوں والے سر کو دونوں ہاتھوں میں لےکر اس کے ہونٹوں پر پیار کر لیا۔

دو ماہ گذر گئے۔ خزاں کا موسم آ گیا۔

رات چپکے چپکے چوروں کی طرح آئی اور اس نے درختوں کو اپنی سیاہ چادر میں چھپا لیا۔ ڈویژن کے ہیڈکوارٹر کا تار بابو اپنے آلے پر جھکا بیٹھا تھا جس پر کٹ کٹ کی آواز کے ساتھہ تاربرقی کے اشارتی ابجد سے مسلسل پیغام آ رہے تھے۔ اس نے کاغذ کی اس پتلی سی طویل پٹی کو جو اس کی انگلیوں کے بیچ

میں سانپ کی طرح لہرا رہی تھی، لپیٹ لیا اور جلدی سے اس کے نقطوں اور چھوٹی چھوٹی لکیروں کو الفاظ اور فقروں میں منتقل کر دیا:

«چیف آف اسٹاف، پہلی ڈویژن۔ نقل برائے صدر انقلابی کمیٹی شیپیتووکا۔ تار ملنے کے دس گھنٹے کے اندر شہر کے تمام سرکاری ادارے ہٹا دو۔ این رجمنٹ کے کمانڈر کی تحویل میں ایک بٹالین شہر میں چھوڑ دو۔ وہی مورچے کے اس خطے کے کمانڈر ہیں۔ ڈویژن ہیڈکوارٹر، سیاسی محکمہ اور تمام فوجی ادارے ہٹاکر بارانچیف اسٹیشن پہنچا دئے جائیں۔ تعمیل کی اطلاع ڈویژن کمانڈر کے پاس بھیج دو۔»

«دستخط»

دس منٹ بعد ایک موٹر سائیکل طوفانی رفتار سے شہر کی خوابیدہ سڑکوں پر شور کرتی ہوئی گذری۔ اس کی گیس کی تیز روشنی تاریکی کا سینہ چاک کرتی جا رہی تھی۔ انقلابی کمیٹی کے دفتر کے پھاٹک کے باہر وہ پھٹ پھٹ کرتی ہوئی رک گئی۔ جو شخص اس موٹر سائیکل پر آیا تھا وہ جلدی سے اندر گیا اور اس نے کمیٹی کے صدر دولینیک کو تار پکڑا دیا۔ آناً فاناً اس جگہ بڑی چہل پہل نظر آنے لگی۔ اسپشل ڈیوٹی کمپنی فوراً صف بستہ ہوکر کھڑی ہو گئی۔ گھنٹے بھر بعد ہی انقلابی کمیٹی کے سامان سے لدی ہوئی گاڑیاں شہر کی سڑکوں پر گڑگڑاتی ہوئی پودولسک اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئیں جہاں پر یہ سب سامان ریل کے ڈبوں میں لاد دیا گیا۔

تار کے مضمون کی اطلاع پاتے ہی سرگئی موٹر سائیکل والے کے پیچھے بھاگا ہؤا باہر آیا۔

«کامریڈ آپ مجھے اسٹیشن تک چھوڑ دیں گے؟» اس نے موٹر سائیکل والے سے پوچھا۔

«پیچھے بیٹھ جاؤ۔ لیکن خیال رکھنا کہ تم اسے مضبوطی سے پکڑے رہو۔»

پرچار والی گاڑی سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر جوکہ ٹرین میں جوڑی جا چکی تھی، سرگئی نے ریتا کو دیکھا۔ اس نے اس کے کندھے پکڑ لئے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ابھی تھوڑی ہی دیر میں اس سے ایک ایسی چیز چھن جائے گی جو اس کے لئے بےحد عزیز اور بیش قیمت بن چکی تھی، اتنی عزیز کہ الفاظ میں بیان کرنا ناممکن تھا۔ اس نے زیرلب کہا «میری عزیز کامریڈ ریتا الوداع۔ ہم پھر ملیں گے۔ مجھے بھول نہ جانا۔»

اسے یہ محسوس کرکے بڑی پریشانی ہوئی کہ آنسوؤں کی روانی سے اس کا گلا بھر آیا تھا۔ اسے فوراً یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بولے گا تو بےقابو ہو جائے گا اسلئے اس نے ریتا کا ہاتھ اتنے کس کر دبایا کہ وہ دکھنے لگا۔

صبح ہوئی تو سارا شہر اور اسٹیشن ویران اور سنسان پڑا تھا۔ آخری ٹرین سیٹی دےکر جیسے کہ وہ شہر کو خیرباد کہہ رہی ہو، اسٹیشن سے روانہ ہو چکی تھی۔ دشمن کو روکنے کے لئے جو بٹالین شہر میں چھوڑ دی گئی تھی اس کے سپاہی ریل کی پٹڑی کے دونوں طرف تعینات کر دئے گئے۔

پیڑوں سے زرد سوکھی پتیاں جھڑ رہی تھیں اور ان کی شاخیں بالکل سونی ہوئی جا رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے نیچے گری ہوئی پتیوں کو اپنی لپیٹ میں لےکر راستوں پر اڑاتے پھر رہے تھے۔

سرگئی سرخ فوج کا اوورکوٹ پہنے اپنے کندھوں پر کرمچ کی بنی ہوئی کارتوسوں کی پیٹیاں لٹکائے ایک درجن سرخ فوج کے

سپاهیوں کے ساتھہ شکر کے کارخانے کے سامنے والے چوراہے پر تعینات کیا گیا تھا ـ پولستانی فوجیں شہر کی طرف بڑھتی آ رہی تھیں ـ

اوتونوم پیتروو‌چ نے اپنے پروسی گیراسیم لیانتیوچ کے دروازے پر دستک دی ـ گیراسیم نے ابھی تک پوری طرح کپڑے بھی نہیں پہنے تھے، اس لئے اس نے دروازے سے باھر سر نکال کر جھانکا ـ

«کیوں کیا معاملہ ھے؟»

اوتونوم پیتروو‌چ نے سڑک پر جاتے ھوئے سرخ فوج کے سپاھیوں کی طرف اشارہ کرتے ھوئے آنکھہ مار کر کہا «ڈیرہ بڑھا گئے ـ»

گیراسیم لیانتیوچ نے اس کی طرف پریشانی کے ساتھہ دیکھہ کر پوچھا «آخر ان پولستانیوں کا قومی نشان کس قسم کا ھے ـ تمہیں کچھہ معلوم ھے؟»

«جہاں تک میرا خیال ھے ان کا قومی نشان ایک سروالا عقاب ھے ـ»

«بھلا بتاؤ وہ کہاں ملے گا؟»

اوتونوم پیتروو‌چ الجھن سے اپنا سر کھجانے لگا ـ

ایک آدھہ لمحے تک سوچنے کے بعد اس نے کہا «ان کا کیا جاتا ھے یہ تو اٹھے اور دامن جھاڑ کر چل دئے ـ مصیبت تو ھماری ھے کہ ھم کو نئے حکمرانوں کے ساتھہ نباھنے کے لئے اپنا سر کھپانا پڑتا ھے ـ»

یک بیک خاموشی کو چیرتی ھوئی مشین گن کی گولیوں کی تڑتڑاھٹ سنائی دی ـ اسٹیشن کی سمت سے اچانک ایک انجن کی سیٹی سنائی دی اور اس کے فوراً بعد ھی اسی جانب سے توپ دغنے کی آواز آئی ـ ایک بھاری سا گولہ تیزی سے بھن بھناتا ھوًا فضا میں اوپر اٹھا اور شکر کے کارخانے کے اس پار سڑک پر جاکر

گرا ـ سڑک کے کنارے کی جھاڑیاں نیلے دھوئیں کے بادلوں میں چھپ گئیں ـ پیچھے ہٹنے والی سرخ فوج کے سپاہی نہایت سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھہ قدم سے قدم ملائے سڑک پر چلے جا رہے تھے ـ چلتے چلتے بیچ بیچ میں وہ پیچھے مڑکر ایک نظر ڈال لیتے تھے ـ

سرگئی کے گال پر ایک سرد آنسو ڈھلک گیا ـ اس نے جلدی سے اسے پونچھہ ڈالا، اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے دیکھا تو نہیں، اس نے ان پر چپکے سے نظر ڈالی ـ سرگئی کے برابر لکڑی چیرنے کے کارخانے کا ایک دبلا پتلا مزدور آنتک کلوپوتووسکی مارچ کر رہا تھا ـ اس کی ایک انگلی رائفل کی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی ـ آنتک بہت افسردہ اور اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا ـ جب سرگئی سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے اپنے وہ خیالات جو اسے پریشان کر رہے تھے، سرگئی کو بتائے ـ

«وہ لوگ ہمارے گھروالوں پر بہت سختیاں کریں گے ـ خاص طور پر میرے گھروالوں پر کیوں‌کہ ہم پولستانی ہیں ـ وہ کہیں گے تم پولستانی ہوکر پولینڈ کی فوج کی مخالفت کرتے ہو ـ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ میرے بوڑھے باپ کو لکڑی چیرنے کے کارخانے سے ٹھوکر مارکر نکال دیں گے، اور اسے کوڑے لگوائیں گے ـ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ ہم لوگوں کے ساتھہ چلے ـ لیکن وہ گھروالوں کو اکیلا چھوڑکر جانا نہیں چاہتا تھا ـ قسمیہ اب مجھہ سے صبر نہیں ہوتا ـ اب تو میں جلد سے جلد ان ملعون موذیوں سے نبٹ لینا چاہتا ہوں ـ» اور یہ کہہ‌کر آنتک نے اپنی خود جو سرک‌کر اس کی آنکھوں پر گئی تھی، غصے سے پیچھے ہٹا دی ـ

... رخصت اے میرے دیرینہ محبوب شہر! حالاں‌کہ اپنے چھوٹے چھوٹے بھدے مکانوں اور اپنی ٹیڑھی میڑھی سڑکوں کی وجہ

سے تم بہت ھی بدنما اور گندے دکھائی دیتے ہو۔ تاہم تم مجھے بہت عزیز ہو۔ الوداع میرے عزیزو! الوداع والیا اور میرے دوسرے ساتھیوں جو روپوش رہکر کام کرنے کے لئے اس شہر میں رہ گئے ہو! پولستانی وائٹ گارڈوں کی غیرملکی، ظالم اور جابر فوجیں قریب آتی جا رہی ہیں۔

ریلوے کے مزدور تیل سے چکٹی ہوئی قمیصیں پہنے کھڑے اداس آنکھوں سے سرخ فوج کے سپاہیوں کو رخصت ہوتے دیکھہ رہے تھے۔

«ساتھیوں ہم پھر لوٹ‌کر آئیں‌گے!» سرگئی نے درد بھرے دل سے پکارکر کہا۔

آٹھواں باب

صبح کے دھندلکے میں دریا کے پانی کی ایک مدھم سی جھلملاھٹ نظر آ رہی ہے۔ ساحل کی چکنی بٹیوں سے ٹکراکر دریا کا پانی قل قل کی ایک نرم سی آواز پیدا کر رہا ہے۔ دریا کے کناروں کے قریب جہاں پانی بہت گہرا نہیں ہے اس کی سطح پرسکون ہے اور اس جگہ پر دریا کی رو پہلی سطح پر کم و بیش کسی قسم کی حرکت نظر نہیں آ رہی ہے۔ لیکن بیچ دھارے میں پانی کا رنگ گہرا اور اس کی سطح پراضطراب ہے اور وہاں پر پانی بڑی تیز رفتاری کے ساتھہ آگے بہتا جا رہا ہے۔ یہ دریا، جسے گوگول نے اپنی ایک تصنیف کے ذریعہ لافانی بنا دیا ہے، پرشکوہ حسن کا ایک شاھکار ہے۔ داھنی طرف والا اونچا سا کنارہ شدید ڈھلان کے ساتھہ جاکر پانی میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ جیسے دریا کے چوڑے دھارے نے کسی پہاڑ کی روش کو یک بیک روک دیا ہو۔ بائیں طرف کا ساحل سپاٹ اور نیچا ہے۔ اور جب موسم بہار کے سیلاب

کے بعد دریا کا پانی اتر جاتا ہے تو اس پر جابجا ریتلے جزیرے ابھر آتے ہیں ۔

دریا کے کنارے کھدی ہوئی ایک چھوٹی سی خندق میں ایک نکٹی مشین گن لگی ہوئی تھی ۔ اور اس کے قریب پانچ جوان لیٹے ہوئے تھے ۔ یہ ساتویں رائفل ڈویژن کی ایک بیرونی چوکی تھی ۔ مشین گن کے سب سے قریب دریا کی طرف منھ کئے سرگئی بروژاک لیٹا ہوا تھا ۔

کل ہی مسلسل لڑائیوں سے تھک کر اور پولستانی فوجوں کے توپ خانے کی طوفانی بمباری کی تاب نہ لاکر انہوں نے کیئف کا شہر چھوڑ دیا تھا، اور پیچھے ہٹ کر دریا کے بائیں کنارے پر اپنا مورچہ جمایا تھا ۔

دشمن کے حملے کے سامنے پیچھے ہٹنا، جان و مال کا بھاری نقصان اور آخرکار کیئف شہر کو مجبوراً دشمن کے قبضے میں جانے دینا، — ان تمام باتوں نے سپاہیوں کو ایک زبردست دھچکا پہنچایا تھا ۔ ساتویں ڈویژن نے بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے دشمن کے محاصرہ کو توڑا تھا ۔ اور جنگل کے راستے آگے بڑھتے ہوئے وہ مالین اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن پر آ نکلی تھی، اور پھر ایک زبردست حملے کے ساتھ اس نے پولستانی فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا اور کیئف کا راستہ صاف کر دیا تھا ۔

لیکن انہیں اس خوبصورت شہر کو چھوڑ دینا پڑا تھا اور سرخ فوج کے سپاہی اپنے اس بھاری نقصان کا سوگ منا رہے تھے ۔

پولستانی فوجیں سرخ دستوں کو دارنیتسا سے نکال دینے کے بعد اب ریل کے پل کے قریب دریا کے بائیں ساحل پر ایک چھوٹے سے علاقے پر قبضہ کرکے اپنا مورچہ جمائے ہوئے تھیں ۔ لیکن سرخ

فوج کے زبردست جوابی حملوں کی وجہ سے ان کے اس مقام سے آگے بڑھنے کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا تھا ۔

دریا کے بہاؤ کو دیکھتے وقت سرگئی کو کل کے تمام واقعات یاد آ رہے تھے ۔

کل دوپہر کے وقت اس کے دستے نے پولستانی فوجوں پر ایک زبردست جوابی حملہ کیا تھا ۔ کل پہلی بار اس کی دشمن کے ساتھہ روبرو ٹکر ہوئی تھی ۔ ایک صفاچٹ چہرے والا پولستانی سپاہی اس پر بڑی تیزی کے ساتھہ جھپٹا تھا ۔ اس کی رائفل جس پر ایک لمبی تیغ‌نما فرانسیسی سنگین لگی ہوئی تھی، اس کے سامنے تنی ہوئی تھی ۔ نہ جانے کیا چیختا ہوا وہ خرگوش کی طرح چھلانگیں مارکر سرگئی کی طرف لپکا ۔ ایک مختصر سے لمحے کے لئے سرگئی نے دیکھا کہ اس کے دشمن کی آنکھیں غیظ کے عالم میں پھٹی ہوئی ہیں اور دوسرے ہی لمحہ سرگئی کی سنگین اس پولستانی سپاہی کی سنگین سے ٹکرائی اور وہ چمکتی ہوئی فرانسیسی سنگین ایک طرف کو ہٹ گئی ۔ سپاہی زمین پر گر پڑا ...

سرگئی کے ہاتھہ میں ذرا بھی لرزش نہیں ہوئی ۔ وہ جانتا تھا کہ آگے چل‌کر بھی اسے مسلسل اسی طرح لوگوں کو قتل کرنا ہوگا ۔ ہاں اسی سرگئی کو جو اتنی لطیف محبت اور اتنی پرخلوص دوستی کی صلاحیت رکھتا تھا، یہ سب کرنا ہوگا ۔ وہ طبیعتاً بےرحم یا ظالم نہیں تھا ۔ لیکن وہ اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا کہ اسے ان گمراہ سپاہیوں کے خلاف لڑنا ہوگا جنہیں دنیا بھر کی خون چوسنے والی حرام‌خور جونکوں نے ورغلاکر ان میں ایک حیوانی نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور انہیں اس کے وطن کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا تھا ۔ اور اس لئے اسے یعنی سرگئی کو لوگوں کو قتل کرنا ہوگا تاکہ وہ دن قریب آ سکے جب کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے خون کا پیاسا نہ ہو ۔

پارامونوف نے اس کے کندھے پر دھیرے سے ھاتھہ مار کر کہا:
«سرگئی ہم لوگوں کو یہاں سے کھسک چلنا چاھئے ورنہ وہ ھمیں دیکھہ لیں گے ۔»

پچھلے ایک سال سے پاویل کورچاگن اپنے وطن کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتا رہا تھا ۔ کبھی مشین گن کی گاڑیوں پر، کبھی توپوں کے لئے گولہ‌بارود لے جانے والی گاڑیوں پر اور کبھی ایک چھوٹی سی بھورے رنگ کی گھوڑی پر سوار ھوکر جس کے کان کا ایک کونا کٹا ھوا تھا ۔ وہ اب ایک پورا مرد تھا ۔ مصیبتوں اور دشواریوں نے اسے پختہ اور سخت جان بنا دیا تھا ۔ کارتوسوں کی وزنی پیٹیوں کی رگڑ سے اس کی نازک جلد پر زخم پڑ گئے تھے ۔ لیکن یہ زخم اب تو نہ جانے کب کے بھر بھی چکے تھے ۔ اور اس کے کندھے پر رائفل کے تسمے کے نیچے ایک سخت گھٹا پڑ گیا تھا ۔

اس ایک سال کے دوران میں پاویل نے بہت سی ھولناک چیزیں دیکھی تھیں ۔ اپنے ھی جیسے شکستہ حال اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ھوئے ھزاروں مصروف جنگ سپاھیوں کے کاندھے سے کاندھا ملاکر، جن کے دلوں میں اپنے طبقے کے اقتدار کی خاطر لڑنے کا ایک ناقابل شکست جذبہ موجزن تھا، اس نے اپنے وطن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگائے تھے ۔ صرف دو بار ایسا ھوا تھا کہ یہ سیلاب اس کے بغیر ھی آگے بڑھہ گیا تھا ۔ پہلی مرتبہ تو اس وقت جب اس کے کولھے میں گولی لگ گئی تھی اور دوسری مرتبہ ۱۹۲۰ء کی سرد فروری میں جب وہ ٹائی‌فس کے بخار میں مبتلا ھو گیا تھا اور کڑاکے کی سردی کے باوجود اس کا تپتا ھوا جسم پسینے سے چپ چپا رہا تھا ۔

بارھویں فوج کی رجمنٹوں اور ڈویژنوں کے جتنے سپاھی

پولستانی توپ کا شکار نہیں ہوئے تھے اس سے کہیں زیادہ تو ٹائی فس کی نذر ہو گئے۔ اس وقت بارھویں فوج بہت وسیع مورچے پر لڑ رہی تھی جو تقریباً پورے شمالی یوکرین میں پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ پولستانی فوجوں کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھی۔

پاویل ابھی اپنی علالت سے پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہو پایا تھا کہ وہ پھر اپنے فوجی دستے میں واپس پہنچ گیا۔ اس کا دستہ اس وقت کازاتن سے اومان جانے والی برانچ لائن کے فرنتووکا اسٹیشن کی حفاظت کر رہا تھا۔ فرنتووکا کا اسٹیشن جنگل کے علاقے میں واقع تھا۔ اور اسٹیشن کی چھوٹی سی عمارت اور اس کے آس پاس کی چند ٹوٹی پھوٹی ویران جھونپڑیوں پر ہی وہاں کی کل بستی مشتمل تھی۔ تین سال تک تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد لڑائیاں ہوتے رہنے کی وجہ سے اس خطے میں عام شہریوں کا رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ فرنتووکا کبھی کسی کے قبضے میں چلا جاتا کبھی کسی کے! ایسا متعدد بار ہو چکا تھا۔

بہت بڑے بڑے اہم واقعات ظہور پذیر ہونے والے تھے۔ اپنے سپاہیوں کی تعداد میں بے شمار کمی ہو جانے کے بعد اور کچھ حد تک غیرمنظم ہوکر بارھویں فوج جس وقت پولستانی فوجوں کے حملوں کے آگے کیئف کی طرف ہٹ رہی تھی، اسی وقت مزدوروں کی جمہوریت اپنی تمام طاقت بٹورکر فتح کے نشے میں چور پولستانی سفید فوجوں پر ایک فیصلہ‌کن حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

متعدد لڑائیوں کی آگ میں تپ کر نکھری ہوئی پہلی گھوڑسوار فوج کی ڈویژنیں شمالی قفقاز کے دور دراز علاقوں سے یوکرین منتقل کی جا رہی تھیں۔ فوجی نقل و حرکت کی یہ مہم دنیا کی فوجی تاریخ میں بےنظیر تھی۔ چوتھی، چھٹی، گیارھویں اور چودھویں

گھوڑ سوار ڈویژنیں ایک ایک کر کے اومان کے علاقے میں پہنچ کر جنگی مورچے کے عقب میں ایک جگہ پر مرکوز ہوتی گئیں - اور میدان جنگ کے اس خطے کی طرف جاتے ہوئے جہاں فیصلہ کن لڑائیاں ہونے والی تھیں وہ راستے میں ماخنو لٹیروں کو بھی پسپا کرتی گئیں -

ساڑھے سولہ ہزار تیغیں! یوکرینی مرغزاروں کے تپتے ہوئے سورج کی دھوپ میں سنولائے اور مرجھائے ہوئے ساڑھے سولہ ہزار مصروف جنگ سپاہی!

سرخ فوج کی اعلی کمان اور جنوب مغربی مورچے کی کمان کی اس وقت سب سے بنیادی ذمےداری یہ تھی کہ دشمن اس فیصلہ کن حملے کو ناکام نہ بنانے پائے - اس اتھاہ گھوڑ سوار طاقت کو کامیابی کے ساتھہ ایک جگہ جمع کرنے کے لئے جو کچھہ بھی ضروری تھا کیا گیا - اومان کے مورچے پر جنگی سرگرمیاں عارضی طور پر ملتوی کر دی گئیں - ماسکو سے خارکوف میں جنگی مورچے کے ہیڈکوارٹر تک اور وہاں سے چودھویں اور بارھویں فوجوں کے ہیڈکوارٹروں تک لگی ہوئی تار کی براہ راست لائنوں پر مسلسل پیغام آتے جاتے رہتے تھے - تار بابو تاربرقی کے اشارتی ابجد میں فوجی حکم ایک جگہ سے دوسری جگہ کھٹ کھٹانے رہنے تھے: «گھوڑ سوار فوج کے مرکز کی طرف سے پولستانی فوجوں کا رخ دوسری طرف موڑ دو -» دشمن کے ساتھہ جم کر ٹکر اسی وقت لی جاتی تھی جب پولستانی فوجوں کے آگے بڑھنے سے بدیانی کی گھوڑ سوار ڈویژنوں پر آنچ آنے کا خطرہ ہوتا تھا -

الاؤ کے شعلوں کی سرخ زبانیں بڑی اونچائی تک لپ لپا رہی تھیں - آگ سے دھوئیں کے سیاہ حلقے چکر کھاتے ہوئے اٹھہ رہے تھے - اور ان کی وجہ سے بےچین بھن بھناتے ہوئے بھنگوں کے غول بھاگے جا رہے تھے - آگ کے گرد سپاہی ایک نیم دائرے

کی شکل میں لیٹے ہوئے تھے اور آگ کی روشنی سے ان کے چہرے تانبے کی طرح دمک رہے تھے۔ نیلگوں سرمئی راکھہ پر رکھے ہوئے ٹین کے برتنوں میں پانی کھول رہا تھا۔

ایک سلگتے ہوئے کندے کے نیچے سے دفعتاً آگ کے ایک شعلے نے اپنی زبان بے تحاشا لپکاکر کسی کے الجھے ہوئے بالوں کو چاٹ لیا۔ اس شخص نے جھنجھلاکر ایک جھٹکے کے ساتھہ اپنا سر پیچھے ہٹا لیا اور بھناکر کہا «لعنت ہے!» اور آگ کے گرد بیٹھے ہوئے سپاہی قہقہہ مارکر ہنس پڑے۔

بہت چھوٹی کتری ہوئی مونچھوں والے ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے جو سرج کی فوجی وردی پہنے ہوئے تھا، آگ کی روشنی میں اپنی رائفل کی نلی کا معائنہ کیا اور گونجتی ہوئی پاٹ دار آواز میں کہا:

«یہ چھوکرا تو عالم فاضل بننے کے چکر میں اتنا غرق ہے کہ اسے آگ کی گرمی بھی محسوس نہیں ہوتی۔»

«کورچاگن کچھہ ہم لوگوں کو بھی بتاؤ کہ کیا پڑھہ رہے ہو» کسی نے تجویز پیش کی۔

سرخ فوج کا وہ نوعمر سپاہی اپنے جھلسے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرکر مسکرا دیا۔

«کامریڈ آندروشچک سچ مچ بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔ بس چھوڑنے کو جی نہیں چاھتا۔»

«کاھے کے بارے میں ہے؟» کورچاگن کے پاس بیٹھے ہوئے چپٹی ناک والے ایک لڑکے نے پوچھا جو بڑی محنت کے ساتھہ اپنے تھیلے کا تسمہ سی رہا تھا۔ اس نے اپنے دانتوں سے کھردرے دھاگے کو کاٹا اور بچا ہوا آدھا دھاگا سوئی پر لپیٹ کر اپنی خود کے اندر کھونس لیا۔ «اگر کوئی عشق کی داستان ہے تو میں اس کے سننے کے لئے سب سے پہلے تیار ہوں۔»

اس فقرے پر ایک زور کا قہقہہ پڑا ۔ ماتوی‌چک نے اپنا منڈا ہوا سر اٹھایا اور اس نکٹے لڑکے کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھ‌کر آنکھ مارتے ہوئے کہا «عشق کا کیا کہنا سریدا اور پھر تم ہو بھی تو اتنے حسین کہ بالکل تصویر معلوم ہوتے ہو ۔ جہاں کہیں ہم لوگ جاتے ہیں وہاں کی تمام لڑکیوں کے جوتوں کے تلے تمہارے پیچھے بھاگتے بھاگتے پھٹ جاتے ہیں ۔ لیکن افسوس کہ ایک بات بہت بری ہے کہ تمہارا جیسا سندر مکھڑا ایک چھوٹے سے عیب کی وجہ سے بالکل تباہ ہو گیا اور وہ یہ ہے کہ ناک کے بجائے معلوم ہوتا ہے تمہارے چہرے پر ایک موٹا پیسہ لگا ہوا ہے ۔ لیکن اس کا بڑی آسانی سے علاج ہو سکتا ہے ۔ اپنی ناک کے سرے پر ایک نووتسکی* پن سیرا لٹکائے رہو بس صبح ہوتے ہی بالکل ٹھیک ہو جائے گی ۔»

اس فقرے بازی کے بعد اتنے زور کا قہقہہ پڑا کہ مشین گنوں کی گاڑیوں سے بندھے ہوئے گھوڑے ڈر کر ہنہنانے لگے ۔

سریدا نے گردن گھماکر بے پروائی سے بولنے والے کی طرف دیکھا ، اور بڑے پرمعنی انداز میں اپنے ماتھے کو انگلی سے تھپ تھپاکر کہا «صورت سے کچھ نہیں ہوتا ۔ اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ تمہارے بھیجے میں کیا بھرا ہے ۔ اپنے ہی کو لےلو ۔ تمہاری زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے اور بالکل زہر میں بجھی ہوئی ہے ۔ مگر ہو تم پورے گدھے کے گدھے ۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کانوں کو سردی لگ رہی ہے ۔ انہیں گرم کرنے کی ضرورت ہے ۔»

«بس بس رہنے دو چھوکروں! غصہ کرنے سے کیا فائدہ؟» سکشن کمانڈر تاتاری‌نوف نے ان دونوں کو جھڑکتے ہوئے کہا جو کسی

* نووتسکی نام کا دستی بم تقریباً پانچ سیر کا ہوتا ہے اور تار کے جالوں کو توڑنے کے کام آتا ہے ۔

بھی دم ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑنے کو تلے بیٹھے تھے ۔ «اس سے بہتر یہی ھے کہ اگر کورچاگن واقعی کوئی دلچسپ چیز پڑھہ رھا ھے تو ھمیں بھی سنائیے ۔»

«یہ بات ٹھیک ھے ۔ ھاں پاولوشکا سناؤ» ھر طرف سے سب نے پاویل سے فرمائش کی ۔

پاویل نے گھوڑے کی زین آگ کے قریب سرکا لی اور اطمینان سے اس پر بیٹھہ گیا ۔ پھر اس نے وہ چھوٹی سی موٹی کتاب اپنے گھٹنوں پر کھول‌کر رکھہ لی ۔

«کامریڈ اس کتاب کا نام ھے «دی گیڈ فلائی» ۔ یہ کتاب مجھے بٹالین کمیسار نے دی تھی ۔ میں تو اس میں بالکل ھی کھو گیا ھوں ۔ ساتھیوں، اگر آپ لوگ خاموش بیٹھہ‌کر سنیں تو میں پڑھنا شروع کروں ۔»

«ھاں ھاں تم شروع کرو! ھم کسی کو بھی گڑبڑ نہیں کرنے دیں گے ۔»

تھوڑی دیر بعد جب رجمنٹ کا کمانڈر پوزی‌ریوسکی اپنے کمیسار کے ساتھہ چپکے سے گھوڑے پر سوار الاؤ کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گیارہ آدمیوں کی آنکھیں بڑے انہماک کے ساتھہ پڑھنے والے پر جمی ھوئی ھیں ۔ اس نے کمیسار سے مخاطب ھوکر الاؤ کے گرد بیٹھے ھوئے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ھوئے کہا:

«رجمنٹ کے آدھے اسکاؤٹ یہاں بیٹھے ھیں ۔ ان میں سے چار ابھی بالکل حال ھی میں نوجوان کمیونسٹ لیگ میں شریک ھوئے ھیں ۔ لیکن یہ سب کے سب بہت اچھے سپاھی ھیں ۔ وہ لڑکا جو کتاب پڑھہ رھا ھے اس کا نام کورچاگن ھے ۔ اور وہ جو ادھر بیٹھا ھے جس کی آنکھیں بھیڑئیے کے بچے جیسی ھیں ژارکی ھے ۔ ان دونوں کی آپس میں بڑی دوستی ھے ۔ لیکن چپکے چپکے وہ دونوں

ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کورچاگن میرا سب سے اچھا اسکاؤٹ تھا۔ لیکن اب اس کا ایک زبردست رقیب پیدا ہو گیا ہے۔ اس وقت یہ لوگ جو کام کر رہے ہیں وہ سیاسی کام ہے، اور بہت موثر قسم کا سیاسی کام ہے۔ میں نے سنا ہے کہ نوجوانوں کی اس ٹولی کا نام «ینگ گارڈ» رکھا گیا ہے۔ میری رائے میں ان کے لئے یہ بہت ہی مناسب نام ہے۔»

«وہ لڑکا جو کتاب پڑھ رہا ہے کیا سیاسی تعلیم دینے کا کام اسی کے ذمے ہے؟» کمیسار نے پوچھا۔

«نہیں سیاسی تعلیم دینے کا کام تو کرامیر کا ہے» پوزیریوسکی نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاکر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

«ساتھیوں سلام!» اس نے پکارکر کہا۔

سب لوگوں نے سر گھماکر کمانڈر کی طرف دیکھا۔ اور کمانڈر بڑی مشاقی کے ساتھ گھوڑے پر سے نیچے اترا اور سپاہیوں کے اس گروہ کی طرف چل دیا۔

«دوستوں! آگ تاپی جا رہی ہے؟» اس نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا اور اس کے سنجیدہ چہرے پر سے جس پر دو چھوٹی چھوٹی کچھ چینیوں جیسی آنکھیں چمک رہی تھیں، خشک سنجیدگی یکلخت غائب ہو گئی۔ سپاہیوں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اپنے کمانڈر کا استقبال کیا، جیسے کوئی اپنے ساتھی اور گہرے دوست کا کرتا ہے۔ کمیسار جو آگے جانے کا ارادہ رکھتا تھا اپنے گھوڑے پر سے نہیں اترا۔

اپنے خول میں رکھے ہوئے پستول کو ایک طرف سرکاتے ہوئے پوزیریوسکی کورچاگن کے پاس بیٹھ گیا۔

«کیوں کچھ سگریٹ پینے کا ارادہ ہے؟» اس نے ان لوگوں کے سامنے تجویز رکھی۔ «میرے پاس تھوڑا بہت ہی عمدہ قسم کا تمباکو ہے۔»

اس نے ایک سگریٹ تیار کرکے اسے سلگایا اور کمیسار کی طرف مڑ کر کہا ــ «دورونن تم چلو، میں تھوڑی دیر یہاں ٹھہروں گا ــ اگر ھیڈکوارٹر پر میری ضرورت ہو تو مجھے اطلاع بھجوا دینا ــ»

«ہاں ہاں تم پڑھتے رہو، میں بھی سنوں گا» دورونن کے چلے جانے کے بعد پوزیریوسکی نے کورچاگن سے کہا ــ

پاویل نے کتاب ختم کرکے اپنے گھٹنوں پر رکھ لی اور کچھ سوچتا ہوا آگ کو گھورنے لگا ــ چند لمحوں تک کوئی بھی نہیں بولا ــ سب لوگ ،گیڈفلائی، کے المناک انجام کے بارے میں سوچ رہے تھے ــ پوزیریوسکی نے سگریٹ کا کش لگایا اور پھر وہ بحث شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا ــ

سریدا نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا «بڑی ہی دردناک کہانی ہے ــ تو دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں ــ اس نے جو کچھ برداشت کیا وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے ــ لیکن اگر آدمی کسی مقصد کے لئے لڑ رہا ہو تو اس میں اتنی طاقت آ جاتی ہے کہ وہ ہر دشواری کا مقابلہ کرسکتا ہے ــ»

سریدا بظاہر اس کتاب سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا ــ اس کتاب نے اس کے دل پر ایک گہرا نقش ڈالا تھا ــ

«اگر وہ پادری میرے ہتھے چڑھ جاتا جس نے اس کے حلق میں صلیب ٹھونسنے کی کوشش کی تھی تو میں اس سور کو وہیں ختم کر دیتا» آندریوشا فومیچیف نے غصے کے ساتھ کہا ــ وہ بیلایا زرکوف نامی مقام کا رہنے والا تھا اور فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے ایک موچی کے یہاں کام کرتا تھا ــ

«اگر انسان کو یہ معلوم ہو کہ وہ کس چیز کے لئے اپنی جان کی بازی لگا رہا ہے تو اس کے لئے مرنا اتنا دشوار نہیں ہوتا» آندروشچک نے ایک لکڑی سے ٹین کے برتن کو آگ کے اور قریب

سر کاتے ہوئے تیقن کے ساتھ کہا ۔ «یہی ہے وہ چیز جس سے انسان کو قوت حاصل ہوتی ہے ۔ اگر آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ حق پر ہے تو وہ خوشی خوشی جان دے سکتا ہے ۔ ہیرو اسی طرح بنتے ہیں ۔ کچھ دن ہوئے میں ایک لڑکے کو جانتا تھا ۔ اس کا نام پورانکا تھا ۔ ادیسا میں جب وہ سفید فوجوں کے نرغے میں گھر گیا تو اس نے تن تنہا ایک پوری پلٹن سے ٹکر لی ۔ اور قبل اس کے کہ وہ لوگ اپنی سنگینوں سے اسے چھلنی کر سکتے اس نے خود کو اور ان تمام لوگوں کو بھی ایک دستی بم سے اڑا دیا ۔ اور دیکھنے میں اس میں کوئی ایسی خاص بات بھی نظر نہیں آتی تھی ۔ وہ اس قسم کا آدمی بھی نہیں تھا جن کے بارے میں آپ کتابوں میں پڑھتے ہیں ۔ گو اس میں شک نہیں کہ وہ اس قابل ہے کہ اس کے بارے میں لکھا جائے ۔ ہم جیسے لوگوں کے درمیان ایسے بہت سے شاندار کردار ملتے ہیں ۔»

اس نے ٹین کے برتن کو ایک چمچے سے چلایا اور پھر اس میں پکتی ہوئی چیز کو تھوڑا سا نکال کر اپنے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے چکھا اور پھر اپنی تقریر دوبارہ جاری کر دی:

«کچھ لوگ ہوتے ہیں جو کتے کی موت مرتے ہیں، بہت ہی ذلت اور بے عزتی کی موت ۔ میں آپ لوگوں کو ایک واقعہ سناتا ہوں جو اضیاسلاو کے مقام پر لڑائی کے دوران میں پیش آیا تھا ۔ اضیاسلاو دریائے گورن کے کنارے بسا ہوا ایک بہت پرانا شہر ہے، جس کی تعمیر بہت زمانہ پہلے شاہزادوں کے زمانے میں ہوئی تھی ۔ وہاں ایک پولستانی گرجاگھر تھا، جو قلعہ‌نما بنا ہوا تھا ۔ خیر ہم لوگ اس شہر میں داخل ہوئے اور ایک ایک کی قطار میں اس کی پر پیچ گلیوں میں ہوتے ہوئے آگے بڑھے ۔ لتھوانیائی سپاہیوں کی ایک کمپنی ہمارے داہنے پہلو کے مورچے کی حفاظت کر رہی تھی ۔ جب ہم لوگ بڑی سڑک پر پہنچے تو دیکھتے کیا

ھیں کہ ایک مکان کی چہاردیواری کے جنگلے سے تین گھوڑے بندھے ہوئے ھیں اور ان کی پیٹھہ پر زینیں کسی ہوئی ھیں۔ ھم بہت خوش ہوئے، سوچا اب یہاں کچھہ پولستانی سپاھی ھاتھہ لگیں گے۔ ھم تقریباً دس لوگ مکان کے صحن میں بھاگتے ہوئے داخل ہوئے۔ ھمارے آگے آگے اپنا ماوزر پستول اٹھائے اس لتھوانیائی کمپنی کا کمانڈر بھاگا جا رھا تھا۔

سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور ھم لوگ بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ لیکن پولستانی سپاھیوں کے بجائے ھماری ملاقات اپنے ھی سپاھیوں سے ہوئی۔ وہ لوگ ایک گھوڑسوار گشتی دستے کے سپاھی تھے۔ وہ ھم سے پہلے وھاں پہنچ گئے تھے۔ ھماری آنکھوں نے جو منظر وھاں دیکھا وہ قطعی خوشگوار نہیں تھا۔ وہ لوگ ایک عورت کی آبروریزی کر رھے تھے جو اس مکان میں رھنے والے پولستانی افسر کی بیوی تھی۔ جب اس لتھوانیائی کمانڈر نے دیکھا کہ کیا ھو رھا ھے، تو اس نے اپنی زبان میں چلاکر کچھہ کہا۔ اس کے سپاھی ان تینوں کو پکڑکر باھر گھسیٹ لے گئے۔ ھم میں سے صرف دو آدمی روسی تھے باقی سب لتھوانیائی تھے۔ ان کے کمانڈر کا نام بریڈس تھا۔ میں ان کی زبان تو نہیں سمجھتا لیکن میں اتنا ضرور سمجھہ گیا کہ اس نے ان تینوں کا کام تمام کر دینے کا حکم دیا تھا۔ لتھوانیائی لوگ بہت ھی سخت ہوتے ھیں۔ ذرا بھی مروت نہیں کرتے۔ وہ لوگ ان تینوں کو گھسیٹ کر اصطبل میں لے گئے۔ میں سمجھہ گیا کہ اب ان کا انجام قریب ھے۔ ان میں سے ایک شخص اپنی پوری طاقت لگاکر ھاتھہ پاؤں مار رھا تھا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رھا تھا۔ وہ بہت لحیم شحیم طاقت ور جسم والا آدمی تھا اور اس کی منحوس صورت دیکھتے ھی پتھر مارنے کو طبیعت چاھتی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رھا تھا کہ محض ایک فاحشہ عورت کی وجہ سے اسے گولی

نہیں ماری جا سکتی۔ باقی دونوں بھی رحم کی درخواست کر رہے تھے۔

میرے تو ہوش اڑ گئے اور سرد پسینہ چھٹنے لگا۔ میں بھاگا ہوا بریڈس کے پاس گیا اور بولا «کامریڈ کمپنی کمانڈر ان لوگوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلوائیے۔ آپ اپنے ہاتھ ناحق کیوں ان لوگوں کے خون سے ناپاک کرنا چاہتے ہیں؟ ابھی شہر میں لڑائی چل رہی ہے اور ہم لوگ ہیں کہ یہاں ان دوزخیوں کے ساتھ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔» اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں شیر کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ یقین کیجئے مجھے اس وقت بہت افسوس ہو رہا تھا کہ نا حق میں نے اس سے اتنی بات کہی۔ اس نے اپنا پستول میری طرف تانا۔ میں سات برس سے جنگ میں لڑ رہا ہوں لیکن اس وقت تو میرے بھی ہوش اڑ گئے، اس بات کو میں قطعی تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ وہ گولی چلانے کو پہلے تیار ہو جاتا تھا سوال بعد میں پوچھتا تھا۔ اس نے بہت ہی ٹوٹی پھوٹی روسی میں چیخ کر مجھ سے کچھ کہا اس لئے میں بڑی مشکل سے سمجھ پایا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا «ہمارا پرچم ہمارے خون میں رنگا ہے۔ اس قسم کے لوگ تمام فوج کے ماتھے پر کلنک لگاتے ہیں۔ اس لٹیرے پن کی سزا موت ہے۔»

میں اور زیادہ برداشت نہ کر سکا اور اپنی پوری رفتار سے بھاگ کر صحن سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ اپنے پیچھے کی طرف میں نے ان لوگوں کے گولی چلانے کی آواز سنی۔ میں سمجھ گیا کہ ان تینوں کا کام تمام کر دیا گیا۔ جب تک ہم لوگ اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس واپس پہنچے شہر پر ہمارا قبضہ ہو چکا تھا۔

کتے کی موت مرنے سے میرا مطلب یہی ہے جس طرح یہ لوگ مرے تھے۔ یہ گشتی دستہ ان سپاہیوں میں سے ایک تھا جو میلتوپول میں ہمارے ساتھ آئے تھے۔ ایک زمانے میں یہ لوگ ماخنو کے ساتھ تھے۔ بالکل ہی ذلیل و رذیل قسم کے لوگ تھے وہ۔»

اندروشچک نے اپنا ٹین کا برتن اپنے قریب رکھ لیا اور اپنا روٹیوں کا تھیلا کھولنے لگا۔

«کبھی کبھی ہماری صفوں میں بھی اس قسم کے ذلیل لوگ نکل آتے ہیں۔ ہر شخص کی ہر حرکت کی ذمہ‌داری تو ہم نہیں لے سکتے۔ بظاہر تو سبھی انقلاب کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہماری بدنامی ہوتی ہے۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ وہ میرے لئے بہت ہی تکلیف دہ منظر تھا۔ میں آسانی سے اسے نہیں بھلا سکتا» اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اپنی تقریر ختم کی۔

جس وقت کیمپ کے تمام لوگ سوئے اس وقت رات بہت کافی بیت چکی تھی۔ رات کی خاموشی میں سریدا کے سیٹی کی آواز پیدا کرنے والے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ پوزی‌ریوسکی ایک گھوڑے کی زین کا تکیہ لگائے سو رہا تھا۔ کرامیر جو سپاہیوں کو سیاسی تعلیم دیتا تھا، بیٹھا اپنی نوٹ‌بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔

دوسرے دن سراغ رسانی کے کسی کام سے لوٹ‌کر پاویل نے اپنا گھوڑا ایک درخت سے باندھ دیا اور کرامیر کو پکار کر جو ابھی ابھی چائے کا پیالہ ختم کر کے بیٹھا ہی تھا، اس سے کہا:

«اے کرامیر تمہارا کیا خیال ہے میں یہاں کے بجائے پہلی گھوڑ سوار فوج میں بھرتی ہو جاؤں؟ قرائن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑے بڑے واقعات ہونے والے ہیں۔ سپاہیوں کو اتنی بڑی تعداد میں محض تفریحاً تو نہیں جمع کیا جا رہا ہوگا۔ کیوں؟ اور

یہاں رہ کر تو ہم لوگوں کو ان اہم واقعات میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملے گا۔»

کرامیر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

«یہاں کے بجائے وہاں بھرتی ہو جاؤں سے کیا مطلب؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ سنیما کی سیٹ کی طرح تم فوج کا دستہ بھی جب چاہے بدل سکتے ہو؟»

«لیکن آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کہاں رہ کر لڑتا ہے؟» پاویل نے اس کا قطع کلام کرتے کوئے کہا۔ «میں میدان جنگ چھوڑ کر عقب میں جانے کی بات تو نہیں کر رہا ہوں۔ یا کر رہا ہوں؟»

لیکن کرامیر پورے طور پر اس کی اس تجویز کے خلاف تھا۔

«لیکن ڈسپلن کا بھی کچھ خیال ہے تمہیں؟ پاویل یوں تو مجموعی طور پر تم برے نوجوان نہیں ہو۔ لیکن بعض معاملات میں تم کچھ دراجیت پسند واقع ہوئے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے جی میں جو آئے کر سکتے ہو؟ میرے دوست تم بھولتے ہو کہ پارٹی اور کومسومول کی تنظیم ایک آہنی ڈسپلن کی بنیاد پر قائم ہے۔ پارٹی کا مفاد ہمارے سامنے سب سے پہلے رہنا چاہئے اور ہم میں ہر شخص کو اس جگہ پر ہونا چاہئے جہاں ہماری سب سے زیادہ ضرورت ہو، نہ کہ جہاں ہمارا جی چاہے۔ پوزی ریوسکی نے تمہاری تبادلہ کی عرضی رد کر دی تھی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ تمہارے سوال کا جواب تمہیں دیا جا چکا ہے۔»

کرامیر اس قدر ہیجانی کیفیت میں بول رہا تھا کہ اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ یہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی فوج میں داخل ہونے سے پہلے ایک چھاپہ خانے میں کام کرتا تھا۔ سیسے کا چورا اس کے پھیپھڑوں میں گہرائی تک پیوست ہو گیا تھا اور

اس کے زرد بےآب چہرے پر اکثر اوقات سرخی کی ایک گہری لہر دوڑ جاتی تھی جو تپ دق کی علامت تھی۔

جوں ہی کرامیر کو سکون حاصل ہوا پاویل نے دبی ہوئی لیکن فیصلہ‌کن آواز میں کہا:

«یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی میں بدیانی کی فوج میں بھرتی ہوکر ہی رہوں‌گا۔»

دوسرے دن شام کو جب کیمپ کے تمام لوگ الاؤ کے گرد جمع ہوئے تو پاویل وہاں سے غائب تھا۔

قریب ہی کے ایک گاؤں میں بدیانی کے گھوڑ سواروں کی ایک ٹولی ایک پہاڑی کے اوپر اسکول کی عمارت کے باہر ایک وسیع دائرے کی شکل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک دیوقامت شخص اپنی ٹوپی پیچھے کی طرف سرکائے مشین‌گن کی گاڑی کی پشت پر بیٹھا ہوا اکارڈین بجا رہا تھا۔ اس کی غیرمشاق انگلیوں کی حرکت سے وہ باجہ بہت ہی بے سرے طریقے سے، ایک دردناک سی آواز میں چلا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بجانے کے بجائے کوئی اسے ایذا پہنچا رہا ہو۔ دائرے کے بیچ میں جو زندہ‌دل گھوڑ سوار سرخ رنگ کی بہت ہی ڈھیلی ڈھالی برجس پہنے بہت مستانہ وار ہوپک ناچ ناچ رہا تھا، وہ باجے کے بے سرے پن پر جھنجھلا اٹھتا تھا۔

گاؤں کے چھوکرے اور چھوکریاں مشین‌گن کی گاڑی یا چہار دیواریوں پر چڑھہ کر بڑی مشتاق نگاہوں سے ان فوجیوں کے کرتب دیکھہ رہی تھیں۔ ان کا بریگیڈ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گاؤں میں داخل ہوا تھا۔

«ہاں تپ‌تالو ذرا رہے۔ زمین کھد جائے تب کی بات ہے! اخ۔ یہ ہوئی بات برادر! ارے! اکارڈین ذرا اور تیز کرو۔ ابھی گرمی نہیں آئی!»

لیکن اکارڈین بجانے والے کی موٹی موٹی بھدی انگلیاں جو بڑی آسانی کے ساتھہ گھوڑے کی نعل کو موڑ سکتی تھیں اس ساز کے پردوں پر بہت ھی بھونڈے پن سے چل رھی تھیں ـ

«بڑا برا ھوا کہ آفاناسی کلیابکا ماخنو کی نذر ھو گیا» ایک گھوڑ سوار نے جس کا چہرہ کانسے کے رنگ کا تھا، افسوس کا اظہار کرتے ھوئے کہا ـ «وہ لڑکا بہت ھی عمدہ اکارڈین بجاتا تھا ـ وہ ھماری ٹکڑی میں دائیں بازو کی طرف اپنے گھوڑے پر سوار چل رھا تھا ـ بہت ھی برا ھوا کہ وہ مارا گیا ـ اور وہ سپاھی بھی بہت اچھا تھا ـ اور اس سے عمدہ اکارڈین بجانے والا تو ھمارے پاس کبھی ھوا ھی نہیں ـ»

پاویل دائرے میں کھڑا ھوا تھا ـ اس نے یہ آخری فقرہ سنا اور وہ دوسروں کو دھکا دیتا ھوا مشین‌گن کی گاڑی کے قریب جا پہنچا ـ وھاں پہنچ کر اس نے اپنا ھاتھہ اکارڈین کی دھونکنیوں پر رکھہ دیا اور موسیقی کا سلسلہ رفتہ رفتہ رک گیا ـ

«آخر تم چاھتے کیا ھو؟» اکارڈین بجانے والے نے ترش روئی سے اس سے پوچھا ـ

تپ تالو ناچتے ناچتے یک بیک رک گیا ـ اور مجمع میں غصے کی ایک لہر دوڑ گئی ـ «آخر معاملہ کیا ھے؟ کیا ھو رھا ھے وھاں؟»

پاویل نے آگے بڑھہ کر ساز کی طرف ھاتھہ بڑھایا «لائیے میں کوشش کرتا ھوں» اس نے کہا ـ

بدیانی کی فوج کا وہ گھوڑ سوار کچھہ بے یقینی کے ساتھہ اس سرخ سپاھی کو دیکھنے لگا، اور بڑی بے دلی کے ساتھہ اس نے اپنے کندھے سے اکارڈین کا تسمہ سرکا دیا ـ

ایک کہنہ مشق کی طرح پاویل نے ساز اپنے گھٹنوں پر رکھہ لیا اور اس کی لہردار دھونکنیوں کو پنکھے کی طرح کھولا اور

ایک پھڑکتی ہوئی دھن چھیڑ دی ۔ اکارڈین پر جتنی پرکیف اور سریلی موسیقی ممکن ہے وہ اس دھن میں موجود تھی:

کدھر چلی
او نئی نویلی نار؟
چیکا پکڑ لے جائے گی
پھر کبھی نہ آئے گی

تپ تالو نے جانی پہچانی دھن فوراً پکڑ لی اور اپنے بازوؤں کو ایک بہت بڑی چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا وہ دائرے میں داخل ہوا اور حیرت انگیز پینترے بدلتے ہوئے اس نے موسیقی کی تال پر بڑی چستی کے ساتھ باری باری سے اپنی رانوں، گھٹنوں، سر، ماتھے، جوتے کے تلوں اور آخر میں منھ پر تھپکیاں دینی شروع کیں ۔

اکارڈین کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی، اور اس سے مدھوش کر دینے والا پرکیف نغمہ پھوٹ رہا تھا ۔ تپ تالو بھی اپنی ٹانگوں کو بڑی چستی کے ساتھ اچھال کر ایڑی کے بل ناچتا ہوا پورے دائرے کا چکر لگاتا رہا جیسے کوئی لٹو ناچ رہا ہو ۔ آخرکار جب اس کا دم بالکل پھول گیا تو وہ رک گیا ۔

کئی مختصر سی لیکن گھمسان ٹکروں کے بعد پانچ جون ۱۹۲۰ء کو بدیانی کی پہلی گھوڑ سوار فوج پولستانی مورچے کو تیسری اور چوتھی پولستانی فوجوں کے درمیان چیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی ۔ اس کے بعد اس نے جنرل ساوتسکی کی رہنمائی میں لڑنے والے ایک پولستانی گھوڑ سوار بریگیڈ کو جو راستے میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، پسپا کیا اور پھر طوفانی رفتار سے روژین کی طرف روانہ ہوئی ۔

پولستانی کمان نے حملہ کرنے کے لئے جلدی جلدی ایک رسالہ منظم کیا اور اسے اس شگاف کو پر کرنے کے لئے لڑائی میں جھونک دیا ۔ پانچ ٹینک پوگرے بشچے اسٹیشن سے میدان جنگ کی طرف فوراً روانہ کئے گئے ۔ لیکن گھوڑ سوار فوج زارودنتسی سے کتراکر نکل گئی اور پولستانی مورچے کے عقب میں جا پہنچی ۔ پولستانیوں نے زارودنتسی میں ھی اس فوج پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا ۔

جنرل کورنتسکی کی گھوڑ سوار ڈویژن پہلی گھوڑ سوار فوج کا تعاقب کرنے کے لئے روانہ کی گئی، اور اسے پیچھے کی طرف سے اس فوج پر حملہ کرنے کی ھدایت دی گئی ۔ پولستانی کمان کا خیال تھا کہ یہ فوج کازاتن کی طرف جا رھی ھے جوکہ جنگ کے نقطۂ نگاہ سے پولستانی مورچہ کے عقب میں اھم ترین مقاموں میں سے ایک تھا ۔ لیکن اس چال سے بھی پولستانی فوجوں کی حالت سدھر نہ سکی ۔ حالانکہ وہ اس شگاف کو پر کرنے اور پہلی گھوڑسوار فوج کو باقی فوجوں سے الگ کر دینے میں کامیاب ھو گئے لیکن یہ بات ان کے لئے کافی تکلیف اور بے اطمینانی کا باعث بنی رھی کہ ان کے مورچے کے پیچھے ایک مضبوط گھوڑسوار فوج تھی جو ان کے عقبی اڈوں کو نیست و نابود کر دینے پر تلی ھوئی تھی، اور جو کسی بھی وقت ان کی کیئف میں مقیم فوجی ٹکڑی پر یلغار کر سکتی تھی ۔ آگے بڑھتے ھوئے سرخ گھوڑسوار ڈویژنوں نے راستے میں ریل کے کئی چھوٹے چھوٹے پل اڑا دئے اور ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دیں تاکہ پولستانی فوجوں کے لئے پیچھے بھاگنا دشوار ھو جائے ۔

قیدیوں سے یہ اطلاع پاکر کہ پولستانی فوج کا ایک ھیڈکوارٹر ژیتومیر میں قائم ھے (دراصل پورے مورچے کا ھیڈکوارٹر وھیں پر قائم تھا) پہلی گھوڑسوار فوج کے کمانڈر نے ژیتومیر اور بردیچیف پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کیا ۔ یہ دونوں شہر ریل کے اھم جنکشن تھے اور حکومت کے کاروبار کے بھی اھم مرکز تھے ۔ ۷ جون کو

علی‌الصبح چوتھی گھوڑسوار ڈویژن پوری رفتار کے ساتھ ژیتومیر کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔

گھوڑسواروں کی ایک ٹکڑی کے داھنے بازو کی طرف اکارڈین بجانے والے کلیابکو کی جگہ پر، جس کی موت کا سب کو بہت غم تھا، اب کورچاگن ایک گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ تمام سپاھیوں کی مجموعی درخواست پر اسے اس ٹکڑی میں بھرتی کر لیا گیا تھا کیوں‌کہ وہ لوگ اتنے اچھے اکارڈین بجانے والے کو ھاتھ سے جانے نہیں دینا چاھتے تھے۔

اپنے پسینے میں تر گھوڑوں کو سستانے کا موقع دئے بغیر وہ لوگ پنکھے کی شکل میں ژیتومیر کے آس پاس پھیل گئے اور سورج کی دھوپ میں اپنی ننگی تلواریں چمکاتے ھوئے شہر پر ٹوٹ پڑے۔

گھوڑوں کی ٹاپوں تلے زمین کراہ رھی تھی، گھوڑے بری طرح ھانپ رھے تھے، اور سپاھی رکابوں پر زور دےکر گھوڑوں کی گردنوں پر جھکے ھوئے آگے بڑھے جا رھے تھے۔

ان کے گھوڑوں کے قدموں کے نیچے زمین بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے بھاگی جا رھی تھی۔ اور وہ بڑا سا شہر اپنے باغوں اور سبزہ‌گاھوں سے آراستہ اس ڈویژن کا استقبال کرنے کے لئے ان کے سامنے تیزی سے بڑھا چلا آ رھا تھا۔ گھوڑوں پر سوار یہ طوفانی سیلاب باغوں کے قریب سے برق رفتاری کے ساتھ گذرتا ھوا شہر کے بیچوں بیچ ٹوٹ پڑا۔ ان کے دل دھلا دینے والے جنگی نعروں سے، جن میں موت کی سی بےرحمی تھی، فضا گونج اٹھی۔

پولستانی فوجیں اس قدر ششدر و حیران رہ گئیں کہ انہوں نے زیادہ مزاحمت بھی نہیں کی۔ اس شہر کی مقامی محافظ فوج پسپا کر دی گئی۔

اپنے گھوڑے کی گردن پر پوری طرح جھکا ھوا کورچاگن تپ‌تالو کے پہلو بہ پہلو بھاگم بھاگ چلا جا رھا تھا۔ تپ‌تالو

ایک پتلی ٹانگوں والے سیاہ گھوڑے پر سوار تھا۔ پاویل نے دیکھا کہ اس جانباز گھوڑ سوار نے ایک پولستانی سپاہی پر اچوک وار کرکے کس طرح اس کے دو ٹکڑے کر دئے۔ اس آدمی کو اپنی بندوق اٹھاکر کندھے تک لانے کا موقعہ بھی نہیں مل پایا۔

سڑک پر آگے بڑھتے ہوئے ان کے گھوڑوں کی لوہے کی نعلیں سڑک کے پتھروں سے ٹکراکر ایک کرخت آواز پیدا کر رہی تھیں۔ کچھہ دور آگے ایک چوراھے پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ان کے بالکل سامنے سڑک کے بیچوں بیچ ایک مشین گن لگی ہوئی ھے۔ نیلی وردیاں اور لمبوتری پولستانی ٹوپیاں پہنے ہوئے تین سپاہی مشین گن پر جھکے کھڑے تھے۔ ایک چوتھا آدمی بھی وھاں پر موجود تھا جس کے کوٹ کے کالر پر سنہری ڈوری سے ایک چھلےدار بیل بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ماوزر پستول سے گھوڑ سواروں پر نشانہ لیا۔

تپ‌تالو اور پاویل دونوں میں سے کوئی بھی اپنے گھوڑے کو نہ روک سکتا تھا۔ لہذا وہ دونوں سیدھے موت کے منھہ میں مشین گن کی سمت سرپٹ بڑھتے گئے۔ افسر نے کورچاگن پر گولی چلائی، لیکن اس کا نشانہ چوک گیا۔ گولی سنسناتی ہوئی پاویل کے گال کے قریب سے گذر گئی اور دوسرے لمحے اس لفٹیننٹ کا سر سڑک کے پتھروں سے ٹکرایا اور زناٹے کے ساتھہ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹکر کھاکر وہ بےحس و حرکت پیٹھہ کے بل گر پڑا۔

اسی لمحہ مشین گن سے بےتحاشہ گولیوں کی ایک وحشیانہ بوچھار ہوئی اور تپ‌تالو اور اس کا سیاہ گھوڑا دونوں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ تپ‌تالو کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک درجن سیسے کی بھڑوں نے اسے ایک ساتھہ بھنبوڑ لیا ہو۔

پاویل کا گھوڑا دھشت‌زدہ ہوکر ھنہناتا ہوا اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے سوار سمیت زمین پر پڑی ہوئی لاشوں

کو پھاندتا ھوا وہ مشین گن چلانے والے سپاھیوں پر کودا۔ پاویل کی تیغ فضا میں ایک روشن خط بناتی ھوئی ایک نیلے رنگ کی مستطیل فوجی ٹوپی میں دھنس گئی۔

تیغ دوبارہ چمکتی ھوئی اوپر کو اٹھی اور دوسرے سر پر پڑنے ھی والی تھی کہ دھشت زدہ گھوڑا چھٹک کر الگ ھٹ گیا۔

ایک تند کوھستانی آبشار کی طرح گھوڑ سوار رسالہ سڑک کے اس نکڑ پر ٹوٹ پڑا اور بیسیوں تیغیں فضا میں چمکنے لگیں۔

قید خانے کے تنگ، لمبے گلیارے لوگوں کی چیخ پکار سے گونج رھے تھے۔

کوٹھڑیوں میں ایک خلفشار مچا ھوا تھا۔ ان کوٹھڑیوں میں لا تعداد مرد اور عورتیں بری طرح ٹھونس کر بند کر دئے گئے تھے۔ ان کے چہرے سوکھے، مرجھائے ھوئے اور ستم زدہ نظر آ رھے تھے۔ ان لوگوں کو اس کا علم تھا کہ شہر میں لڑائی ھو رھی ھے اور ان کو اس بات پر آسانی سے یقین نہیں آ رھا تھا کہ اس کا مطلب تھا ان کی رھائی۔ انہیں یقین نہیں آ رھا تھا کہ جو حملہ آور اتنے اچانک طور پر شہر پر ٹوٹ پڑے تھے وہ ان کے اپنے ھی آدمی تھے۔

قید خانے کے صحن میں گولیاں چلنے لگیں۔ برآمدوں میں لوگ ادھر ادھر بھاگ رھے تھے اور پھر یک بیک انہیں وہ عزیز ازجان اور انتہائی مانوس الفاظ سنائی دئے جن کی وہ آس لگائے بیٹھے تھے: «ساتھیوں، آپ آزاد ھیں!»

پاویل ایک مقفل دروازے کی طرف لپکا جس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔ درجنوں قیدیوں کی آنکھیں اس کھڑکی میں سے بیتابی سے جھانک رھی تھیں۔ اس نے اپنی رائفل کا کندہ کئی بار تالے پر زور سے مارا۔

«ٹھہرو میں ابھی اسے ایک بم سے اڑائے دیتا ہوں» میرونوف نے پاویل کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا دستی بم نکال کر کہا۔

پلٹن کے کمانڈر تسیگارچنکو نے دستی بم اس کے ہاتھہ سے جھپٹ کر چھین لیا۔

«کیا کر رہے ہو، بے وقوف کہیں کے! تمہارا کچھہ دماغ خراب ہوا ہے؟ ابھی ذرا سی دیر میں چابیاں آئی جاتی ہیں۔ جو تالا آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتا اسے ہم چابیوں سے کھول لیں گے۔»

قید خانے کے گارڈ کے سپاہیوں کی پیٹھہ میں ریوالور اڑا کر انہیں بر آمدے میں سے ہو کر کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بر آمدہ شکستہ حال اور میلے کچیلے مردوں اور عورتوں سے بھر گیا جو خوشی کے مارے دیوانے ہو اٹھے تھے۔

کوٹھڑی کا دروازہ پورا کھول کر پاویل بھاگ کر اندر داخل ہوا۔

«ساتھیو، آپ آزاد ہیں! ہم لوگ بدیانی کی فوج کے سپاہی ہیں، ہماری ڈویژن نے شہر پر قبضہ کر لیا ہے!»

ایک عورت جس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، بھاگتی ہوئی پاویل کے قریب آئی، اور اسے اپنی باہوں میں بھینچ کر اس طرح سسک سسک کر رونے لگی جیسے اسے بہت دن کا بچھڑا ہوا اپنا کوئی عزیز مل گیا ہو۔

پانچ ہزار اکہتر بالشویکوں کی رہائی جنہیں پولستانی سفید فوجوں نے ان پتھر کے تہہ خانوں میں گولی مارے جانے یا پھانسی پر لٹکائے جانے کا انتظار کرنے کے لئے بند کر رکھا تھا، اور ان کے ساتھہ سرخ فوج کے دو ہزار سیاسی کارکنوں کی رہائی ان سپاہیوں کے نزدیک تمام نمائشات فتح سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ یہ انعام ان کے لئے خود فتح سے بھی بڑھہ کر تھا۔ ماہ جون کے تپتے ہوئے دنوں کے تابناک سورج نے ان سات ہزار

انقلابیوں کے لئے رات کی بھیانک تاریکی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

ایک قیدی جس کی جلد نیبو کی طرح زرد پڑ گئی تھی، خوشی سے بے تاب ہوکر پاویل کی طرف لپکا۔ وہ سیموئیل لیخر تھا جو شیپتووکا کے چھاپہ خانے میں کمپوزیٹر کا کام کرتا تھا۔

جب پاویل نے سیموئیل سے اس خون چکاں المیہ کی پوری داستان سنی، جو اس کی جنم بھومی میں کھیلا گیا تھا، تو اس کا چہرہ بالکل پھیکا پڑ گیا اور سیموئیل کے الفاظ اس کے دل میں پگھلی ہوئی دھات کے قطروں کی طرح پیوست ہوتے گئے۔

«انہوں نے ہمیں رات کے وقت گرفتار کیا، ہم سب لوگوں کو بیک وقت۔ کسی بدمعاش نے ہمارے ساتھ غداری کرکے فوجی پولیس کو ہمارے نام بتا دئے تھے۔ اور ایک بار جب ہم ان کے چنگل میں آ گئے تو انہوں نے ہمارے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کی۔ پاویل ان لوگوں نے ہمیں بڑی بے رحمی سے مارا۔ مجھے تو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کم تکلیف ہوئی کیوں کہ میں پہلے ہی چند لمحوں کے بعد بیہوش ہوکر گر پڑا۔ لیکن دوسرے لوگ نسبتاً زیادہ طاقت ور تھے۔

ہم لوگوں کے پاس کوئی خفیہ راز نہیں تھا۔ فوجی پولیس کو ہر بات کے بارے میں ہم سے زیادہ معلومات حاصل تھیں۔ انہیں ہم لوگوں کی ایک ایک گذشتہ حرکت کا پتہ تھا۔ اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے جب کہ ہم ہی میں سے کسی نے غداری کی تھی! پاویل، میں ان دنوں کے بارے میں گفتگو نہیں کر سکتا۔ جو لوگ گرفتار کئے گئے تھے ان میں سے بہتوں کو تم جانتے ہو۔ مثلاً والیا بروژاک اور روزا گرٹسمین، کیسی پیاری لڑکی تھی وہ! روزا حال ہی میں سترہ سال کی ہوئی تھی۔ پاویل کس قدر اعتبار

تھا اس کی آنکھوں میں! اس کے علاوہ ساشا بن شافٹ پکڑا گیا تھا ۔ اسے تو تم جانتے ہوگے ۔ وہ ہمارے چھاپہ خانے میں ٹائپ بٹھانے کا کام کرتا تھا ۔ بڑا مست لڑکا تھا ۔ ہمیشہ چھاپہ خانے کے مالک کے کارٹون بناتا رہتا تھا ۔ وہ لوگ اسے اور اس کے ساتھ ثانوی مدرسے کے دو لڑکوں، نوووسیلسکی اور تڑتس کو بھی پکڑ لئے گئے ۔ غالباً تمہیں وہ دونوں بھی یاد ہونگے؟ باقی لوگ بھی مقامی آدمی تھے ۔ چند لوگ ضلع کے مرکز کے بھی تھے ۔ کل ملاکر انتیس لوگ گرفتار کئے گئے تھے، جن میں سے چھ عورتیں تھیں ۔ ان سب کو سخت اذیتیں پہنچائی گئیں ۔ والیا اور روزا کی پہلے ہی دن عصمت دری کی گئی ۔ ان موذیوں نے ان کے ساتھ ہر قسم کی شرمناک حرکتیں کیں اور پھر ان بےچاریوں کو گھسیٹ کر کوٹھڑی میں ڈال گئے ۔ اس وقت ان کی مردوں سے بدتر حالت تھی ۔ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصے کے بعد روزا بہکی بہکی باتیں کرنے لگی اور کچھ ہی دن بعد بالکل پاگل ہو گئی ۔

ان لوگوں کو یقین نہیں آیا کہ وہ سچ مچ پاگل ہو گئی ہے! وہ کہتے تھے کہ بنتی ہے ۔ اس لئے ہر بار جب وہ اسے سوال کرنے کے لئے لے جاتے تھے تو بڑی بےرحمی سے پیٹتے تھے ۔ آخرکار جب ان لوگوں نے اسے گولی ماری اس وقت اس کی حالت انتہائی عبرت ناک ہو چکی تھی ۔ اس کا تمام چہرہ زخموں سے سیاہ پڑ گیا تھا، اس کی آنکھوں میں دیوانگی تھی اور وہ بالکل بڑھیا معلوم ہونے لگی تھی ۔

والیا بروژاک کا رویہ آخیر تک بہت قابل تعریف رہا ۔ ان سب نے سچے سورماؤں کی طرح اپنی جانیں دیں ۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان میں اتنی قوت برداشت کہاں سے آئی ۔ آہ پاویل! میں ان کی موت کا منظر تم سے کس طرح بیان کروں ۔ بہت ہی ہولناک تھا وہ منظر!

والیا کے ذمے بہت ہی خطرناک قسم کا کام تھا - پولستانی فوج کے ہیڈکوارٹر میں بے تار کی تاربرقی کے آلوں پر کام کرنے والے لوگوں اور ضلع کے مرکز میں ہمارے لوگوں کے ساتھہ وہی تعلق قائم رکھتی تھی - اس کے علاوہ جب اس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو اس کے یہاں سے ایک پستول اور دو دستی بم برآمد ہوئے - وہ دستی بم تو اسے اس شخص نے دئے تھے جو دشمن کے ساتھہ ساز باز کرکے ہمیں پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا - پوری سازش اس طرح مرتب کی گئی تھی کہ ان لوگوں پر یہ الزام لگایا جائے کہ وہ فوجی ہیڈکوارٹر کو اڑا دینا چاہتے تھے -

آہ پاویل! کیا بتاؤں ان آخری دنوں کا ذکر کرتے ہوئے میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے - لیکن چونکہ تم اصرار کر رہے ہو اس لئے میں تمہیں بتاؤں گا - فوجی عدالت نے والیا اور دوسرے دو شخصوں کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی اور باقی تمام لوگوں کے لئے گولی سے اڑا دئے جانے کی - جن پولستانی سپاہیوں نے ہمارے ساتھہ مل کر کام کیا تھا، ان پر دو دن پہلے ہی مقدمہ چلایا جا چکا تھا - کارپوریل سنےگرکو پر وطن کے ساتھہ غداری اور سپاہیوں میں کمیونسٹ خیالات کا پرچار کرنے کا الزام لگایا گیا اور اسے گولی سے اڑا دئے جانے کی سزا دی گئی - جنگ سے پہلے وہ لودز کے شہر میں بجلی کا مستری تھا - گرفتاری کے وقت وہ بے تار کی تاربرقی کے آلوں پر کام کرتا تھا - اس نے سزائے موت کے خلاف کوئی اپیل بھی نہیں کی اور سزا سنانے کے چوبیس گھنٹے بعد اسے گولی مار دی گئی -

اس کے مقدمے میں والیا کو شہادت کے لئے طلب کیا گیا تھا - بعد میں اس نے ہم لوگوں کو بتایا کہ سنےگرکو نے عدالت کے سامنے کمیونسٹ کے خیالات کا پرچار کرنے کے الزام کو تسلیم کیا لیکن اس بات کو قطعی تسلیم نہیں کیا کہ اس نے اپنے ملک کے

ساتھہ کسی قسم کی غداری کی تھی – اس نے کہا «میری مادر وطن پولستانی سوویت سوشلسٹ جمہوریت ہے – ہاں میں پولینڈ کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہوں – مجھے میری مرضی کے خلاف فوج میں بھرتی کیا گیا، اور ایک بار فوج میں پہنچنے کے بعد میں نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ میں اپنے جیسے متعدد دوسرے لوگوں کی آنکھیں کھول دوں جنہیں زبردستی جنگ کے مورچے پر بھیج دیا گیا تھا – مجھے اس جرم کے لئے بیشک پھانسی دی جا سکتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ میں نے مادر وطن کے ساتھہ غداری کی ہے کیونکہ نہ تو میں کبھی غدار تھا اور نہ کبھی آئندہ اپنی مادر وطن کے ساتھہ غداری کروں گا – تمہارا وطن میرا وطن نہیں – تمہارا وطن رؤسا کا وطن ہے اور میرا وطن مزدوروں اور کسانوں کا وطن ہے – اور میرے وطن میں، جو ایک دن قائم ہوکے رہے گا — اس بات کے بارے میں مجھے کسی قسم کا شبہہ نہیں ہے — مجھے کبھی کوئی غدار نہیں کہہ سکے گا –

مقدمے کے بعد ہم سب کو ساتھہ رکھا گیا – سزائے موت کی تعمیل سے فوراً پہلے ہم لوگوں کو جیل بھیج دیا گیا – رات کو ان لوگوں نے جیل کے سامنے ہسپتال کے قریب پھانسی کا تختہ تیار کیا – گولی مارنے کے لئے انہوں نے سڑک سے تھوڑے فاصلے پر جنگل کے قریب کی ایک بڑی سی خندق کے پاس ایک جگہ منتخب کی تھی – ہم سب لوگوں کے لئے ایک مشترکہ قبر تیار کی گئی تھی –

ان سزاؤں کا اعلان کرتے ہوئے تمام شہر میں پوسٹر چپکا دئے گئے تھے تاکہ ہر شخص کو ان کی اطلاع ہو جائے – شہر کے تمام باشندوں کے دلوں میں دہشت بٹھانے کے لئے پولستانیوں نے بہ سرعام یہ سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا تھا – صبح ہی سے وہ لوگ شہر والوں کو کھدیڑ کھدیڑکر قتل گاہ کی طرف لانے لگے – حالانکہ

یہ بہت ہی ہولناک منظر تھا، لیکن کچھہ لوگ وہاں محض تماشہ دیکھنے کی غرض سے گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں جیل خانے کی دیوار کے باہر بہت بڑا مجمع جمع کر لیا گیا۔ اپنی جیل کی کوٹھڑی سے ہمیں ان لوگوں کی آوازوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ مجمع کے پیچھے سڑک پر انہوں نے مشین گنیں لگا رکھی تھیں۔ اور اس علاقے کے ہر حصے سے گھوڑسوار اور پیدل خفیہ پولیس کو خاص طور پر بلا لیا گیا تھا۔ ان پولیس والوں کی ایک پوری بٹالین سڑکوں کو اور ان کے اس پار والے سبزیوں کے کھیتوں کو گھیرے کھڑی تھی۔ جن لوگوں کو پھانسی دی جانے والی تھی ان کے لئے پھانسی کے تختے کے پاس ایک بڑا سا گڑھا کھودا گیا تھا۔

ہم لوگ خاموشی کے ساتھہ اپنے انجام کا انتظار کر رہے تھے، کبھی کبھی آپس میں بس ایک آدھہ بات کر لیتے تھے۔ اس سے پچھلی رات کو ہم لوگوں کو جو کچھہ بھی کہنا سننا تھا سب کہہ سن چکے تھے اور ایک دوسرے سے رخصت ہو چکے تھے۔ صرف روزا کوٹھڑی کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی اپنے آپ سے چپکے چپکے کچھہ باتیں کر رہی تھی۔ اتنی مارپیٹ اور اذیتیں برداشت کرنے کے بعد والیا میں تو ہلنے جلنے کی بھی سکت باقی نہیں رہی تھی اور وہ تمام وقت بےحس و حرکت پڑی رہتی تھی۔ دو مقامی کمیونسٹ لڑکیاں جو آپس میں بہنیں تھیں، جب آخری بار ایک دوسرے سے رخصت ہونے کے لئے گلے ملیں تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ ستیپانوف نے جو ایک دیہاتی کڑیل جوان تھا، اور جس نے دو پولیس والوں کو مار گرایا تھا جب وہ اسے گرفتار کرنے کے لئے گئے تھے، ان دونوں بہنوں کو رونے سے منع کیا: «ساتھیو آنسو نہ بہاؤ! تم یہاں تو خیر رو سکتی ہو لیکن وہاں باہر قطعی نہیں۔ ہم لوگ ان بدمعاشوں قاتلوں کو دل ہی

دل میں خوش ہونے کا موقعہ نہیں دے سکتے۔ ہمارے ساتھہ اب کسی قسم کا رحم کئے جانے کی امید تو ہے نہیں۔ ہمیں مرنا تو بہرحال ہے، پھر کیوں نہ ہم عزت کے ساتھہ مریں۔ ہم ان کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔ ساتھیوں، یاد رہے ہم لوگ شان کے ساتھہ مریں گے۔

پھر وہ لوگ ہمیں لینے آئے۔ ان کے آگے آگے محکمۂ سراغ رسانی کا اعلی حاکم شوارکاؤسکی تھا۔ وہ بالکل پاگل کتے کی مانند تھا اور ایذا پسند تو حد درجے کا تھا۔ جب وہ خود زنا نہیں کرتا تھا تو اپنے پولیس والوں کو زنا کرتے دیکھہ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ ہمیں خفیہ پولیس کی دو قطاروں کے درمیان سے ہوکر پھانسی کے تختے کی سمت سڑک پر لے جایا گیا۔ ہم ان پولیس والوں کو 'کینری' کہتے تھے کیوں کہ ان کے شانوں پر زرد رنگ کے جھبے لگے رہتے تھے۔ وہ ہاتھوں میں بے نیام تیغیں لئے سڑک کے دونوں طرف کھڑے تھے۔

اپنی رائفلوں کے کندوں سے ٹھیل ٹھیل کر انہوں نے ہمیں جیل خانے کے صحن سے جلدی جلدی باہر نکالا۔ اور ہمیں چار چار کی قطاروں میں کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھاٹک کھولا اور ہمیں باہر سڑک پر لاکر پھانسی کے تختے کی طرف منھہ کر کے کھڑا کر دیا تاکہ اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے ہم اپنے ساتھیوں کو مرتے ہوئے دیکھیں۔ پھانسی کا چوکھٹا بہت اونچا تھا، اور موٹے موٹے شہتیروں سے تیار کیا گیا تھا۔ چوکھٹے کے درمیانی بڑے شہتیر سے موٹی رسی کے تین پھندے لٹک رہے تھے۔ اور ہر پھندے کے نیچے ایک زینے دار چبوترہ لکڑی کے کندوں پر ٹکا ہوا تھا۔ لکڑی کے یہ کندے پیر کی ٹھوکر سے کھسکائے جا سکتے تھے۔ مجمع کے بیکراں سمندر سے جو ہولے ہولے ہلکورے لے رہا تھا ایک ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز اٹھی۔ تمام نظریں ہم لوگوں

پر جمی ہوئی تھیں۔ ہم نے مجمع میں اپنے کچھ عزیزوں کو پہچانا۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک برساتی کے قریب پولستانی رؤسا اور افسران کا گروہ دوربینیں لئے کھڑا تھا۔ وہ لوگ بالشویکوں کو پھانسی دئے جانے کا تماشہ دیکھنے آئے تھے۔

ہمارے قدموں کے نیچے نرم برف بچھی ہوئی تھی۔ تمام جنگل برف سے سفید ہو رہا تھا۔ اور درختوں پر برف کی موٹی موٹی تہیں روئی کے گالوں کی طرح جمی ہوئی تھیں۔ برف کے گالے فضا میں چکر کاٹتے ہوئے دھیرے دھیرے گر رہے تھے اور ہمارے تمتماتے ہوئے چہروں پر آکر پگھل جاتے تھے۔ پھانسی کے تختے کے زینوں پر بھی برف کا غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ ہم لوگ بہت ہی ناکافی کپڑے پہنے ہوئے تھے، لیکن ہم میں سے کسی کو بھی سردی نہیں لگ رہی تھی۔ ستیپانوف کو تو اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ صرف موزے ہی پہنے ہوئے چل رہا ہے۔

پھانسی کے تختے کے نزدیک فوجی وکیل اور دیگر بڑے بڑے افسران کھڑے تھے۔ آخرکار والیا اور دوسرے دو ساتھیوں کو جنہیں پھانسی دی جانے والی تھی، جیل سے باہر نکالا گیا۔ وہ تینوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔ والیا بیچ میں تھی اور وہ دونوں اسے سہارا دئے ہوئے تھے کیوں‌کہ اس میں اپنے بل پر چلنے کی سکت نہیں تھی، لیکن وہ اپنے آپ کو سیدھا رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اسے ستیپانوف کے الفاظ یاد تھے: «ساتھیو، ہم لوگ شان کے ساتھ مریں گے۔» وہ صرف ایک اونی جیکٹ پہنے تھی۔ اس کے جسم پر کوٹ بھی نہیں تھا۔

ظاہر ہے شوارکاؤسکی کو ان کا اس طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈال‌کر چلنا قطعی پسند نہیں تھا کیونکہ وہ انہیں پیچھے سے ٹھیل رہا تھا۔ والیا نے کچھ کہا اور خفیہ پولیس کے ایک گھوڑ سوار

نے پورے زور کے ساتھہ اس کے چہرے پر اپنی چابک رسید کر دی - مجمع میں سے ایک عورت دردناک انداز میں چیخ پڑی اور گھیرے کو توڑکر قیدیوں تک پہنچ جانے کی کوشش میں دیوانوں کی طرح کش‌مکش کرنے لگی - لیکن اسے گھسیٹ‌کر پیچھے ہٹا دیا گیا - یقیناً وہ والیا کی ماں ہوگی - جب وہ لوگ پھانسی کے تختے کے قریب پہنچے تو والیا نے گانا شروع کیا - اپنی عمر میں میں نے ویسی آواز نہیں سنی - صرف وہی شخص جو اپنی موت کا سامنا کرنے جا رہا ہو، جذبات کی اتنی شدت کے ساتھہ گا سکتا ہے - وہ «وارشاؤیانکا» نامی ترانہ گا رہی تھی اور باقی دونوں بھی اس کی آواز میں‌آواز ملاکر گانے لگے - گھوڑ سوار سپاہیوں نے غصے سے بیتاب ہوکر ان پر اندھادھند کوڑے برسانے شروع کئے - لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان تینوں کو چوٹ کا احساس ہی نہ ہو رہا ہو- وہ مارتے مارتے گرا دئے گئے اور پھر بوروں کی طرح گھسیٹ‌کر انہیں پھانسی کے تختے پر لے جایا گیا - سزائے موت جلدی جلدی پڑھ‌کر سنائی گئی، اور ان کی گردنوں میں پھندے ڈال دئے گئے - اسی وقت ہم لوگوں نے گانا شروع کیا:

اٹھہ جاگ بھوکے بندی....

چاروں طرف سے سپاہی ہم لوگوں کی طرف جھپٹ پڑے اور اس ہنگامے میں میں صرف اتنا دیکھہ سکا کہ رائفل کے کندوں سے ٹھیل ٹھیل‌کر چبوتروں کے نیچے سے ان کو سہارا دینے والی لکڑی سرکا دی گئی اور تین جسم ان پھندوں میں جھٹکا کھاکر جھول گئے...

ہم باقی لوگوں کو بھی دیوار کے سہارے کھڑا کیا جا چکا تھا کہ اتنے میں اعلان کیا گیا کہ ہم میں سے دس کی سزائیں گھٹاکر بیس سال قید کی سزائیں کر دی گئی ہیں - باقی سولہ کو گولی مار دی گئی -»

سیموئیل نے بڑے مضطربانہ طریقے سے اپنی قمیص کا کالر پکڑ لیا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

«تین دن وہ لاشیں ان پھندوں میں جھولتی رہیں ۔ پھانسی کے تختے کے قریب دن رات پہرہ لگا رہتا تھا ۔ اس کے بعد قیدیوں کا ایک نیا جتھہ جیل میں لایا گیا، اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ جس پھندے سے کامریڈ توبولدین کی لاش لٹک رہی تھی وہ چوتھے دن ٹوٹ گیا ۔ وہ ان تینوں میں سب سے زیادہ بھاری تھا ۔ اس کے بعد ان لوگوں نے باقی دونوں لاشیں بھی اتار لیں اور سب کو دفن کر دیا ۔

لیکن پھانسی کا چوکھٹا نہیں اتارا گیا ۔ جب ہم لوگ یہاں لائے گئے اس وقت تک وہ وہاں بدستور قائم تھا ۔ نئے شکار کے انتظار میں پھانسی کے پھندے ابھی تک اس میں لٹک رہے ہیں ۔»

سیموئیل چپ ہو گیا اور اپنے سامنے کی طرف خلا میں گھورنے لگا ۔ لیکن پاویل اس بات سے بے خبر تھا کہ قصہ ختم ہو گیا ہے ۔ وہ تینوں لاشیں خاموشی سے اس کی نظروں کے سامنے جھول رہی تھیں، اور ان کے سر بہت ہی بھیانک انداز میں ایک طرف کو جھکے ہوئے تھے ۔

باہر بگل کی آواز سن کر پاویل چونک کر ہوش میں آیا ۔ سپاہیوں کے جمع ہونے کا وقت آ گیا تھا ۔

«آو سیموئیل چلیں» اس نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ اسے سننا بھی دشوار تھا ۔

سڑک کے دونوں طرف گھوڑ سوار سپاہی قطار باندھے کھڑے تھے ۔ پولستانی قیدیوں کا ایک جتھہ سڑک پر لے جایا جا رہا تھا ۔ قید خانے کے پھاٹک پر رجمنٹ کا کمیسار کھڑا کاغذ پر کوئی حکم تحریر کر رہا تھا ۔

«کامریڈ آنتیپوف» اس نے ایک تنو مند اسکواڈرن کمانڈر کو پرچی تھماتے ہوئے کہا ۔ «یہ لو اور تمام قیدیوں کو گھوڑ سوار

سپاہیوں کی نگرانی میں نووو گراد والنسکی پہنچا دو۔ جو لوگ زخمی ہیں ان کی طبی دیکھ بھال کا پورا خیال رکھنا۔ وہاں سے انہیں گاڑیوں پر بٹھا کر شہر سے تقریباً بارہ پندرہ میل دور لے جاکر چھوڑ دینا۔ ہمارے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم ان سے اپنا سر کھپائیں۔ لیکن دیکھو قیدیوں سے کسی قسم کی بد سلوکی نہ کی جائے۔»

اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر پاویل نے مڑکر سیموئیل کی طرف دیکھا اور کہا «سنا تم نے؟ وہ تو ہمارے آدمیوں کو پھانسی دیں اور ہم ان کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں لے جاکر ان کی طرف واپس پہنچا دیں۔ اور اوپر سے طرہ یہ کہ ان کے ساتھ سلوک بھی اچھا کریں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟»

رجمنٹ کے کمانڈر نے مڑکر دیکھا اور یہ الفاظ کہنے والے کو سختی سے گھورا۔ «نہتے قیدیوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرنے والے کو» پاویل نے اسے کہتے سنا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو «موت کی سزا دی جائے گی۔ ہم لوگ سفید فوج کے آدمی نہیں ہیں!»

اپنے گھوڑے پر آگے بڑھتے وقت پاویل کو انقلابی فوجی کونسل کے اس حکم کے آخری الفاظ یاد آئے، جو پوری رجمنٹ کے سامنے پڑھ کر سنایا گیا تھا:

«مزدوروں اور کسانوں کی سرزمین اپنی سرخ فوج سے محبت کرتی ہے۔ اور اسے اس فوج پر ناز ہے۔ اس فوج کے پرچم پر کبھی ایک بھی دھبہ نہیں لگنے پائے گا۔»

«ایک بھی دھبہ نہیں» پاویل کے ہونٹوں نے دھرایا۔

جس وقت چوتھی گھوڑ سوار ڈویژن نے ژیتومیر پر قبضہ کیا اس وقت ساتویں رائفل ڈویژن کی بیسویں بریگیڈ جو کامریڈ گولیکوف

کی رہنمائی میں لڑنے والے ایک طوفانی رسالے کا حصہ تھی۔ آکونیووو گاؤں کے قریب دریائے دنیپر کو پار کر رہی تھی۔

اس رسالے کو جو پچیسویں رائفل ڈویژن اور ایک باشکیر گھوڑ سوار بریگیڈ پر مشتمل تھا، دریائے دنیپر پار کرکے ایرشا اسٹیشن کے قریب کیئف اور کوروستین کے درمیان کی ریلوے لائن کے دونوں طرف مورچہ جمانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس چال کے کامیاب ہو جانے سے پولستانیوں کا کیئف سے بھاگ نکلنے کا آخری راستہ بھی بند ہو جاتا تھا۔

دریا پار کرنے کے دوران میں شپیتووکا کی کومسومول تنظیم کے رکن میشا لیوچوکوف کا انتقال ہو گیا۔ وہ لوگ کشتیوں کے ہلتے ڈولتے پل پر سے ہوکر بھاگ رہے تھے کہ اتنے میں دریا کی دوسری طرف والے ڈھلوان کنارے کے پار کہیں سے ایک گولہ انتہائی خطرناک انداز سے سنسناتا ہوا ان کے سروں پر سے گذرا اور ایک زبردست چھپاکے کے ساتھ بہت سا پانی اچھالتا ہوا دریا میں گرا۔ اسی لمحہ میشا پل کی ایک کشتی کے نیچے غائب ہو گیا۔ دریا نے اسے نگل لیا اور پھر واپس نہیں کیا۔ سنہرے بالوں والا ایک سپاہی یاکی‌مینکو جو ایک فرسودہ سی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، چیخ پڑا: «میشکا! ارے وہ تو میشکا تھا! ہائے بیچارہ پتھر کی طرح ڈوب کے رہ گیا!» دہشت سے وہ ایک لمحے تک پانی کے اندر گھورتا رہا۔ لیکن اس کے پیچھے بھاگ کر آتے ہوئے سپاہیوں نے اسے آگے کی طرف دھکا دے کر کہا «بے وقوف کہیں کا۔ وہاں کیا جھانک رہا ہے۔ آگے کیوں نہیں بڑھتا؟» ان کے پاس کسی کے لئے پریشان ہونے کا بھی وقت نہیں تھا۔ ان کی بریگیڈ باقی لوگوں سے پیچھے رہ گئی تھی، جو آگے جاکر دریا کے داہنے کنارے پر قبضہ کر چکے تھے۔

سرگئی کو چار دن تک میشا کی موت کی خبر نہیں ملی۔ اس وقت تک بریگیڈ بوچا کے اسٹیشن پر قبضہ کر چکی تھی اور

تیزی کے ساتھہ کیئف کی طرف مڑکر پولستانیوں کے زبردست حملے کا مقابلہ کر رہی تھی۔ پولستانی ان کی صفوں کو چیرکر کوروستین پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

یاکی‌مینکو گولیاں چلانے والوں کی صف میں آکر سرگئی کے برابر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ وہ کچھہ دیر سے مسلسل گولیاں چلا رہا تھا اور اب اسے اپنی رائفل کا توڑا جھٹکے کے ساتھہ آگے کرنے میں بھی دقت ہو رہی تھی کیونکہ رائفل بہت گرم ہو گئی تھی۔ بڑی احتیاط کے ساتھہ اپنا سر بالکل نیچے کئے ہوئے وہ سرگئی سے مخاطب ہوکر بولا «اسے کچھہ دیر کے لئے آرام دینا ہوگا۔ بالکل تپ رہی ہے۔»

گولیاں چلنے کے شوروغل میں سرگئی اس کی بات بھی ٹھیک سے نہ سن سکا۔

جب شور کچھہ کم ہوا تو یاکی‌مینکو نے یوں ہی غیرارادی طور پر کہا «تمہارا ساتھی تو دنیپر میں ڈوب گیا۔ قبل اس کے کہ میں کچھہ کر سکتا وہ ڈوب چکا تھا۔» اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ اس نے اپنی رائفل کا توڑا آگے سرکانے کی کوشش کی اور آزماکر دیکھا کہ وہ ٹھیک کام کر رہا ہے یا نہیں۔ پھر اس نے کارتوسوں کی ایک نئی پیٹی نکالی اور دوبارہ رائفل میں کارتوس بھرنے میں مصروف ہو گیا۔

گیارھویں ڈویژن کو جو بردی‌چیف پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی، پولستانیوں کی سخت مدافعت کا سامنا کرنا پڑا۔ شہر کی سڑکوں پر بہت ہی گھمسان رن پڑا۔ مشین‌گن کی گولیوں کی بوچھار میں سے ہوکر سرخ سوار فوج آگے بڑھتی گئی۔ شہر پر قبضہ کر لیا گیا اور شکست کھائی ہوئی پولستانی فوج کے بچے کھچے لوگ شہر چھوڑکر بھاگ گئے۔ ریلوے کے یارڈوں میں ریل گاڑیاں

جوں کی توں قابل استعمال حالت میں ان کے قبضے میں آ گئیں۔ لیکن پولستانیوں کے لئے سب سے زیادہ تباہ‌کن نقصان تو یہ ہوا کہ ان کا گولہ بارود کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جہاں سے پورے مورچے کو گولہ بارود پہنچایا جاتا تھا، اڑا دیا گیا۔ دس لاکھ گولے ہوا میں اڑ گئے۔ اس زبردست دھماکے سے دور دور تک کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ‌کر چور چور ہو گئے اور مکان اسطرح لرزنے لگے جیسے دفتی کے بنے ہوئے ہوں۔

ژیتومیر اور بردی‌چیف پر قبضہ ہو جانے سے پولستانی مورچہ کا عقب حملہ‌آور فوجوں کی زد میں آ گیا۔ اور پولستانی فوجیں کیئف شہر سے دو دھاروں میں جوق در جوق باہر نکلنے لگیں۔ جو آھنی شکنجہ ان کے گرد کستا جا رہا تھا اسے توڑکر نکل جانے کی کوشش میں وہ اپنا سب کچھہ داؤں پر لگاکر لڑ رہی تھیں۔

لڑائی کے طوفانی سیلاب میں گھرکر پاویل ان دنوں اپنی ذات کا احساس بھی کھو بیٹھا تھا۔ اس کی شخصیت جماعت کی شخصیت میں ضم ہو گئی تھی، اور ہر مصروف جنگ سپاہی کی طرح اس کے ذھن میں بھی لفظ «میں» کا کوئی وجود باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے ذھن میں اب صرف لفظ «ھم» باقی رہ گیا تھا: «ھماری رجمنٹ، ھمارا اسکواڈرن، ھماری بریگیڈ۔»

حالات طوفانی رفتار سے تبدیل ہو رہے تھے۔ ہر دن اپنے ساتھہ کوئی نیا واقعہ لےکر آتا تھا۔

بدیانی کی گھوڑ سوار فوج ایک تند سیلاب کی طرح آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔ وہ دشمن پر پے در پے حملے کر رہی تھی، یہاں تک کہ پولستانی مورچے کے عقب کے پرخچے اڑ گئے۔ اپنی فتوحات کے ھیجانی جوش سے مست ہوکر ان گھوڑ سوار ڈویژنوں نے نوووگراد والنسکی پر، جو کہ پولستانی عقب کا سب سے اھم مرکز تھا، انتہائی غضب‌ناک طریقے سے یلغار کر دی۔ جس طرح سمندر کی لہریں چٹانی ساحل سے ٹکراکر پیچھے ہٹ جاتی ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر

بعد پھر آگے بڑھتی ہیں، اسی طرح وہ بھی پیچھے ہٹتے تھے، لیکن دلوں میں دہشت بٹھا دینے والے «بزن! بزن!» کے نعرے بلند کرتے ہوئے پھر آگے بڑھنے لگتے تھے۔

پولستانیوں کو اب کوئی بھی طاقت بچا نہیں سکتی تھی — نہ کانٹےدار تاروں کے گھیرے اور نہ اس محافظ شہر فوج کی شدیدترین مدافعت جوکہ شہر میں مضبوطی سے اپنے قدم جمائے ہوئے تھی، اور ۲۷ جون کی صبح کو بدیانی کی گھوڑسوار فوجیں گھوڑوں پر سے اترے بغیر ہی دریائے سلوچ کو پار کر گئیں — اور نوووگراد والنسکی میں داخل ہوکر انہوں نے پولستانیوں کو کوریتس کی سمت شہر سے باہر نکال دیا۔ اسی وقت پینتالیسویں ڈویژن نے نووی میروپول نامی مقام کے قریب دریائے سلوچ کو پار کیا — اور کوتوفسکی کی گھوڑ سوار بریگیڈ ایوبار نامی بستی پر ٹوٹ پڑی۔

پہلی گھوڑ سوار فوج کے ریڈیو اسٹیشن میں جنگی مورچے کے کمانڈر انچیف کا یہ حکم آیا کہ رونو پر قبضہ کرنے کے لئے تمام گھوڑ سوار فوجوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کیا جائے۔ سرخ ڈویژنوں کی ناقابل شکست یلغار کے آگے پولستانی فوجیں پست ہمت ہوکر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تتر بتر ہو گئیں۔

انہیں طوفانی دنوں کے دوران میں پاویل کورچاگن کے ساتھ ایک نہایت غیرمتوقع واقعہ پیش آیا۔ اس کو بریگیڈ کے کمانڈر نے کسی کام سے اسٹیشن بھیجا تھا جہاں ایک زرہ بند ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ پاویل گھوڑے کو دلکی چال سے بھگاتا ہوا ریلوے لائن کے کنارے والے پشتے کو پار کر گیا اور فولادی خاکستری رنگ کے اگلے ڈبے کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ چھوٹی چھوٹی گول برجیوں سے توپوں کے سیاہ دہانے نکلے ہوئے تھے، اور ان توپوں کی وجہ سے گاڑی بہت بھیانک اور مرعوب کن معلوم ہو رہی تھی۔ تیل سے چکٹے ہوئے کپڑے پہنے

کئی آدمی گاڑی کے قریب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے ۔ وہ لوگ فولاد کی اس بھاری چادر کو چڑھا رہے تھے جو پہیوں کی حفاظت کے لئے لگائی جاتی ہے ۔

«میں اس ٹرین کے کمانڈر سے کہاں مل سکتا ہوں؟» پاویل نے سرخ فوج کے ایک سپاہی سے پوچھا جو چمڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا اور ہاتھہ میں پانی کی ایک بالٹی لئے چلا آ رہا تھا ۔

«وہاں چلے جاؤ» اس آدمی نے ریل کے انجن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا ۔

پاویل اپنا گھوڑا بڑھاکر انجن کے قریب جا پہنچا ۔ «میں کمانڈر سے ملنا چاہتا ہوں» اس نے کہا ۔ ایک شخص نے جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور جو سر سے پاؤں تک چمڑے کا لباس پہنے ہوئے تھا اس کی طرف مڑکر کہا «کہو میں کمانڈر ہوں ۔»

پاویل نے فوراً اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا ۔

«بریگیڈ کے کمانڈر نے یہ حکم آپ کے لئے بھیجا ہے ۔ لفافے پر دستخط کر دیجئے ۔»

کمانڈر نے لفافہ اپنے گھٹنوں پر رکھہ‌کر اس پر اپنے دستخط گھسیٹ دئے ۔ انجن کے نیچے ریل کی پٹڑی کے قریب ایک آدمی تیل کی کپی لئے انجن کے بیچ والے پہیے میں تیل دے رہا تھا ۔ پاویل کو صرف اس کی چوڑی پیٹھہ اور اس کی چمڑے کی پتلون کی جیب سے باہر جھانکتی ہوئی پستول کی موٹھہ دکھائی دے رہی تھی ۔

ٹرین کے کمانڈر نے لفافہ پاویل کو واپس پکڑا دیا ۔ پاویل نے اپنے گھوڑے کی باگ سنبھالی اور وہ چلنے ہی کو تھا کہ تیل کی کپی والا وہ شخص اٹھہ‌کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مڑا ۔ چشم زدن میں پاویل اپنے گھوڑے سے کود پڑا جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے اڑ کر گر پڑا ہو ۔

«آرتیم!»

اس شخص نے تیل کی کپی زمین پر ڈال دی اور سرخ فوج کے اس نوجوان سپاہی کو اپنی ریچھہ کی سی آغوش میں کس کر بھینچ لیا۔

«پاوکا! شیطان! یہ تو ہے!» وہ خوشی سے چلا پڑا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

زرہ بند ٹرین کا کمانڈر اور قریب کھڑے ہوئے اور کئی توپچی کھلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھہ ان کو دیکھتے رہے۔

«عجیب بات ہے کہ دو بھائی اچانک اس طرح مل جائیں» انہوں نے کہا۔

یہ واقعہ ۱۹ اگست کو لووف کے علاقے کی ایک لڑائی کے دوران میں پیش آیا۔ لڑائی میں پاویل کی ٹوپی کہیں گم ہو گئی تھی، اور وہ اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ کر رک گیا تھا۔ اس کے آگے والے اسکواڈرن پولستانی مورچے کو چیر کر آگے بڑھہ گئے تھے۔ اسی وقت دریا کی سمت سرپٹ اپنا گھوڑا بھگاتا ہوا دیمیدوف جھاڑیوں کے بیچ میں سے نکلا۔ پاویل کے قریب سے ہوکر آندھی کی طرح گذرتے ہوئے اس نے چلاکر کہا:

«ڈویژن کمانڈر مارا گیا!»

پاویل چونک پڑا۔ لیتونوف اس کا دلیر و جانباز کمانڈر، وہ جوہردار شجاعت کا مالک، مارا گیا! پاویل پر ایک وحشیانہ غیظ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اپنے تھکن سے چور گھوڑے گنیدکو کو آگے بڑھانے کی غرض سے اس نے اپنی تیغ کے کند سرے سے اسے کونچا اور آندھی کی طرح گھوڑا دوڑاتا ہوا وہ گھمسان لڑائی میں کود پڑا۔ گھوڑے کے منہہ سے خون آلود جھاگ ٹپک رہا تھا۔

«مار ڈالو ان موذیوں کو۔ قتل کر دو! پولستانی درندوں کی بوٹیاں بوٹیاں اڑا دو۔ انہوں نے ہمارے لیتونوف کو مار ڈالا ہے!»
اور بے سوچے سمجھے پاویل نے سبز وردی والے ایک سپاہی پر بھرپور وار کر دیا ـ اپنی ڈویژن کے کمانڈر کی موت پر غصے سے پاگل گھوڑ سوار سپاہیوں نے پولستانی فوجیوں کی ایک پوری پلٹن کا صفایا کر دیا ـ

دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے وہ میدان جنگ میں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے بے تحاشہ آگے بڑھے ـ لیکن اتنے میں پولستانی توپ‌خانے کا ایک دستہ آگ اگلنے لگا ـ گولوں کے دھماکے سے فضا گونج رہی تھی، اور چاروں طرف موت کی بارش ہو رہی تھی ـ

دفعتاً پاویل کی آنکھوں کے سامنے ایک سبز رنگ کا خیرہ‌کن شعلہ سا کوند گیا ـ اس کے کان ایک زبردست دھماکے کی گونج سے سن ہو گئے، اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دھکتے ہوئے سرخ لوہے کی ایک سلاخ اس کی کھوپڑی میں گھس گئی ہو۔ اس کے چاروں طرف زمین ایک عجیب و غریب اور ہیبتناک انداز میں گھومنے لگی اور رفتہ رفتہ الٹ پلٹ ہونے لگی ـ

پاویل ایک تنکے کی طرح اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر سے گرا اور وہ بڑی تیزی سے گنیدکو کے سر پر سے ہوتا ہوا دھم سے زمین پر آ رہا ـ

اور چشم زدن میں چاروں طرف سیاہ رات چھا گئی...

۹
نواں باب

اوکٹوپس* کی ایک بلی کے سر کے برابر، باہر کو ابھری ہوئی آنکھ ہے! ایک چمکتی ہوئی سرخی مائل آنکھ، جس کے سبز مرکز

---

* ایک خوفناک بحری جانور جس کے آٹھ ٹانگیں ہوتی ہیں ـ

میں ایک دمکتی ہوئی ضو فگن روشنی لرزتی رہتی ہے۔ یہ خوفناک درندہ ہیبتناک پھندں کا ایک لوتھڑہ ہے، جو متعدد سانپوں کی ایک الجھی ہوئی گرہ کی طرح بلبلاتا اور بل کھاتا رہتا ہے۔ اور جب اس کے یہ پھن جنبش کرتے ہیں تو ان کی خشک، فلس‌دار جلد سے ایک گھناونی سی سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اوکٹوپس حرکت کر رہا ہے۔ وہ اس کو اپنی آنکھوں سے بالکل قریب نظر آ رہا ہے۔ اور اب پھن اس کے جسم پر رینگ رہے ہیں۔اس کے پھن سرد ہیں اور بچھوے کی طرح چبھہ رہے ہیں۔ وہ اپنا ڈنک نکال کر اس کے سر میں جونک کی طرح چبھا رہا ہے۔ اور عجیب تشنجی طریقے سے اینڈتا ہوا وہ اس کا خون چوس رہا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس کا خون اس کے جسم سے نکل‌کر اس درندے کے پھولتے ہوئے جسم میں بھرتا جا رہا ہے۔ اس کا ڈنک خون چوستا جا رہا ہے، اور خون چوسنے کے اس عمل کی وجہ سے اسے ناقابل برداشت تکلیف ہو رہی ہے۔

دور کہیں دور سے اسے انسانی آوازیں سنائی دے رہی ہیں:
«اس کی نبض اب کیسی ہے؟»

ایک دوسری آواز جو کسی عورت کی ہے نرمی سے جواب دیتی ہے:

«اس کی نبض کی رفتار ایک سو اڑتیس ہے۔ اور اسے ۱۰۱٫۱ ڈگری بخار ہے۔ تمام وقت وہ سرسامی کیفیت میں پڑا رہتا ہے۔»

اوکٹوپس غائب ہو گیا۔ لیکن درد بدستور ٹیسیں مارتا رہا۔ پاویل نے محسوس کیا کہ کوئی اس کی کلائی چھو رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے پپوٹے اتنے بھاری ہو گئے تھے کہ اس میں انہیں اٹھانے کی بھی قوت نہ تھی۔

آخر اتنی گرمی کیوں ہے؟ یقیناً ماں نے آتش‌دان میں آگ سلگائی ہوگی۔ اسے پھر وہی آوازیں سنائی دیتی ہیں:

«نبض کی رفتار اب ایک سو بائیس ہے۔»

وہ اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے جسم کے اندر ایک آگ سلگ رہی ہے۔ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔

اسے بے انتہا پیاس لگ رہی ہے۔ اسے فوراً اٹھ‌کر پانی پینا چاہئے۔ لیکن وہ اٹھ کیوں نہیں پاتا؟ وہ ہلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے اعضا اس کا حکم ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اس کا جسم خود اس کے لئے اجنبی ہو گیا ہے۔ ماں اسے فوراً تھوڑا سا پانی لا دے‌گی۔ وہ ماں سے کہے‌گا «مجھے پیاس لگ رہی ہے۔» اس کے قریب کوئی چیز ہل رہی ہے۔ کیا اوکٹوپس پھر اس کے جسم پر رینگنے کی تیاری کر رہا ہے؟ دیکھو وہ آ رہا ہے۔ اسے اس کی سرخ آنکھیں دکھائی دے رہی ہیں...

کہیں دور سے وہ نرم آواز آ رہی ہے:

«فروسیا تھوڑا سا پانی لے آؤ!»

«کس کا نام ہے یہ؟» لیکن اس میں تو اتنی سکت بھی نہیں کہ یہ یاد کرنے کی کوشش کرے، اور ایک بار پھر تاریکی اسے آکر دبوچ لیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس تاریکی کے چنگل سے نکل‌کر اسے یاد آتا ہے «مجھے پیاس لگی ہے۔»

اور اسے کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں:

«معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہوش میں آ رہا ہے۔»

وہ نرم آواز اب زیادہ قریب اور زیادہ صاف سنائی دیتی ہے:

«کامریڈ پانی پیوگے؟»

«کیا یہ لوگ مجھ سے سوال کر رہے ہیں؟ کیا میں بیمار ہوں؟ ارے ہاں مجھے تو ٹائی‌فس ہے۔ اب یاد آیا۔» اور تیسری بار وہ

اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ آخرکار وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں کی محدود بصارت کے توسط سے جو چیز سب سے پہلے اس کے شعور پر اپنی چھاپ ڈالتی ہے وہ ہے ایک سرخ رنگ کی گیند جو اس کے سر پر لٹک رہی ہے۔ لیکن کوئی تاریک سی چیز اس کے جسم پر جھکتی ہے اور اس کی آڑ میں وہ سرخ گیند غائب ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ہونٹ ایک گلاس کے سخت کنارے اور نمی، جاں‌فزا نمی، کا لمس محسوس کرتے ہیں۔ اس کے جسم کے اندر سلگتی ہوئی آگ دب جاتی ہے۔ مطمئن ہوکر وہ زیرلب کہتا ہے «یہ بہتر ہے۔»

«کامریڈ کیا تم مجھے دیکھ سکتے ہو؟»

یہ اس شخص کی آواز ہے جس کے جسم کا تاریک سایہ اس پر جھکا ہوا ہے۔ اور قبل اس کے کہ غنودگی اس پر پھر غالب آ جائے وہ بس اتنا کہہ پاتا ہے «مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن سن سکتا ہوں...»

«بھلا کسے یقین تھا کہ یہ بچ جائےگا؟ دیکھو تو کس طرح رفتہ رفتہ گھسٹتے ہوئے وہ پھر زندگی کے دائرے میں واپس آ گیا ہے۔ کمال کی ساخت پائی ہے اس کے جسم نے۔ نینا ولادی‌میرووناتم اپنے اوپر فخر کر سکتی ہو۔ دراصل تمہیں نے اس کی جان بچائی ہے۔»

اور اس عورت کی آواز، جس میں ہلکا سا ارتعاش ہے، جواب دیتی ہے:

«مجھے بےحد خوشی ہے!»

تیرہ دن بےہوش رہنے کے بعد پاویل کورچاگن کو ہوش آیا۔ اس کا نوخیز جسم مرنا نہیں چاہتا تھا اور رفتہ رفتہ اس میں پھر طاقت آنے لگی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دوبارہ جنم لے رہا ہو۔ ہر چیز نئی اور معجزہ نما معلوم ہوتی تھی۔

صرف اس کا سر بےحس و حرکت پڑا تھا - پلستر کے خول میں اس کا سر اس قدر ناقابل برداشت حد تک بھاری ہو گیا تھا کہ اس میں اسے ہلانے جلانے کی بھی طاقت نہیں تھی - لیکن اس کے جسم کے باقی حصوں میں قوت احساس واپس آ گئی تھی، اور جلد ہی وہ اپنی انگلیوں کو موڑنے کے قابل ہو گیا -

فوجی ہسپتال کی چھوٹی ڈاکٹر نینا ولادیمیرو ونا اپنے کمرے میں ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھی ہوئی ایک موٹی سرخ رنگ کی ڈائری کے ورق الٹ رہی تھی، جس میں نہایت خوبصورت ترچھی لکھائی میں متعدد مختصر اندراج تھے:

«۲۶ اگست ۱۹۲۰ء

آج ایمبولینس ٹرین سے کچھ ایسے مریض لائے گئے جن کی حالت خطرناک تھی - ان میں سے ایک کے سر میں بہت ہی بھیانک زخم آیا ہے - ہم نے اسے کھڑکی کے قریب کونے میں رکھا ہے - وہ ابھی صرف سترہ سال کا ہے - اس کی جیب میں رکھے ہوئے کاغذات اور اس کی علالت کی تفصیلات مجھے ایک لفافے میں رکھ کر دی گئیں - اس کا نام ہے پاویل اندرائیوچ کورچاگن - اس کے کاغذات میں حسب ذیل چیزیں تھیں: ایک بہت ہی گھسا ہوا یوکرین کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی رکنیت کا کارڈ (نمبر ۹٦۷)، سرخ فوج کا سپاہی ہونے کی شناختی سند جو کافی پھٹ چکی تھی، رجمنٹ کی طرف سے دی ہوئی ایک سند کی نقل جس میں یہ درج تھا کہ سرخ فوج کے سپاہی، کورچاگن کے سپرد دشمن کی فوج کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے کا جو کام کیا گیا تھا اس کو قابل تقلید طریقے سے انجام دینے کی وجہ سے اس کی ستائش کی گئی - ان کاغذات میں ایک پرچہ اور بھی تھا جو بظاہر اس نے اپنے ہی ہاتھ سے لکھا تھا - اس پرچے میں لکھا تھا: «اگر میں مر جاؤں تو

میری موت کی اطلاع میرے گھروالوں کو اس پتے پر دے دی جائے:
میکینک آرتیم کورچاگن، ریلوے ڈپو، شپیتووکا ۔»

۱۹ اگست کو اس کے بم کا ایک گولہ پھٹنے سے چوٹ آئی تھی ۔ اسی وقت سے وہ بےہوش ہے ۔ کل اناتولی استپانووچ اس کا معائنہ کریں گے ۔

۲۷ اگست

آج ہم لوگوں نے کورچاگن کے زخم کا معائنہ کیا ۔ زخم بہت گہرا ہے ۔ کھوپڑی کی ھڈی ٹوٹ گئی ہے، اور سر کا پورا داھنا حصہ مفلوج ھو گیا ہے ۔ داھنی آنکھہ کی ایک شریان پھٹ گئی ہے جس کی وجہ سے وہ آنکھہ بری طرح سوجی ہوئی ہے ۔

اناتولی استپانووچ سوزش اور ورم کو روکنے کے لئے آنکھہ نکال دینا چاھتے تھے ۔ لیکن میں نے انہیں روک دیا کیوںکہ ابھی تک امید ہے کہ شاید سوجن کم ھو جائے ۔ میں نے محض جمالیاتی نقطۂ نظر سے ایسا کیا ۔ شاید وہ لڑکا بچ جائے ۔ کتنا برا ھوگا اگر اچھا ھونے پر اس کی شکل بدنما ھو چکی ھو ۔

وہ تمام وقت سرسامی کیفیت میں پڑا رھتا ہے اور انتہائی بیچین رھتا ہے ۔ اس کے پلنگ کے پاس ھر وقت ھم میں سے کسی نہ کسی کی ڈیوٹی رھتی ہے ۔ میں اپنا زیادہ‌تر وقت اسی کے پاس گذارتی ھوں ۔ وہ اتنا کم عمر ہے کہ اسے ابھی ھرگز نہیں مرنا چاھئے ۔ اور میں نے عہد کر لیا ہے کہ میں اس کی نو خیز زندگی کو موت کے پنجوں سے چھڑا لوں‌گی ۔ مجھے اس میں کامیاب ھونا ہے ۔

اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد کل میں نے کئی گھنٹے اس کے وارڈ میں گذارے ۔ اس وارڈ میں سب سے زیادہ نازک حالت اسی کی ہے ۔ میں بیٹھی اس کی بےربط باتیں سنتی رھی ۔ بعض اوقات اس کی باتیں ایک افسانہ معلوم ھوتی ھیں، اور ان سے مجھے اس

کی زندگی کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ بہت ہی گندی گالیاں بکتا ہے۔ وہ بہت ہی نامعقول الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کے منھہ سے ایسی بری گالیاں سن کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اناتولی استپانووچ کو اس کے بچنے کی قطعی امید نہیں۔ وہ بوڑھا جھنجھلاکر کہتا ہے «میری سمجھہ میں نہیں آتا کہ آخر فوج ایسے نادان بچوں سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ بڑے شرم کا مقام ہے۔»

۳۰ اگست

کورچاگن ابھی تک بےہوش ہے۔ اسے وہاں سے ہٹاکر ان مریضوں کے وارڈ میں پہنچا دیا گیا ہے جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ نرس فروسیا تقریباً ہر وقت اسی کے پاس رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اسے پہلے سے جانتی ہے۔ کبھی دونوں نے ساتھہ ساتھہ کام کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھہ کتنی نرمی سے پیش آتی ہے! اب تو مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔

۲ ستمبر ۱۱ بجے شب

آج کا دن میرے لئے بہت ہی خوشی کا دن ہے۔ آج میرے مریض کورچاگن کو ہوش آ گیا۔ وہ خطرے سے باہر ہو گیا ہے۔ میں پچھلے دو دن ہسپتال میں ہی رہی۔ گھر گئی ہی نہیں۔

میں بیان نہیں کر سکتی کہ مجھے اس بات کی کتنی خوشی ہے کہ ایک اور جان بچ گئی۔ ہمارے وارڈ میں ہونے والی موتوں کی تعداد میں ایک کی کمی ہو گئی۔ میرے اس تھکاکر چور کرنے والے کام میں سب سے زیادہ خوشی کا موقع وہی ہوتا ہے جب کوئی مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ مریض بالکل بچوں جیسے ہو جاتے ہیں۔ ان کی محبت بہت سادہ اور پرخلوص ہوتی ہے اور مجھے بھی ان

سے بڑا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جب وہ ہسپتال چھوڑ کر جانے لگتے ہیں تو اکثر میرے آنسو نکل آتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ ایسا کرنا حماقت ہے لیکن میں بالکل بےقابو ہو جاتی ہوں۔

۱۰ ستمبر

آج میں نے کورچاگن کی طرف سے اس کے گھروالوں کو پہلا خط لکھا۔ اس نے خط میں لکھوایا کہ اس کی چوٹ زیادہ خطرناک نہیں ہے اور وہ جلد ہی اچھا ہوکر گھر آئےگا۔ اس کے جسم سے بہت زیادہ خون نکل گیا ہے۔ اس لئے وہ بالکل مردوں کی طرح پیلا پڑ گیا ہے اور ابھی تک بہت کمزور ہے۔

۱٤ ستمبر

آج کورچاگن ہسپتال آنے کے بعد پہلی بار مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بہت ہی حسین ہے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے۔ وہ اتنی تیزی سے اچھا ہو رہا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کی اور فروسیا کی بڑی دوستی ہے۔ میں فروسیا کو اس کے پلنگ کے پاس ہی پاتی ہوں۔ یقیناً وہ اس سے میرے بارے میں باتیں کرتی ہوگی، اور ظاہر ہے میری تعریف کے پل باندھتی ہوگی کیوں‌کہ اب میں جب بھی اپنے مریض کے پاس جاتی ہوں تو وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھہ میرا استقبال کرتا ہے۔ کل اس نے مجھہ سے پوچھا:

«ڈاکٹر آپ کے بازو پر وہ سیاہ نشان کس چیز کے ہیں؟»

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ سرسام کی حالت میں اس نے میرے بازو میں کس‌کر اپنی انگلیاں گاڑ دی تھیں۔ اسی سے یہ داغ پڑ گئے تھے۔

۱۷ ستمبر

کورچاگن کے ماتھے کا زخم کافی تیزی سے بھر رہا ہے۔ یہ نوجوان زخم پر پٹی بندھواتے وقت اس شدید تکلیف کو جس

غیر معمولی صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کرتا ہے، اس پر ہم سب ڈاکٹروں کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔

عام طور پر مریض ایسی حالت میں بہت زیادہ کراہتا ہے اور عموماً بہت زیادہ ہنگامہ کرتا ہے۔ لیکن یہ مریض بالکل چپ چاپ لیٹا رہتا ہے۔ اور جب کھلے ہوئے زخم کو آئی ڈین سے تر کیا جاتا ہے تب وہ اپنے جسم کو تان کر وایلن کے تار کی طرح سخت کر لیتا ہے۔ اکثر وہ بےہوش بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے منہہ سے کراہنے کی آواز ہم نے ایک بار بھی نہیں سنی۔

اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ کورچاگن صرف بےہوشی کی حالت میں ہی کراہتا ہے! میں حیران ہوں کہ آخر اس میں برداشت کی اتنی قوت کہاں سے آئی؟

۲۱ ستمبر

آج ہم لوگ کورچاگن کو پہیوں والی کرسی پر بٹھاکر پہلی بار بڑی بالکنی میں لے گئے۔ باغ کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کیسا کھل اٹھا! تازی ہوا میں وہ کیسے ندیدوں کی طرح گہرے گہرے سانس لیتا رہا! اس کا تمام سر پٹیوں سے لپٹا ہوا ہے۔ صرف ایک آنکھہ کھلی ہے۔ اور اس کی اس زندہ و تابندہ آنکھہ نے چاروں طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس دنیا کو پہلی بار دیکھہ رہی ہو۔

۲٦ ستمبر

آج دو نوجوان لڑکیاں کورچاگن کو دیکھنے ہسپتال آئی تھیں۔ میں ان سے بات کرنے کے لئے نیچے ویٹنگ روم میں گئی۔ ان میں سے ایک بہت ہی خوبصورت تھی۔ انہوں نے اپنے نام تونیا تمانووا اور تاتیانا برانوفسکایا بتائے۔ تونیا کا نام میں پہلے بھی سن چکی تھی۔ سرسام کی کیفیت میں کورچاگن نے کئی بار اس کا ذکر کیا تھا۔ میں نے انہیں اس سے ملنے کی اجازت دے دی۔

۸ اکتوبر

اب کورچاگن باغ میں اکیلا ٹہلنے لگا ہے۔ وہ مجھہ سے بار بار پوچھتا ہے کہ اسے ہسپتال سے چھٹی کب ملے گی۔ میں اسے یقین دلا دیتی ہوں کہ ۔ جلد۔ مریضوں سے ملاقات کے دن وہ دونوں لڑکیاں پابندی کے ساتھہ اسے دیکھنے آتی ہیں ۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کبھی کراہتا کیوں نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا ۔ اس نے جواب دیا «،دی گیڈفلائی، نام کی ایک کتاب ہے اسے پڑھنے سے اس کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔»

۱٤ اکتوبر

کورچاگن کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی ۔ وہ مجھہ سے رخصت ہوتے وقت بڑے تپاک سے ملا ۔ اس کی آنکھہ پر سے پٹی کھول دی گئی ہے ۔ اب صرف اس کے سر پر پٹی بندھی ہے ۔ اس کی آنکھہ اندھی ہو گئی ہے لیکن دیکھنے میں بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے ۔ اس بہت ہی اچھے نوجوان کامریڈ سے جدا ہونے کا مجھے بہت افسوس ہوا ۔ لیکن یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے ۔ ایک بار جہاں یہ لوگ اچھے ہوئے یہ ہمیں چھوڑکر چلے جاتے ہیں اور شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ دوبارہ ان سے ہماری ملاقات ہو ۔

جاتے وقت اس نے کہا:

«کاش میری بائیں آنکھہ خراب ہوتی ۔ اب میں نشانہ کیسے لگاؤں گا؟»

وہ ابھی تک جنگی مورچے کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے ۔»

ہسپتال سے آنے کے بعد پاویل کچھہ عرصے تک برانوفسکی کے یہاں رہا جہاں تونیا ٹھہری ہوئی تھی ۔

پاویل نے فوراً تونیا کو کومسومول کی سرگرمیوں میں کھینچ لانے کی کوشش کی ۔ ابتدا کے طور پر اس نے تونیا کو شہر کی

کومسومول تنظیم کی ایک میٹنگ میں شرکت کرنے کی دعوت دی۔ تونیا چلنے پر راضی ہو گئی۔ لیکن جس وقت وہ میٹنگ میں جانے کے کپڑے پہن کر اپنے کمرے سے باہر نکلی، پاویل نے جھنجھلاہٹ سے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ وہ خودآرائی کے جذبے کے تحت نہایت خوبصورت لباس میں بہت سج دھج کر آئی تھی۔ پاویل سوچ رہا تھا کہ کومسومول کی میٹنگ میں اس کا یہ بناؤسنگار قطعی غیرمناسب معلوم ہوگا۔

ان کے پہلے جھگڑے کا سبب یہی تھا۔ جب اس نے تونیا سے پوچھا کہ وہ اتنی بنی سنوری کیوں ہے تو وہ برا مان گئی:

«میں کوئی وجہ نہیں سمجھتی کہ میں عین مین اور تمام لوگوں کی طرح رہوں۔ لیکن اگر میرے کپڑے تمہاری مرضی کے مطابق نہیں ہیں تو میں نہیں جاؤں گی۔»

کلب میں تونیا کے نفیس کپڑے بدرنگ ٹیونکوں اور ملگجے بلاؤزوں کے درمیان اتنے نمایاں نظر آ رہے تھے کہ پاویل کو شدید الجھن ہونے لگی۔ تمام نوجوان اسے اپنے حلقے سے باہر کا سمجھ رہے تھے۔ اور تونیا نے بھی، جیسے ان کی ناپسندیدگی کا احساس ہو گیا تھا، حقارت آمیز اور مدافعانہ رویہ اختیار کر لیا۔

جہاز گھاٹ کی کومسومول تنظیم کا سکریٹری چوڑے شانوں والا جہازی مزدور پانکراتوف گھٹیا قسم کی لنن کی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس نے پاویل کو الگ بلایا اور تونیا کی طرف آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے بہت خفگی کے ساتھ کہا:

«اس گڑیا کو تم لائے تھے یہاں؟»

«ہاں» پاویل نے ترشی سے جواب دیا۔

«ہوں» پانکراتوف نے کچھ سوچ کر کہا۔ «صورت سے تو یہ اس جگہ کے لائق نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا رکھ رکھاؤ بالکل ہی بورژوا قسم کا ہے۔ یہ یہاں کیسے آ گئی؟»

پاویل کی کنپٹیاں پھڑکنے لگیں۔

«وہ میری دوست ہے۔ اسے یہاں میں لایا ہوں۔ سمجھے؟ اگرچہ وہ اپنے کپڑوں کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ دیتی ہے، لیکن اس کا رویہ ہماری طرف دشمنی کا قطعی نہیں ہے۔ لوگوں کے لباس سے ان کے بارے میں ہمیشہ صحیح رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ اس بات کو میں بھی اتنی ہی طرح سمجھتا ہوں جتنا کہ تم کہ کسے یہاں لانا چاہئے اور کسے نہیں۔ اس لئے کامریڈ آپ کے اس قدر مداخلت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔»

وہ کوئی بہت سخت توہین آمیز بات کہنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ محسوس کرکے کہ پان‌کراتوف وہاں پر آئے ہوئے تمام لوگوں کی عام رائے کا اظہار کر رہا ہے، وہ خاموش رہا۔ اس نے اپنا سارا غصہ تونیا پر اتارا۔

«میں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اسے یہاں کس قسم کے ماحول کی توقع کرنی چاہئے۔ آخر اس کے اتنا لئے دئے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟»

وہ شام ان کی دوستی کے خاتمے کی ابتدا کی شام تھی۔ تلخی اور تعجب کے ساتھ پاویل ایک ایسے رشتے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ٹوٹتے دیکھ رہا تھا جو بظاہر بہت پائیدار معلوم ہوتا تھا۔

کئی دن اور گذر گئے اور ہر ملاقات اور ہر گفتگو کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ دور ہوتے گئے۔ تونیا کی چھچھوری انفرادیت پسندی پاویل کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔

ان دونوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے تعلقات کا ختم ہو جانا ناگزیر ہو گیا ہے۔

آج کپیےچسکی باغ میں ان کی آخری بار ملاقات ہوئی تھی۔ باغ کے راستوں پر سڑتی ہوئی پتیاں بکھری پڑی تھیں۔ وہ ایک

چٹان کے سرے پر کٹھرے کے سہارے کھڑے نیچے دریائے دنیپر کے مٹیالے پانی کا بہاؤ دیکھ رہے تھے۔ پل کے قدآور ستون کے پیچھے سے ایک بہت بڑی سی کشتی دریا کے دھارے کے سہارے ہولے ہولے بہتی چلی آ رہی تھی، اس کے پیچھے دو اور بڑی بڑی کشتیاں بندھی ہوئی اس کے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھیں۔ غروب ہوتے ہوئے سورج نے تروخانوف جزیرے کو سنہرے رنگ میں دیا تھا اور مکانوں کی کھڑکیوں میں آگ سی لگا دی تھی۔

تونیا نے سورج کی سنہری کرنوں کی طرف دیکھتے ہوئے ایک شدید، قلبی غم کے ساتھ کہا:

«کیا ہماری دوستی بھی اس ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی؟»

پاویل نے جو اپنی آنکھوں کو اس کے چہرے کے حسن سے سیراب کر رہا تھا، اپنی بھنویں سختی سے سکیڑ کر دھیمی آواز میں جواب دیا:

«تونیا یہ تمام باتیں ہم پہلے بھی کئی بار کر چکے ہیں۔ یہ تو تم جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا تھا اور اب بھی میری محبت دوبارہ واپس آ سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے تمہیں ہم لوگوں کے ساتھ آنا ہوگا۔ اب میں وہ پہلےوالا پاولوشا نہیں رہا۔ اور اگر تم مجھ سے یہ توقع کرتی ہو کہ میں تمہیں پارٹی پر ترجیح دوں تو میں تمہارے لئے ایک برا شوہر ثابت ہوں گا۔ کیوں کہ میں پارٹی کو ہمیشہ اولین درجہ دوں گا اور تمہیں اور اپنے دوسرے عزیزوں کو اس کے بعد۔»

تونیا بہت دل گیر اور رنجیدہ ہوکر گہرے نیلے رنگ کے پانی کو تکتی رہی، اور اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

پاویل ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کے ایک رخ کو دیکھتا رہا، اس چہرے کو جسے وہ اب بہت اچھی طرح جاننے اور سمجھنے

لگا تھا ۔ وہ اس کے سرخی مائل بھورے رنگ کے گھنے بالوں کو دیکھتا رہا ۔ اور اس کے دل میں اس لڑکی کے لئے، جو کبھی اسے بےحد عزیز اور محبوب تھی، رحم کا ایک جذبۂ بےاختیار پیدا ہوا ۔

بڑی نرمی سے اس نے اپنا ہاتھ تونیا کے کندھے پر رکھ دیا ۔

«تونیا اپنے موجودہ ماحول سے ناتا توڑکر ہم لوگوں کے ساتھ آ جاؤ ۔ ہم دونوں مل‌کر ان سیٹھوں اور سرمایہ‌داروں کو ختم کرنے کے لئے کام کریں‌گے ۔ ہمارے ساتھ بہت سی اچھی لڑکیاں ہیں جو ہمارے شانہ‌بشانہ اس تلخ و تند جدوجہد کا بوجھ اٹھا رہی ہیں اور ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کر رہی ہیں ۔ ممکن ہے وہ تمہاری جتنی پڑھی لکھی نہ ہوں ۔ لیکن تم ہم لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آنا چاہتیں ۔ آخر کیوں؟ تم کہتی ہو کہ چوژانن نے تمہاری عصمت دری کرنے کی کوشش کی تھی ۔ لیکن وہ سپاہی نہیں ہے، وہ اخلاقی طور پر انتہائی پست انسان ہے ۔ تم کہتی ہو کہ ہمارے ساتھیوں نے تمہارے ساتھ غیردوستانہ سلوک کیا ۔ لیکن تم وہاں ایسے کپڑے پہن‌کر گئی ہی کیوں تھیں جیسے رئیسوں کے کسی ناچ میں شریک ہو رہی ہو؟ سارا قصور تمہارے اس احمقانہ غرور کا ہے: محض اس لئے کہ ہر شخص پہنتا ہے کیا ضروری ہے کہ میں بھی گندی پرانی ٹیونک پہنوں؟ تم میں ایک مزدور سے محبت کرنے کی جرائت تو تھی لیکن تم ایک تصور سے محبت نہیں کر سکتیں ۔ مجھے بہت رنج ہے کہ مجھے تم سے جدا ہونا پڑ رہا ہے ۔ اور میری خواہش یہ ہوگی کہ تمہاری یاد کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھوں ۔»

اس کے آگے وہ کچھ نہ بولا ۔

اگلے دن اس نے سڑک پر ایک حکم نامہ چپکا ہوا دیکھا جس پر اس علاقے کے چیکا کے صدر کی حیثیت سے ژوخرائی کے دستخط

تھے ۔ اس کا دل بانسوں اچھل گیا ۔ بڑی مشکل سے وہ اس ملاح کے دفتر میں داخل ہو پایا ۔ سنتری اسے اندر داخل ہی نہیں ہونے دیتے تھے ۔ اس نے اتنا ہنگامہ برپا کیا کہ وہ گرفتار ہوتے ہوتے رہ گیا ـــ لیکن آخرکار اسی کی خواہش پوری ہوکر رہی ۔

فیودور نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا ۔ اس ملاح کا ایک بازو کٹ گیا تھا ـــ وہ لڑائی کے دوران میں توپ کے گولے سے اڑ گیا تھا ۔

گفتگو کا رخ فوراً ہی کام کی طرف مڑ گیا ۔ ژوخرائی نے کہا «جب تک تم مورچے پر واپس جانے کے لائق نہ ہو جاؤ تب تک تم یہاں انقلاب دشمنوں کو کچلنے میں میری مدد ہی کرو ۔ کل ہی کام شروع کر دو ۔»

پولستانی سفید فوجوں کے خلاف جنگی جدوجہد کامیابی کے ساتھہ ختم ہو گئی ۔ سرخ فوجوں نے دشمن کو کھدیڑکر تقریباً وارسا کی شہر پناہ تک پہنچا دیا ۔ لیکن چونکہ ان کی مادی اور جسمانی قوت کافی حد تک ختم ہو چکی تھی اور جنگ کے مورچوں کو رسد پہنچانےوالے مرکز بہت پیچھے رہ گئے تھے، اس لئے وہ اس آخری مورچے کو سر کرنے میں ناکامیاب رہیں اور پیچھے ہٹ آئیں ۔ پولستانیوں نے وارسا سے سرخ فوجوں کے پیچھے ہٹ آنے کو «دریائے ویسلا کا معجزہ» کا نام دے رکھا تھا ۔ اس واقعہ کی حقیقت دراصل یہی تھی ۔ اور اس طرح اشرافیہ کے پولینڈ کی مدت زندگی کچھہ اور بڑھہ گئی ۔ اس وقت پولستانی سوویت سوشلسٹ جمہوریت کے خواب کی تعبیر ممکن نہ تھی ۔

خونچکاں سر زمین امن و سکون کی تمنائی تھی ۔

پاویل کو اپنے گھروالوں سے ملنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ شپیتووکا دوبارہ پولستانیوں کے قبضے میں چلا گیا اور عارضی

طور پر پولستانی فوجوں کی سرحدی چوکی بن گیا ـ صلح کی گفت و شنید جاری تھی ـ

پاویل دن رات چیکا کے مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کام کرتا رهتا تھا ـ جب اسے خبر ملی که اس کے شہر پر دو باره پولستانیوں کا قبضه هو گیا تو اسے بہت پریشانی هوئی ـ

«کیا اس کا مطلب یه هے که اگر اب صلح هو گئی تو میری ماں سرحد کے اس پار هوگی؟» اس نے ژوخرائی سے پوچھا ـ

لیکن فیودور نے اس کا اندیشه دور کر دیا:

«زیاده تر امکان تو اسی بات کا هے که سرحد دریا کے کنارے کنارے گورن شہر سے هوکر گذرے گی، جس کا مطلب هے که تمہارا شہر هماری طرف هوگا» اس نے کہا ـ «اور جو کچھه هونا هوگا اس کا پته تھوڑے هی دن میں چل جائے گا ـ»

فوج کی ڈویژنیں پولستانی مورچے سے هٹاکر جنوب کی طرف بھیجی جا رهی تھیں ـ کیونکه جس وقت جمہوریه کی ساری طاقتیں پورے کس بل کے ساتھه پولستانی مورچے پر جنگ میں مصروف تھیں، ورانگل اس التواء کا فائده اٹھاکر کریمیا میں اپنی ماند سے باهر نکل آیا اور یکاتیرینوسلاو گبرنیا* کو اپنا فوری نشانه بناکر دریائے دنیپر کے کنارے کنارے شمال کی طرف بڑھنے لگا ـ

اب چونکه پولستانیوں کے ساتھه جنگ ختم هو چکی تھی اس لئے جمہوریه نے انقلاب دشمنوں کے اس آخری قلعه کو پسپا کرنے کے لئے اپنی فوجیں کریمیا کی طرف بھیجنا شروع کیں ـ

سپاهیوں، گاڑیوں، میدان جنگ کے باورچی‌خانوں اور توپوں سے بھری هوئی ٹرینیں کیئف کے راستے جنوب کی طرف جا رهی

---

* گبرنیا ضلع سے بڑے علاقے کو کہتے هیں جس میں کئی ضلع هوتے هیں ـ

تھیں – آمدورفت کے اس بے‌پناہ سیلاب کی وجہ سے راستے میں جو رکاوٹیں پیدا ہو جاتی تھیں انہیں دور کرنے کے لئے اس علاقے کے محکمۂ وسائل آمدورفت کا چیکا ان دنوں جان توڑ محنت کر رہا تھا – اسٹیشنوں پر ریل گاڑیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور اکثر لائن خالی نہ ملنے کی وجہ سے آمدورفت بالکل رک جاتی تھی – تار بابو مسلسل پیغامات کے ذریعے احکام ناطق کھٹکھٹاتے رہتے تھے کہ فلاں فلاں ڈویژن کے لئے لائن فوراً خالی کر دی جائے – تار برقی کے آلے نقطوں اور چھوٹی چھوٹی لکیروں سے بھری ہوئی کاغذ کی پتلی پتلی لامتناھی پٹیاں اگلتے رہتے تھے – اور ہر پیغام میں ترجیح دئے جانے کا مطالبہ ھوتا تھا: «باقی تمام کاموں پر ترجیح دو... یہ فوجی حکم ھے... لائن فوراً خالی کر دو...» اور تقریباً ہر پیغام میں یاد دھانی کے طور پر یہ تاکید شامل کر دی جاتی تھی کہ حکم کی تعمیل نہ کرنے پر انقلابی فوجی عدالت کے سامنے مقدمہ چلایا جائے گا –

مقامی وسائل آمدورفت کے چیکا کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ بلا کسی رکاوٹ کے گاڑیوں کی آمدورفت جاری رکھنے کا انتظام کرے –

فوجی دستوں کے کمانڈر اپنی ریوالوریں دکھاتے ہوئے چیکا کے صدر دفتر میں گھس آتے تھے اور ان میں سے ہر ایک یہی مطالبہ کرتا تھا کہ تار نمبر فلاں کے مطابق جس پر فوج کے کمانڈر کے دستخط موجود ھیں، اس کی ٹرین فوراً روانہ کر دی جائے – اور ان میں سے کوئی بھی یہ دلیل سننے کو تیار نہیں ھوتا تھا کہ یہ قطعی نا ممکن ھے – «گاڑی تو تمہیں روانہ کرنی ھی پڑے گی – چاھے اس میں تمہاری جان ھی کیوں نہ چلی جائے –» اور اس کے بعد خوفناک گالیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا – جب کوئی معاملہ خاص طور پر بہت سنگین ہو جاتا تھا تو ژوخرائی کو نہایت

تاکیداً بلوایا جاتا تھا - اور اس کے آتے ہی وہ غصے سے پاگل آدمی جو ایک دوسرے کو وہیں پر گولی مار دینے پر تلے ہوتے تھے، فوراً ٹھنڈے پڑ جاتے تھے - اس آہنی شخص کو دیکھتے ہی، جس کی آواز جذبات سے قطعی عاری تھی اور جو کسی قسم کی چون و چرا برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا، ریوالوریں اپنے اپنے خولوں میں واپس چلی جاتی تھیں -

کبھی کبھی پاویل دفتر سے لڑکھڑاتا ہوا نکل کر پلیٹ فارم پر آ جاتا تھا - اس کے سر میں اتنا شدید درد ہوتا تھا کہ جیسے کوئی خنجر چبھا رہا ہو - چیکا کے دفتر میں کام کرنے کا اس کے اعصاب پر بہت ہی تباہ‌کن اثر ہو رہا تھا -

ایک دن گولہ بارود کے بکسوں سے لدے ہوئے ریل گاڑی کے ایک کھلے ڈبے پر اس نے سرگئی بروژاک کو دیکھا - سرگئی ریل کے ڈبے سے فوراً کود پڑا اور اپنے دوست کے گلے میں باہیں ڈال کر اس سے لپٹ گیا - گاڑی سے کودنے کے عمل میں اس نے پاویل کو گرا ہی دیا ہوتا -

«پاوکا شیطان کہیں کا! میں تو دیکھتے ہی تجھے پہچان گیا تھا -»

ان دونوں نوجوانوں کو ایک دوسرے سے اتنی باتیں کرنی تھیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شروع کہاں سے کریں - ان کی پچھلی ملاقات کے وقت سے ان دونوں کی زندگی میں نہ جانے کتنی باتیں پیش آ چکی تھیں - وہ ایک دوسرے پر سوالوں کی بوچھار کر رہے تھے اور جواب کا انتظار کئے بغیر مسلسل اپنی اپنی بات کہتے جا رہے تھے - وہ دونوں گفتگو میں اتنا محو تھے کہ انہوں نے انجن کی سیٹی کی آواز بھی نہیں سنی - اور جب گاڑی اسٹیشن سے بالکل روانہ ہو گئی تب کہیں وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے -

انہیں اب بھی ایک دوسرے سے نہ جانے کتنی باتیں کہنے کو رہ گئی تھیں۔ لیکن گاڑی رفتار پکڑتی جا رہی تھی۔ سرگئی نے چلاکر اپنے دوست سے کچھہ کہا اور پلیٹ‌فارم پر بھاگتے ہوئے مال گاڑی کے ایک ڈبے کا کھلا ہوا دروازہ پکڑکر وہ لٹک گیا۔ اندر سے کئی ہاتھوں نے جھپٹ‌کر اسے پکڑ لیا اور اندر کھینچ لیا۔ جس وقت پاویل اسے رخصت ہوتے ہوئے دیکھہ رہا تھا اسے یک‌بیک خیال آیا کہ سرگئی کو والیا کی موت کا قطعی علم نہیں ہے کیونکہ شیپیتووکا سے آنے کے بعد وہ وہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ اور اس غیر متوقع مڈبھیڑ کے ہنگامے میں وہ اسے بتانا بھی بھول گیا تھا۔

«لیکن اچھا ہی ہے کہ اسے علم نہیں ہے۔ اس کے ذہن کو سکون رہےگا» پاویل نے سوچا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ اب اپنے دوست سے کبھی نہیں مل پائےگا۔ اور نہ ریل گاڑی کے ڈبے کی چھت پر خزاں کی ہوا کے جھونکوں کے سامنے اپنا سینہ کھول‌کر کھڑے ہوئے سرگئی کو ہی اس بات کا علم تھا کہ وہ اپنی موت کی طرف جا رہا ہے۔

«سریوژکا وہاں سے اتر آؤ» دوروشنکو نے درخواست کی۔ دوروشنکو سرخ فوج کا ایک سپاہی تھا۔ اور اس کے کوٹ کی پشت میں کسی چیز سے جل جانے کی وجہ سے ایک سوراخ ہو گیا تھا۔

«گھبراؤ نہیں، میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں» سرگئی نے ہنستے ہوئے کہا۔ «ہوا کے ساتھہ میری بڑی گہری دوستی ہے۔»

ہفتے بھر بعد دشمن کے ساتھہ اس کی پہلی ہی ٹکر میں اسے اتفاقاً گولی لگ گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا، اس کا سینہ شدید درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے خلا میں کوئی چیز

پکڑنے کی کوشش کی اور اپنے بازو سینے کے اوپر کس کر جما لئے۔ وہ چکر کھاکر دھم سے زمین پر گر پڑا اور اس کی بےنور نیلی آنکھیں یوکرین کے وسیع اسٹیپی میدانوں کو تکتی رہ گئیں۔

پاویل کی خراب صحت پر چیکا کے اعصاب کو شل کر دینے والے کام کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اس کے سر کا شدید درد اب نسبتاً بہت جلدی جلدی ہونے لگا تھا۔ لیکن دو راتوں تک متواتر جاگنے کے بعد جب ایک دن وہ غش کھاکر گر پڑا تب جاکر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ژوخرائی سے اس سلسلے میں گفتگو کرےگا۔

«فیودور تمہارے خیال میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں کوئی دوسری قسم کا کام لے لوں؟ میں تو بڑے مشین کھاتے میں اپنے پیشے کا کام کرنا ہی سب سے زیادہ پسند کروںگا۔ مجھے خیال ہے کہ میں اب چیکا کے کام کے لئے موزوں نہیں ہوں۔ ڈاکٹری معائنے میں تو مجھ سے صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ میں فوج کی نوکری کے لئے بالکل بےکار ہوں۔ لیکن یہ کام تو مورچے پر لڑنے سے بھی بدتر ہے۔ سوتیر کے گروہ کو گرفتار کرنے میں ہم لوگوں نے جو دو دن صرف کئے انہوں نے تو مجھے بالکل ہی شکستہ کر دیا ہے۔ مجھے ان تمام معرکوں سے الگ رہکر آرام کرنا چاہئے۔ فیودور بات یہ ہے کہ اگر مجھ میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہ رہی تو تمہارے کسی بھی کام کے لائق نہ رہوںگا۔»

ژوخرائی بڑی فکرمندی سے پاویل کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔

«ہاں تمہاری صحت تو کچھ اتنی اچھی نظر نہیں آتی، اسمیں قصور میرا ہی ہے۔ مجھے اب سے بہت پہلے تمہیں چھٹی دے دینی چاہئے تھی۔ لیکن میں کام میں اتنی بری طرح پھنسا ہوا تھا کہ میں نے اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔»

اس گفتگو کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پاویل کومسومول کی علاقائی کمیٹی کے سامنے حاضر ہوا۔ اس کے پاس ایک رقعے پر یہ سند موجود تھی کہ وہ باضابطہ طور پر اس کمیٹی کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ ایک بےتکلف نوجوان نے جو اپنی ٹوپی بڑے بانکپن سے اپنی ناک تک جھکائے ہوئے تھا، کاغذ کے اس رقعے پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر پاویل کی طرف آنکھ مار کر بولا:

«چیکا سے آئے ہو؟ وہ بھی خوب محکمہ ہے۔ ہم یہاں فوراً تمہارے لئے کوئی کام تلاش کر دیں گے۔ ہمیں تو بہت سے لوگوں کی ضرورت ہے۔ جتنے زیادہ لوگ مل سکیں اچھا ہے۔ تم کہاں کام کرنا پسند کروگے؟ گبرنیا کے غذائی محکمے میں کام کروگے؟ نہیں؟ اچھا جہازی مزدوروں کے درمیان پرچار کے محکمے میں کام کرنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ وہاں بھی نہیں؟ یہ تو بڑی بری بات ہے۔ وہ تو بہت ہی عمدہ اور کافی آرام کا کام ہے۔ وہاں اسپیشل راشن بھی ملتا ہے۔»

پاویل نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا:

«میں تو ریل کے بڑے ڈپو میں کام کرنا پسند کروں گا۔»

وہ لڑکا منھ کھول کر حیرت سے اسے تکنے لگا۔ «کار کے کارخانے میں؟ ہوں۔ میرے خیال میں تو وہاں کسی آدمی کی ضرورت ہے نہیں... لیکن تم استینووچ کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمہیں کہیں نہ کہیں ضرور کام دلا دے گی۔»

سانولے رنگ کی استینووچ کے ساتھ ایک مختصر سی ملاقات کے بعد یہ فیصلہ ہو گیا کہ پاویل ریلوے کے کارخانے میں کام کرے گا۔ اور اسے وہاں کی کومسومول تنظیم کا سکریٹری مقرر کر دیا جائے گا۔

اسی عرصے میں سفید فوجیں کریمیا میں داخل ہونے کے راستوں پر قلعہ بندیاں کر رہی تھیں اور زمین کی اس پتلی سی پٹی پر جو کسی زمانے میں کریمیا کے تاتاروں اور زاپوروژئے کے قزاقوں کی بستیوں کے درمیان سرحد کا کام دیتی تھی، پیریکوپ کا جدید قسم کا قلعہ بند مورچہ تھا۔

اور پیریکوپ کے پیچھے کریمیا میں قدیم طرز زندگی جسے ملک کے ہر کونے سے نکال کر یہاں دھکیل دیا گیا تھا، مے نوشی کی سرمستیوں میں غرق بدستور قائم تھا۔ اس طرز زندگی کو اپنے محفوظ ہونے کا پر فریب یقین اس حد تک تھا کہ وہ سر پر منڈلاتی ہوئی قضا کو دیکھنے سے بھی قاصر تھا۔

موسم خزاں کی ایک بہت مرطوب اور سرد رات کو محنت کش عوام کے ہزاروں فرزند رات کی تاریکی کی اوٹ میں خلیج کو پار کر کے قلعوں میں بند دشمن پر پیچھے سے حملہ کرنے کی غرض سے خلیج سواش کے برفانی پانی میں اترے۔ انہیں ہزاروں لوگوں کے ساتھہ اپنی مشین گن کو بھیگنے سے بچانے کے لئے اپنے سر سے اوپر اٹھائے ایوان ژارکی بھی پانی میں اترا۔

اور طلوع آفتاب کے وقت جب پیریکوپ میں ایک خلفشار اور ہنگامہ برپا تھا اور اس کی قلعہ بندیوں پر سامنے سے حملہ کر دیا گیا تھا، سواش کو پار کرنے والے سپاہیوں کے پہلے دستے دشمن پر پیچھے سے حملہ کرنے کے لئے جزیرہ نمائے لتووسکی کے ساحل پر چڑھہ آئے۔ اس چٹانی ساحل پر چڑھنے والے پہلے لوگوں میں ایک ایوان ژارکی بھی تھا۔

بہت ہی گھمسان لڑائی ہوئی۔ سفید گھوڑسوار فوجیں وحشیانہ انداز میں پانی سے باہر نکلتے ہوئے سرخ فوج کے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑیں۔ ژارکی کی مشین گن موت اگل رہی تھی۔ اور اس کی ہلاک کن تڑتڑاہٹ مسلسل جاری تھی۔ سیسے کی گولیوں کی بوچھار

کے آگے گھوڑے اور سپاہی ڈھیر ہوئے جا رہے تھے ـ ژار کی بڑی تیزی کے ساتھ مشین گن میں کارتوسوں کی نئی پیٹیاں ڈالتا جا رہا تھا ـ

اس حملے کے جواب میں پیریکوپ اپنی سینکڑوں توپوں کے دھانوں سے گرج اٹھا ـ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود کرۂارض ایک اتھاہ غار میں گر پڑا ہے ـ ہزاروں گولے موت کا سامان لئے کانوں کے پردے پھاڑ دینےوالی آواز کے ساتھ آسمانوں کو چیرتے ہوئے اوپر کو اٹھتے تھے اور ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ کر اپنے لاتعداد چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دور دور تک بکھیر دیتے تھے ـ زخم خوردہ اور مجروح زمین سے سیاہ بادلوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے، جنہوں نے سورج کو ڈھک لیا تھا ـ

دیو کا سر کچل دیا گیا تھا اور آخری فیصلہ کن وار کرنے کے لئے پہلی گھوڑ سوار فوج کا سرخ سیلاب کریمیا میں تند رفتاری کے ساتھ ابل پڑا تھا ـ بوکھلائے ہوئے سفید فوجوں کے سپاہی خوف سے دہشت زدہ ہوکر بندرگاہ سے چھٹنےوالے جہازوں پر سوار ہونے کے لئے بھاگنے لگے ـ

بدرنگ اور ملگجی فوجی وردیوں پر جمہوریہ کی طرف سے آرڈر آف دی ریڈ بینر کے سنہرے تمغے لگا دئے گئے ـ ان تمغوں کے نیچے جفاکش دل دھڑک رہے تھے ـ ان فوجی وردیوں میں سے ایک وردی کومسومول کے رکن مشین گن چلانے والے ایوان ژارکی کی بھی تھی ـ

پولستانیوں کے ساتھ صلح ہو گئی اور ژوخرائی کی پیشین گوئی کے مطابق شیپیتووکا کا شہر سوویت یوکرین کی حد میں رہا ـ اس شہر سے تقریباً بیس بائیس میل کے فاصلے پر بہنےوالے دریا کو سرحد قرار دیا گیا تھا ـ

دسمبر ۱۹۲۰ء کی ایک یادگار صبح کو پاویل اپنے شہر پہنچا۔ گاڑی سے وہ برف سے ڈھکے ہوئے پلیٹ فارم پر اترا، تختی پر لکھے ہوئے اسٹیشن کے نام «شپیتووکا I» پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر بائیں طرف مڑکر سیدھا ریل کے ڈپو پہنچا اور وہاں آرتیم کے بارے میں دریافت کیا۔ لیکن اس کا بھائی وہاں نہیں تھا۔ اپنے فوجی کوٹ کو جسم پر اس نے اور کس کر لپیٹ لیا اور پھر جنگلوں میں سے ہوتا ہوا وہ شہر کی طرف روانہ ہوا۔

ماریا یاکوولیونا نے دروازے پر دستک سن کر مڑکر کہا «اندر چلے آؤ۔» ایک شخص جو سر سے پاؤں تک برف سے ڈھکا ہوا تھا، اندر داخل ہوا، اور ماں نے اپنے بیٹے کا محبوب چہرہ دیکھا۔ اس کا ہاتھ بےاختیار اس کے دل کی طرف اٹھ گیا اور اس کے تمام جسم میں خوشی کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی، جس نے اسے گنگ کر دیا۔

وہ اپنے بیٹے سے لپٹ گئی اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔ اس کے گالوں پر خوشی کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ اور پاویل اپنی ماں کے دبلے پتلے منحنی سے جسم کو زور سے بھینچ کر خاموشی کے ساتھ اسکے چہرے کو تکتا رہا جس پر فکروں، پریشانیوں اور دکھوں نے گہری جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنی ماں کے پرسکون ہونے انتظار کرنے لگا۔

اس عورت کی آنکھیں جس نے اتنی مصیبتیں برداشت کی تھیں، ایک بار پھر مسرت کے نور سے چمک اٹھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا جی اپنے بیٹے کو دیکھنے سے کبھی نہیں بھرے گا۔ اسی بیٹے کو جسے دوبارہ دیکھنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اور جب تین دن بعد بہت رات گئے کندھے پر اپنے سامان کا تھیلا لادے آرتیم اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا تب تو اس کی خوشی کی کوئی حد و انتہا ھی نہیں رہی۔

کورچاگن کنبہ دوبارہ یکجا ہو گیا تھا - دونوں بھائی موت کے منھہ سے نکل کر واپس آ گئے تھے اور بےپناہ دلخراش مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد وہ پھر مل گئے تھے -

«اب تم لوگوں کا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟» ماں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا -

«ماں میں تو اپنے ریل کے ڈپو میں واپس جاوںگا» آرتیم نے زندہ دلی سے جواب دیا -

جہاں تک پاویل کا تعلق تھا، وہ دو ہفتے گھر پر رہ کر کیئف واپس چلا گیا، جہاں اس کا کام اس کا انتظار کر رہا تھا -

حصّۂ دوُئم

پہلا باب

آدھی رات کا وقت ہے۔ بہت کافی عرصہ پہلے ھی آخری ٹرام اپنی شکستہ لاش کو گھسیٹ کر ڈپو میں پہونچا آئی ھے۔ چاند کی سکون آور روشنی کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑ رھی ھے۔ اور بستر پر چاندنی کی شفاف چادر بچھی ھوئی ھے۔ باقی کمرہ نیم تاریکی کی آغوش میں ھے۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھی ھوئی میز کے قریب ریتا ایک موٹی سی نوٹ بک پر جھکی بیٹھی ھے۔ وہ اپنی ڈائری لکھہ رھی ھے۔ میز پر رکھے ھوئے لیمپ سے اس کی ڈائری پر روشنی کا ایک حلقہ پڑ رھا ھے۔ اس کی نکیلی پنسل کاغذ پر یہ الفاظ تحریر کر رھی ھے:

«۲٤ مئی

میں اپنے تاثرات درج کرنے کی ایک بار پھر کوشش کر رھی ھوں۔ اب پھر اتنا لمبا وقفہ ھو گیا۔ چھہ ھفتے سے میں نے اپنی ڈائری میں کچھہ بھی درج نہیں کیا ھے۔ لیکن میں بالکل مجبور تھی۔

میرے پاس ڈائری بھرنے کا وقت ھی کہاں ھے؟ آدھی رات گذر چکی ھے اور میں ابھی تک بیٹھی لکھہ رھی ھوں۔ نیند میری

آنکھوں کے ساتھ بےوفائی کر رہی ہے۔ کامریڈ سیگل ہم لوگوں کو چھوڑکر جا رہے ہیں۔ وہ اب مرکزی کمیٹی میں کام کریں گے۔ اس خبر سے ہم سب لوگ بہت پریشان ہیں۔ بہت ہی لاجواب آدمی ہیں ہمارے لازار الیکزاندرووچ! مجھے اب تک اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ان کی دوستی ہم لوگوں کے لئے کتنی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد جدلی مادیت کی تعلیم کا کام یقیناً درہم برہم ہو جائےگا۔ کل ہم لوگ رات کے پچھلے پہر تک ان کے یہاں رہے اور اس بات کا اندازہ لگاتے رہے کہ ہمارے «شاگردوں» نے کتنی ترقی کی ہے۔ اس گبرنیا کی کومسومول کمیٹی کا سکریٹری آ کم آیا تھا۔ اور وہ نا قابل برداشت تفتہ بھی۔ مجھے تو اس بقراط کی صورت سے نفرت ہے۔ سمجھتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی ہئی نہیں جس کے بارے میں اسے علم نہ ہو۔ سیگل اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ پارٹی کی تاریخ سے متعلق کسی سوال پر بحث کے دوران میں ان کے شاگرد کورچاگن نے تفتہ کو بری طرح رگڑا۔ ان دو مہینوں کی محنت بہر حال ضائع نہیں ہوئی ہے۔ ایسی شاندار کامیابیاں دیکھ‌کر کوئی محنت کرنے میں بددلی یا بخل نہیں کر سکتا۔ افواہ ہے کہ ژوخرائی کو بدل‌کر فوجی حلقہ کے اسپیشل ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیوں۔

لازار الیکزاندرووچ نے اپنے شاگرد کو میرے سپرد کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا:

«جس کام کو میں نے شروع کیا اسے تمہیں پورا کرنا ہوگا۔ دیکھو کام ادھورا نہ چھوڑ دینا۔ ریتا تم اور وہ ایک دوسرے سے بہت سی باتیں سیکھ سکتے ہیں۔ اس لڑکے کی زندگی میں ابھی ذرا بدنظمی ہے۔ اس کی طبیعت میں کچھ تلون ہے اور اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ اپنے جذبات کی رو میں بہہ جائے۔

میرا خیال ہے کہ اس کی رہنمائی کے لئے تم بہت مناسب رہوگی۔ ریتا میں تہ دل سے تمہاری کامیابی کا خواہاں ہوں۔ مجھے ماسکو کے پتے پر خط لکھنا نہ بھولنا۔»

آج مرکزی کمیٹی نے سولومینسکی ضلع کمیٹی کے لئے ایک نیا سکریٹری بھیجا اس کا نام ژارکی ہے۔ میں اسے اس وقت سے جانتی ہوں جب کہ وہ فوج میں تھا۔

کل دمیتری دوباوا کورچاگن کو لائےگا۔ میں ذرا دوباوا کا حلیہ بیان کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ درمیانہ قد اور مضبوط اور گٹھیلا جسم۔ ۱۹۱۸ء میں کومسومول میں بھرتی ہؤا۔ اور ۱۹۲۰ء سے پارٹی کا ممبر ہے۔ «مزدور مخالفت» نامی جماعت کا ممبر ہونے کے جرم میں جو تین افراد کومسومول کی ضلع کمیٹی سے نکالے گئے تھے ان میں ایک وہ بھی تھا۔ اسے پڑھانا کچھ آسان کام نہیں رہا ہے۔ بےشمار سوالات پوچھ پوچھ‌کر وہ ہر روز ہمارے پروگرام کو گڑبڑ کر دیتا تھا اور ہمیں ہمیشہ موضوع سے ہٹاکر بحث کا رخ دوسری طرف موڑ دیتا تھا۔ میری ایک دوسری شاگرد آلگا یورینیوا کی اس سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے آلگا کو سر سے پاؤں تک دیکھ‌کر کہا تھا:

«خاتون من، آپ کا حلیہ سرے سے بالکل غلط ہے۔ آپ کو تو پیچھے کی طرف چمڑا لگی ہوئی پتلون، مہمیز والے فوجی بوٹ، بدیانی کے گھوڑ سواروں والی ٹوپی اور تیغ سے لیس ہونا چاہئے۔ اس حلیے میں تو آپ نہ تیتر معلوم ہوتی ہیں نہ بٹیر۔»

ظاہر ہے یہ بات آلگا کے لئے قطعی ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے مجھے بیچ بچاؤ کرنا پڑا۔ دوباوا میرے خیال میں کورچاگن کا دوست ہے۔ بس آج رات کے لئے بہت کافی ہو گیا ہے۔ اب سو جانا چاہئے۔»

سورج کی جھلسا دینےوالی دھوپ میں زمین بہت تپ رہی تھی - اسٹیشن کے ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر جانے والے پل کی لوہے کی ریلنگ اتنی بری طرح جل رہی تھی کہ اسے چھونا بھی ناممکن تھا - گرمی سے پریشان اور مرجھائے ہوئے لوگ بڑی بےدلی سے پاؤں گھسیٹتے ہوئے پل پر چڑھ رہے تھے - ان میں سے زیادہ تر دراصل مسافر نہیں تھے بلکہ ریلوے کی بستی کے لوگ تھے جو شہر جانے کے لئے اسی پل پر سے ہوکر جاتے تھے -

پل کی سیڑھیوں سے اترتے وقت پاویل نے ریتا کو دیکھا - وہ اس سے پہلے اسٹیشن پہونچ گئی تھی اور لوگوں کو پل سے اترتے ہوئے دیکھہ رہی تھی -

پاویل اس سے تقریباً تین گز کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا - ریتا نے اسے نہیں دیکھا، اور وہ ایک نئی دریافت شدہ دلچسپی کے ساتھہ اس کا جائزہ لیتا رہا - وہ ایک دھاری‌دار بلاؤز اور کسی سستے سے کپڑے کا نیلے رنگ کا اونچا سا سایہ پہنے ہوئے تھی - اس کے کندھے پر نرم چمڑے کی ایک جیکٹ لٹکی ہوئی تھی - اس کے دھوپ سے سنولائے ہوئے چہرے کے گرد الجھے ہوئے خودسر بالوں کا ایک حلقہ تھا - وہ اپنا سر کچھہ پیچھے کی طرف کئے کھڑی تھی، اور سورج کی چمک سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں - اسے اس طرح وہاں کھڑے دیکھہ‌کر کورچاگن کو پہلی بار اس بات کا احساس ہؤا کہ اس کی دوست اور استاد ریتا کومسومول کی گبرنیا کمیٹی کے بیورو کی محض ایک رکن نہیں ہے - بلکہ... اپنے ذہن میں اس قسم کے «گناہ آلودہ» خیالات کو جگہ دینے پر کھسیاکر اس نے ریتا کو پکارا:

«میں گھنٹے بھر سے تمہیں تک رہا ہوں - اور تم ہو کہ دیکھتی ہی نہیں» اس نے ہنس‌کر کہا - «آؤ چلو ہماری گاڑی آ گئی -»

وہ دونوں اس دروازے کی طرف چل دئے جس سے ہوکر ریلوے کے ملازمین پلیٹ فارم پر جاتے تھے۔

اس سے ایک دن قبل گبرنیا کمیٹی نے کومسومول کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے، جس میں دوسرے ضلعوں کے نمائندے بھی آنے والے تھے، ریتا کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا اور کورچاگن کو اس کے ساتھ اس کے نائب کی حیثیت سے جانا تھا۔ ان کے سامنے فوری مسئلہ ریل پر چڑھنے کا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسے موقع بہت ہی نادر ہوتے تھے جب کہ اس اسٹیشن سے ٹرین گذرتی تھی، اور ان موقعوں پر اسٹیشن پر پانچ آدمیوں پر مشتمل ایک قادر مطلق کمیٹی کا قبضہ ہو جاتا تھا۔ اس کمیٹی کی اجازت حاصل کئے بغیر کوئی بھی شخص پلیٹ فارم پر نہیں جا سکتا تھا۔ پلیٹ فارم میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے تمام راستوں پر اس کمیٹی کے آدمی پہرہ دیا کرتے تھے۔ جتنے لوگ گاڑی پکڑنے کے منتظر ہوتے تھے، ان میں سے صرف چند کو ہی ان ٹھساٹھس بھری ہوئی گاڑیوں میں جگہ مل سکتی تھی۔ اور کوئی بھی گاڑی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اگلی گاڑی کے انتظار میں کئی دن تک وہیں پڑے رہیں۔ اس لئے ہزاروں لوگ پلیٹ فارم میں داخل ہونے کے دروازوں پر آکر جمع ہو جاتے تھے اور اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی طرح وہ اس ناکے بندی کو توڑکر گاڑی کے ان ڈبوں تک پہونچ جائیں جو ان کی پہونچ سے باہر تھے۔ ان دنوں بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ایک فوج اسٹیشن کے چاروں طرف گھیرا ڈالے پڑی ہوئی ہے، اور کبھی کبھی تو وہاں باقاعدہ جم کر لڑائیاں بھی ہوتی تھیں۔

پلیٹ فارم میں داخل ہونے کے دروازے پر اکٹھی بھیڑ کو چیرکر اندر جانے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد پاویل جو اسٹیشن کے چپے چپے سے بخوبی واقف تھا، ریتا کی رہنمائی کرتا ہؤا

مال گھر سے ہوکر پلیٹ فارم پر پہونچ گیا ۔ بڑی مشکل سے بھیڑ کے بیچ میں سے راستہ بناتے ہوئے وہ دونوں چار نمبر کے ڈبے کے قریب جا پہونچے ۔ ڈبے کے دروازے کے قریب چیکا کا ایک آدمی کھڑا تھا جو گرمی کے مارے پسینے میں تر ہو گیا تھا ۔ وہ مجمع کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور بار بار یہی کہتا تھا :

«ڈبہ بالکل بھر گیا ہے ۔ اور گاڑی کی چھت پر یا بفر پر کھڑے ہوکر سفر کرنا قانون کے خلاف ہے ۔»

غصے سے بھرے ہوئے شہری اس پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، اور اس کی ناک کے قریب لے جا لے جاکر اسے وہ ٹکٹ دکھا رہے تھے جو کمیٹی نے جاری کئے تھے ۔ ہر ڈبے کے سامنے گالی گلوج، چیخ پکار اور دھکم دھکا مچی ہوئی تھی ۔ پاویل سمجھ گیا کہ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلے گا ۔ لیکن وہ گاڑی پکڑنا بھی اس کے لئے قطعی لازمی تھا، ورنہ کانفرنس ملتوی کرنا پڑے گی ۔

ریتا کو ایک طرف لے جاکر اس نے گاڑی پر چڑھنے کا ایک منصوبہ مرتب کیا ۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ وہ کسی طرح گھس پل کر ایک ڈبے میں چڑھ جائے گا اور پھر اندر سے ایک کھڑکی کھول دیگا، اور کھڑکی میں سے اسے اندر داخل کرے گا ۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا ۔

«اپنی وہ چمڑے والی جیکٹ ذرا مجھے دے دو ۔ یہ بہترین سند رہے گی ۔»

اس نے جیکٹ پہن لی ۔ اور اپنا پستول جیب میں اس طرح رکھ لیا کہ اس کی موٹھ اور ڈوری باہر سے دکھائی دیتی رہے ۔ سامان ریتا کے پاس چھوڑکر وہ ڈبے کی طرف چل دیا، اور دروازے کے قریب کھڑے ہوئے برانگیختہ مسافروں کے مجمع کو چیرتا ہوا وہ آگے نکل گیا اور اس نے جاکر ڈبے کے باہر لگا ہوا ڈنڈا پکڑ لیا ۔

«اے کامریڈ کہاں جا رہے ہو؟»

پاویل نے بڑی بے پروائی سے گردن گھماکر اس گٹھیلے جسم والے چیکا کے آدمی کو دیکھا ۔

«میں حلقه کے اسپیشل ڈیپارٹمنٹ کا آدمی هوں ۔ میں دیکھنا چاهتا هوں که اس ڈبے میں جتنے لوگ بیٹھے هیں ان سب کے پاس کمیٹی کے دئے هوئے ٹکٹ هیں یا نہیں» اس نے یه بات اس قدر رعب کے ساتھه کہی که اس کے اختیارات کے بارے میں کسی قسم کا شبه باقی نہیں رها ۔

چیکا کے آدمی نے پاویل کی جیب پر ایک نظر ڈالی اور اپنی آستین سے ماتھے کا پسینه پونچھتے هوئے تھکے هوئے انداز میں کہا :

«اچھا جاؤ ۔ اگر گھس پاؤ تو کس نے روکا ہے ۔»

اپنے هاتھوں اور کندھوں سے دھکے دیتا هوا اور کبھی کبھی گھونسوں کی بھی مدد لیتا هؤا پاویل اوپر کی سیٹوں کی کگر کا سہارا لےکر نیچے کی سیٹوں کے درمیان والے راستے میں اپنے اپنے سامان پر بیٹھے هوئے مسافروں کے سروں پر سے هوتا هؤا ڈبے کے بیچ میں پہونچ گیا ۔ چاروں طرف سے اس پر گالیوں کی بوچھار هو رهی تھی لیکن اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی ۔

«اندھے هو، دکھائی نہیں دیتا، کہاں جا رهے هو! خدا کی مار هو تم پر!» ایک موٹی تازی عورت نے چیخ کر کہا ۔ نیچے کی سیٹوں کے درمیان والے راستے میں اترتے وقت پاویل کا پیر اتفاق سے اس کے گھٹنے میں لگ گیا تھا ۔ اس نے اپنا تین من کا جسم نه جانے کیسے ایک سیٹ کی کگر پر ٹکا رکھا تھا اور اس پر وہ اپنے گھٹنوں کے بیچ میں تیل کا ایک بڑا سا پیپه بھی دبائے هوئے تھی ۔ سامان رکھنے کی تمام جگه اس قسم کے پیپوں، گٹھڑیوں، بوریوں اور ٹوکریوں سے اٹی هوئی تھی ۔ ڈبے کے اندر دم گھٹا جاتا تھا ۔

اس کی گالیوں کی طرف کوئی توجہ نہ دے کر پاویل نے سوال کیا:

«بڑی بی آپ کا ٹکٹ؟»

«میرا کیا؟» بڑی بی نے اس بن بلائے انسپکٹر کو تڑ سے جواب دیا۔

سب سے اوپر والی سیٹ پر سے کسی نے اپنا سر باہر کی طرف نکالا، اور اس کی ایک بھدی سی آواز گونج اٹھی:

«واسکا ذرا دیکھنا یہ کون ہے۔ کیا چاہتا ہے؟ اسے الله میاں کے یہاں کا ایک ٹکٹ کٹا دو۔ دیکھتے کیا ہو؟»

واسکا کا لحیم شحیم جسم اور بالوں سے بھرا ہوا سینہ ٹھیک پاویل کے سر کے اوپر نظر آیا۔ یقیناً وہی واسکا رہا ہوگا۔ اس کی دو خونی آنکھیں شکاری کتے کی طرح پاویل کو گھورنے لگیں۔

«خبردار جو اس عورت کو پریشان کیا۔ سمجھے کہ نہیں؟ ٹکٹ کاہے کے لئے چاہئے تمہیں؟»

اوپر کی سیٹ سے چار آدمیوں کی ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں۔ وہ چاروں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے چٹ چٹ کی تیز آواز نکالتے ہوئے سورج مکھی کے بیج کھا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہی پاویل سمجھ گیا کہ وہ لوگ کون تھے۔ یہ غلے کی چوربازاری کرنےوالوں کا ایک گروہ تھا۔ یہ لوگ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاکر غلہ خرید لیتے تھے اور پھر اسے منمانی قیمتوں پر بیچتے تھے۔ پاویل کے پاس ان سے سر کھپانے کا وقت نہیں تھا۔ اسے کسی طرح ریتا کو اندر لانا تھا۔

«یہ بکس کس کا ہے؟» اس نے کھڑکی کے نیچے رکھے ہوئے لکڑی کے ایک بکس کی طرف اشارہ کرکے ادھیڑ عمر کے

ایک شخص سے پوچھا جو اپنی پوشاک سے ریلوے کا ملازم معلوم ہوتا تھا ۔

«اس کا ہے» اس نے ایک عورت کی موٹی موٹی پنڈلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا جن پر کتھئی رنگ کے موزے چڑھے تھے ۔

کھڑکی کھولنے کے لئے بکس کو ہٹانا ضروری تھا ۔ چوں کہ اسے کھسکانے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لئے پاویل نے بکس اٹھا کر اس کی مالکہ کے حوالے کر دیا جو اوپر کی ایک سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی ۔

«مہربانی کرکے اسے ایک منٹ کے لئے پکڑ لیجئے میں ذرا کھڑکی کھولنا چاہتا ہوں ۔»

«دوسروں کے سامان کو ہاتھ مت لگاؤ!» اس چپٹی ناک والی چھوکری نے چیخ کر کہا ۔ پاویل نے بکس اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا تھا ۔

«موتکا آخر یہ آدمی چاہتا کیا ہے؟» اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے مرد سے کہا ۔ موتکا نے پاویل کی پیٹھ پر اپنے جوتے سے ایک ٹھوکر لگائی ۔

«اے سنتے ہو ۔ سیدھے سیدھے یہاں سے چلے جاؤ نہیں تو میں ابھی تمہیں ایک ایسا ہاتھ دونگا کہ یاد کروگے ۔»

پاویل نے چپ چاپ اس کی ٹھوکر برداشت کر لی ۔ وہ کھڑکی کھولنے میں اتنا مصروف تھا کہ اسے اور کسی بات کی فکر ہی نہیں تھی ۔

«بھیا مہربانی کرکے ذرا ادھر کھسک آؤ» اس نے ریلوے کے اس ملازم سے کہا ۔

راستے سے ایک دوسرا پیپہ ہٹاکر پاویل نے کھڑکی کے سامنے تھوڑی سی جگہ خالی کر لی ۔ ریتا نیچے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی ۔

اس نے جلدی سے اپنا تھیلا پاویل کو پکڑا دیا ۔ تھیلے کو اس مٹلی عورت کے گھٹنوں پر پھینک کر جو تیل کا پیپہ لئے بیٹھی تھی پاویل نے کھڑکی سے باہر جھک کر ریتا کے ھاتھ پکڑ لئے، اور اسے اندر کھینچ لایا ۔ قبل اس کے کہ گارڈ اس قانون شکنی کی طرف توجہ کرتا ریتا ڈبے کے اندر پہونچ چکی تھی اور گارڈ نیچے کھڑا ہوا اسے برا بھلا کہہ رہا تھا ۔ ڈبے میں ریتا کے پہونچتے ھی سٹے بازوں کے اس گروہ نے اس قدر ھنگامائی انداز میں اس کا استقبال کیا کہ وہ سٹ پٹا گئی ۔ چوں‌کہ فرش پر کھڑے رہنے کی کہیں جگہ نہیں تھی اس لئے وہ نیچے کی سیٹ کی کگر پر کسی طرح اپنا پاؤں ٹکاکر اوپروالی سیٹ کا سہارا لےکر کھڑی ھو گئی ۔ چاروں طرف سے گندی گالیوں کی بوچھار ھونے لگی ۔ اوپر سے اسی بھدی سی موٹی آواز نے مینڈک کی طرح ٹراکر کہا:

«دیکھا سور کو ۔ پہلے تو خود گھسا پھر اپنی اس لونڈیا کو بھی لے آیا ۔»

اوپر سے کسی نے باریک آواز میں کہا:

«موتکا دیکھتا کیا ھے ایک دے نا اسکی دونوں آنکھوں کے بیچ!»

وہ عورت پاویل کے سر پر اپنا بکس ٹکائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی ۔ وہ دونوں نووارد چاروں طرف سے مکروہ وحشیانہ صورتوں کے نرغے میں گھرے ھوئے تھے ۔ پاویل کو اس بات پر کوفت ھو رہی تھی کہ ریتا کو یہ تمام باتیں سننی پڑ رہی تھیں ۔ لیکن چارہ ھی کیا تھا ۔ کسی نہ کسی طرح ان تمام باتوں کو برداشت کرنا ھی تھا ۔

«بھائی ذرا راستے سے اپنے بورے ھٹا لو ۔ اس کامریڈ کے لئے تھوڑی سی جگہ کر دو» پاویل نے اس شخص سے کہا جسے وہ لوگ موتکا کہہ‌کر مخاطب کر رہے تھے ۔ لیکن اس درخواست کے

جواب میں اس نے اتنی گندی گالی دی کہ پاویل غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس کی دائیں آنکھ کے اوپروالی رگ بری طرح پھڑکنے لگی۔ «ٹھیر جا بدمعاش ابھی تجھے اس کا مزا معلوم ہوا جاتا ہے» پاویل نے اس غنڈے سے کہا۔ لیکن اتنے میں کسی نے اوپر سے اس کے سر پر ایک ٹھوکر ماری۔

«شاباش واسکا۔ ایک اور دے اسے!» چاروں طرف سے شاباش کے نعرے بلند ہونے لگے۔

آخرکار پاویل اپنے پر قابو نہ رکھہ سکا، اور جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہوتا تھا اس نے فوراً اور یقینی طور پر اپنے اگلے اقدام کا فیصلہ کر لیا۔

«حرامی سٹے باز کہیں کے۔ تم لوگ سمجھتے ہو کہ تم جو چاہو کر سکتے ہو» اس نے چیخ کر کہا۔ اور پھرتی سے اچک کر وہ اوپروالی سیٹ پر پہونچ گیا اور اس نے موتکا کے چوروں جیسے کائیاں چہرے پر پوری طاقت سے ایک گھونسہ جڑ دیا۔ اس نے اتنے زور کا گھونسہ مارا تھا کہ وہ سٹے باز لڑھک کر نیچے کی سیٹوں کے درمیان والے رستے میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں کے سر پر جاکر گرا۔

«اترو وہاں سے، سورو نہیں تو میں تم سب کو گولی مار دوں گا!» پاویل ان چاروں کی ناک کے سامنے پستول گھماکر دیوانوں کی طرح چلایا۔

پانسہ پلٹ گیا۔ ریتا بڑے غور سے اس واقعے کو دیکھہ رہی تھی اور اس بات کے لئے بالکل تیار تھی کہ اگر کوئی کورچاگن پر حملہ کرے تو وہ فوراً گولی چلا دے۔ اوپروالی سیٹ جلد ہی خالی ہو گئی، اور سٹےبازوں کا گروہ دم دباکر پاس والے ڈبے میں چلا گیا۔

پاویل نے ریتا کو اوپروالی خالی سیٹ پر چڑھاکر اس سے چپکے سے کہا :

« تم ذرا یہاں بیٹھو میں ابھی ان لوگوں کی خبر لیتا ہوں ـ »

ریتا نے اسے روکنے کی کوشش کی :

« تم ان سے لڑنے کا ارادہ تو نہیں کر رہے ہو نا ؟ »

« نہیں نہیں » اس نے ریتا کو یقین دلایا ـ « میں ابھی لوٹ کر آتا ہوں ـ »

پاویل نے پھر کھڑکی کھولی اور پلیٹ فارم پر اتر گیا ـ تھوڑی ہی دیر بعد وہ برمیسٹر سے باتیں کر رہا تھا ـ برمیسٹر ریلوے چیکا میں کام کرتا تھا اور کسی زمانے میں پاویل کا افسر رہ چکا تھا ـ اس لیتھوانیائی چیکا کے آدمی نے پاویل کی پوری بات سنی اور حکم دیا کہ پورا ڈبہ خالی کرا دیا جائے اور تمام مسافروں کے ٹکٹ وغیرہ کی جانچ کی جائے ـ

« یہی تو میں ہمیشہ سے کہتا آ رہا ہوں » برمیسٹر نے غراکر کہا ـ « گاڑیوں کے یہاں پہونچنے سے پہلے ہی یہ کمبخت سٹے باز ان میں بھر جاتے تھے ـ »

دس چیکا کے آدمیوں کے ایک دستے نے ڈبہ خالی کرا دیا ـ پاویل نے اپنی پرانی ڈیوٹی سنبھال لی اور مسافروں کے ٹکٹ اور شناختی کاغذات کی جانچ کرنے میں چیکا کے آدمیوں کی مدد کرنے لگا ـ چیکا کے پرانے ساتھیوں کے ساتھہ اس نے اپنے تعلقات پوری طرح ختم نہیں کئے تھے ـ اور کامسومول کے سکریٹری کی حیثیت سے اس نے کومسومول کے کچھہ بہترین ممبروں کو چیکا میں کام کرنے کے لئے بھیجا تھا ـ تمام مسافروں کے کاغذات وغیرہ کی جانچ ہو جانے کے بعد پاویل ریتا کے پاس واپس آیا ـ اب اس ڈبے میں بالکل ہی دوسرے قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ــ سرخ فوج کے سپاہی اور کارخانوں اور دفتروں میں کام کرنے والے لوگ جو سب کسی نہ کسی ضروری کام سے سفر کر رہے تھے ـ

ریتا اور پاویل کے حصے میں ڈبے کے ایک کونے کی اوپروالی سیٹ آئی تھی۔ لیکن اخباروں کے پلندوں نے اتنی جگہ گھیر رکھی تھی کہ صرف ریتا کے لیٹنے بھر کی جگہ رہ گئی تھی۔

«تم فکر نہ کرو» ریتا نے کہا۔ «ہم کسی نہ کسی طرح کام چلا لیں گے۔»

آخرکار گاڑی روانہ ہوئی۔

جس وقت گاڑی رینگتی ہوئی اسٹیشن کے باہر نکل رہی تھی اس وقت ان لوگوں نے ایک جھلک اس مٹلی عورت کی دیکھی جو بوروں کے ایک بنڈل پر بیٹھی ہوئی چلا رہی تھی:

«اے مانکا ہمارا تیل کا پیپہ کہاں گیا؟»

پاویل اور ریتا اپنی تنگ سی جگہ میں بیٹھے ہوئے سیب اور ڈبل روٹی کھا رہے تھے اور ہنس ہنس‌کر اس واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے جس سے کہ ان کے سفر کی ابتدا ہوئی تھی حالانکہ اس واقعہ میں ہنسنے کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اخباروں کے بنڈلوں کی آڑ میں دوسرے مسافر انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ریل گاڑی رینگتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ پٹڑی کے ہر جوڑ پر گاڑی کے پرانے، شکستہ حال اور ضرورت سے زیادہ بوجھ سے دبے ہوئے ڈبے چرمراتے تھے، کراہتے تھے اور بری طرح کانپ جاتے تھے۔ شام کے دھندلکے کی گہری نیلگوں سیاہی کھڑکیوں سے اندر جھانک رہی تھی۔ رفتہ رفتہ رات آئی اور اس نے پورے ڈبے کو تاریکی کی چادر اڑھا دی۔

ریتا بہت تھکی ہوئی تھی۔ وہ تھیلے پر اپنا سر ٹکاکر سو گئی۔ پاویل سیٹ کی کگر پر بیٹھا ہؤا سگریٹ پیتا رہا۔ تھکا ہؤا تو وہ بھی تھا، لیکن لیٹنے کی جگہ ھی کہاں تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے رات کی تازی خوش‌گوار ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ اچانک ایک جھٹکا لگنے سے ریتا کی آنکھ کھل گئی اور اس نے

اندھیرے میں پاویل کی سگریٹ کو جلتے دیکھا ۔ پاویل کا مزاج ھی کچھہ ایسا تھا کہ وہ رات بھر یوں ھی جاگ کر کاٹ دیتا، لیکن ریتا کو ھرگز تکلیف نہ دیتا ۔

«کامریڈ کورچاگن! بورژوا سماج کی یہ عادتیں بھول جاؤ، اور یہاں آکر لیٹ جاؤ» ریتا نے کچھہ مذاق کے انداز میں کہا ۔

پاویل نہایت فرمانبرداری کے ساتھہ اس کے برابر لیٹ گیا اور عیش کے ساتھہ اپنی اکڑی ہوئی ٹانگیں پھیلا لیں ۔

«کل ھمیں بہت سا کام کرنا ھے ۔ اس لئے اب کوشش کرکے تھوڑا سا سو جاؤ لڑاکا لڑکے ۔» ریتا نے بڑے اعتماد کے ساتھہ اپنی بانھہ اس کے گلے میں ڈال دی اور پاویل کو ایسا محسوس ھؤا کہ جیسے ریتا کے بال اس کے گال چھو رھے ھیں ۔

پاویل کے لئے ریتا کی ھستی بہت مقدس تھی ۔ وہ اس کی دوست تھی، کامریڈ تھی اور اس کی سیاسی رھنما بھی تھی ۔ لیکن ان سب باتوں کے علاوہ وہ عورت بھی تو تھی ۔ اسے اس بات کا احساس پہلی بار اسٹیشن کے اس پل پر ھوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کی ھم آغوشی اسے اس وقت اتنا بےقرار کئے دے رھی تھی ۔ وہ اس کے گہرے پرسکون سانسوں کے زیروبم کو محسوس کر رھا تھا ۔ کہیں اس سے بہت قریب ھی اس کے ھونٹ بھی تھے ۔ اس قربت نے پاویل کے دل میں ان لبوں تک پہونچنے کی ایک شدید خواھش پیدا کر دی ۔ اور اپنی قوت ارادی سے پورا کام لے کر ھی وہ اپنی اس شدید خواھش پر قابو پا سکا ۔

ریتا اندھیرے میں مسکرائی جیسے وہ اس کے جذبات تاڑ گئی ھو ۔ وہ شدت جذبات کی مسرت اور پاکر کھو دینے کے غم دونوں سے ھی آشنا ھو چکی تھی ۔ اس نے دو بالشویکوں پر اپنی محبت نثار کی تھی ۔ لیکن سفید فوجوں کے سپاھیوں کی گولیوں نے ان دونوں کو اس سے چھین لیا تھا ۔ ان میں سے ایک تو بہت ھی

شاندار دیوھیکل شخص تھا جوکہ ایک بریگیڈ کا کمانڈر تھا اور دوسرا شفاف نیلی آنکھوں والا ایک کم عمر نوجوان تھا ۔

ریل کے پہیوں کی لے نے پاویل کو تھپکیاں دےکر سلا دیا ۔ اور اس کی آنکھہ دوسرے دن صبح انجن کی سیٹی کی تیز آواز سن کر ھی کھلی ۔

ریتا ھر روز بہت رات گئے تک کام میں اتنا مصروف رھتی تھی کہ اسے اپنی ڈائری بھرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی ۔ چند دنوں کے وقفے کے بعد اس کی ڈائری میں کچھہ اور مختصر اندراجات نظر آئے :

«۱۱ اگست

گبرنیا کانفرنس ختم ھو گئی ھے ۔ آکم، مخایلو اور کئی دوسرے ساتھی کل یوکرین کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے خارکوف چلے گئے ھیں ۔ اور دفتر کا سارا لکھا پڑھی کا کام مجھہ پر چھوڑ گئے ھیں ۔ دوباوا اور پاویل گبرنیا کمیٹی میں کام کرنے کے لئے بھیج دئے گئے ھیں ۔ دمیتری کو جب سے پچارسک کی ضلع کمیٹی کا سکریٹری بنایا گیا ھے تب سے اس نے پڑھنے کے لئے آنا بند کر دیا ھے ۔ اس پر اتنا کام آ پڑا ھے کہ اسے دم لینے کی فرصت نہیں ملتی ۔ پاویل تھوڑا بہت پڑھنے کی کوشش کرتا ھے لیکن ھم لوگ کچھہ زیادہ نہیں کر پاتے کیوںکہ یا تو میں بہت مصروف رھتی ھوں یا پھر اسے کسی کام پر بھیج دیا جاتا ھے ۔ ریلوں کے انتظام میں اس وقت جو سنگین صورت حال پیدا ھو گئی ھے اس کی وجہ سے کومسومول کے لوگوں کو مسلسل کام پر لگایا جا رھا ھے ۔ ژارکی کل مجھہ سے ملنے آیا تھا ۔ وہ شکایت کر رھا تھا کہ اس کے کارکن اس سے چھینے جا رھے ھیں جب کہ اسے خود ان کی سخت ضرورت ھے ۔

۲۳ اگست

آج جس وقت میں برآمدہ میں جا رہی تھی میں نے کورچاگن کو پانکراتوف اور ایک دوسرے شخص کے ساتھہ مینجر کے دفتر کے قریب کھڑا دیکھا - قریب پہونچ کر میں نے پاویل کو کہتے سنا:

«وہ لوگ جو وہاں پر کرسیوں پر بیٹھے ہیں انہیں گولی مار دینی چاھئیے - وہ کہتا ھے تمہیں ھمارے حکم کے خلاف حکم جاری کرنے کا کوئی اختیار نہیں ھے - یہاں ریلوے کی ایندھن کمیٹی کا حکم چلتا ھے اور بہتر یہی ھے کہ تم کومسومول والے اس میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ - ذرا تم اس کی صورت دیکھتے... اور یہاں اس جیسے نہ جانے کتنے حرام خور بھرے پڑے ھیں -»

اس کے بعد اس نے چند بہت ھی تکلیف دہ الفاظ کا استعمال کیا - پانکراتوف نے مجھے دیکھہ کر اس کے کہنی ماری - پاویل تیزی سے مڑا اور جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، اور وہ مجھہ سے آنکھیں ملائے بغیر ھی چل دیا - وہ اب بہت عرصے تک مجھے اپنی صورت نہ دکھائے گا کیوں کہ وہ جانتا ھے کہ میں گندے الفاظ کا استعمال برداشت نہیں کر سکتی -

۲۷ اگست

ھم لوگوں کے بیورو کی ایک خفیہ میٹنگ ھوئی - صورت حال بہت سنگین ھوتی جا رہی ھے - میں ابھی اس کے بارے میں تفصیل سے نہیں لکھہ سکتی - آکم جب علاقائی کانفرنس سے لوٹا تو بہت پریشان نظر آتا تھا - کل رسد لے جانےوالی ایک اور گاڑی الٹ دی گئی - میرا خیال ھے کہ اب اس ڈائری کو جاری رکھنے کی کوشش بےکار ھے - یوں بھی اس میں کوئی تسلسل اور ترتیب باقی نہیں رہی ھے - کورچاگن مجھہ سے ملنے آنے والا ھے - ابھی اس

دن جب مجھ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی تو اس نے بتایا کہ وہ اور ژارکی مل کر پانچ آدمیوں کا ایک کمیون بنا رہے ہیں۔"

ایک دن ریلوے کے کارخانے میں کام کرتے وقت پاویل کو ٹیلیفون پر بلایا گیا۔ ریتا کا ٹیلیفون تھا۔ اس دن شام کو اسے فرصت تھی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ وہ لوگ اس بات کو ختم کر لیں جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے — پیرس کمیون کی شکست کے اسباب۔

اس دن شام کو جب پاویل نے یونیورسٹی اسٹریٹ میں ریتا کے مکان کے قریب پہونچ کر اوپر نظر ڈالی تو اس نے دیکھا کہ کھڑکی میں روشنی ہو رہی ہے۔ وہ بھاگتا ہؤا اوپر چڑھ گیا، اور حسب دستور دروازے پر مختصر سی دستک دے کر کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر پہونچ کر وہ دیکھتا کیا ہے کہ پلنگ پر، جہاں کسی نوجوان کامریڈ کو ایک لمحہ کے لئے بھی بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی، ایک شخص فوجی وردی پہنے لیٹا ہوا ہے۔ میز پر ایک ریوالور، سامان رکھنے کا فوجی تھیلہ اور ایک فوجی ٹوپی پڑی ہوئی تھی جس پر ایک سرخ ستارہ لگا ہوا تھا۔ ریتا اس اجنبی کو مضبوطی سے اپنی باھوں میں کسے ہوئے اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی وہ دونوں رازدارانہ گفتگو میں مشغول تھے، اور پاویل کے داخل ہوتے ہی ریتا نے سر اٹھاکر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھلا ہؤا تھا۔

وہ شخص اپنے آپ کو اس کی آغوش سے رہا کر کے اٹھ بیٹھا۔

«پاویل» ریتا نے اس سے ھاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ «یہ ھیں ...»

«ڈیوڈ استینووچ» اس شخص نے بڑے تپاک سے کورچاگن کا ہاتھہ دباکر کہا ۔

«مجھے ان کے آنے کی کوئی خبر نہ تھی ۔ بالکل اچانک آ گئے» ریتا نے مسرت کی ھنسی ھنستے ھوئے پاویل کو سمجھانے کی کوشش کی ۔

پاویل نے انتہائی روکھے پن سے اس نووارد سے ھاتھہ ملایا ۔ اور اس کی آنکھیں کچھہ اس انداز سے چمکنے لگیں جیسے اس شخص کا وھاں آنا اسے بہت ناگوار گذرا ھو ۔ پاویل نے اس کی وردی کی آستین پر کمپنی کمانڈر والے چار چوکور نشان دیکھے ۔

ریتا کچھہ کہنے ھی والی تھی کہ پاویل بیچ میں ھی بول اٹھا:

«میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ آج شام کو میں گھاٹ پر لکڑی لادنے کے کام میں مصروف رھوں گا» اس نے کہا ۔ «اور یوں بھی تمہارے یہاں مہمان آئے ھوئے ھیں ۔ اچھا تو میں چلتا ھوں ۔ کچھہ لوگ نیچے میرا انتظار کر رھے ھیں ۔»

اور جس قدر اچانک وہ کمرے میں داخل ھوا تھا، اسی قدر اچانک وہ دروازے کے باھر غائب ھو گیا ۔ انہوں نے اس کے سیڑھیوں سے تیزی کے ساتھہ اترنے کی آواز سنی ۔ پھر باھروالا دروازہ بند ھو گیا ۔ اور چاروں طرف خاموشی چھا گئی ۔

«معلوم ھوتا ھے اسے کچھہ ھو گیا ھے» ڈیوڈ کی سوالیہ نظروں کے جواب میں ریتا نے رک رک کر جواب دیا ۔

نیچے کچھہ فاصلے پر پل کے نیچے کھڑے ھوئے ریل کے ایک انجن نے گہری آہ بھری اور اس کے مضبوط پھیپھڑوں سے سنہری چنگاریوں کا ایک فوارہ چھوٹ پڑا ۔ عجیب و غریب انداز میں ناچتی ھوئی چنگاریاں اوپر کی طرف اٹھیں اور دھوئیں میں کھو گئیں ۔

پاویل ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا اور وہ ریل کی قینچی نما

پٹڑیوں کو آنکھ مارتی ہوئی سگنل کی رنگین بتیوں کو گھور رہا تھا — اس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں —

«کامریڈ کورچاگن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر یہ معلوم کرکے تمہیں اس قدر تکلیف کیوں ہوئی کہ ریتا کا شوہر موجود ہے؟ کیا کبھی اس نے تم سے کہا تھا کہ اس کا شوہر نہیں ہے؟ اور اگر شوہر ہے بھی تو کیا ہوا؟ آخر اس بات پر تم اس قسم کا رویہ کیوں اختیار کر رہے ہو؟ کامریڈ تم نے تو سوچا تھا کہ یہ محض پاکیزہ دوستی ہے اور کچھ بھی نہیں... پھر آخر تم نے یہ کیسے ہونے دیا؟» اس نے ایک تلخ طنز کے ساتھ اپنے آپ سے سوال کیا — «لیکن اگر وہ اس کا شوہر نہ ہو تو؟ ڈیوڈ استینووچ تو اس کا بھائی یا چچا بھی ہو سکتا ہے... اگر ایسا ہے تو تم نے اس کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے — بے وقوف تم نے انتہائی ذلیل حرکت کی ہے — یہ معلوم کرنا تو بہت آسان ہے کہ وہ اس کا بھائی ہے کہ نہیں — اگر وہ اس کا بھائی یا چچا نکلا تو اس کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے کے بعد اب تم ریتا کے پاس کیا منھ لےکر جاؤگے؟ نہیں اب تمہیں اس سے ملنا چھوڑ دینا ہوگا!»

انجن کی سیٹی کی تیز آواز سے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا —

«بہت دیر ہو چکی ہے — اب گھر چلنا چاہئے — بس بہت ہو چکی یہ خرافات —»

جس بستی میں ریلوے کے مزدور رہتے تھے اس کا نام سولومینکا تھا — اسی بستی میں پانچ نوجوانوں نے اپنا ایک چھوٹا سا کمیون قائم کر لیا — ایک ژارکی، ایک پاویل اور ایک تھا ایک بہت ہی ہنسوڑ قسم کا سنہرے بالوں والا چیکوسلوواکیائی ساتھی،

کلاویچک۔ چوتھا نکولائی آکونیف جو ریلوے یارڈ کی کومسومول تنظیم کا سکریٹری تھا، اور پانچواں تھا ستیپان آرتیوخن جو پہلے بوائلر مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ لیکن اب ریلوے چیکا میں تھا۔

ان لوگوں نے ایک کمرہ تلاش کیا اور تین دن تک اپنا تمام خالی وقت اس کی صفائی اور رنگائی پتائی میں صرف کیا۔ وہ لوگ پانی کی بالٹیاں لےکر اتنی بار اندر باہر آئے گئے کہ پڑوسیوں کو یہ شبہ ہونے لگا کہ شاید مکان میں آگ لگ گئی ہے۔ انہوں نے اپنے سونے کے لئے تختے لگائے اور پارک سے مہوے کی سوکھی پتیاں بٹورکر انہیں گدوں میں بھر لیا۔ اور چوتھے دن کمرہ اتنا صاف ہو گیا تھا کہ وہ حقیقتاً چمک رہا تھا۔ کمرے کی دیوار پر پیتروو‌سکی کی ایک تصویر اور ایک بڑا سا نقشہ لٹکا ہؤا تھا۔

کھڑکیوں کے درمیان ایک الماری تھی جو اوپر سے لےکر نیچے تک کتابوں سے لدی ہوئی تھی۔ چیڑ کے دو خالی بکسوں پر دفتی لگاکر ان سے کرسیوں کا کام لیا جاتا تھا۔ اور ایک نسبتاً بڑا بکس الماری کا کام دیتا تھا۔ کمرے کے بیچ میں بلیارڈ کی ایک بڑی سی میز پڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے اوپر کا کپڑا غائب تھا۔ اس میز کو کمرے کے باسی اپنے کندھوں پر لادکر مال گودام سے لائے تھے۔ دن کے وقت اسے میز کی طرح استعمال کیا جاتا تھا اور رات میں کلاویچک اس پر سوتا تھا۔ پانچوں نوجوان اپنا اپنا سامان لے آئے۔ اور کلاویچک نے جو گرھستی کے کام میں کافی ہوشیار معلوم ہوتا تھا کمیون کی جائداد کی ایک فہرست تیار کر لی۔ وہ تو اس فہرست کو دیوار پر ٹانگ دینا چاھتا تھا۔ لیکن باقی لوگوں نے اعتراض کیا۔ کمرے کی ہر چیز مشترکہ ملکیت قرار دے دئی گئی۔ ہر شخص کی کمائی، راشن اور

وقتاً فوقتاً ان کے گھروں سے آنے والے پارسل ہر چیز برابر برابر تقسیم کر لی جاتی تھی ۔ ذاتی ملکیت کی مد میں صرف ایک چیز آتی تھی اور وہ تھی ان لوگوں کے ہتھیار ۔ اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ کمیون کا جو بھی رکن مشترکہ ملکیت کے قوانین توڑے گا یا جو اپنے ساتھیوں کے اعتماد سے غداری کرے گا اسے کمیون سے خارج کر دیا جائے گا ۔ آکونیف اور کلاویچک اس پر مصر تھے کہ کمیون سے خارج کئے جانے کے بعد اس شخص کو کمرے سے بھی نکال دیا جائے اور ان کی یہ تجویز منظور کر لی گئی ۔

ضلعے کی کومسومول تنظیم کے تمام سرگرم اراکین اس کمیون کی افتتاحی دعوت میں شرکت ہوئے ۔ پڑوسیوں سے ایک بہت بڑا سماوار ادھار مانگ لیا گیا تھا ۔ کمیون کی سیکرین کا سارا ذخیرہ چائے کی دعوت کی نذر ہو گیا ۔ چائے کے بعد ان لوگوں نے ساتھ ملکر گانا شروع کیا اور ان کی پر جوش نوجوان آوازیں چھت کی کڑیوں سے ٹکراکر گونجنے لگی :

غم کے اشکوں میں ڈوبا ہے سارا جہاں
سخت محنت میں ہوتی ہے گزران یہاں
لو وہ پھوٹی کرن اب اندھیرا کہاں...

تالیا لاگوتینا گانے کی رہنمائی کر رہی تھی ۔ وہ تمباکو کے کارخانے میں کام کرتی تھی ۔ اس کے سر پر بندھا ہؤا گہرے سرخ رنگ کا رومال سرک کر ایک طرف کو آ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں، جن کی گہرائیوں کی تھاہ ابھی تک کوئی نہیں پا سکا تھا، شرارت ناچ رہی تھی ۔ تالیا کی ہنسی انتہائی دلفریب تھی اور دوسروں کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیتی تھی ۔ اور وہ پوری کائنات کو اپنی اٹھارہ سالہ زندگی کی درخشان بلندیوں سے دیکھتی

تھی۔ دفعتاً اس کا ہاتھ اوپر اٹھتا اور نغمے کا طوفان ابل پڑتا، جیسے بیک وقت کئی نفیریاں بج اٹھیں:

سیل کی مانند عالم پر چھا جائیں ہمارے نغمے
کس شان سے لہراتا ہے ہمارا پرچم
ساری دنیا اسکی ضیا سے روشن
اس کی ضیا کو اپنا لہو دے دیکے نکھارا ہم نے

یہ محفل بڑی دیر تک جمی رہی اور شہر کی خاموش سڑکیں صبح کے وقت ان کی پرجوش نوجوان آوازوں سے جاگیں۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ژارکی نے ہاتھ بڑھاکر ٹیلیفون کا چونگا اٹھا لیا۔

«ذرا خاموش رہو۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا ہے!» اس نے کومسومول کے اراکین سے ڈانٹ کر کہا جو سکریٹری کے کمرے میں جمع ہوکر بہت شور مچار ہے تھے۔

غل شور کچھ حد تک کم ہؤا۔

«ہلو! اچھا تم ہو۔ ہاں ہاں فوراً۔ کن کن سوالوں پر غور کیا جائے گا؟ ارے وہی پرانا جھگڑا۔ وہی گھاٹ سے ایندھن لدواکر منگانے کا سوال۔ کیا کہا؟ نہیں اسے کہیں نہیں بھیجا گیا ہے۔ وہ یہیں ہے۔ اس سے بات کرنا چاہتی ہو؟ اچھا ایک منٹ۔»

ژارکی نے پاویل کو اشارہ سے بلایا۔

«کامریڈ استینووچ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔» یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون پاویل کے حوالے کر دیا۔

«میں تو سمجھی تھی کہ تم شاید کہیں باہر چلے گئے ہو» پاویل نے ریتا کی آواز کو کہتے سنا۔ «آج شام مجھے فرصت ہے۔ تم یہاں آ کیوں نہ جاؤ؟ میرا بھائی چلا گیا ہے۔ وہ ادھر شہر سے

ہو کر گذر رہا تھا، اس لئے اس نے سوچا کہ مجھ سے ملتا جائے۔ دو برس سے ہم نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔»
اس کا بھائی!
پاویل نے اس کے آگے کچھ بھی نہیں سنا۔ اسے اس بد نصیب شام کا منظر یاد آ رہا تھا اور اپنا وہ عہد جو اس دن رات کو اس نے پل پر کھڑے ہو کر کیا تھا۔ ہاں وہ آج شام ضرور اس کے پاس جائے گا اور اس قصے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔ محبت کے ساتھ ہمیشہ بہت تکلیف اور پریشانی وابستہ رہتی ہے۔ کیا یہ ان سب باتوں کا وقت ہے؟
آواز نے پھر اس کے کان میں کہا:
«کیا تمہیں میری آواز سنائی نہیں دے رہی ہے؟»
«ہاں ہاں۔ سن رہا ہوں۔ اچھی بات ہے۔ بیورو کی میٹنگ کے بعد میں آ جاؤں گا۔» یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون رکھ دیا۔
پاویل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور شاہ بلوط کی لکڑی کی بنی ہوئی میز کا سرا زور سے پکڑ کر کہا:
«میں سمجھتا ہوں کہ اب میرے لئے تم سے ملنے آنا ممکن نہ ہوگا۔»
اس نے دیکھا کہ اس کے یہ الفاظ سن کر اس کی گھنی پلکیں اوپر کو اٹھ گئیں۔ اس کی پنسل جو بڑی روانی کے ساتھ کاغذ پر چل رہی تھی یک لخت رک گئی اور پھر کھلے ہوئے پیڈ پر بے حس و حرکت گر پڑی۔
«آخر کیوں؟»
«میرے لئے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔ تم تو خود جانتی ہو کہ آج کل ہمیں دم لینے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے لیکن میرے خیال میں ہمیں اب یہ سلسلہ ختم کر دینا ہوگا...»

اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کے ان آخری الفاظ میں یقین کی بہت کمی تھی۔

«آخر تم اس قدر گھما پھرا کر باتیں کیوں کر رہے ہو؟» پاویل کو دل ہی دل میں اپنے اوپر بہت غصہ آ رہا تھا۔ «بزدل کہیں کے۔ تم میں کھل کر بھرپور وار کرنے کی ہمت نہیں ہے»

پھر اس نے زور زور سے کہنا شروع کیا:

«اس کے علاوہ میں کافی عرصے سے تمہیں یہ بتانا چاھتا تھا کہ تم جس طرح چیزوں کی تشریح کرتی ہو اسے سمجھنے میں مجھے بڑی دشواری ہوتی ہے۔ جب ہم لوگ سیگل سے پڑھتے تھے اس وقت جو کچھہ بھی پڑھایا جاتا تھا وہ میرے ذہن میں رہتا تھا۔ لیکن تمہارے ساتھہ یہ بات نہیں ہے۔ یہاں سے اپنا سبق ختم کرنے کے بعد مجھے ہمیشہ توکاریف کے پاس جانا پڑتا تھا، اور تمام باتوں کو اس سے دوبارہ اچھی طرح سمجھنا پڑتا تھا۔ اس میں قصور میرا ہی ہے۔ میرے بھیجے میں کچھہ گھستا ہی نہیں ہے۔ تمہیں کوئی دوسرا شاگرد تلاش کرنا ہوگا جس کے دماغ میں کچھہ زیادہ عقل ہو۔»

پاویل نے اس کی تیز متلاشی نگاہوں کی طرف سے اپنا منھہ پھیر لیا، اور جان بوجھہ کر اپنی تمام بچی کھچی امیدوں کے لئے راستہ بند کرتے ہوئے ضد سے کہا:

«تو صورت یہ ہے اس لئے اب ہمارے لئے اس سلسلے کو جاری رکھنا اپنا دونوں کا وقت ضائع کرنا ہوگا۔»

پھر وہ اٹھا اور بڑی احتیاط کے ساتھہ پاؤں سے کرسی ایک طرف کو سرکا کر اس نے اس جھکے ہوئے سر اور چہرے کو دیکھا جو لیمپ کی روشنی میں بہت ہی زرد معلوم ہو رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی ٹوپی پہن لی۔

«اچھی بات ہے تو میں اب جاتا ہوں کامریڈ ریتا۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں نے تمہارا اتنا وقت ضائع کیا۔ مجھے اب سے

بہت پہلے ہی تمہیں بتا دینا چاھئے تھا ۔ میرا اتنا قصور ضرور ہے ۔»

ریتا نے غیر ارادی طور پر اپنا ھاتھہ اس کی طرف بڑھا دیا ۔ لیکن پاویل کی اس اچانک بے رخی سے وہ اتنی حیران رہ گئی تھی کہ وہ چند الفاظ سے زیادہ کچھہ نہ کہہ سکی:

«پاویل میں تمہیں الزام نہیں دیتی ۔ اگر میں چیزوں کو تمہیں ٹھیک سے سمجھانے کا طریقہ دریافت کرنے میں ناکام رہی ہوں تو میں اسی کی مستحق ہوں ۔»

پاویل بہت افسردگی کے ساتھہ اپنے بوجھل قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا اور باھر نکل کر اس نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا ۔ نیچے پہونچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا ۔ اب بھی کچھہ نہیں بگڑا ھے ۔ اب بھی واپس جاکر وہ اس سے سب کچھہ صاف صاف کہہ دے گا... لیکن اس سے فائدہ؟ آخر کیوں؟ کیا محض اس کا حقارت آمیز رد عمل دیکھنے کے لئے اور دوبارہ پھر واپس آ جانے کے لئے؟ نہیں!

ریل کے ٹوٹے پھوٹے ڈبوں اور ناقابل استعمال انجنوں کا قبرستان بڑھتا ھی جا رہا تھا ۔ لکڑی جمع کرنے کے ویران یارڈ میں ھوا کے تند بگولے اٹھتے تھے اور لکڑی کا چورا یارڈ بھر میں پھیلا دیتے تھے ۔

شہر کے چاروں طرف جنگل کے گھنے جھرمٹوں میں اور پہاڑوں کی گہری گپھاؤں میں آرلک کے گروہ جابجا چھپے ہوئے تھے ۔ دن کے وقت تو وہ آس پاس کے گاؤں میں یا جنگل کے علاقوں میں چپ چاپ پڑے رہتے تھے، لیکن رات کے وقت وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں رینگتے ہوئے ریل کی پٹڑیوں کے قریب آ جاتے تھے اور بڑی بے رحمی سے پٹڑیاں اکھاڑ دیتے تھے ۔ اپنے اس

ناپاک کام کو پورا کرکے وہ پھر چوروں کی طرح اپنی ماندوں میں گھس جاتے تھے۔

اس طرح متعدد آھنی گھوڑے ریلوے لائن سے نیچے گرکر چکنا چور ھو گئے۔ مال گاڑیوں کے نہ جانے کتنے ڈبوں کے پرخچے اڑ گئے۔ اونگھتے ھوئے انسان اس ملبے کے نیچے دب‌کر بالکل پچی ھو گئے۔ بیش قیمت غلہ خاک اور خون میں لتھڑکر ادھر ادھر بکھر گیا۔

یہ گروہ اچانک کسی چھوٹے سے قصبے پر ٹوٹ پڑتا تھا اور سہمی ھوئی مرغیاں قیں قیں کرتی ھوئی ادھر ادھر بھاگ جاتی تھیں۔ کچھ گولیاں اٹکل پچو ادھر ادھر چلا دی جاتیں۔ قصبے کی سوویت کی عمارت کے باھر ایک مختصر سے عرصہ کے لئے رائفلوں کی گولیاں چلنے کی آواز ھوتی، بالکل ویسی ھی جیسی کسی پاؤں کے نیچے پتلی پتلی سوکھی ٹہنیاں ٹوٹنے سے ھوتی ھے۔ اور پھر یہ لٹیرے اپنے موٹے تازے گھوڑوں پر سوار آندھی کی طرح گاؤں بھر میں گشت لگاتے تھے اور راستے میں جو بھی آتا اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے۔ وہ اپنے مقتولوں! کو بلا کسی لحاظ و مروت کے اس طرح کاٹ کر رکھہ دیتے تھے جیسے کوئی لکڑی چیرتا ھے۔ شائد ھی کبھی وہ گولی چلاتے ھوں کیوں‌کہ گولیاں بڑی مشکل سے دستیاب ھوتی تھیں۔

لٹیروں کا یہ گروہ جیسے آندھی کی طرح آتا تھا ویسے ھی آندھی کی طرح چلا بھی جاتا تھا۔ اس گروہ کی آنکھیں اور کان ھر جگہ لگے ھوئے تھے۔ وہ آنکھیں اس چھوٹی سی سفید عمارت کی دیواروں کے پار دیکھہ سکتی تھیں جس میں قصبے کی سوویت کا دفتر تھا۔ کیوں‌کہ پادری کے گھر سے اور امیر کسانوں کی جھونپڑیوں سے جنگل کے گھنے جھرمٹوں تک خبررسانی کے خفیہ سلسلے قائم تھے۔ کارتوسوں کے بکس، سور کے تازے گوشت کے ذخیرے، نیلگوں کچی شراب‌کی بوتلیں اور ان کے ساتھہ ھی ھر

23—83

قسم کی خبریں وہاں پہونچا دی جاتی تھیں ۔ وہاں سے یہ خبریں چھوٹے چھوٹے عطامان کے کانوں سے ہوتی ہوئی بہت ہی پیچیدہ راستوں سے خود آرلک تک پہونچا دی جاتی تھیں ۔

حالانکہ اس گروہ میں دو تین سو سے زیادہ قاتل نہیں تھے لیکن ابھی تک یہ گروہ گرفت میں نہیں لایا جا سکا تھا ۔ یہ گروہ کئی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہوکر بیک‌وقت دو تین ضلعوں میں کام کرتا تھا ۔ ان سب کو پکڑنا نا ممکن تھا ۔ رات کے وقت جو لٹیرا تھا وہی دوسرے دن پرامن کسان بن جاتا تھا، اور اپنے باغیچے کو درست کرنے میں یا اپنے گھوڑے کو دانہ کھلانے میں یا اپنے پھاٹک پر کھڑے ہوکر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنا پائپ پیتے ہوئے خالی نگاہوں سے فوج کے گھوڑ سوار گشتی دستوں کو ادھر سے گذرتا ہوا دیکھنے میں مصروف پایا جاتا تھا ۔

الیکزانڈر پوزی‌ریوسکی اپنی رجمنٹ کی مدد سے بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ ان لٹیروں کا ان تین ضلعوں کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تعاقب کرتا رہتا تھا ۔ کبھی کبھی ان کی دم بھی اس کے ہاتھ میں آ جاتی تھی ۔

ایک ہی مہینے کے بعد آرلک کو اپنے غنڈوں کو دو ضلعوں سے ہٹا لینے پر مجبور ہونا پڑا، اور اب وہ ایک بہت ہی محدود علاقے میں گھر کر رہ گیا تھا ۔

شہر کی زندگی بدستور پہلے جیسی رفتار سے گرتی پڑتی چل رہی تھی ۔ شہر کے پانچ بازاروں میں لوگوں کے پرشور مجمع جمع ہو جاتے تھے ۔ اس بے پناہ انبوہ میں ہر شخص پر صرف دو ہی جذبات حاوی رہتے تھے ۔ پہلا یہ کہ زیادہ سے زیادہ جتنا ممکن ہو ہتھیا لو، اور دوسرا یہ کہ جب دینے کا وقت آئے تو کم سے کم جتنا ممکن ہو دو ۔ ہر قسم کے اٹھائی گیروں اور دغابازوں کے لئے اپنی قوت اور صلاحیت کا پورا استعمال کرنے کے لئے اس سے

بہتر ماحول اور کیا ہو سکتا تھا ـ ان مجمعوں میں سینکڑوں مشتبہ قسم کے لوگ اپنے اپنے شکار کی تاک میں گھومتے رہتے تھے ـ ان کی نظروں میں ایمانداری کا شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا ـ شہر کے تمام چھٹے ہوئے بدمعاش یہاں اس طرح آکر جمع ہو جاتے تھے جیسے غلاظت کے ڈھیر پر مکھیاں ٹوٹتی ہیں ـ ان سب کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا ـ بھولے بھالے لوگوں کو بے وقوف بناکر اپنا الو سیدھا کرنا ـ ادھر سے ہوکر جو چند ریل گاڑیاں گذرتی تھیں ان میں سے بوروں سے لدے ہوئے لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اترتے تھے، اور اسٹیشن سے سیدھے ان منڈیوں کا رخ کرتے تھے ـ

رات کے وقت منڈیوں میں الو بولنے لگتا تھا، اور چھوٹی چھوٹی کابک نما دکانوں اور چھوٹی چھوٹی اسٹالوں کی سیاہ قطاروں پر نحوست اور درندگی برسنے لگتی تھی ـ

کوئی بہت ہی دلیر ایسا رہا ہوگا جو اندھیرا ہونے کے بعد اس ویران علاقے میں جانے کی ہمت کر سکتا، جہاں ہر دکان کے پیچھے کوئی نہ کوئی خطرہ چوروں کی طرح چھپا بیٹھا رہتا تھا ـ اکثر رات کے وقت گولی چلنے کی آواز سنائی دی جاتی جیسے لوہے پر ہتھوڑا پڑنے کی آواز آتی ہے، اور کسی بدنصیب کا گلا اپنے ہی خون کے سیلاب سے گھٹ جاتا ـ اور جس وقت مٹھی بھر ملیشیا والے سب سے قریب والی گشتی چوکی سے موقع پر پہونچتے تھے (اکیلے جانے کی تو کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی) تو انہیں وہاں بدھیئت لاش کے علاوہ کچھہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا ـ قاتل اس وقت تک بھاگ چکے ہوتے تھے اور بازار کے چوک میں رات کے وقت اڈا جمانے والے چند آوارہ گرد اس شور وغل سے گھبراکر ہوا کے جھونکے کی طرح وہاں سے رفو چکر ہو جاتے تھے ـ

بازار کے سامنے ہی «اورین» سنیما تھا ـ سڑک اور اس کے کنارے کے فٹ پاتھہ بجلی کی تیز روشنیوں سے جگمگاتے رہتے

تھے، اور سنیما کے دروازے پر لوگ بھیڑ لگائے کھڑے رہتے تھے۔ ھال کے اندر فلم دکھانے والی مشین مسلسل کرکر کی آواز کے ساتھہ چلتی رہتی تھی اور انتہائی مضحکہ خیز محبت کے سین پردہ پر منعکس کرتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی فلم بیچ میں ٹوٹ جاتی تھی اور آپریٹر مشین روک دیتا تھا جس پر تماشبینوں کا مجمع احتجاجاً شور مچانے لگتا تھا۔

شہر کے اندر اور شہر کے اطراف زندگی اپنے پرانے ڈھرے پر چلتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ پارٹی کی گبرنیا کمیٹی میں بھی جو انقلابی اقتدار کا مرکز تھی کسی قسم کی سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن یہ سکوت محض باھر سے ھی نظر آتا تھا۔

شہر کے اندر ایک طوفان کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

مختلف سمتوں سے آنے والے ان لوگوں میں سے بہت سے جن کے لمبے کسانوں والے اوورکوٹوں کے نیچے ان کی رائفلیں صاف نظر آتی تھیں، اس آنے والے طوفان سے باخبر تھے۔ وہ لوگ بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے جو غلے کی نفع خوری کرنے والوں کے بھیس میں ریل کی چھت پر بیٹھہ‌کر آتے تھے. لیکن جو اپنے بوروں کو منڈی لے جانے کے بجائے بڑی محنت سے حفظ کئے ہوئے پتوں پر پہونچا دیتے تھے۔

ان لوگوں کو سب کچھہ معلوم تھا۔ لیکن مزدوروں کی بستیوں میں حتی کہ بالشویکوں کو بھی اس آنے والے طوفان کی کوئی بھنک تک نہیں ملی تھی۔

شہر میں صرف پانچ بالشویکوں کو معلوم تھا کہ کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔

وارسا میں مقیم غیرملکی سفارت خانوں کی پوری مدد سے پیتلورا کی فوج کے بچے کھچے گروہ، جنہیں سرخ فوج نے وھائٹ پولینڈ میں کھدیڑ دیا تھا، بغاوت میں حصہ لینے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

پیتلورا کی رجمنٹوں کی بچی کھچی طاقت کو بٹور کر ایک حملہ‌آور فوج تیار کی جا رہی تھی۔

شیپتووکا میں بھی ان باغیوں کی مرکزی کمیٹی کی ایک تنظیم قائم تھی، یہ تنظیم ٤٧ افراد پر مشتمل تھی، جن میں سے بیشتر پہلے بھی انقلاب کے سرگرم دشمن رہ چکے تھے اور جنہیں مقامی چیکا نے خوش اعتمادی کے تحت آزاد چھوڑ دیا تھا۔

فادر واسیلی، انسائن ونک اور کوزمینکو نام کا پیتلورا فوج کا ایک افسر اس تنظیم کی رہنمائی کر رہے تھے۔ پادری کی بیٹیاں، ونک کا باپ اور بھائی اور ساموتنیا نام کا ایک شخص جو کسی طرح ایگزیکیوٹیو کمیٹی کے دفتر میں پہونچ گیا تھا مخبری کا کام کرتے تھے۔

ان لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ رات کے وقت سرحد پر واقع اسپیشل ڈیپارٹمنٹ پر دستی بموں سے حملہ کیا جائے، قیدیوں کو رہا کرا لیا جائے اور اگر ممکن ہو تو اسٹیشن پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔

اسی عرصے میں خفیہ طور پر شہر میں فوجی افسر جمع کئے جا رہے تھے کیوں‌کہ یہ شہر اس بغاوت کا مرکز بننے والا تھا۔ اور اس کے ساتھہ ھی آس پاس کے جنگلوں میں لٹیروں کے گروہ لاکر بسائے جا رہے تھے۔ اس مقام سے معتبر لوگوں کے ذریعے رومانیہ کے ساتھہ اور خود پیتلورا کے ساتھہ تعلق قائم رکھا جاتا تھا۔

اسپیشل ڈیپارٹمنٹ کے اپنے دفتر میں فیودور ژوخرائی بیٹھا تھا۔ وہ چھہ راتوں سے سویا نہیں تھا۔ ان پانچ بالشویکوں میں جنہیں ان سازشوں کی تیاریوں کا علم تھا وہ بھی ایک تھا۔ اس شخص کی جو کسی زمانے میں ملاح تھا اس وقت وھی کیفیت تھی

جو اس بڑے جانوروں کے شکاری کی ہوتی ہے جو اپنے شکار کو زد پہ لا چکا ہو اور اس کا منتظر ہو کہ کب وہ جھپٹے اور کب وہ اس کا کام تمام کر دے۔

وہ چلانے یا شور مچانے کی جرائت نہیں کر سکتا۔ خون کے پیاسے درندے کو تو جان سے ہی مارنا ہوتا ہے تبھی جاکر سکون حاصل ہوتا ہے، ورنہ ہر وقت خوف سے ہر جھاڑی پر نظر رکھنی پڑتی ہے کہ نہ جانے کس جھاڑی کے پیچھے وہ درندہ چھپا بیٹھا ہو۔ لیکن اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں شکار ڈرکر بھاگ نہ جائے۔ اس قسم کے معرکوں میں جن میں زندگی اور موت کا سوال ہوتا ہے فتح اسی کی ہوتی ہے جو مضبوط اور ثابت قدم ہوتا ہے۔

وہ نازک اور فیصلہ‌کن گھڑی قریب آ گئی تھی۔

سازش کرنے والوں نے اپنے چھپنے کی خفیہ جگہوں کی بھول بھلیوں کے درمیان شہر کے اندر ہی کسی مقام پر بیٹھ‌کر وقت کا فیصلہ کر لیا تھا: کل رات کو!

لیکن جن پانچ بالشویکوں کو اس سازش کا علم تھا انہوں نے اس سے پہلے ہی خود حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے حکم جاری کیا کہ کل نہیں وقت ہے آج رات کو۔

اسی دن شام کو ایک زرہ بند ریل گاڑی نہایت خاموشی کے ساتھ ریلوے کے یارڈ سے باہر نکلی اور پھر اتنی ہی خاموشی کے ساتھ یارڈ کے جنگی پھاٹک بند ہو گئے۔

خفیہ اشارتی زبان میں تار مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جا رہے تھے۔ اور ان چوکس اور مستعد لوگوں نے، جن کو جمہوریہ کے تحفظ کی ذمہ‌داری سونپی گئی تھی، ان تاروں کے ذریعے بھیجی ہوئی ضروری ہدایات کے مطابق زہریلے سانپوں کی اس بانبی کو نیست و نابود کر دینے کے لئے فوری کارروائی کی۔

آکم نے ژارکی کو ٹیلیفون کیا:

«مرکزہ کی میٹنگوں کا انتظام سب ٹھیک ٹھاک ھے نا؟ اچھی بات ھے تم یہاں ایک میٹنگ کے لئے فوراً چلے آؤ، اور اپنے ساتھہ پارٹی کی ضلع کمیٹی کے سکریٹری کو بھی لیتے آنا۔ ایندھن کا مسئلہ اس سے کہیں بدتر ھے جتنا کہ ھم لوگوں نے سوچا تھا۔ تم یہاں آؤگے تب تفصیلات پر بحث کریں گے۔» آکم جلدی جلدی لیکن پراعتماد لہجے میں بول رھا تھا۔

«یہ ایندھن کا مسئلہ تو ھم لوگوں کو پاگل بناکے چھوڑے گا» ژارکی نے غراکر ٹیلیفون کے چونگے میں جواب دیا۔

لتکے دونوں سکریٹریوں کو لے کر آندھی کی رفتار سے موٹر چلاتا ھؤا ھیڈکوارٹر پہونچا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑہ کر دوسری منزل کی طرف جا رھے تھے، اسی وقت وہ سمجھہ گئے کہ انہیں وھاں ایندھن کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے لئے نہیں بلایا گیا ھے۔

آفس مینجر کی میز پر ایک مشین گن رکھی ھوئی تھی اور اسپیشل ڈیوٹی کمپنی کے توپچی اس کے قریب کھڑے ھوئے کسی کام میں مصروف تھے۔ شہر کی پارٹی اور کومسومول تنظیموں سے آئے ھوئے خاموش گارد کے سپاھیوں سے برآمدے بھرے ھوئے تھے۔ سکریٹری کے دفتر کے کشادہ دروازوں کے پیچھے پارٹی کی گبرنیا کمیٹی کے بیورو کی ایک اھم بیٹھک ختم ھونے کے قریب تھی۔

سڑک پر کھلنے والے دروازے کے اوپر والی کھڑکی میں سے ھوکر دو ٹیلیفون کے تار گذرتے تھے، جو دو فوجی ٹیلیفونوں سے جڑے ھوئے تھے۔

کمرے میں دبی آواز میں گفتگو کرنے کی بھنبھناھٹ سنائی دے رھی تھی۔ آکم، ریتا اور مخایلو وھاں موجود تھے۔ ریتا سرخ فوج کے سپاھیوں والا خود، خاکی رنگ کا ایک سایہ اور چمڑے کی جیکٹ پہنے ھوئے تھی جس کی پیٹی سے ایک بھاری سا ماؤزر

پستول لٹک رہا تھا۔ یہی پوشاک وہ پہلے بھی مورچے پر پہنا کرتی تھی، جب کہ وہ کمپنی کے سپاہیوں کو سیاسی تعلیم دینے کا کام کرتی تھی۔

«آخر ماجرا کیا ھے؟» ژارکی نے تعجب سے اس سے پوچھا۔

«وانیا یہ قواعد لوگوں کو خطرے کے خلاف چوکس رکھنے کے لئے کرائی جا رھی ھے۔ ھم یہاں سے سیدھے تمہارے علاقے میں جا رھے ھیں۔ وھاں پانچویں انفینٹری اسکول میں ایک قواعد ھونے والی ھے۔ کومسومول کے تمام اراکین اپنے اپنے مرکزہ کی میٹنگوں کے بعد وھاں پہونچ جائیں گے۔ مسئلہ وھاں اس طرح پہونچنے کا ھے کہ کسی کو یہ پتہ نہ چلنے پائے کہ کوئی خاص بات ھونے والی ھے۔»

پرانے فوجی اسکول کا میدان جس میں شاہ بلوط کے پرانے تناور درخت کھڑے تھے اور جس کے ٹھہرے ھوئے پانی کے تالاب میں کائی جمی رھتی تھی اور جس کے چوڑے چوڑے راستوں کی صفائی نہیں ھوتی تھی، خاموشی میں ڈوبا ھوا تھا۔

میدان کے بیچ میں ایک اونچی سی سفید دیوار کے پیچھے اسکول کی عمارت تھی جس میں سرخ فوج کے کمانڈروں کی تعلیم کے لئے پانچواں انفینٹری اسکول قائم کیا گیا تھا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی عمارت کی اوپر کی منزل میں اندھیرا تھا۔ باھر سے دیکھنے پر وھاں مکمل سکوت معلوم ھوتا تھا، اور ادھر سے گذرنے والا ھر شخص یہی سمجھتا کہ اسکول کی عمارت میں رھنے والے تمام لوگ سوئے ھوئے ھیں۔ لیکن پھر لوھے کے پھاٹک کیوں کھلے ھوئے تھے۔ اور پھاٹک کے قریب بہت ھی بڑے بڑے مینڈکوں کی شکل کے وہ دو تاریک سائے کیا تھے؟ ریلوے کی بستی کے ھر حصے سے آنے والے جو لوگ وھاں جمع ھوئے تھے وہ بخوبی جانتے تھے کہ ایک بار جب رات کو خطرے کے خلاف چوکس رھنے کا

اعلان کر دیا گیا تھا تو اسکول کی عمارت میں رہنے والے لوگ سوئے ہوئے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس مختصر سے اعلان کے بعد فوراً وہ لوگ کومسومول اور پارٹی کے مرکزہ کی میٹنگیں چھوڑکر یہاں چلے آئے تھے۔ وہ نہائت خاموشی کے ساتھہ ایک ایک دو دو کرکے یا حد سے حد تین تین کی ٹولیوں میں یہاں آئے تھے، اور ان میں سے ہر ایک کے پاس کمیونسٹ پارٹی یا کومسومول کی ممبری کا کارڈ تھا جس کے بغیر کوئی بھی لوہے کے پھاٹک کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

میٹنگ کرنے کا بڑا ھال تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ وھاں کافی بڑا مجمع جمع ہو گیا تھا۔ کھڑکیوں پر تمبو بنانے میں استعمال ہونے والے کرمچ کے موٹے موٹے پردے پڑے ہوئے تھے۔ جن بالشویکوں کو یہاں بلایا گیا تھا وہ ادھر ادھر کھڑے سکون کے ساتھہ گھر کی بنی ہوئی تمباکو پی رہے تھے، اور اس قواعد کے سلسلے میں برتی ہوئی احتیاطوں کے بارے میں مذاق کر رہے تھے۔ یہ کوئی بھی نہیں سمجھہ رہا تھا کہ یہ سچ مچ کے خطرے کے خلاف چوکس رہنے کی تاکید تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب کچھہ محض اسپیشل ڈیوٹی والے دستوں میں ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے کیا جا رہا تھا۔ لیکن کہنہ مشق سپاہی اسکول کے میدان میں داخل ہوتے ہی وہاں کے آثار دیکھہ‌کر فوراً سمجھہ جاتے تھے کہ یہ سچ مچ کے خطرے کے خلاف چوکس رہنے کی تاکید تھی۔ مجموعی طور پر بہت زیادہ احتیاط برتی جا رہی تھی۔ باہر طالبعلموں کی پلٹنیں صفیں باندھہ‌کر کھڑی ہو رہی تھی۔ فوجی افسر حکم بھی دبی آواز میں ھی دے رہے تھے۔ نہایت خاموشی کے ساتھہ مشین گنیں لائی جا رہی تھیں، اور عمارت کی کسی بھی کھڑکی میں سے روشنی کی ایک شعاع بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

«متیائی کیا معاملہ کچھ سنگین ہے» پاویل کورچاگن نے دوباوا سے پوچھا جو کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک لڑکی کے نزدیک بیٹھا ہؤا تھا ـ پاویل کو یاد آیا کہ اس لڑکی کو تو اس نے چند دن قبل ہی ژارکی کے گھر پر دیکھا تھا ـ

دوباوا نے خوش مزاجی سے پاویل کے کندھے کو زور سے تھپتھپایا ـ

«دم خشک ہو رہا ہے، کیوں؟ خیر کوئی بات نہیں ہم تمہیں لڑنا سکھا دیں گے ـ شاید تم دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے یا جانتے ہو؟» اس نے لڑکی کی طرف سر سے اشارہ کیا ـ «ان کا نام آنا ہے باقی نام تو مجھے نہیں معلوم ـ لیکن ان کا رتبہ میں جانتا ہوں ـ یہاں کا پروپیگنڈا اور پرچار کا محکمہ انہیں کے ذمے ہے ـ»

وہ لڑکی جس کا تعارف دوباوا نے اس طرح مذاق کے ساتھ کرایا تھا کورچاگن کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی ـ اور اس نے اپنی زلفوں کی ایک لٹ جو اس کے سر پر بندھے ہوئے شوخ ارغوانی رنگ کے رومال سے باہر نکل آئی تھی، پیچھے جھٹک دی ـ

کورچاگن کی نظریں اس کی نظروں سے لڑیں اور چند لمحوں کے لئے ایک خاموش تصادم جاری رہا ـ لمبی لمبی پلکوں کے نیچے سے اس کی چمکدار بالکل سیاہ آنکھیں گویا پاویل کی آنکھوں کو دعوت مقابلہ دے رہی تھیں ـ پاویل اپنی نظریں ہٹاکر دوباوا کو دیکھنے لگا ـ اس بات کے احساس سے کہ وہ جھینپ کر سرخ ہو رہا ہے اس کے چہرے پر خفگی کی لہر دوڑ گئی ـ

«تم دونوں میں سے کون پرچار کا کام کرتا ہے؟» اس نے زبردستی مسکراکر پوچھا ـ

اسی وقت ہال میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی - ایک کمپنی کمانڈر نے کرسی پر چڑھکر بلند آواز میں کہا:

"پہلی کمپنی کے تمام لوگ قطار باندھکر کھڑے ہو جائیں - کامریڈ جلدی کیجئے، جلدی!"

ژوخرائی گبرنیا کی ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر اور آکم کے همراہ کمرے میں داخل ہوا - وہ اسی وقت آئے تھے - ہال اب ایک سرے سے دوسرے سرے تک صف بستہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا -

گبرنیا کی ایگزیکٹو کمیٹی کا صدر وہاں مشق کے لئے رکھی ہوئی مشین گن کے چبوترے پر چڑہ گیا اور اپنا ہاتھہ اٹھاکر بولا:

"ساتھیوں آپ لوگوں کو یہاں بہت ہی سنگین اور اشد ضروری کام سے بلایا گیا ہے - میں آپ کو جو کچھہ بتانے والا ہوں وہ حفاظت کے خیال سے اب سے پہلے نہیں بتایا جا سکتا تھا - کل رات کو اس شہر میں اور یوکرین کے دوسرے شہروں میں ایک انقلاب دشمن بغاوت کرنے کی تیاریاں کی گئی ہیں - اس شہر میں وھائٹ گارڈ افسر بھرے ہوئے ہیں، اور شہر کے چاروں طرف لٹیروں کے گروہ لاکر بسا دئے گئے ہیں - سازش کرنے والوں میں سے کچھہ لوگ چوری سے ہمارے زرہ بند موٹروں کے دستے میں گھس آئے ہیں اور وہاں ڈرائیوروں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں - لیکن چیکا نے بروقت اس سازش کا پتہ لگا لیا ہے اور ہم نے پارٹی اور کومسومول کی تنظیموں کے تمام لوگوں کو مسلح کرنے کا فیصلہ کیا ہے - کمیونسٹوں کی پہلی اور دوسری بٹالینیں فوجی اسکول کے دستوں اور چیکا کے رسالوں کے ساتھہ مل‌کر کام کریں گی - فوجی اسکول کے دستوں نے تو کام شروع بھی کر دیا ہے - ساتھیوں، اب آپ لوگوں کی باری ہے - آپ کے پاس پندرہ منٹ کا وقت ہے اتنی دیر میں آپ لوگ اپنے ہتھیار لےکر قطاروں میں

کھڑے ہو جائیے۔ لڑائی کا کمان کامریڈ ژوخرائی کے ہاتھہ میں ہوگا۔ مختلف دستوں کے کمانڈر ان کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ مجھے اس بات پر زور دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں کہ حالات کس قدر سنگین ہیں۔ کل کے لئے جس بغاوت کی تیاریاں کی گئی ہیں اسے آج ہی کچل دینا ہوگا۔»

پندرہ منٹ بعد مسلح بٹالین اسکول کے میدان میں صف بستہ کھڑی تھی۔

ژوخرائی نے بےحس و حرکت کھڑے ہوئے سپاہیوں پر نظر دوڑائی۔

ان سے تین قدم آگے دو فوجی اپنی کمر پر چمڑے کی پیٹیاں کسے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بٹالین کمانڈر منیائیلو تھا جو یورال کا رہنے والا ایک دیوہیکل آدمی تھا اور پہلے لوہا ڈھالنے کے کسی کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اور اس کے برابر بٹالین کا کمیسار آکم تھا۔ بائیں طرف پہلی کمپنی کی پلٹنیں کھڑی تھیں۔ کمپنی کا کمانڈر اور سیاسی معلم ان کے دو قدم آگے کھڑے تھے۔ اور ان کے پیچھے کمیونسٹ بٹالین کے تین سو لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔

فیودور نے اشارہ کیا۔

«وقت ہو گیا۔»

تین سو آدمی ویران سڑکوں پر قدم ملاکر مارچ کرنے لگے۔

سارا شہر سو رہا تھا۔

لووفسکایا اسٹریٹ پر جو دکایا اسٹریٹ کے مقابل تھی، پہونچ کر بٹالین کے سپاہی صفیں توڑکر تتر بتر ہو گئے۔ جنگی کارروائی کی ابتدا وہ لوگ یہیں سے کرنے والے تھے۔

انتہائی خاموشی کے ساتھہ انہوں نے عمارتوں کو گھیر لیا۔ ایک دوکان کی سیڑھیوں پر ان کا ہیڈکوارٹر قائم کیا گیا۔

مرکز کی سمت سے ایک موٹر تیزی سے لووفسکایا اسٹریٹ پر آتی ہوئی دکھائی دی۔ موٹر کے سامنے والی تیز بتیاں اس کے آگے ایک روشن راستہ بناتی جا رہی تھیں۔ بٹالین کے کمان کی چوکی کے سامنے پہونچ کر موٹر دفعتاً ایک جھٹکے کے ساتھہ رک گئی۔

اس بار ہوگو لتکے اپنے باپ کو موٹر میں لایا تھا۔ کمانڈنٹ پھرتی سے موٹر سے اترا اور اس نے گردن گھماکر لیتھوانیائی زبان میں اپنے بیٹے سے دو چار مختصر سے جملے کہے۔ موٹر ایک جھٹکے کے ساتھہ چل پڑی اور پلک جھپکاتے سڑک کے ایک موڑ پر پہونچ کر غائب ہو گئی۔ لتکے طوفانی رفتار سے موٹر چلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھہ اسٹیرنگ کے پہیے کو اتنی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے گویا اسی کا ایک حصہ ہوں، اور اس کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔

ہاں آج ہی تو لتکے کی موٹر چلانے کی مہارت کام آئی تھی۔ آج تو اس بات کا بھی خطرہ نہیں تھا کہ موٹر تیز بھگانے کے جرم میں اسے دو دن کے لئے حراست میں لے لیا جائے گا۔

اور ہوگو لتکے ٹوٹے ہوئے ستارے کی رفتار سے سڑک پر موٹر بھگائے چلا جا رہا تھا۔

نوجوان لتکے نے ژوخرائی کو چشم زدن میں شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے پر پہونچا دیا۔ ژوخرائی اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے لتکے کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

«اگر آج تم نے موٹر سے کسی کو کچل نہ دیا تو کل تمہیں انعام میں ایک سونے کی گھڑی دی جائیگی۔»

ہوگو بےحد خوش تھا۔

«میں تو سمجھا تھا کہ اس موڑ پر میں نے جس طرح موٹر گھمائی تھی اس کے لئے مجھے دس دن کی قید کی سزا دی جائے گی...»

سازش کرنے والوں کے هیڈکوارٹر پر پہلا هلا کیا جا چکا تھا۔ تھوڑی هی دیر بعد اسپیشل ڈیپارٹمنٹ کے سامنے قیدی اور دستاویزات کے بنڈل پیش کئے جانے لگے۔

دکایا اسٹریٹ کے مکان نمبر ۱۱ میں زووربرٹ نام کا ایک شخص رهتا تھا۔ چیکا کے پاس جو اطلاع تھی اس کے مطابق اس نے وهائٹ گارڈوں کی سازش میں بہت اهم حصه لیا تھا۔ پودول کے علاقے میں افسروں کے جو دستے حربی کارروائیاں کرنے والے تھے ان کی فہرستیں اس کی تحویل میں تھیں۔

اسے گرفتار کرنے کے لئے کمانڈنٹ لتکے خود دکایا اسٹریٹ گئے۔ زووربرٹ کے مکان کی کھڑکیاں ایک باغ میں کھلتی تھیں۔ اس باغ کی اونچی سی دیوار کے اس پار والی عمارت میں کسی زمانے میں راهبائیں رها کرتی تھیں۔ زووربرٹ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ اس کے پڑوسیوں سے معلوم هوا که وه تو دن بھر وهاں دکھائی هی نہیں دیا تھا۔ اس کے گھر کی تلاشی لی گئی، اور وهاں سے ناموں اور پتوں کی فہرستیں اور ساتھه هی دستی بموں سے بھرا هوا ایک بکس برآمد هوا۔ لتکے نے حکم دیا که کچھه لوگ زووربرٹ کی گھات میں ادھر ادھر چھپ جائیں، اور وه خود کاغذات کا جائزه لینے کے لئے کمرے میں کچھه دیر کے لئے رک گیا۔

فوجی اسکول کے اس نوجوان کو جسے نیچے باغ میں سنتری کی ڈیوٹی پر تعینات کیا گیا تھا، باغ کے اس کونے سے وه کھڑکی صاف نظر آتی تھی جس کے پیچھے کمرے میں روشنی هو رهی تھی۔ اندھیرے میں وهاں اکیلے کھڑے رهنا اسے کچھه پسند نہیں آیا۔ اسے تھوڑا سا ڈر بھی لگ رها تھا۔ اسے هدایت دی گئی تھی که وه دیوار پر نظر رکھے۔ کمره کی سکون بخش روشنی اسے اپنی جگه سے بہت دور معلوم هو رهی تھی۔ اور اس سے بھی بری بات

یہ تھی کہ چاند بار بار بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ رات کے وقت جھاڑیوں کا ماحول کچھ عجیب منحوس سا ہو جاتا ہے۔ اس نوجوان سپاہی نے اپنے چاروں طرف اندھیرے میں سنگین چلانی شروع کی، لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

«آخر انہوں نے مجھے یہاں کیوں تعینات کیا؟ ادھر دیوار پر چڑھ کر تو کوئی آ نہیں سکتا ہے۔ اتنی اونچی دیوار پر کون چڑھےگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ذرا چل کر کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھنا چاہئے۔» دیوار پر ایک سرسری سی نظر اور ڈال کر وہ اس سیلن سے بھرے ہوئے کونے سے باہر نکل آیا جہاں کائی کی بو بسی ہوئی تھی۔ جب وہ کھڑکی کے قریب پہونچا اسی وقت لتکے نے میز پر سے کاغذ سمیٹ کر اٹھائے۔ اتنے میں دیوار کے اوپر ایک سایہ نظر آیا۔ وہاں سے کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا وہ سنتری اور کمرے کے اندروالا شخص دونوں صاف نظر آتے تھے۔ وہ سایہ بلی کی طرح پھرتی سے ایک پیڑ پر چڑھ گیا اور وہاں سے نیچے کودا۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں وہ دھیرے دھیرے اپنے شکار کی طرف بڑھا۔ ایک ہی وار میں وہ سنتری زمین پر لوٹنے لگا، اور بحری سپاہیوں والا ایک خنجر اس کی گردن میں پورا پیوست ہو گیا۔

باغ میں گولی چلنے کی آواز گونج اٹھی اور جو لوگ اس عمارت کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے ان میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ان میں سے چھ آدمی مکان کی طرف دوڑے رات کی خاموشی میں ان کے قدموں کی آواز خوب گونج رہی تھی۔

لتکے کا جسم عجیب انداز سے سمٹا ہوا میز پر جھکا تھا، اور اس کے سر کے زخم سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر چور چور ہو گیا تھا۔ لیکن قاتل کو دستاویزات حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

دارالراهبات کی دیوار کی سمت میں کئی اور گولیاں چلنے کی آواز آئی - قاتل دیوار پھاندکر سڑک کی طرف جا پہونچا تھا اور لکیانوف کے کھیتوں میں سے ہوکر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا - بھاگتے بھاگتے وہ گولی چلاتا جا رہا تھا - لیکن ایک گولی نے اس کا کام تمام کر دیا اور وہ آگے نہ بڑھ سکا -

تلاشیاں رات بھر جاری رہیں - سینکڑوں ایسے لوگ جن کے نام مکانات کا انتظام کرنے والی کمیٹی کے رجسٹروں میں درج نہیں تھے اور جن کے پاس سے مشتبہ قسم کے دستاویز اور ہتھیار برآمد ہوئے تھے چیکا کے حوالے کر دئے گئے - وہاں ان مشتبہ لوگوں کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لئے ایک خاص محکمہ کام کر رہا تھا -

کہیں کہیں سازش کرنے والوں نے مدافعت کرنے کی بھی کوشش کی - ژلیانسکایا اسٹریٹ کے ایک مکان کی تلاشی کے دوران میں آنتون لیبی‌دیف کو کسی نے بالکل قریب سے گولی مار دی -

اس رات سولومینکا بٹالین کے پانچ آدمی مارے گئے، اور چیکا کے لوگوں میں سے یان لتکے کی جان گئی جو ایک پرانا معتبر بالشویک اور جمہوریہ کا وفادار محافظ تھا -

لیکن وھائٹ گارڈوں کی بغاوت شروع ہونے سے پہلے ہی کچل دی گئی -

اسی رات فادر واسیلی کو اس کی بیٹیوں اور باقی پورے گروہ کے ساتھہ شپیتووکا میں گرفتار کر لیا گیا -

کشاکش کچھہ کم ہوئی -

لیکن جلد ہی شہر کے سامنے ایک نئے دشمن کا خطرہ آ کھڑا ہوا - یہ دشمن تھا ریلوں کی نقل و حرکت کا ٹھپ ہو جانا - اور اس کا مطلب تھا کہ آنے والی سردیوں میں لوگوں کو فاقہ‌کشی اور ٹھنڈ کی مصیبت جھیلنا پڑے گی -

اب ہر بات کا انحصار غلے اور ایندھن پر تھا -

دوسرا باب

فیودور نے اپنا چھوٹی نلی والا پائپ منهه سے نکالا، اور کچهه سوچتے هوئے بڑی احتیاط کے ساتهه اس کی راکهه کریدنے لگا۔ پائپ بجهه گیا تها۔

گبرنیا کی ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر کی کرسی اور چهت کے درمیان درجنوں سگریٹوں کے نیلگوں دهوئیں کے گهنے بادل منڈلا رهے تهے۔ کمرے کے کونوں سے میز کے گرد بیٹهے هوئے لوگوں کے چہرے دهوئیں کے ان بادلوں کی وجه سے بہت دهندلے نظر آ رهے تهے۔

توکاریف جو صدر کے برابر بیٹها تها آگے جهکا اور جهنجهلاکر اپنی چهدری ڈاڑهی نوچنے لگا۔ بیچ بیچ میں وه کنکهیوں سے ایک پسته قد، گنجے شخص کو دیکهتا جاتا تها جو اپنی بلند آواز میں مسلسل ایسے فقرے تقریر کی لڑی میں پروتا جا رها تها جو انڈے کے خول کی طرح کهوکهلے اور بے معنی تهے۔

آکم نے اس بوڑهے مزدور کی نظروں کو دیکها، اور اسے اس لڑاکو مرغے کی یاد آ گئی جسے اس نے بچپن میں اپنے گاؤں میں دیکها تها۔ دشمن پر جهپٹنے سے پہلے اس مرغے کی آنکهوں میں بهی بالکل وهی انداز هوتا تها۔

پارٹی کی گبرنیا کمیٹی کی بیٹهک گهنٹے بهر سے زیاده سے چل رهی تهی۔ وه گنجا آدمی ریلوے کی ایندهن کمیٹی کا صدر تها۔

سامنے رکهے هوئے کاغذوں کے ڈهیر کو اپنی پهرتیلی انگلیوں سے الٹتے هوئے وه گنجا آدمی بڑی تیزی سے بولتا رها:

«... ان حالات میں گبرنیا کمیٹی اور ریلوے کے منتظمین کے فیصلے کو عمل میں لانا قطعی ناممکن هے۔ میں ایک بار پهر کہتا هوں که ایک ماه بعد بهی هم چار سو مکعب میٹر سے زیاده ایندهن فراهم نہیں کر سکتے۔ جہاں تک ایک لاکهه اسی هزار مکعب میٹر

کی ضرورت کا سوال ہے تو وہ تو خیر بالکل ہی ...» مقرر صحیح لفظ کی تلاش میں تھوڑی دیر کے لئے اٹک کر پھر بولا۔ «جسے کہتے ہیں... ہوائی قلعے بنانا ہے!» یہ کہکر اس نے اپنی تقریر ختم کر دی اور اپنا چھوٹا سا منھہ اس طرح بھینچ لیا جیسے اس کے ساتھہ کوئی بہت بڑی زیادتی کی گئی ہو۔

اس کے بعد بڑی دیر تک خاموشی رہی۔

فیودور نے پائپ کو اپنے ناخن سے کھٹ‌کھٹاکر راکھہ جھاڑ دی۔ آخرکار توکاریف نے اس سکوت کو توڑا:

«فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کچھہ حاصل نہیں» اس نے اپنی گہری آواز میں کہنا شروع کیا۔ «ریلوے کی ایندھن کمیٹی کے پاس نہ تو اس وقت ایندھن ہے اور نہ کبھی تھا۔ اور آئندہ بھی ہونے کی کوئی امید نہیں ہے... ٹھیک ہے نا؟»

اس گنجے آدمی نے اپنا کندھا جھٹک دیا۔

«کامریڈ معاف کیجئےگا۔ ہم لوگوں نے ایندھن جمع تو کیا تھا لیکن اسے سڑک کے ذریعے لانے لیجانے کی دقت کی وجہ سے ...» اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی چیز نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس نے ایک چارخانےدار رومال نکال‌کر اپنی چمکتی ہوئی چندیا سے پسینہ پونچھا اور کئی بار رومال کو جیب میں واپس رکھنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد اس نے بوکھلاکر رومال اپنے چمڑے کے تھیلے کے نیچے گھسا دیا۔

«تم نے لکڑی یہاں پہونچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ سازش میں جو خاص خاص ماہرین شامل تھے ان کی گرفتاری کو تو اب کافی دن ہو چکے ہیں» دینےکو نے ایک کونے سے آواز اٹھائی۔

وہ گنجا آدمی اس کی طرف مخاطب ہوکر بولا:

«میں نے تین بار ریلوے کے حاکموں کو لکھا کہ جب تک آمدورفت کی معقول سہولتیں فراہم نہیں کی جائیں‌گی اس وقت تک ہمارے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ ...»

توکاریف نے اسے بیچ ہی میں روک دیا۔

«یہ سب تو ہم سن چکے ہیں» اس نے اس گنجے آدمی پر مخاصمانہ نظر ڈالتے ہوئے روکھےپن سے کہا۔ «کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم سب کے سب بالکل بے وقوف ہیں؟»

یہ الفاظ سن‌کر اس گنجے آدمی کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔

«انقلاب دشمنوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی ذمےداری مجھ پر تو عائد نہیں ہوتی» اس نے دبی آواز میں جواب دیا۔

«لیکن تمہیں یہ معلوم تھا کہ نہیں کہ لکڑی ریلوے لائن سے بہت دور کاٹ‌کر گرائی جا رہی ہے؟» آکم نے پوچھا۔

«میں نے اس کی بابت سنا ضرور تھا لیکن میں اپنے حاکموں کی توجہ ایک ایسی بے قاعدگی کی طرف مبذول نہیں کرا سکتا تھا جو میرے حلقۂ اختیار سے باہر ہو رہی تھی۔»

«تم نے اس کام پر کتنے آدمی لگا رکھے ہیں؟» ٹریڈ یونین کونسل کے چیرمین نے سوال کیا۔

«تقریباً دو سو» اس گنجے آدمی نے جواب دیا۔

«اس حساب سے تو گویا یہ حرام خور سال بھر میں فی کس صرف ایک مکعب میٹر لکڑی مہیا کر پائیں گے!» توکاریف نے زیرلب کہا۔

«ریلوے کی ایندھن کمیٹی کے لئے خاص راشن منظور کیا گیا ہے۔ تمہیں مزدوروں کا پیٹ کاٹ‌کر راشن دیا جا رہا ہے۔ اور اس کا یہ نتیجہ ہے؟ اور وہ دو گاڑی بھر آٹا کیا ہوا جو تمہیں مزدوروں کے لئے دیا گیا تھا؟» ٹریڈ یونین کا صدر مسلسل سوال کرتا رہا۔

اس گنجے آدمی پر چاروں طرف سے اسی قسم کے کھرے کھرے سوالات کی بوچھار ہونے لگی۔ وہ ان سوالات کے جوابات اس طرح

پریشان ہوکر دینے لگا جیسے کوئی جان کھانے والے قرض خواہوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔

سیدھے سیدھے جوابات سے بچنے کے لئے وہ طرح طرح کے حیلے بہانے کر رہا تھا، اور جھکائی دےکر نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن گھبراہٹ کے مارے اس کی آنکھیں بڑی تیزی کے ساتھ ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ آنے والے خطرے کو محسوس کرنے لگا تھا، اور اس کی بزدل روح کو صرف ایک چیز کی آرزو تھی ــــ کہ وہ کسی طرح یہاں سے جلد سے جلد نکل بھاگے، اور جاکر اپنے آرام دہ گوشۂ عافیت میں پناہ لے جہاں لذیذ کھانا اس کا انتظار کر رہا ہوگا اور جہاں اس کی بیوی ہوگی جو ابھی تک کافی جوان تھی اور جو شاید آرام سے بیٹھی ہوئی پال دی کاک کا ناول پڑھ‌کر اپنا وقت گذار رہی ہوگی۔

اس گنجے آدمی کے جوابات کو بڑے غور سے سن‌کر فیودور نے اپنی نوٹ بک میں جلدی جلدی کچھ لکھ ڈالا۔ «میرے خیال میں اس شخص کے بارے میں اچھی طرح تحقیقات کی جانی چاہئے۔ یہ محض اس کی نا اہلیت کا سوال نہیں ہے۔ مسئلہ اس سے زیادہ سنگین ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ باتیں جانتا ہوں ... بحث ختم کر دو اور اسے یہاں سے جانے دو تاکہ ہم لوگ کام کی باتیں کر سکیں۔»

گبرنیا کی ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر نے رقعہ پڑھا اور فیودور کی طرف دیکھ‌کر سر ہلایا۔

ژوخرائی کسی کو ٹیلیفون کرنے کے لئے اٹھ‌کر باہر برآمدے میں چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو صدر ایک تجویز پڑھ رہے تھے:

«... ریلوے کی ایندھن کمیٹی کے منتظمین کو جان بوجھ کر کام بگاڑنے اور رکاوٹیں ڈالنے کے جرم میں 'برخاست کر دیا جائے

اور لکڑی مہیا کرنے کے مسئلے کو ایک تحقیقاتی کمیٹی کے حوالے کر دیا جائے ۔»

اس گنجے آدمی کو اس سے بھی زیادہ خطرناک انجام کا اندیشہ تھا ۔ یہ تو صحیح تھا کہ جان بوجھ کر کام بگاڑنے اور رکاوٹیں ڈالنے کے جرم میں ملازمت سے علیحدہ کر دئے جانے پر اس کے عام طور پر معتبر ہونے یا نہ ہونے کا سوال بھی لازمی طور پر اٹھے گا ۔ لیکن وہ کوئی ایسی سنگین بات نہیں تھی ۔ اور جہاں تک بویار کا والے معاملے کا سوال تھا تو اسے اس سلسلے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی کیونکہ بہرحال وہ واقعہ اس کے حلقے سے باہر کا تھا ۔ «حالانکہ یہ ماننا پڑے گا کہ بس بال بال بچ گئے» اس نے اپنے دل میں کہا ۔ «میں تو سمجھا تھا کہ شاید ان لوگوں کو سچ مچ کسی سنگین معاملے کا پتہ چل گیا ہے ...»

اب چونکہ اسے تقریباً پوری طرح اطمینان ہو گیا تھا اس لئے اس نے اپنے کاغذات تھیلے میں رکھتے ہوئے کہا:

«مجھے اپنے کام کے بارے میں خاص علم اور تجربہ ہونے کی بناء پر ہی اس عہدے پر تعینات کیا گیا تھا ۔ لیکن چونکہ میں پارٹی کا آدمی نہیں ہوں اس لئے آپ لوگوں کو مجھ پر اعتبار نہ کرنے کا پورا حق ہے ۔ لیکن میرا ضمیر بالکل صاف ہے ۔ مجھ سے جس بات کی توقع کی گئی تھی اگر اسے پورا کرنے میں میں ناکام رہا ہوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کام کو پورا کرنا ناممکن تھا ۔»

اس پر کسی نے کچھ بھی نہ کہا ۔ وہ گنجا آدمی باہر نکل کر تیزی سے سیڑھیاں پار کرتا ہوا نیچے اترا اور سڑک پر نکلنے کا دروازہ کھول کر اس نے گلو خلاصی پر اطمینان سانس لیا ۔

«شہری تمہارا نام؟» فوجی کوٹ میں ملبوس ایک شخص نے اس سے سوال کیا ۔

ڈوبتے ہوئے دل سے اس گنجے نے ہکلا کر کہا: «چر... ونسکی...»
اس باہر کے آدمی کے چلے جانے کے بعد اوپر وہ تیرہ آدمی کانفرنس کی اس بڑی سی میز کے گرد سر جوڑ کر کسی مسئلے پر غور کرنے لگے۔

«یہ دیکھو» ژوخرائی نے میز پر کھلے ہوئے نقشے پر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ «یہ ہے بویارکا کا اسٹیشن۔ یہاں سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر لکڑی کے لئے پیڑ کاٹ کر گرائے گئے ہیں۔ یہاں دو لاکھ دس ہزار مکعب میٹر لکڑی ڈھیر ہے۔ مزدوروں کی ایک پوری فوج نے آٹھ ماہ تک سخت محنت کر کے اتنی لکڑی جمع کی تھی۔ اور اس کا نتیجہ؟ غداری! ریلوں کے لئے اور شہر کی ضروریات کے لئے ایندھن نہیں ہے۔ اگر پانچ ہزار گاڑیاں کم سے کم مہینے بھر تک متواتر کام کریں تب کہیں وہ اتنی لکڑی ڈھو کر چار میل دور اسٹیشن تک پہونچا سکتی ہیں۔ اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ دن میں دو پھیرے کریں۔ سب سے قریب کا گاؤں بھی وہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے اور اس پر ستم یہ ہے کہ آرلک اور اس کے گروہ کے لٹیرے ان علاقوں میں لوٹ مار کر رہے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ دیکھئے منصوبہ یہ بنایا گیا تھا کہ لکڑی کی کٹائی یہاں پر شروع کی جائے گی، اور وہ لوگ پیڑ گراتے ہوئے رفتہ رفتہ اسٹیشن کی طرف بڑھتے آئیں گے۔ ان بدمعاشوں نے کیا یہ کہ وہ پیڑ کاٹتے ہوئے جنگل کے اور بھی اندر کی طرف گھستے گئے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی بھی طرح ہم لکڑی ڈھو کر ریلوے لائن تک نہ لانے پائیں۔ اور ان کا اندازہ کچھ غلط نہیں تھا۔ ہم لوگوں کو اس کام کے لئے سو گاڑیاں بھی نہیں مل سکیں۔ انہوں نے ہمارے اوپر یہ بہت ہی ذلیل حملہ کیا ہے۔ بغاوت بھی اس سے زیادہ سنگین نہیں تھی۔»

نقشے کے باریک کاغذ پر ژوخرائی کا مکا زور سے پڑا۔
اب تو اس مسئلے کے وہ زیادہ بھیانک پہلو بھی، جن کا ژوخرائی نے ذکر نہیں کیا تھا، ان تیرھوں آدمیوں میں سے ہر ایک کی سمجھ میں صاف صاف آنے لگے۔ سردیاں شروع ہونے والی تھیں۔ انہیں ہسپتال، اسکول، دفتر اور لاکھوں انسان سردی کے برفانی شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ اس تصور سے کانپ گئے کہ لوگ اسٹیشنوں پر کھچا کھچ بھرے ہوں گے اور انہیں لے جانے کے لئے ہفتے میں صرف ایک گاڑی چل سکے گی۔
جس وقت ہر آدمی صورت حال پر غور کر رہا تھا کمرے میں گہری اور مکمل خاموشی طاری تھی۔
آخرکار فیودور نے اپنی بھنچی ہوئی مٹھی کھولی۔
«ساتھیوں، اس دشواری کو حل کرنے کا ایک راستہ ہے» اس نے کہا۔ «ہم لوگوں کو تین ماہ کے اندر اندر اسٹیشن سے لکڑی والے علاقے تک تقریباً پانچ میل لمبی چھوٹی لائن کی ریل تعمیر کر لینی چاہئے۔ اس کا پہلا حصہ لکڑی کے ذخیرے کے اسٹیشن سے قریب والے سرے تک جائے گا۔ اور یہ حصہ چھ ہفتوں میں تیار ہو جانا چاہئے۔ میں پچھلے ایک ہفتے سے اس تجویز پر غور کر رہا ہوں۔ ہمیں اس کام کے لئے» ژوخرائی کی آواز اس کے خشک ہوتے ہوئے گلے میں پھنسنے لگی «ساڑھے تین سو مزدوروں اور دو انجنیروں کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے پاس ریل کی پٹڑیاں کافی ہیں، اور پشچا وادتسا کے اسٹیشن پر ریل کے سات انجن بھی ہیں۔ کومسومولوں نے انہیں مال گوداموں سے ڈھونڈکر نکالا ہے۔ جنگ سے پہلے پشچاوادتسا سے شہر تک ایک چھوٹی لائن بنانے کی تجویز تھی۔ دقت یہ ہے کہ بویارکا میں مزدوروں کے رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ تمام جگہ اجاڑ اور ویران پڑی ہے۔ ہمیں لوگوں کو پندرہ پندرہ دن کے لئے چھوٹی ٹولیوں

میں بھیجنا پڑے گا ۔ اس سے زیادہ عرصے تک وہ وہاں کی مصیبتیں برداشت نہیں کر سکیں گے ۔ کیوں آکم تمہارا کیا خیال ہے ۔ کیا ہم کومسومولوں کو وہاں بھیجدیں؟»

اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس نے اپنی بات جاری رکھی:

«کومسومول تنظیمیں حتی‌الامکان اپنے زیادہ سے زیادہ ممبر فوراً وہاں کے لئے روانہ کر دیں ۔ ابتدا کرنے کے لئے تو سولومینکا کی تنظیم ہئی ہے ۔ پھر کچھہ شہر سے بھی مل ہی جائیں گے ۔ کام مشکل ضرور ہے ـــ دراصل بہت ہی مشکل ہے، لیکن اگر نوجوانوں کو یہ بتا دیا جائے کہ اس کام کے پورا نہ ہونے سے کیا کیا خطرات پیدا ہو جائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس کام کو ضرور پورا کر دیں گے ۔»

ریلوے کے اعلی حاکم نے شبہ کے انداز میں اپنا سر ہلایا ۔

«میرے خیال میں تو یہ سب بےکار ہے ۔ ان حالات میں جنگل کے علاقے میں تقریباً پانچ میل لمبی ریل کی لائن تعمیر کرنا جب کہ خزان کی بارش شروع ہونے والی ہے اور تھوڑے ہی دن بعد برف پڑنے لگے گی ...» اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا ۔

لیکن ژوخرائی نے اس کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی:

«آندری واسیلیوچ تمہیں ایندھن کے مسئلے کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے تھی ۔ اس لائن کی تعمیر قطعی ضروری ہے اور ہم اسے پورا کرکے ہی دم لیں گے ۔ ہم ہاتھہ پر ہاتھہ دھرے سردی سے ٹھٹھرکر مرجانے کو تیار نہیں ہیں ۔ کیا میں غلط کہتا ہوں؟»

اوزاروں کے آخری بکس ریل گاڑی پر لاد دئے گئے ۔ گاڑی چلانے والے اپنی اپنی جگہوں پر پہونچ گئے ۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی ۔ پانی کی شفاف بلوری بوندیں ریتا کی چمکتی ہوئی چمڑے کی جیکٹ پر ڈھلکنے لگیں ۔

ریتا نے بڑے تپاک سے توکاریف سے ھاتھہ ملایا ۔ «ھم سب کی دلی آرزو ھے کہ آپ کو کامیابی حاصل ھو» اس نے نرمی سے کہا ۔

اس بوڑھے نے اپنی گھنی سفید بھنوؤں کے نیچے سے بڑی شفقت کے ساتھہ اسے دیکھا ۔

«سچ مچ ان لوگوں نے ھمیں بہت مصیبت میں پھنسا دیا ھے ۔ خدا غارت کرے انہیں» اس نے اپنے ھی خیالات کے جواب میں غرا کر کہا ۔ «تم لوگ یہاں ذرا معاملات پر کڑی نظر رکھنا، تاکہ اگر کوئی دشواری پیش آئے تو فوراً حسب ضرورت کچھہ دباؤ ڈالا جا سکے ۔ یہاں جو سب کے سب نکمے جمع ھیں یہ تو دفتری کارروائی کے گورکھہ دھندے میں پھنسائے بغیر کوئی کام کر ھی نہیں سکتے ۔ اچھا بیٹی ۔ تو میں اب چلتا ھوں ۔ گاڑی چھٹنے والی ھے ۔»

بوڑھے نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کر لئے ۔ آخری وقت جب کہ گاڑی بالکل چھٹنے والی تھی ریتا نے یونہی لگے ھاتھوں اس سے پوچھا:

«کورچاگن بھی آپ لوگوں کے ساتھہ جا رھا ھے نا؟ میں نے اسے باقی لڑکوں کے ساتھہ کہیں دیکھا نہیں ۔»

«نہیں وہ اور ریلوے لائن کی تعمیر کا سپرنٹنڈنٹ تو کل ھی ٹرالی سے وھاں چلے گئے، تاکہ ھم لوگوں کے پہونچنے سے پہلے کچھہ انتظام کر رکھیں ۔»

اسی وقت ژارکی، دوباوا اور آنا بورھارٹ تیزی سے پلیٹ‌فارم پار کرکے ان کی طرف آتے ھوئے دکھائی دیئے ۔ آنا اپنی جیکٹ بڑی لاپروائی سے کندھے پر ڈالے ھوئے تھی اور اس کی نازک انگلیوں میں ایک سگریٹ دبی ھوئی تھی ۔

ان لوگوں کے وھاں پہونچنے سے پہلے ریتا کو ایک اور سوال پوچھنے کا موقع مل گیا :

«آپ کے ساتھہ کورچاگن کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟»
بوڑھے نے اسے حیرت سے دیکھا ۔
«کیسی پڑھائی؟ وہ لڑکا تو تمہاری نگرانی میں ہے نا؟ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بہت سی باتیں بتائی ہیں ۔ تمہاری بڑی تعریف کرتا ہے ۔»
ریتا کو یقین نہیں آیا ۔
«کامریڈ توکاریف کیا آپ کو پورا یقین ہے؟ مجھہ سے پڑھنے کے بعد چیزوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے کیا وہ آپ کے پاس نہیں جاتا تھا؟»
بوڑھا قہقہہ مارکر ہنس پڑا ۔
«میرے پاس؟ ارے میں نے تو کبھی اس کا سایہ بھی نہیں دیکھا ۔»
انجن نے زور سے سیٹی دی ۔ کلاویچک نے ایک ڈبے سے چلاکر کہا:
«ارے کامریڈ استینووچ ہمارے ڈیڈی کو چھوڑ دو! ان کے بغیر ہم کیا کریں گے؟»
وہ چیک آدمی اس کے بعد بھی کچھہ کہنے والا تھا لیکن وہاں تین نوواردوں کو دیکھہ کر وہ رک گیا ۔ ایک لمحہ کے لئے وہ آنا کی پریشان نظروں کو دیکھتا رہا، لیکن جب رخصت ہونے سے پہلے آنا نے دوباوا کی طرف مسکراکر دیکھا تو اس کے کلیجے میں ایک تیر سا لگا، اور اس نے فوراً کھڑکی کی طرف سے اپنا منھہ پھیر لیا ۔

خزاں کی بارش کے چھینٹے منھہ پر طمانچوں کی طرح لگ رہے تھے ۔ سرمئی رنگ کے بارش سے بوجھل بادل زمین سے بہت ہی کم اونچائی پر منڈلا رہے تھے ۔ خزاں کو شروع ہوئے کافی

عرصہ ہو چکا تھا۔ تمام درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے اور وہ بالکل بے برگ و بار کھڑے تھے۔ ہارن بیم کے پرانے درخت بہت اداس نظر آ رہے تھے اور ان کی جھریوں دار چھال پر کتھئی رنگ کی کائی جم گئی تھی۔ بے رحم خزاں نے ان سے ان کے شاندار پیراہن چھین لئے تھے اور وہ بالکل برہنہ اور عبرتناک حالت میں کھڑے تھے۔

جنگل کے بیچ میں اسٹیشن کی چھوٹی سی عمارت تنہا سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ پتھر کے فرش والے پلیٹ‌فارم سے، جہاں مال گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں، جنگل کے اندر تک تازہ کھدی ہوئی زمین کی ایک پتلی پٹی چلی گئی تھی۔ اس پٹی کے اردگرد لوگ چیونٹیوں کی طرح دل باندھے کام میں جٹے ہوئے تھے۔

قدموں کے نیچے پھسلنی کیچڑ انتہائی ناخوش‌گوار طریقے سے بھچ بھچ کرتی تھی۔ پشتہ کے قریب، جہاں لوگ کھدائی میں بڑی سرگرمی کے ساتھ مصروف تھے، پتھر پر بیرموں کے کھڑکنے اور پھاوڑوں کے ٹکرانے کی کرخت آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

پانی اس طرح برس رہا تھا گویا کسی باریک چھلنی میں سے ہوکر آ رہا ہو۔ اور پانی کی سرد بوندیں کام کرنے والوں کے کپڑوں کو پار کرکے اندر تک پہونچ جاتی تھی۔ بارش ان لوگوں کی ساری کی کرائی محنت پر پانی پھیر دینے کی دھمکی دے رہی تھی، کیوں‌کہ چکنی مٹی گارے کی شکل میں بہہ بہہ کر پشتہ سے نیچے کی طرف آ رہی تھی۔

سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور اور گیلے سرد کپڑے پہنے ہوئے وہ لوگ اندھیرا ہونے کے بہت دیر بعد تک بھی کام کرتے رہتے تھے۔

اور جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے تازی کھدی ہوئی زمین کی یہ پٹی جنگل کے اندر کی طرف اور آگے بڑھتی جاتی تھی۔

اسٹیشن سے کچھہ ہی فاصلے پر ایک ہیبت‌ناک کھنڈر نظر

آ رہا تھا جہاں کسی زمانے میں پکی عمارت رہی ہو گی۔ اس مکان کی ہر وہ چیز جو اٹھاکر لے جائی جا سکتی تھی یا الگ کی جا سکتی تھی یا بارود سے اڑاکر نکالی جا سکتی تھی بہت عرصے پہلے ھی لٹیروں کی نذر ہو چکی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کی جگہ پر اب صرف بڑے بڑے شگاف تھے۔ جس جگہ پر کسی زمانے میں آتش دانوں کے کواڑ تھے وھاں اب سیاہ درزیں نظر آ رہی تھیں۔ جابجا گری ہوئی چھت کے سوراخوں میں سے کڑیاں ایسی معصوم نظر آتی تھیں گویا جسم کے پنجر کی پسلیاں ھوں۔

صرف چار بڑے کمروں کا سمینٹ کا فرش ثابت اور سالم تھا۔ رات کے وقت چار سو انسان کیچڑ میں لت پت گیلے کپڑے پہنے اسی فرش پر سو جاتے تھے۔ دروازے پر جس وقت وہ اپنے کپڑوں کو نچوڑتے تھے تو ان سے مٹیالے پانی کی دھار بہہ نکلتی تھی۔ وہ لوگ بارش کو اور اس دلدلی مٹی کو جی بھرکر کوستے تھے۔ سمینٹ کے فرش پر پیال کی ایک پتلی سی تہہ بچھا دی گئی تھی۔ یہ لوگ اس پر گرمی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے سٹ کر سیدھی سیدھی قطاروں میں لیٹ جاتے تھے۔ ان کے کپڑوں سے ابخرات اٹھتے تھے لیکن وہ سوکھہ نہیں پاتے تھے۔ کھڑکیوں پر کیلوں سے ٹاٹ کے جو پردے جڑ دئے گئے تھے ان سے رس رس کر بارش کا پانی اندر آتا تھا اور بہہ کر فرش پر پہونچ جاتا تھا۔ ٹین کی چھتوں کا جو حصہ بچ گیا تھا اُس پر بارش کا پانی گرنے سے تاشہ بجنے کی سی آواز آتی تھی، اور دروازوں کی بڑی بڑی درزوں میں سے ھوا سائیں سائیں کرتی ہوئی اندر داخل ھوتی تھی۔

صبح کے وقت تمام لوگ اس شکستہ بیرک میں جو باورچی خانے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی چائے پی کر اپنے کام پر چلے جاتے تھے۔ کھانے کے لئے انہیں روز وھی ابلی ہوئی دال ملتی

تھی اور اس کے ساتھ فی کس روز تین پاؤ روٹی کا راشن بندھا ہوا تھا ۔ یہ روٹیاں بالکل سنگ اسود کی طرح سیاہ ہوتی تھیں ۔ ہر روز یہی کھانا کھاتے کھاتے وہ اکتا گئے تھے ۔

شہر سے اس کے علاوہ اور کچھہ فراہم نہیں کیا جا سکتا تھا ۔

والیریان نکودیموو‌چ پاتوشکن ایک لمبا سا دبلا پتلا بوڑھا آدمی تھا جس کے منھہ کے دونوں طرف دو گہری گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں — وہ ریلوے لائن کی تعمیر کی نگرانی کے لئے سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا تھا ۔ وہ اور واکولنکو نام کا ٹیکنیشین جو ایک گٹھے ہوئے جسم، موٹے نقشے اور موٹی سی ناک والا آدمی تھا، اسٹیشن ماسٹر کے گھر پر رہتے تھے ۔

توکاریف ریلوے چیکا کے مقامی حولدار کے ساتھہ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا ۔ حولدار ایک منحنی سا متلون مزاج شخص تھا ۔ اس کا نام خولیاوا تھا ۔

وھاں کام کرنے والے لوگ بڑے صبر اور تحمل کے ساتھہ مصیبتیں برداشت کر رہے تھے ۔ اور ریلوے لائن کا پشتہ روز بروز جنگل میں اندر کی طرف آگے بڑھتا جا رہا تھا ۔

اس سے تو انکار نہیں کہ کچھہ لوگ کام چھوڑکر بھاگ بھی گئے تھے ۔ شروع میں نو آدمی بھاگے پھر چند دنوں بعد پانچ اور ۔

کام شروع ہونے کے ھفتہ بھر بعد پہلا بڑا سانحہ پیش آیا ۔ اس دن رات کی گاڑی سے روٹیوں کی رسد نہیں پہونچی تھی ۔

دوباوا نے توکاریف کو جگاکر اس سانحے کی اطلاع دی ۔ پارٹی ممبروں کی ٹکڑی کے سکریٹری نے بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنی گھنے بالوں والی ٹانگیں جھلائیں اور بغل کو زور زور سے کھجانے لگا ۔

«تماشہ شروع ہو رہا ھے» اس نے غراکر کہا اور جلدی جلدی کپڑے پہننے لگا ۔

اتنے میں خولیاوا اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر پھدکتا ہوا اندر داخل ہوا۔

«ذرا لپک کر چلے جاؤ اور اسپیشل ڈیپارٹمنٹ سے ٹیلیفون ملاؤ» توکاریف نے اسے ہدایت دی اور پھر دوباوا سے مخاطب ہوکر کہا۔ «اور دیکھو خبردار کسی کو روٹیوں کے بارے میں ایک حرف بھی معلوم نہ ہونے پائے۔»

ریلوے کے ٹیلیفون آپریٹروں سے پورے آدھے گھنٹے تک جھگڑا کرنے کے بعد خولیاوا جو کسی سے دبنے والا آدمی نہیں تھا، آخرکار ژوخرائی سے ٹیلیفون ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ ژوخرائی اسپیشل ڈیپارٹمنٹ کے سب سے بڑے افسر کا نائب تھا۔ تمام وقت توکاریف خولیاوا کے قریب کھڑا بےقراری سے پہلو بدل رہا تھا۔

«کیا کہا؟ روٹی نہیں پہونچی؟ میں ابھی پتہ لگاتا ہوں۔ یہ گڑبڑ کس نے کی ہے» ٹیلیفون پر آتی ہوئی ژوخرائی کی آواز میں ایک معنی خیز کھنک تھی۔

«لیکن ہم یہاں کام کرنےوالوں کو کل کھانے کے لئے کیا دیں گے؟» توکاریف نے غصہ ہوکر زور سے ٹیلیفون میں کہا۔

اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی رہی۔ ظاہر تھا کہ ژوخرائی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔

«تمہیں روٹی آج رات کو مل جائےگی» اس نے آخرکار کہا۔ «میں لتکے کے ساتھ موٹر پر بھجوا دوں‌گا۔ وہ راستہ جانتا ہے۔ صبح تک روٹیاں تمہارے پاس پہونچ جائیں گی۔»

علی الصبح روٹیوں کے تھیلوں سے لدی کیچڑ میں بھری ہوئی ایک موٹر اسٹیشن پر آکر رکی۔ لتکے بہت تھکا ہؤا موٹر سے اترا۔ رات بھر بغیر پلک جھپکائے موٹر چلاتے رہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔

ریلوے لائن کی تعمیر کے کام میں روز بروز نئی نئی دشواریاں پیش آ رہی تھیں اور ان بڑھتی ہوئی دشواریوں کے خلاف وہاں کام کرنےوالوں کو سخت جد و جہد کرنا پڑ رہی تھی۔ ریلوے کے حکام نے اعلان کر دیا کہ ریل کی پٹڑیوں کے لئے سلیپر دستیاب نہیں ہو سکتے۔ اس مقام تک ریل کی پٹڑیاں اور انجن پہونچانے کے لئے شہر کے حکام کے پاس کوئی ذرائع نہیں تھے۔ اور انجن خود ایسی حالت میں تھے کہ ان میں کافی مرمت کی ضرورت تھی۔ پہلی ٹکڑی کے مزدور اپنا کام پورا کر چکے تھے اور اب اتنے شل ہو گئے تھے کہ انہیں وہاں اور زیادہ دن تک روکنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن ان کی جگہ کام کرنے کے لئے مزدور نہیں مل رہے تھے۔

اس شکستہ کھپریل میں جہاں تیل کے دئے کی دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی پارٹی کے نمایاں اراکین کی ایک میٹنگ ہوئی اور وہ لوگ رات کو بہت دیر تک وہاں بیٹھے صورت حال پر بحث مباحثہ کرتے رہے۔

دوسرے دن صبح توکاریف، دوباوا اور کلاویچک اور چھہ آدمیوں کو ساتھہ لےکر انجنوں کی مرمت کرنے اور ریل کی پٹڑیاں بھجوانے کے کام میں جلدی کرانے کی غرض سے شہر گئے۔ کلاویچک جو پیشے کا نان بائی تھا انسپکٹر کی حیثیت سے سپلائی کے محکمے میں بھیج دیا گیا، اور باقی لوگ پشچا وادتسا کی طرف بڑھ گئے۔

جس جگہ ریلوے لائن کی تعمیر ہو رہی تھی وہاں لگاتار موسلادھار بارش پڑ رہی تھی۔

پاویل کورچاگن نے بڑی کوشش کرکے کیچڑ میں سے اپنا پاؤں نکالا۔ تلوے میں شدید ٹھنڈ لگنے سے اسے احساس ہوا کہ آخرکار اس کے جوتے کا تلا اوپر والے حصے سے الگ ہو گیا تھا۔ جب سے

پاویل یہاں کام کرنے آیا تھا اسی وقت سے اس کے پھٹے ہوئے جوتے اسے بڑی تکلیف دے رہے تھے- وہ کبھی سوکھنے ہی نہیں پاتے تھے اور جو کیچڑ ان میں داخل ہو جاتی تھی وہ چلتے وقت ایک عجیب بھچ بھچ کی آواز پیدا کرتی تھی- اب تک جوتے کا تلا بالکل ہی غائب ہو گیا تھا اور برفانی کیچڑ اس ننگے پاؤں میں خنجر چبھا رہا تھا- کیچڑ میں سے جوتے کا تلا نکال‌کر پاویل نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا- اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ کبھی گالی نہیں بکےگا- لیکن اس وقت اسے اپنی قسم توڑنی پڑی- ایک پاؤں ننگا رکھ‌کر اس کے لئے کام کرتے رہنا ناممکن تھا- اس لئے وہ ایک ٹانگ پر اچکتا ہوا بیرک میں گیا- چولھے کے قریب بیٹھ‌کر اس نے کیچڑ میں بھری ہوئی پاؤں کی پٹی کھولی اور ٹھٹھرا ہوا پاؤں آگ کے سامنے کر دیا-

اس اسٹیشن کے لائن‌مین کی بیوی اودارکا وہاں کھانا پکانے میں مدد دیتی تھی- وہ اس وقت باورچی‌خانے کی میز کے قریب کھڑی ہوئی چقندر کاٹنے میں مصروف تھی- وہ خوب لمبی چوڑی عورت تھی اور ابھی تک کافی جوان تھی- اس کے شانے بالکل مردوں کی طرح چوڑے تھے- اس کا سینہ بہت ابھرا ہوا اور کولھے بہت بھاری تھے- وہ بڑی پھرتی سے چھری چلا رہی تھی، اور اس کی پھرتیلی انگلیوں کی بدولت کٹی ہوئی سبزی کا ڈھیر بڑی تیزی سے اونچا ہوتا جا رہا تھا-

اودارکا نے لاپروائی سے پاویل پر ایک نظر ڈالی اور جھڑک‌کر اس سے بولی:

«اگر تم ابھی سے کھانے کے چکر میں آئے ہو تو میں صاف بتا دوں کہ ابھی کھانے میں بہت دیر ہے- بچو کام سے جی چراکر اس طرح بھاگتے تمہیں شرم نہیں آتی- اپنے پاؤں چولھے پر سے ہٹاؤ- یہ باورچی خانہ ہے کوئی حمام نہیں ہے-»

اتنے میں باورچی آ گیا ۔

«میرا یہ کم‌بخت جوتا بالکل ٹوٹ گیا ہے» پاویل نے اس طرح بے وقت باورچی‌خانے میں اپنی موجودگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ۔

ادھیڑ عمر کے اس باورچی نے پھٹے ہوئے جوتے کو دیکھا اور سر سے اودارکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

«شاید اس کا شوہر انہیں ٹھیک کر دے ۔ وہ تھوڑا بہت موچی کا کام بھی جانتا ہے ۔ بہتر ہے کہ اس کی مرمت کرا لو نہیں تو بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے ۔ بغیر جوتوں کے کام نہیں چلنے کا ۔»

یہ سن‌کر اودارکا نے پاویل پر دوبارہ ایک نظر ڈالی اور وہ اس نتیجے پر پہونچی کہ اس کے بارے میں رائے قائم کرنے میں اس نے بڑی عجلت سے کام لیا تھا ۔

«میں تو سمجھی تھی کہ تم کام سے جی چراکر یہاں بھاگ آئے ہو» اس نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے ندامت کے ساتھ کہا ۔

پاویل نے مسکراکر اسے یقین دلایا کہ اس نے اس کی بات کا برا نہیں مانا تھا ۔ اودارکا نے ایک ماہر موچی کی طرح جوتے کا معائنہ کرکے کہا:

«اس کی مرمت کرانے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ لیکن میں ایک کام کر سکتی ہوں ۔ میرے گھر پر ایک پرانا برساتی بوٹ پڑا ہوا ہے ۔ وہ میں تمہیں لا دوں‌گی ۔ تم اسے اپنے جوتے کے اوپر پہن لینا ۔ پھر تمہارے پاؤں میں تکلیف نہیں ہوگی ۔ اس طرح کیسے مارے مارے پھروگے ۔ تم مر جاؤگے ۔ اب کسی بھی دن برف پڑنی شروع ہو جائےگی ۔»

اتنا کہہکر اودارکا جو اس وقت سرتاپا ہمدردی کا مجسمہ بنی

ہوئی تھی، چھری رکھکر جلدی سے باہر گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک لمبا سا برساتی بوٹ اور مضبوط لنن کی لمبی سی پٹی لئے ہوئے واپس لوٹی۔

پاویل کا پاؤں اب خشک ہو گیا تھا۔ اور کافی گرما بھی گیا تھا۔ اس پر موٹے لنن کی پٹی لپیٹکر اس نے برساتی بوٹ میں اپنا پاؤں ڈالتے ہوئے اودارکا کی طرف تشکرانہ انداز میں دیکھا۔

توکاریف شہر سے بہت برانگیختہ واپس آیا۔ اس نے خولیاوا کے کمرے میں پارٹی کے اہم اراکین کی میٹنگ کرکے انہیں شہر کی ناخوشگوار خبر سنائی۔

«ہر جگہ رکاوٹیں ہی رکاوٹیں نظر آتی ہیں۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہیے تو گھوم رہے ہیں لیکن گاڑی آگے نہیں بڑھتی۔ ہر جگہ یہ غدار وھائٹ گارڈ گھسے ہوئے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہماری زندگی میں تو وہ ختم ہونے والے نہیں۔ دیکھو بھئی میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ مجھے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ ابھی تک ان کام کرنےوالوں کی جگہ لینے کے لئے دوسرے لوگوں کا کوئی انتظام نہیں ہو پایا ہے اور اگر ہو بھی گیا تو کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کتنے لوگ آئینگے۔ اب کسی بھی دن برف باری شروع ہو جائےگی۔ اور ہمیں ہر حالت میں اس سے قبل ہی دلدل کو پار کرکے آگے نکل جانا چاھئے۔ کیونکہ اگر زمین پر برف جم گئی تو پھر آگے بڑھنا ناممکن ہو جائےگا۔ اس لئے جب تک وہ لوگ شہر میں گڑبڑ پیدا کرنے والےلوگوں سے نبٹنے میں مصروف ہیں تب تک ہمیں یہاں اپنا کام دگنی رفتار سے کرنا چاھئے۔ اس لائن کو بنانا تو ھئی ہے اور ہم اس کام کو پورا کرکے ہی دم لیں گے، چاھے اس

میں ہماری جان ھی کیوں نہ چلی جائے۔ ورنہ ہم بالشویک نہیں بلکہ بالکل مٹی کے پتلے ہیں» ۔ توکاریف کی بھرائی ہوئی بھاری آواز میں فولاد کی سی سختی تھی، اور اس کے گھنے ابروؤں کے نیچے اس کی آنکھوں میں عزم کی چمک تھی۔

«ہم آج اپنے تمام ممبروں کی ایک خاص میٹنگ کرکے انہیں اس بات کی اطلاع دیدیں گے اور کل سے ہم سب کام میں جٹ جائیں گے۔ صبح ہم ان سب لوگوں کو چھٹی دیدیں گے جو پارٹی کے ممبر نہیں ہیں۔ باقی ہم تمام لوگ یہیں رہیں گے۔ یہ ہے پارٹی کی گبرنیا کمیٹی کا فیصلہ» اس نے پانکراتوف کو چار پرتوں میں تہہ کیا ہوا ایک کاغذ تھماتے ہوئے کہا۔

پاویل کورچاگن نے پانکراتوف کے کندھے پر سے جھانک کر پڑھا: «حالات کی سنگینی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کومسومول کے تمام ممبر کام جاری رکھیں گے۔ اور انہیں اس وقت تک چھٹی نہیں دی جائے گی جب تک ایندھن کی پہلی قسط روانہ نہ ہو جائے۔ دستخط: آر. استینووچ، برائے سکریٹری گبرنیا کمیٹی۔»

باورچی خانے والی بیرک میں لوگ کھچاکھچ بھرے ہوئے تھے۔ اس تنگ سی جگہ میں ایک سو بیس آدمی گھسے بیٹھے تھے۔ کچھ دیواروں کا سہارا لگائے کھڑے تھے، کچھ میزوں پر چڑھ گئے تھے اور کچھ نے تو فوجی باورچی خانے کی موٹر پر اڈہ جما لیا تھا۔

پانکراتوف نے میٹنگ کی کارروائی شروع کی۔ اس کے بعد توکاریف نے اپنی مختصر سی تقریر کے آخر میں وہ اہم اعلان سنایا جس سے وہ تمام لوگ اس طرح چونک پڑے گویا ان کے بیچ میں بم پھٹ گیا ہو۔

«کمیونسٹ اور کومسومول کل کام چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔»

اس بوڑھے نے یہ اعلان کرتے وقت اس انداز سے ہاتھ ہلایا جس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ فیصلہ کسی بھی حالت میں بدلہ نہیں جا سکتا۔ اس اعلان نے ان لوگوں کی شہر واپس جانے، اپنے گھر جانے اور اس دوزخ سے نجات حاصل کرنے کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

چند لمحوں تک تو غصے سے بھری ہوئی آوازوں کے شور و غل میں کچھ اور سنائی ہی نہیں دیا۔ لوگوں کے ادھر ادھر ہلنے جلنے کی وجہ سے تیل کے دئے کی مدھم لو رہ رہ کر کانپ جاتی تھی۔ اس جگہ کی نیم تاریکی میں ہنگامہ بڑھتا ہی گیا۔ وہ لوگ «گھر» واپس جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑے غصے کے ساتھ احتجاج کیا کہ وہ اپنی سکت بھر کام کر چکے تھے۔ اس سے زیادہ کام کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ کچھ لوگ اس خبر کو سن کر خاموش ہو گئے۔ صرف ایک شخص تھا جس نے کھلے عام کام چھوڑ کر چلے جانے کی بات کہی۔

«جہنم میں جائے یہ کام!» اس نے ایک کونے سے بہت غصے کے ساتھ چلاکر کہا۔ اور پھر بےہودہ گالیوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ «میں اب یہاں ایک دن بھی نہیں ٹھیروں گا۔ مجرموں سے اس قسم کی بیگار لینا ٹھیک ہے۔ لیکن ہم نے کونسا جرم کیا ہے۔ ہم لوگ احمق تھے کہ اتنے دن تک کام کرتے رہے۔ دو ہفتے بہت بھگت چکے بس اتنا کافی ہے۔ جن لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے ذرا وہ خود تو یہاں آکر کام کرکے دیکھیں۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہاں اس فضول کام میں مزا آتا ہو۔ لیکن میری زندگی تو ایک ہی بار کی ہے۔ میں کل ہی جا رہا ہوں۔»

یہ آواز آکونیف کے پیچھے سے آئی تھی۔ اس نے دیاسلائی جلاکر بولنے والے کی صورت دیکھی۔ ایک لمحہ کے لئے دیاسلائی

کی لو نے بولنے والے کا غصہ سے بگڑا ہوا چہرہ اور کھلا ہوا منھ جھپٹ کر اندھیرے سے باہر نکال لیا ـ لیکن اس ایک ہی لمحہ میں آکونیف نے پہچان لیا کہ وہ شخص گبرنیا کے محکمۂ غذا کے ایک کلرک کا بیٹا تھا ـ

«کیوں کیا حلیہ درج کر رہے ہو؟» اس نے دانت نکال کر غصے سے کہا ـ «لیکن مجھے اس بات کا کوئی خوف نہیں ـ میں کوئی چور نہیں ہوں ـ»

دیاسلائی جھلملاکر بجھ گئی ـ پانکراتوف اٹھا اور تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا ـ

«یہ میں کس قسم کی باتیں سن رہا ہوں؟ یہ کون ہے جو پارٹی کے مفوضہ کام کا مجرموں کی بیگار سے مقابلہ کر رہا ہے؟» اس نے سامنے کی قطاروں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر قہرآلود نظر دوڑاتے ہوئے گرج کر کہا ـ «نہیں ساتھیوں، ہمارے لئے شہر جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـ ہمیں یہیں رہنا ہے ـ اگر ہم اس وقت یہاں سے چلے گئے تو لوگ سردیوں میں ٹھٹھر کر مر جائیں گے ـ جتنی جلدی ہم اپنا کام ختم کر لیں گے اتنی ہی جلدی ہم اپنے گھر پہونچ سکتے ہیں ـ وہاں پیچھے بیٹھا ہوا وہ کام چور بھاگ جانے کی جو تجویز رکھہ رہا ہے وہ نہ تو ہمارے نظریئے کے مطابق ہے اور نہ ہمارے ڈسپلن کے ـ»

پانکراتوف جو پہلے جہازی مزدور تھا خود بہت لمبی تقریروں کا قائل نہیں تھا ـ لیکن غصے سے بھری ہوئی اسی آواز نے اسے اس چھوٹی سی تقریر ہی کے دوران میں ٹوک دیا:

«جو لوگ پارٹی میں نہیں ہیں وہ تو جا رہے ہیں نا؟»

«ہاں ـ»

ایک چھوکرا اونچا سا اوورکوٹ پہنے مجمع کو چیرتا ہؤا سامنے آیا ـ پھر کومسومول کی ممبری کا ایک کارڈ کمرے میں

چمگادڑ کی طرح اڑتا ہؤا آکر پانکراتوف کے سینے سے آکر ٹکرایا، میز پر گرا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

«وہ رہا، اپنا کارڈ رکھہ لیجئے۔ میں دفتی کے اس ٹکڑے کے لئے اپنی صحت خطرے میں ڈالنے کو تیار نہیں ہوں!»

غصے سے بھری ہوئی آوازوں کے شور و غل میں اس کے آخری الفاظ گم ہو گئے۔

«آخر تم نے کیا سمجھہ‌کر اس کارڈ کو اس طرح پھینک دیا؟»

«حرامی غدار کہیں کا!»

«کومسومول میں یہ سوچ‌کر بھرتی ہؤا تھا کہ یہاں عیش کرنے کو ملےگا۔»

«نکال دو اسے دھکے مار کر!»

«ذرا مجھے جانے دو میں ابھی سمجھے لیتا ہوں اس کام چور سے!»

وہ بھگوڑا سر جھکائے باہر نکلنے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ انہوں نے اسے گذر جانے دیا لیکن اس سے اس طرح بچنے لگے گویا وہ کوڑھی ہو۔ اس کے باہر چلے جانے کے بعد دروازہ چوں چوں کی آواز کرتا ہؤا بند ہو گیا۔

پانکراتوف نے میز پر پڑا ہوا ممبری کا کارڈ اٹھا لیا اور اسے چراغ کی لو کے حوالے کر دیا۔

دفتی نے آگ پکڑ لی اور جوں جوں وہ جلتی گئی اینٹھہ‌کر مڑتی بھی گئی۔

جنگل میں گولی چلنے کی آواز گونج گئی۔ ایک گھوڑ سوار اس شکستہ بیرک کی طرف سے مڑا اور گھوڑا دوڑاتا ہؤا جنگل کے اندھیرے میں کھو گیا۔ فوراً بعد ھی اس بیرک اور اسکول کی عمارت سے لوگ بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔ ان میں سے کسی کی نظر دروازے کی چوکھٹ کی درز میں اٹکی ہوئی پلائی وڈ کی ایک

تختی پر پڑی۔ دیاسلائی جلاکر اس کی جھلملاتی ہوئی لو کو ہاتھہ کی آڑ میں ہوا سے محفوظ رکھہکر ان لوگوں نے اس تختی پر بہت ہی شکستہ خط میں یہ عبارت لکھی ہوئی دیکھی: «تم لوگ یہ جگہ چھوڑ دو اور جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ۔ اگر نہیں گئے تو ہم تم میں سے ایک ایک مزدور کو گولی سے اڑا دیں گے۔ میں تمہیں یہاں سے نکل جانے کے لئے کل رات تک کا وقت دیتا ہوں۔ عطامان چیس نوک۔»

چیس‌نوک آرلک کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔

ریتا کے کمرے میں میز پر ایک ڈائری کھلی پڑی ہے۔

«۲ دسمبر

آج صبح پہلی برف گری۔ بہت کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ ویاچیسلاو آلشنسکی سے سیڑھیوں پر میری ملاقات ہو گئی اور ہم دونوں ساتھہ سڑک پر نکلے۔

اس نے کہا «مجھے پہلی برف‌باری میں ہمیشہ بہت مزا آتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اتنے کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہو۔ کتنا خوبصورت ہے! ہے نا؟»

لیکن میں بویارکا کی بابت سوچ رہی تھی۔ اور میں نے صاف صاف اس سے کہہ دیا کہ برف‌باری اور کڑاکے کی سردی میرے لئے قطعی باعث مسرت نہیں ہیں بلکہ اس کے برخلاف مجھہ پر ان کا بڑا مایوس‌کن اثر پڑتا ہے۔ اور میں نے اسے اس کی وجہ بھی بتلا دی۔

اس نے کہا «یہ تو بالکل ہی داخلی قسم کا رد عمل ہے۔ اگر اسی اصول کو دلیل کی بنیاد بنایا جائے تب تو جنگ کے زمانے میں خوشی منانے یا مسرت کا اظہار کرنے پر قطعی پابندی لگا دینی پڑے گی۔ لیکن زندگی اس اصول پر نہیں چلتی۔ المیہ کا دائرہ

جنگ کے مورچے کی اس تنگ سی پٹی تک ھی محدود ھوتا ھے جہاں کہ لڑائی ھوتی ھے۔ وھاں موت کی قربت کا احساس زندگی پر حاوی آ جاتا ھے۔ لیکن وھاں بھی لوگ ھنستے ھیں۔ اور جنگ کے مورچے سے دور زندگی حسب دستور اپنی روش پر چلتی رھتی ھے۔ لوگ ھنستے ھیں، روتے ھیں، مصیبتیں برداشت کرتے ھیں، خوشیاں مناتے ھیں، محبت کرتے ھیں اور تفریح، مسرت اور دلچسپیوں کی جستجو میں رھتے ھیں۔»

آلشنسکی کے الفاظ میں طنز کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ آلشنسکی عوامی حکومت کی وزارت خارجہ کا نمائندہ ھے۔ وہ ۱۹۱۷ء سے پارٹی میں ھے۔ اچھے کپڑے پہنتا ھے۔ ڈاڑھی ھمیشہ صاف بنائے رھتا ھے اور اس کے جسم سے ھمیشہ عطر کی بھینی بھینی خوشبو آتی رھتی ھے۔ وہ ھمارے گھر میں سیگل والے حصے میں رھتا ھے۔ کبھی کبھی شام کے وقت وہ مجھ سے ملنے چلا آتا ھے۔ گفتگو کرنے کے لئے وہ نہایت دلچسپ آدمی ھے۔ یورپ کے بارے میں کافی معلومات رکھتا ھے۔ کئی برس پیرس میں رہ چکا ھے۔ لیکن مجھے تو یقین نہیں کہ ھم دونوں کبھی بھی اچھے دوست بن سکیں گے۔ وجہ یہ ھے کہ اس کے نزدیک میں سب سے پہلے محض ایک عورت ھوں۔ اور یہ بات کہ میں اس کی پارٹی کامریڈ بھی ھوں اس کے نزدیک ضمنی حیثیت رکھتی ھے۔ یہ تو سچ ھے کہ اس سلسلے میں وہ اپنے جذبات اور خیالات کو چھپانے کی قطعی کوشش نہیں کرتا۔ اس میں اپنی رائے پر اعتماد کے ساتھ قائم رھنے کی جرائت ھے۔ اور اس کے اظہار خصوصیت میں بھی کسی قسم کی ناشائستگی نہیں ھے۔ اپنے اظہار خصوصیت کو بہت ھی حسین اور لطیف بنانے میں اسے مہارت حاصل ھے۔ پھر بھی مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔

ژوخرائی کی روکھی سادگی مجھے آلشنسکی کے شائستہ قسم کے یورپی آداب محفل کے مقابلے میں کہیں زیادہ پسند ھے۔

بویارکا کی خبریں مختصر رپورٹوں کی شکل میں ملتی رہتی ہیں - ہر روز دو سو گز پٹڑیاں بچھا دی جاتی ہیں - وہ لوگ اتھلے اتھلے گڑھے کھود کر جمی ہوئی زمین پر ہی سلیپریں بچھا رہے ہیں - اس وقت وہاں صرف دو سو چالیس آدمی کام پر ہیں - پہلے والے مزدوروں کی جگہ جو لوگ بھیجے گئے تھے ان میں سے آدھے کام چھوڑ کر بھاگ گئے - وہاں کام کرنے کے حالات واقعی بہت تکلیف دہ ہیں - میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس برف باری میں وہ اپنا کام کیسے جاری رکھ سکیں گے - دوباوا کو گئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے - پشچاوادتسا کے آٹھ انجنوں میں سے ابھی تک صرف پانچ کی مرمت ہو پائی ہے - باقی کے لئے پرزے ہی نہیں تھے -

ٹراموے کے حاکموں نے دمیتری کے خلاف بہت ہی سنگین قسم کے الزام لگائے ہیں - پشچاوادتسا سے شہر آنے والی ٹرام کمپنی کے پاس جتنے بھی کھلے ڈبے تھے ان سب کو روک کر اس نے اپنی ٹکڑی کی مدد سے مسافروں کو اتار دیا اور ان پر بویارکا کی ریلوے لائن کے لئے پٹڑیاں لدوا دیں - وہ لوگ ٹرام کے ذریعے شہر کے ریلوے اسٹیشن تک انیس ڈبے بھر کر ریل کی پٹڑیاں لائے - ٹرام چلانے والے ملازمین نے بڑی خوشی سے ان کی مدد کی -

سولومینکا کی کومسومول تنظیم کے جو لوگ شہر میں رہ گئے ہیں انہوں نے رات بھر پٹڑیاں ریل کے ڈبوں میں لادیں اور دمیتری اپنی ٹکڑی کے ہمراہ انہیں لے کر بویارکا کے لئے روانہ ہو گیا -

آکم نے دوباوا کے معاملے کے بارے میں کومسومول کے بیورو میں بحث کرنے سے انکار کر دیا - دمیتری نے ہمیں ٹرام کمپنی کے حکام کے شرمناک ضابطہ پرستی کے رویہ اور دفتری کارروائی کے گورکھ دھندے کے بارے میں بتایا - اس نے کہا کہ ان لوگوں نے اس کام کے لئے دو سے زائد ڈبے دینے سے صاف انکار کر دیا تھا -

لیکن تفتہ نے دوباوا کو الگ لے جاکر تنبیہہ کی - اس نے

کہا «اب ان چھاپے مار ہتھکنڈوں کا زمانہ نہیں رہا۔ بہتر ہے کہ تم اپنے یہ طور طریقے چھوڑ دو، ورنہ کسی دن پکڑ کر جیل میں بند کر دئے جاؤگے، تب معلوم ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ ہتھیاروں کے استعمال کے بغیر بھی اس مسئلے کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کیا جا سکتا تھا۔»

میں نے دوباوا کو اس سے پہلے کبھی اتنا برانگیختہ نہیں دیکھا تھا۔

«تو پھر تمہیں نے ان سے بات کرکے کوئی فیصلہ کر لینے کی کوشش کیوں نہ کی؟ بس یہاں بیٹھے بیٹھے خالی قلم چلانا آتا ہے۔» اس نے طوفان برپا کرتے ہوئے کہا۔ «کرسی توڑنے اور زبان چلانے کے علاوہ تمہیں آتا ہی کیا ہے؟ آخر تمہیں بتاؤ کہ میں ریل کی پٹڑیاں لئے بغیر بویارکا کیسے واپس جا سکتا تھا؟ یہاں بیٹھے بیٹھے خالی وقت گذارنے اور ہر شخص کے عیب دریافت کرنے کے بجائے اگر تمہیں وہاں کام کرنے کے لئے بھیجدیا جائے تب معلوم ہو۔ توکاریف سے سابقہ پڑے تو تمہارے مزاج درست ہو جائیں۔» دمیتری اتنے زور سے گرج رہا تھا کہ پوری عمارت میں اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

تفتہ نے دوباوا کے خلاف ایک شکایت لکھی۔ لیکن آکم نے مجھے کمرے سے جانے کے لئے کہکر دس منٹ تک اکیلے میں اس سے گفتگو کی، جس کے بعد تفتہ سرخ اور بپھرا ہؤا کمرے سے باہر نکلا۔

۳ دسمبر

گبرنیا کمیٹی کے پاس ایک اور شکایت آئی ہے۔ اس بار محکمۂ آمد و رفت کے چیکا کے پاس سے۔ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ پانکراتوف، آکونیف اور دوسرے کئی ساتھی موتوولووکا اسٹیشن جاکر وہاں کی خالی عمارتوں کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں کے چوکھٹ

اکھاڑ لائے۔ جس وقت وہ لوگ انہیں مال گاڑی کے ڈبے میں لاد رہے تھے تب اسٹیشن پر تعینات چیکا کے آدمی نے انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے زبردستی اس کے ہتھیار چھین لئے اور گولیاں نکال کر پستول اسے واپس کر دی، لیکن اس وقت جب کہ گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہو چکی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے چوکھٹ لے کر وہ لوگ وہاں سے صاف نکل گئے۔

ریلوے کے سپلائی کے محکمے نے توکاریف پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ بویارکا کے ریلوے کے گودام سے تقریباً نو من کیلیں اٹھا لے گیا۔ اس نے یہ کیلیں ریل کی سلیپروں کے لئے استعمال کی جانے والی لکڑی ڈھونے میں مدد کرنے کے معاوضے کے طور پر کسانوں کو تقسیم کر دیں۔

میں نے کامریڈ ژوخرائی سے ان تمام شکایتوں کے بارے میں گفتگو کی، لیکن انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ وہ کہنے لگے «فکر نہ کرو وہ سب ہم ٹھیک کر لیں گے۔»

ریلوے لائن کی تعمیر کے سلسلے میں صورت حال بہت نازک ہے اور اب ایک ایک دن بہت قیمتی ہے۔ ہمیں یہاں ذرا ذرا سی بات کے لئے دباؤ ڈالنا پڑتا ہے۔ آئے دن ہمیں کام میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو گبرنیا کمیٹی کے دفتر میں طلب کرنا پڑتا ہے۔ اور جہاں ریلوے لائن بنانے کا کام ہو رہا ہے وہاں تو ہمارے لوگ دن بہ دن باضابطگی کے ساتھ کام کرنے کے ہر اصول کو ترک کرتے جا رہے ہیں۔

آلشنسکی نے مجھے بجلی کی ایک چھوٹی سی انگیٹھی دی ہے۔ میں اور آلگا یورینیوا اس پر اپنے ہاتھ سینکتے ہیں۔ لیکن اس سے کمرہ ذرا بھی گرم نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں اس جنگل میں کام کرنے والے لوگ اتنی کڑاکے کی سردی میں اپنی رات کیسے بسر کرتے ہوں گے؟ آلگا نے مجھے بتایا کہ ہسپتال میں اتنی سردی ہے

که مریض کمبل اوڑھنے کے باوجود ٹھٹھرتے رھتے ھیں – ھفتے میں صرف دو دن ھسپتال کو گرم کرنے کا انتظام ھے –

نہیں کامریڈ آلشنسکی، جنگ کے مورچے کا المیہ مورچے سے دور عقب کا المیہ بھی ھے!

٤ دسمبر

کل تمام رات برف گرتی رھی – بویارکا سے ان لوگوں نے لکھا ھے کہ ھر طرف برف جمی ھوئی ھے، اور ریل کی لائن صاف کرنے کے لئے انہیں کام روکنا پڑا – آج گبرنیا کمیٹی نے یہ فیصلہ منظور کیا کہ ریلوے لائن کا پہلا حصہ جو اس علاقے کے سرے تک جائےگا جہاں لکڑی کاٹ کر گرائی گئی ھے، جس سے حد یکم جنوری ۱۹۲۲ ء تک بن کر تیار ھو جانا چاھئے – سنا گیا ھے کہ جس وقت اس فیصلے کی خبر بویارکا پہونچی تو توکاریف نے کہا «ضرور بنا دیں گے بشرطیکہ اس وقت تک ھمارا دم نہ نکل جائے –»

مجھے کورچاگن کے بارے میں قطعی کوئی اطلاع نہیں ملتی – مجھے بڑی حیرت ھے کہ وہ پانکراتوف والے «معاملے» کی قسم کی کسی واردات میں مبتلا کیوں نہیں ھوا – ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ سے کتراتا کیوں ھے –

۵ دسمبر

کل لٹیروں نے زیر تعمیر ریلوے لائن پر حملہ کیا –»

نرم پولی برف پر گھوڑے بڑی احتیاط کے ساتھ قدم رکھتے ھوئے چلتے ھیں – کبھی کبھی برف کے نیچے چھپی ھوئی کوئی پتلی سی ٹہنی گھوڑے کے سموں کے نیچے آکر ٹوٹ جاتی ھے اور گھوڑا اپنے نتھنے پھیلانے اور بھڑکنے لگتا ھے –

لیکن اپنے پیچھے کی طرف تنے ہوئے کانوں پر چابک کی ایک ہی چوٹ کھاکر وہ پھر دوسرے گھوڑوں کے پیچھے سرپٹ بھاگنے لگتا ہے۔

دس بارہ گھوڑ سوار ایک پہاڑی چٹان پار کرکے سیاہ مٹی کی ایک ایسی تنگ پٹی پر پہونچ گئے جہاں ابھی تک برف نہیں جمنے پائی تھی۔ وہاں پہونچ کر سواروں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔ رکابوں کے آپس میں ٹکرانے سے ایک ہلکی سی جھنجھنا ہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ ان لوگوں کے سردار کا گھوڑا جس کی جلد اتنی دور تک بھاگنے کے بعد پسینے سے چمک رہی تھی، زور زور سے اپنے جسم کو جھٹکنے لگا۔

«ان کم بختوں کی تعداد کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے» گھوڑ سواروں کے سردار نے یوکرینی زبان میں کہا۔ «لیکن ہم جلد ہی انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں گے۔ عطامان کا حکم ہے کہ ان حرامیوں کو کل تک یہاں سے کھدیڑ کر بھگا دیا جائے گا۔ یہ لوگ ایندھن کے بہت قریب پہونچتے جا رہے ہیں...»

وہ لوگ چھوٹی لائن کے بالکل کنارے کنارے اپنے گھوڑوں پر سوار اکہری قطار میں اسٹیشن پہونچے۔ انہوں نے اسکول کی پرانی عمارت کے پاس والی کھلی جگہ سے کچھ فاصلے پر اپنے گھوڑے دھیمے کر دئے اور پیڑوں کے پیچھے پہونچ کر رک گئے۔ ان کی کھلے میدان میں نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

گولیوں کی بوچھار نے رات کی خاموشی کا دامن چاک کر دیا۔ چاند کی روشنی میں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے برچ کے درخت کی ایک شاخ سے برف کی ایک تہہ گلہری کی طرح سڑک کر نیچے گر پڑی۔ پیڑوں کے بیچ میں سے گولیاں چلنے کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ گولیاں دیواروں کے گرتے ہوئے پلستر کو پھاڑ کر اندر دھنس گئیں۔ کانچ کے ٹوٹنے کی جھنجھنا ہٹ ہوئی اور پانکراتوف

کی کھڑکیوں کے شیشے چور چور ہو کر ادھر ادھر بکھر گئے ـ

گولیوں کی آواز سنتے ہی سیمنٹ کے فرش پر سوئے ہوئے لوگ اچھل کر کھڑے ہو گئے ـ لیکن جب وہ مہلک کیڑے سیسے کی کارتوسوں کی شکل میں کمرے کے اندر ادھر ادھر اڑنے لگے تو وہ لوگ فوراً ایک دوسرے پر گرتے پڑتے پھر زمین پر لیٹ گئے ـ

«کہاں جا رہے ہو؟» دوباوا نے پاویل کا کوٹ پیچھے سے پکڑ لیا ـ

«باہر ـ»

«لیٹ جا بےوقوف» دمیتری نے دانت بھینچ کر کہا ـ «باہر سر نکالتے ہی وہ تجھے گولی کا نشانہ بنا دیں گے ـ»

وہ دونوں دروازے کے قریب ایک دوسرے کے برابر برابر لیٹے تھے ـ دوباوا دروازے کی سمت میں اپنا ریوالور تانے فرش سے چمٹا ہوا اوندھا لیٹا تھا ـ پاویل پھسکڑا مارے بیٹھا تھا اور گھبرائے ہوئے طریقے سے اپنے ریوالور کے کارتوسوں والے خانے میں انگلی ڈال کر کچھہ دیکھہ رہا تھا ـ اس میں پانچ گولیاں تھیں ـ دہ خانہ خالی تھے ـ اس نے کارتوسوں کے سیلنڈر کو ایک دانتے بھر آگے بڑھا دیا ـ

گولیاں چلنا دفعتاً بند ہو گیا ـ اس کے بعد جو خاموشی طاری ہو گئی اس میں بڑا تناؤ تھا ـ

«جن لوگوں کے پاس ہتھیار ہیں وہ ادھر آ جائیں» دوباوا نے بھرائی ہوئی آواز میں زیرلب حکم دیا ـ

پاویل نے بڑی احتیاط کے ساتھہ دروازہ کھولا ـ کھلے میدان میں بالکل سناٹا تھا ـ برف کے گالے ہولے ہولے گر رہے تھے ـ

جنگل میں دس گھوڑ سوار اپنے گھوڑوں کو چابک لگا کر سرپٹ بھگائے لئے جا رہے تھے ـ

دوسرے دن شہر سے ریل کا ایک ڈبہ وہاں آیا جس میں سے ژوخرائی اور آکم اترے۔ اسٹیشن پر توکاریف اور خولیاوا انہیں لینے آئے تھے۔ ایک میکسم مشین گن، مشین گن کی کارتوسوں سے بھرے ہوئے کئی بکس اور دو درجن رائفلیں ڈبے سے پلیٹ فارم پر اتاری گئیں۔

وہ لوگ جلدی جلدی جائے تعمیر پر پہونچے۔ فیودور کے لمبے اوورکوٹ کا پچھلا حصہ اس کے پیچھے برف پر ایک ٹیڑھا میڑھا نقش بناتا چل رہا تھا۔ وہ ابھی تک جھٹکے کے ساتھہ جہازیوں کی اسی بھاری چال سے چلتا تھا گویا کسی جنگی جہاز کے عرشے پر چل رہا ہو۔ لمبی ٹانگوں والا آکم فیودور سے قدم ملاکر چل رہا تھا، لیکن توکاریف کو ان کے ساتھہ رہنے کے لئے کبھی کبھی تھوڑا سا بھاگنا پڑتا تھا۔

«ان لٹیروں کا حملہ ہماری سب سے بڑی مصیبت نہیں ہے۔ لائن کے عین راستے میں ایک جگہ پر زمین یک بیک انتہائی بے ہودہ انداز میں اونچی ہو گئی ہے۔ ہماری بد قسمتی ہے اور کیا کہا جائے۔ اب اسے ہموار کرنے کے لئے بہت کافی فالتو کھدائی کرنی پڑے گی۔»

بوڑھا رکا اور پھر ہوا کی طرف پیٹھہ کرکے ہتیلی کی آڑ میں دیاسلائی جلاکر اس نے ایک سگریٹ سلگائی۔ سگریٹ کے دو چار کش لینے کے بعد وہ دوسروں کا ساتھہ پکڑنے کے لئے لپکا۔ آکم اس کے انتظار میں رک گیا تھا، لیکن ژوخرائی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔

«تمہارا کیا خیال ہے کیا لائن وقت پر بن کر تیار ہو جائے گی؟» آکم نے توکاریف سے پوچھا۔

توکاریف جواب دینے سے پہلے کچھہ دیر کے لئے رکا۔

«دیکھو بیٹا بات یہ ہے» اس نے آخرکار کہا۔ «عام حالات

میں تو یہ کام پورا کرنا نا ممکن ہے، لیکن چوں کہ اسے پورا کرنا ہی ہے اس لئے پورا کیا جائے گا۔»

وہ دونوں تھوڑی دیر میں فیودور کے قریب جا پہونچے اور پھر سب ساتھ چلنے لگے۔

«بات دراصل یہ ہے» توکاریف نے نہایت دیانت داری سے کہنا شروع کیا۔ «یہاں صرف ہم دو آدمی یعنی میں اور پاتوشکن اس بات سے واقف ہیں کہ ایسے حالات میں جب کہ ہمارے پاس سامان اور کام کرنے والوں دونوں ہی کی کمی ہے، ریلوے لائن بنانا ناممکن ہے۔ لیکن باقی تمام لوگ ــــ تم میں سے ایک ایک اس بات کو جانتا ہے کہ کسی بھی قیمت پر ریلوے لائن بناکر تیار کرنا ہی ہے۔ اسی لئے میں نے یہ کہا تھا کہ اگر ہم سردی سے اکڑکر مر نہ گئے تو یہ کام یقیناً پورا کیا جائے گا۔ آپ لوگ خود ہی سوچئے ہم یہاں ایک مہینے سے زیادہ سے کھدائی کر رہے ہیں۔ پرانے مزدوروں کی جگہ پر جو چوتھا جتھا آیا تھا وہ جلد ہی چھٹی پا جائے گا۔ لیکن بیشتر مزدور شروع سے اب تک اس کام پر جٹے ہوئے ہیں۔ وہ محض اپنی جوانی کے جوش کے برتے پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی آدھے کو بری طرح پالا مار گیا ہے۔ انہیں دیکھ کر تکلیف سے دل پھٹ جاتا ہے۔ بہت ہی قابل فخر نوجوان ہیں یہ سب کے سب، ان سے بہتر کہیں ڈھونڈھے نہیں ملیں گے۔ لیکن اس کم بخت دوزخ میں تو ان میں سے بہتوں کی جان چلی جائے گی۔»

اسٹیشن سے تقریباً پانچ فرلانگ کے فاصلے پر آکر تیارشدہ چھوٹی لائن یک بیک ختم ہو گئی تھی۔ اس کے آگے تقریباً ایک میل تک ہموار کی ہوئی اونچی زمین کی پٹی پر سلیپریں اس طرح بچھی ہوئی تھیں گویا شہتیروں کا ایک جنگلہ تیز ہوا سے اڑکر وہاں آ گرا ہو۔ تمام سلیپر مضبوطی کے ساتھ اپنی اپنی جگہوں

پر جڑ دی گئی تھیں ۔ اور سلیپروں کے اس سلسلے کے آگے ٹیلے تک صرف ایک ھموار سڑک تھی ۔

پانکراتوف کی پہلی تعمیری ٹولی اسی قطعے میں کام کر رھی تھی ۔ چالیس آدمی سلیپر بچھانے کے کام میں جٹے ھوئے تھے ۔ اور ایک سرخ ڈاڑھی والا کسان جو چٹائی کے بنے ھوئے نئے جوتے پہنے تھا نہایت اطمینان کے ساتھہ اپنی گاڑی پر سے شہتیر اتار کر پٹڑیاں بچھانے کے لئے اونچی کی ھوئی زمین پر ڈھیر کر رھا تھا ۔ دور کچھہ فاصلے پر کئی اور سلیج گاڑیوں سے اس طرح شہتیر اتارے جا رھے تھے ۔ زمین پر لوھے کی دو لمبی لمبی چھڑیں پڑی ھوئی تھیں جنہیں سلیپروں کو ھموار کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ۔ پٹڑیوں کے نیچے بچھے ھوئے پتھروں کو برابر کرنے کے لئے کلہاڑوں، بیرموں اور بیلچوں، ھر چیز کا استعمال کیا جا رھا تھا ۔

ریل کی پٹڑیوں کے سلیپر بچھانے کا کام بہت ھی سست رفتار اور پرمشقت کام ھے ۔ سلیپر بہت مضبوطی کے ساتھہ زمین میں جما دئے جانے چاھئیں تاکہ پٹڑیاں ان میں سے ھر ایک پر یکساں دباؤ ڈالیں ۔

اس پورے گروہ میں صرف ایک شخص سلیپر بچھانے کے فن سے واقف تھا، اور وہ تھا تالیا کا باپ لاگوتین ۔ اس کی عمر چون سال کی تھی، اور اس کی بےحد سیاہ ڈاڑھی بیچ سے دو حصوں میں تقسیم تھی ۔ اس کے سر کا ایک بال بھی ابھی تک سفید نہیں ھوا تھا ۔ وہ لائن فورمین تھا اور اس لائن کی تعمیر کی ابتدا سے ھی بویارکا میں کام کر رھا تھا ۔ وہ نوجوانوں ھی کی طرح تمام دشواریاں برداشت کرتا تھا ۔ اور اسی لئے اس جتھے کے تمام لوگ اسے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ حالانکہ وہ پارٹی کا ممبر نہیں تھا پھر بھی لاگوتین کو پارٹی کی تمام کانفرنسوں میں عزت کا مقام دیا جاتا تھا ۔ اسے اس بات پر بڑا فخر تھا اور اس نے وعدہ

کیا تھا کہ جب تک کام پورا نہیں ہو جائےگا تب تک وہ وہاں سے نہیں جائےگا۔

«میں تم لوگوں کو یہاں اکیلے کام چلانے کے لئے چھوڑکر کیسے جا سکتا ہوں؟ اگر نگرانی رکھنے کے لئے یہاں کوئی تجربہ‌کار آدمی نہیں ہوگا تو یقیناً کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوتی رہےگی۔ سچ پوچھو تو میں نے زندگی میں ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اتنے سلیپر ٹھونکے ہیں کہ مجھے ٹھیک سے ان کی تعداد یاد بھی نہیں» ہر بار جب کچھہ لوگوں کو چھٹی دےکر ان کی جگہ نئے لوگوں کو کام پر لگانے کا سوال اٹھتا تو وہ ہمیشہ بہت خوش مزاجی سے یہی جواب دیتا۔ اور اس طرح وہ وہاں ٹکا رہا۔

پاتوشکن نے دیکھا کہ لاگوتین اپنے کام میں ہوشیار ہے اور اس لئے وہ شائد ہی کبھی اس کے قطعے کے کام کا معائنہ کرنے جاتا ہو۔ آکم اور ژوخرائی کے ہمراہ جب توکاریف اس جگہ پر پہونچا جہاں وہ لوگ کام کر رہے تھے، تو پانکراتوف سلیپر بچھانے کے لئے ایک گڑھا کھود رہا تھا۔ سخت محنت کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتمایا ہوا اور تمام جسم پسینے میں تر تھا۔ آکم کو اس نوجوان جہازی مزدور کو پہچاننے میں بھی دشواری ہوئی۔ پانکراتوف بہت دبلا ہو گیا تھا، اس کے میلے پچکے ہوئے زرد چہرے پر گالوں کی چوڑی ہڈیاں بہت نمایاں طور پر ابھر آئی تھیں۔

«اچھا اچھا» اس نے آکم کی طرف اپنا گرم پسینے میں تر ہاتھہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ «بڑے صاحب لوگ تشریف لائے ہیں!»

پھاوڑوں کی آواز بند ہو گئی۔ آکم نے اپنے گرد جمع‌شدہ لوگوں کے زرد مرجھائے ہوئے چہروں کا جائزہ لیا۔ ان کے کوٹ اور جیکٹیں ایک بےترتیب ڈھیر میں برف پر پڑی ہوئی تھیں۔

لاگوتین کے ساتھہ مختصر سی گفتگو کے بعد توکاریف آکم اور ژوخرائی کو اس جگہ لے گیا جہاں کھدائی کا کام ہو رہا تھا۔

اس نے پانکراتوف کو بھی ساتھ آنے کی دعوت دی۔ وہ جہازی مزدور ژوخرائی کے پہلو بہ پہلو چلنے لگا۔

«اچھا پانکراتوف یہ تو بتاؤ کہ موتوولووکا میں کیا ہوا تھا؟ تمہارے خیال میں کیا تم لوگوں نے اس چیکا کے آدمی کے ہتھیار چھین کر زیادتی نہیں کی؟» فیودور نے سختی کے ساتھ اس کم سخن جہازی سے پوچھا۔

پانکراتوف نے کھسیاکر اپنی بتیسی کھول دی۔

«وہ سب تو آپس کی رضامندی سے ہوا تھا» اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ «اس نے خود ہم لوگوں سے اپنے ہتھیار چھین لینے کو کہا تھا۔ وہ بہت ہی بھلا آدمی تھا۔ جب ہم لوگوں نے اسے تمام حالات اچھی طرح سمجھائے تو وہ بولا «میں تمہاری دشواری سمجھتا ہوں دوستو، لیکن تمہیں یہ کھڑکیاں اور دروازے اس طرح لے جانے کی اجازت دینے کا مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہم لوگوں کو کامریڈ دزیرژنسکی کا حکم ہے کہ ریلوے کے سامان کی اس لوٹ مار کو ختم کر دیا جائے۔ یہاں کا اسٹیشن ماسٹر ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ وہ حرامی خود سامان کی چوری کرتا ہے اور میں اس کی راہ میں حائل ہوں۔ اگر میں نے تم لوگوں کو یہ تمام چیزیں لے جانے دیں تو وہ یقیناً میری شکایت کر دے گا اور انقلابی عدالت کے سامنے مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ لیکن تم میرے ہتھیار چھین کر صاف نکل کے جا سکتے ہو۔ اور اگر اسٹیشن ماسٹر نے شکایت نہ کی تو معاملہ یہیں ختم ہو جائے گا۔» اس لئے ہم لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ آخر وہ دروازے اور کھڑکیاں ہم کوئی اپنے ذاتی استعمال کے لئے تو لا نہیں رہے تھے۔»

ژوخرائی کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک دیکھ کر وہ کہتا رہا:

«کامریڈ ژوخرائی اگر آپ چاہیں تو ہم لوگوں کو اس کی سزا دے سکتے ہیں ۔ لیکن اس لڑکے کو کچھہ نہ کہیےگا ۔»

«وہ معاملہ تو خیر کب کا ختم بھی ہو گیا ۔ لیکن دیکھو آئندہ کبھی اس قسم کی کوئی واردات نہ ہونے پائے ۔ اس سے ہمارے ڈسپلن پر حرف آتا ہے ۔ اب ہم لوگ اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ ضابطہ پرستی اور دفتری حکومت کو منظم طور پر کچل سکتے ہیں ۔ اچھا ہمیں اب اس سے زیادہ اہم مسئلے کے بارے میں گفتگو کرنی چاہئے ۔» اور فیودور اس سے لٹیروں کے حملے کی تفصیلات دریافت کرنے لگا ۔

بویارکا اسٹیشن سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر مزدوروں کا ایک جتھا ایک ٹیلے کی کھدائی میں زور شور سے جٹا ہوا تھا ۔ یہی ٹیلہ ریلوے لائن کے راستے میں حائل تھا ۔

سات آدمی اس دستے کے لوگوں کے تمام ہتھیاروں سے لیس ہوکر کھڑے پہرہ دے رہے تھے ۔ ان ہتھیاروں میں خولیاوا کی رائفل اور کورچاگن، پانکراتوف، دوباوا اور خوموتوف کی پستولوں کے علاوہ اور کچھہ بھی نہیں تھا ۔

پاتوشکن ٹیلے پر بیٹھا اپنی نوٹ بک میں کچھہ حساب لگا رہا تھا ۔ اس تعمیر کے کام میں جتنے لوگ حصہ لے رہے تھے ان میں صرف وہی انجینیر تھا ۔ ابھی تک واکولنکو نام کا ایک ٹیکنیشین بھی تھا ۔ لیکن وہ اسی دن صبح بھاگ گیا تھا ۔ کیوں‌کہ وہ لٹیروں کے ہاتھوں مرنے کے بجائے کام چھوڑکر بھاگ جانے کے جرم میں سزا پانے کو ترجیح دیتا تھا ۔

«اس ٹیلے کو کھودکر ہموار کرنے میں تو دو ہفتے کا وقت لگ جائےگا ۔ زمین جم‌کر سخت ہو گئی ہے» پاتوشکن نے اپنے قریب کھڑے ہوئے افسردہ خوموتوف سے دھیمی آواز میں کہا:

«پوری لائن مکمل کرنے کے لئے ہمیں صرف پچیس دن کا وقت دیا گیا ہے اور تم پندرہ دن صرف اس کام کے لئے رکھہ رہے ہو۔»

خوموتوف نے اپنی مونچھہ کا سرا چباتے ہوئے غرا کر کہا:

«مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ کام پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو سچ ہے کہ اس سے پہلے ایسے حالات میں اور ایسے کام کرنے والوں کی مدد سے میں نے کوئی تعمیر نہیں کی ہے۔ ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو۔ دراصل اس سے پہلے بھی دو بار میرا اندازہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔»

اس وقت ژوخرائی، آکم اور پانکراتوف ٹیلے کی چڑھائی کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

«دیکھو وہ کون آ رہا ہے؟» پیوتر ترافیموف نے چلاکر کہا وہ ریلوے کی ورکشاپ کا ایک نوجوان میکنک تھا۔ وہ کہنیوں پر سے پھٹا ہؤا ایک پرانا سویٹر پہنے تھا۔ اس نے کورچاگن کے ٹھوکا مارکر آنے والوں کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحہ پاویل ہاتھہ میں پھاوڑا لئے ٹیلے کی ڈھلان پر دوڑا چلا جا رہا تھا۔ خود کے آگے کی طرف کو نکلے ہوئے حصے کے نیچے سے اس کی آنکھوں نے مسکراکر بڑی گرمجوشی کے ساتھہ انکا استقبال کیا۔ اور فیودور اس سے ہاتھہ ملانے کے بعد دیر تک اس کا ہاتھہ تھامے رہا۔

«ارے تم ہو پاویل۔ اس سج دھج میں تو میں تمہیں پہچان بھی نہیں پایا۔»

یہ سن کر پانکراتوف ایک خشک ہنسی ہنس دیا:

«اس کے لئے مناسب لفظ سج دھج نہیں ہے۔ ہوا جانے کے لئے اس میں دیکھئے سوراخ کتنے ہیں۔ کام چھوڑکر بھاگنے والے اس بےچارے کا اوورکوٹ بھی چرا لے گئے۔ وہ تو کہو آکونیف نے اسے یہ جیکٹ دے دی۔ آپ جانتے ہیں ان لوگوں کا ایک کمیون

قائم ہے؟ لیکن پاویل کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں ہے اس کی رگوں میں گرم خون رواں ہے۔ وہ ایک دو ہفتے تک ابھی اور سیمنٹ کے فرش پر اپنی پیٹھ سینکے گا کیونکہ پیال ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اور پھر وہ نہایت شان دار صنوبر کی لکڑی کے تابوت میں لیٹنے کے لائق ہو جائے گا» اس جہازی مزدور نے تلخ طنز کے ساتھ اپنی بات ختم کی۔

سیاہ ابروؤں اور چپٹی ناک والے آکونیف نے اپنی شرارت بھری آنکھیں سکیڑ کر اعتراض کیا:

«تم غم نہ کرو۔ ہم لوگ پاولوشکا کا انتظام کر دیں گے۔ ہم سب لوگوں کی رائے سے اسے باورچی خانے میں اودارکا کی مدد کرنے پر لگا دیں گے۔ اگر اس میں ذرا بھی عقل ہوگی تو یہ وہاں تھوڑا بہت فاضل کھانا بھی مار لے گا اور اپنا جسم گرم رکھنے کے لئے چولھے سے یا خود اودارکا سے لپٹ کر سو رہا کرے گا۔»

آکونیف کی اس بات پر ایک زور کا قہقہہ لگا۔ اس دن وہ لوگ پہلی بار ہنسے تھے۔

فیودور ژوخرائی نے ٹیلے کا معائنہ کیا، اور پھر سلیج گاڑی پر بیٹھ کر توکاریف اور پاتوشکن کے ہمراہ اس علاقے کی طرف چل دیا جہاں لکڑی کاٹ کر گرائی گئی تھی۔ جب وہ واپس لوٹا اس وقت بھی لوگ بڑی مضبوطی اور مستقل مزاجی کے ساتھ ٹیلے کی کھدائی میں جٹے ہوئے تھے۔ فیودور نے ان کے پھاوڑوں کی تیز حرکت اور ان کی سخت مشقت سے جھکی ہوئی پیٹھوں کو دیکھا۔ اس نے آکم سے مخاطب ہوکر دبی آواز میں کہا:

«میٹنگوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے کسی پرچار کی ضرورت نہیں ہے۔ توکاریف تم ٹھیک ہی کہتے تھے کہ یہ جوان تو سونے میں تولنے کے لائق ہیں۔ ایسی ہی جگہوں پر تو فولاد تپ کر نکھرتا ہے۔»

ژوخرائی نے کھدائی کرنے والوں کو تعریفی اور فخریہ نظروں سے دیکھا، اس کے فخر میں سختی بھی تھی اور محبت بھی۔ ان میں سے کئی کو تو وہ ابھی چند ھی دن پہلے اپنی سنگینوں کی نوکیں تانے اپنے سامنے صاف بستہ دیکھہ چکا تھا۔ وہ بغاوت سے پہلے والی رات تھی۔ اور اب وہ سب ایک ھی جذبے کے تحت جان توڑ محنت کر رھے تھے کہ ریلوے لائن کی فولادی شہہ رگیں حرارت اور زندگی کے اس گراں قدر خزینے تک پہونچ سکیں۔

پاتوشکن بڑے ادب کے ساتھہ لیکن پورے اعتماد سے فیودور کو سمجھانے لگا کہ اس ٹیلے کو دو ھفتے سے کم میں کھودکر ھموار کرنا قطعی ناممکن تھا۔ فیودور اپنے خیالات میں گم اس کی دلیلیں سنتا رھا۔ صاف ظاھر تھا کہ اس کا ذھن کسی دوسرے ھی مسئلہ کی بابت سوچنے میں مصروف تھا۔

«اس ٹیلے کی کھدائی کا کام رکوا دو۔ اور اس کے آگے لائن بچھوانا شروع کر دو۔ ٹیلے کے مسئلے کو حل کرنے کا ھم کوئی دوسرا راستہ تلاش کر لیں گے» آخرکار اس نے کہا۔

اسٹیشن پہونچ کر وہ بڑی دیر تک ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کرتا رھا۔ خولیاوا باھر دروازے پر کھڑا پہرہ دے رھا تھا۔ اسے کمرہ میں فیودور کی بھرائی ھوئی بھاری آواز سنائی دے رھی تھی:

«فوجی علاقہ کے چیف آف اسٹاف کو ٹیلیفون کرکے اس سے میری طرف سے کہو کہ پوزی ریوسکی کی رجمنٹ کا تبادلہ کرکے فوراً یہاں بھیجدے جہاں ریلوے لائن کی تعمیر ھو رھی ھے۔ اس علاقے سے لٹیروں کا فوراً صفایا ھو جانا چاھئے۔ ایک زرہ بند ریل گاڑی اور اس کے ساتھہ چٹانوں کو مسمار کرنے والے چند سپاھی بھجوا دو۔ باقی تمام انتظام میں خود کر لوں گا۔ میں ذرا دیر سے لوٹوں گا۔ لتکے سے کہدینا کہ رات کو بارہ بجے موٹر لے کر اسٹیشن پہونچ جائے۔»

بیرک میں آکم کی مختصر سی تقریر کے بعد ژوخرائی بولنے کھڑا ہؤا۔ اور رفیقانہ بحث و مباحثے میں دیکھتے دیکھتے ایک گھنٹہ گذر گیا۔ فیودور نے ان لوگوں کو واضح الفاظ میں بتا دیا کہ ریلوے لائن کو مکمل کرنے کے لئے یکم جنوری تک کی جو میعاد مقرر کی گئی تھی، اسے اور زیادہ ملتوی کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔

«اس وقت سے ہم اس کام کو فوجی نوعیت دے دیں گے» اس نے کہا۔ «جتنے پارٹی ممبر ہیں ان سب کی ایک اسپیشل ڈیوٹی کمپنی بنا دی جائے گی، اور کامریڈ دوباوا اس کمپنی کے کمانڈر ہوں گے۔ تمام کام کرنے والوں کو چھ ٹولیوں میں تقسیم کر کے انہیں الگ الگ کام دے دیا جائے گا۔ جتنی لائن اس وقت بننے کو باقی رہ گئی ہے اسے چھ برابر خطوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور ایک ایک خطے کی ذمے داری ہر ٹولی کے سپرد کر دی جائے گی۔ یکم جنوری تک کام پورا ہو جانا چاہئے۔ جو ٹولی اپنا کام پہلے ختم کرے گی اسے شہر واپس جانے کی اجازت دیدی جائے گی۔ گبرنیا کی ایگزیکٹو کمیٹی کی صدارتی مجلس حکومت سے درخواست کرے گی کہ اول آنے والی ٹولی کے سب سے اچھے کارکن کو آرڈر آف دی ریڈ بنیر کا تمغہ انعام میں دیا جائے۔»

مختلف ٹولیوں کے لئے حسب ذیل لیڈر مقرر کر دئے گئے: پہلی ٹولی کے کامریڈ پانکراتوف، دوسری کے کامریڈ دوباوا، تیسری کے کامریڈ خوموتوف، چوتھی کے کامریڈ لاگوتین، پانچویں کے کامریڈ کورچاگن اور چھٹی کے کامریڈ آکونیف۔

«تعمیر کے اس کل کام کے اعلی افسر، سیاسی اور انتظامی لیڈر پہلے ہی کی طرح آنتن نکیفوروچ توکاریف رہیں گے» ژوخرائی نے ایک کہنہ مشق مقرر کے انداز میں اپنی تقریر ختم کی۔

یک بیک تالیوں کی آواز گونج اٹھی جیسے چڑیوں کا غول

دفعتاً پر پھڑپھڑاکر اڑ گیا ہو ـ لوگوں کے گمبھیر چہروں کا تناؤ ختم ہو گیا اور سب مسکرانے لگے ـ تقریر کے اس دلچسپ پرخلوص اختتام پر تمام مجمع جو اب تک دم سادھے بڑے غور سے سن رہا تھا، یک بیک قہقہہ مارکر ہنس پڑا ـ

بیس بائیس جوان آکم اور فیودور کو رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن گئے ـ

کورچاگن سے ہاتھہ ملاتے وقت فیودور نے اس کے برف سے بھرے ہوئے برساتی بوٹ کو ایک نظر دیکھا ـ

«میں تمہارے لئے ایک جوڑ جوتے بھجوا دوں گا» اس نے دھیمی آواز میں کہا ـ «مجھے امید ہے کہ کم سے کم ابھی تک تو تمہارے پاؤں گلنے شروع نہیں ہوئے ہیں؟»

«نہیں بس ذرا ذرا سی سوجن آ گئی ہے» پاویل نے جواب دیا ـ پھر ایک دم اسے اپنی بہت پرانی فرمائش کی یاد آئی ـ اور اس نے فیودور کا بازو پکڑکر کہا «کیا آپ میرے پستول کے لئے کچھہ کارتوس دے سکتے ہیں؟ میرے پاس شائد اب صرف تین کارآمد کارتوس رہ گئے ہیں ـ»

ژوخرائی نے سر ہلاکر اپنی مجبوری ظاہر کی، لیکن پاویل کا چہرہ اترا ہوا دیکھہ‌کر اس نے جلدی سے اپنے ماؤزرپستول کا تسمہ کھولا ـ

«لو میں تمہیں یہ تحفہ دیتا ہوں ـ»

پاویل کو پہلے تو یقین نہیں آیا کہ اس کی عرصے کی مراد پوری ہو رہی ہے ـ لیکن ژوخرائی نے تسمہ اس کے کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا:

«لے لو، لے لو! میں جانتا ہوں کہ بہت عرصے سے اس پر تمہاری نظر تھی ـ لیکن دیکھو ذرا خیال رکھنا کہیں ہمارے ہی کسی آدمی کو اس کا نشانہ نہ بنا دینا ـ اور لو اس کے ساتھہ کارتوسوں کی یہ تین پیٹیاں بھی ہیں ـ»

پاویل کو اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ باقی تمام لوگ اسے رشک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

«اے پاوکا» کسی نے چلاکر کہا۔ «مجھ سے سودا کرتے ہو؟ میں تمہیں اس کے بدلے ایک جوڑ جوتے دے سکتا ہوں اور ایک کوٹ گھاتے میں لے لینا۔»

پانکراتوف نے پاویل کو چھیڑتے ہوئے اس کی پیٹھ میں کہنی ماری:

«لاؤ مجھے دیدو۔ میں تمہیں اس کے بدلے میں ایک جوڑا فیلٹ کے جوتے دے دوں گا۔ اور یوں بھی تم اس کا کیا کروگے۔ تم تو اپنے اس برساتی بوٹ میں بڑے دن سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔»

ریل کے ڈبے کی سیڑھی پر ایک پاؤں رکھ کر ژوخرائی نے اپنے گھٹنے کا سہارا لےکر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ریوالور کی پرمٹ لکھدی۔

دوسرے دن بہت سویرے ہی ایک زرہ بند ریل گاڑی پٹڑیوں کی قینچیوں پر کھٹاکھٹ کی آواز کرتی ہوئی اسٹیشن پر آکر رکی۔ انجن سے ہنس کے پروں کی طرح سفید بھاپ کے بادل نکل رہے تھے جو بلور کی سی شفاف سرد ہوا میں جاکر غائب ہو جاتے تھے۔ اس گاڑی کے فولاد کے بنے ہوئے ڈبوں سے چمڑے کی وردیوں میں ملبوس سپاہی اترنے لگے۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر چٹانیں مسمار کرنے والے تین سپاہیوں نے جو اس گاڑی سے آئے تھے ٹیلے میں گڑھے کھودکر کدو کی شکل کے دو بڑے بڑے سیاہ گولے ان میں رکھ دئے، اور پھر ان میں لمبے لمبے فلیتے لگا دئے۔ کام کرنے والوں کو آگاہ کرنے کے لئے انہوں نے ہوا میں کچھ فائر کئے اور تمام لوگ اس خطرناک ٹیلے سے دور بھاگ کر ادھر ادھر بکھر

گئے۔ فلیتے کے ایک سرے پر دیاسلائی دکھا دی گئی اور وہ ایک چھوٹی سی روشن لو کے ساتھ جلنے لگا۔

تھوڑی دیر کے لئے لوگ اپنا دم سادھے رہے ایک دو لمحہ کے لئے بڑا تناؤ رہا پھر زمین کانپی اور ایک بے پناہ قوت نے ٹیلے کے چیتھڑے چیتھڑے اڑا دئے اور مٹی کے بڑے بڑے تودے آسمان کی طرف ایک دھماکے کے ساتھ اڑ گئے۔ دوسرا دھماکہ پہلے سے بھی زیادہ زبردست تھا۔ اس کی گرج آس پاس کے جنگلوں میں گونجی رہی اور مختلف آوازیں خلط ملط ہوکر ایک عجیب سی آواز میں تبدیل ہو گئیں۔

جب دھوئیں اور گرد کے بادل چھٹ گئے تو اس ٹیلے کی جگہ پر ایک گہرا گڑھا منھہ پھاڑے نظر آیا۔ اور کئی گز کے دائرے میں شکر کی طرح صاف اور دانےدار برف پر مٹی بکھر گئی۔

اس دھماکے سے جو غار تیار ہوا تھا اس کی طرف لوگ کدالیں اور پھاوڑے لےکر دوڑ پڑے۔

ژوخرائی کے چلے جانے کے بعد مختلف ٹولیوں میں اپنا کام سب سے پہلے ختم کرنے کی عزت حاصل کرنے کا زبردست مقابلہ شروع ہو گیا۔

طلوع صبح سے بہت پہلے ھی کورچاگن اس بات کا پورا خیال رکھتے ہوئے کہ کوئی دوسرا نہ جاگنے پائے چپکے سے اٹھا اور سرد فرش پر اپنے ٹھٹھرے ہوئے قدموں سے دبے پاؤں چلتا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا۔ وہاں پہونچ کر اس نے چائے کا پانی گرم کیا اور پھر اپنی ٹولی کے باقی لوگوں کو جگانے کے لئے لوٹا۔

جب تک دوسرے لوگ جاگے دن کافی نکل آیا تھا۔

اس صبح پانکراتوف بیرک میں جمع لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا وہاں پہونچا جہاں دوباوا اور اس کی ٹولی کے دوسرے لوگ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

«سنا تم نے متیائی؟» اس نے کافی مشتعل ہوکر کہا۔ «پاوکا آج صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو جگاکر کام پر لے گیا۔ میں دعوے کے ساتھہ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک وہ لوگ کم سے کم بیس گز پٹڑیاں بچھا چکے ہوں گے۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے ریلوے کی کار ورکشاپ کے ان چھوکروں کو جوش دلاکر اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ ان کے قطعہ کا کام پچیس تاریخ تک پورا ہو جائے۔ وہ ہم سب کو نیچا دکھانا چاہتا ہے، لیکن میں بھی خاموش بیٹھنے والا آدمی نہیں ہوں!»

دوباوا معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ وہ بخوبی سمجھہ رہا تھا کہ ریلوے کار ورکشاپ کے ان نوجوانوں نے جو کچھہ کیا تھا اس پر جہاز گھاٹ کی کومسومول تنظیم کا سکریٹری اس قدر بپھرا ہوا کیوں تھا۔ دراصل اس کا دوست پاویل خود اس سے، یعنی دوباوا سے بھی، بازی لے گیا تھا۔ کسی سے ایک لفظ بھی کہے بغیر اس نے پوری کمپنی کو مقابلے کے لئے للکارا تھا۔

«دوست ہونے نہ ہونے سے کچھہ فرق نہیں پڑتا۔ جیتےگا وہی جو سب سے اچھا کام کرےگا» پانکراتوف نے کہا۔

دو پہر کے قریب کورچاگن کی ٹولی پورے زور شور کے ساتھہ کام میں جٹی ہوئی تھی کہ اتنے میں ان کے کام میں ایک ناگہانی خلل پڑ گیا۔ رائفلوں پر پہرہ دینے والے سنتری نے درختوں کے بیچ سے گھوڑ سواروں کے ایک دستے کو اسی سمت آتے دیکھا، اور تمام لوگوں کو آگاہ کر دینے کی غرض سے اس نے ہوا میں گولی چلائی۔

«جوانوں ہتھیار سنبھالو! لٹیرے آ رہے ہیں!» پاویل چلایا۔ اس نے اپنا پھاوڑا پھینک دیا اور قریب کے ایک پیڑ پر لٹکے ہوئے اپنے ماذر پستول کی طرف لپکا۔

باقی لوگوں نے بھی لپک کر اپنی اپنی رائفلیں سنبھال لیں۔ اور زیر تعمیر ریلوے لائن کے کنارے اسی حالت میں اوندھے لیٹ گئے۔ دستے کے آگے والے گھوڑ سواروں نے اپنی ٹوپیاں ہلائیں۔

«خبردار کامریڈ۔ گولی نہ چلانا!» ان میں سے ایک نے چلاکر کہا۔

بدیانی کی فوج کی مخصوص ٹوپیاں لگائے تقریباً پچاس گھوڑ سوار سڑک پر اپنے گھوڑے بڑھائے چلے آ رہے تھے۔ ان کی ٹوپیوں کے آگے چمکدار سرخ ستارے لگے ہوئے تھے۔

پوزیریوسکی کی رجمنٹ کی ایک ٹکڑی دیکھ بھال کے لئے آئی تھی۔ پاویل نے دیکھا کہ گھوڑ سواروں کے کمانڈر کے گھوڑے کے ایک کان کا سرا کٹا ہوا تھا۔ وہ دراصل ایک نہایت خوبصورت بھورے رنگ کی گھوڑی تھی جس کے ماتھے پر ایک سفید داغ تھا۔ وہ اپنے سوار کو پیٹھ پر لئے بڑی بےقراری سے اچھل کود مچا رہی تھی اور جب پاویل نے لپک کر اس کی لگام پکڑی تو کچھ بوکھلاہٹ کے ساتھ بھڑک کر اس نے منھ پھیر لیا۔

«کیوں لسکا کیسی ہو، دوست؟ بہت دنوں میں ملی۔ مجھے تو امید ھی نہیں تھی کہ ہم دونوں کی کبھی ملاقات ہوگی؟ تو تم گولیوں سے بچ گئیں نا میری کن کٹی حسینہ۔»

وہ بڑی محبت کے ساتھ اس کی نازک گردن سے لپٹ گیا، اور اس کے کانپتے ہوئے نتھنوں کو تھپکنے لگا۔

کمانڈر ایک لمحہ تک پاویل کو تکتا رہا، پھر بڑی حیرت سے چلایا:

«ارے یہ تو کورچاگن ہے! گھوڑی کو تو پہچان لیا لیکن اپنے پرانے دوست سریدا کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھا بھی نہیں – کہو دوست کیسے ہو – سلام!»

اسی عرصے میں ریلوے لائن کو جلد سے جلد مکمل کرانے کے لئے شہر میں ہر جگہ دباؤ ڈالا جا رہا تھا – اور ان لوگوں کی ان کوششوں کا اثر فوراً تعمیر کے کام پر دیکھنے میں آیا – ژارکی نے تو واقعی کومسومول کی ضلع کمیٹی کے ممبروں میں جتنے مرد تھے سب کو چھانٹ چھانٹ کر بویارکا بھیجدیا تھا – سولومینکا میں اب صرف لڑکیاں رہ گئی تھیں – اس نے ریلوے کے اسکول سے بھی طالبعلموں کا ایک جتھا بھجوانے کا انتظام کیا –

«اب میں یہاں زنانی پرولتاریہ کے درمیان اکیلا رہ گیا ہوں» اس نے آکم کے سامنے اپنے کام کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے مذاق کیا – «میں تو سوچتا ہوں کہ تالیا لاگوتینا کو یہاں اپنی جگہ بٹھاکر باہر دروازے پر «عورتوں کا محکمہ» کا سائن بورڈ لگا دوں اور خود بویارکا چلا جاؤں – مجھے یہاں بڑا عجیب سا لگتا ہے – اتنی بہت سی عورتوں کے بیچ میں میں اکیلا مرد رہ گیا ہوں – ارے تم نے تو دیکھا نہیں کہ وہ مجھے کیسی کیسی نظروں سے گھورتی ہیں – مجھے یقین ہے دل میں یہی کہتی ہوں گی «دیکھو تو اس مکار مربھکے کو سب کو بھیج دیا خود آرام سے یہیں ڈٹا ہوا ہے – یا شائد اس سے بھی بری بری باتیں کہتی ہوں – مجھے تو تم یہاں سے چھٹی دلا دو –»

لیکن آکم نے ہنس کر اس کی بات ٹال دی –

بویارکا میں نئے مزدور آتے رہے – ان میں ریلوے کے اسکول کے ساتھ طالبعلم بھی تھے –

ژوخرائی نے ریلوے کے حاکموں کو اس بات پر راضی کر لیا

تھا کہ وہ ان نئے نئے کام کرنے والوں کے رہنے کے لئے سواری گاڑی کی چار بوگیاں بھجوا دیں۔

دوباوا کی ٹولی کو چھٹی دے کر ریل کے انجن اور چھوٹی لائن کے پینسٹھ کھلے ڈبے لانے کے لئے پشچا وادتسا بھیج دیا گیا۔ یہ کام ان کے مقررہ کام میں ہی شمار ہونے والا تھا۔

جانے سے پہلے دوباوا نے توکاریف کو مشورہ دیا کہ وہ کلاویچک کو شہر سے بلوا کر بویارکا کی کسی نئی منظم شدہ ٹولی کا لیڈر مقرر کر دے۔ توکاریف نے اس کے مشورے پر عمل کیا لیکن اسے آنا کے اس رقعے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا جو سولومینکا سے آنے والے نئے لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور آنا کے اسی رقعے میں دوباوا کی اس درخواست کا اصلی راز پوشیدہ تھا۔ آنا نے لکھا تھا:

«دمیتری! کلاویچک نے اور میں نے ملکر تمہارے لئے بہت سی کتابیں جمع کی ہیں۔ ہم دونوں تمہیں اور بویارکا کے تمام جان باز مزدوروں کو نہایت پرخلوص پیام تہنیت بھیجتے ہیں۔ تم سب لوگ واقعی بہت ہی قابل فخر ہو! ہم سب کی یہی دلی خواہش ہے کہ تم لوگوں میں اس کام کو پورا کرنے کی قوت اور توانائی قائم رہے۔ کل لکڑیوں کا بچا ہؤا ذخیرہ بھی تقسیم کر دیا گیا۔ کلاویچک تمہیں سلام کہتا ہے۔ وہ بہت ہی عمدہ آدمی ہے۔ بویارکا میں کام کرنے والوں کے لئے تمام روٹیاں وہ خود بناتا ہے۔ خود آٹا چھانتا ہے اور اسے گوندھ کر تیار کرتا ہے۔ وہ بیکری میں کسی اور پر یہ کام چھوڑنے کے لئے راضی نہیں ہوتا۔ اسے کہیں سے بہت عمدہ آٹا مل گیا ہے اور اس کی روٹیاں نہایت لذیذ ہوتی ہیں۔ جیسی روٹیاں مجھے ملتی ہیں ان سے تو کئی درجہ بہتر ہوتی ہیں۔ شام کے وقت ہمارے دوست میرے گھر

پر جمع ہوتے ہیں۔ لاگوتینا، آرتیوخن، کلاویچک اور کبھی کبھی ژارکی بھی۔ ہم لوگ تھوڑا بہت پڑھتے بھی ہیں، لیکن زیادہ‌تر وقت ادھر ادھر کی باتوں میں خصوصاً بویارکا سے متعلق باتوں میں گذر جاتا ہے۔ لڑکیاں توکاریف سے بہت خفا ہیں کہ اس نے انہیں ریلوے لائن کی تعمیر میں حصہ نہیں لینے دیا۔ وہ کہتی ہیں کہ مصیبتیں برداشت کرنے میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ تالیا تو کہتی ہے کہ وہ اپنے باپ کے کپڑے پہن‌کر اکیلی بویارکا چلی جائےگی۔ وہ کہتی ہے «دیکھیں وہ کیسے مجھے وہاں سے نکال دیں‌گے۔»

اگر وہ اپنی دھمکی پر عمل کرے تو مجھے زیادہ تعجب نہ ہوگا۔ اپنے سیاہ چشم دوست سے میرا سلام کہنا۔ آنا۔»

یک بیک ان لوگوں پر ایک برفانی طوفان کا حملہ ہوا۔ نیچے نیچے سرمئی رنگ کے بادل آسمان پر جابجا بکھر گئے اور برف بڑی تیزی کے ساتھہ کافی مقدار میں گرنے لگی۔ رات کے وقت ہوا چمنیوں میں گرجتی گونجتی تھی اور پیڑوں کے درمیان اس طرح گذرتی تھی گویا کراہ رہی ہو۔ برف کے چکر کھاتے ہوئے گالے ہوا اپنے ساتھہ اڑا لے جاتی تھی اور اس کی منحوس کرہ کی صدائے بازگشت جنگل میں گونجنے لگتی تھی۔

تمام رات طوفان اپنے پورے غیظ و غضب کے ساتھہ جاری رہا۔ اور حالانکہ انگیٹھیاں رات بھر سلگتی رہیں لیکن لوگ سردی کے مارے کانپتے ہی رہے۔ اسٹیشن کی شکستہ عمارت میں سردی سے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

صبح ان لوگوں کو اپنے اپنے کام کے قطعے تک پہونچنے کے لئے گہری برف کو کھودکر جانا پڑا۔ لیکن درختوں سے بہت

اوپر، صاف نیلے آسمان پر سورج پوری تابناکی سے چمک رہا تھا۔ آسمان کی شفاف وسعت پر ایک بھی بادل کا دھبہ نہیں تھا۔

کورچاگن اور اس کے ساتھی اپنے قطعے کی برف صاف کرنے کے لئے نکلے۔ پاویل کو آج پہلی بار اس بات کا احساس ھؤا کہ انسان کو سردی سے کتنی تکلیف پہونچ سکتی ھے۔ آکونیف کی تارتار جیکٹ سردی سے اس کی کوئی خاص حفاظت نہیں کر سکتی تھی، اور اس کا برساتی بوٹ ھمیشہ برف سے بھرا رھتا تھا۔ وہ بوٹ باربار برف میں کھو جاتا تھا۔ اور اب تو اس کے دوسرے جوتے کا تلا بھی الگ ھو جانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ اس کی گردن پر دو بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے تھے۔ یہ ٹھنڈے فرش پر سونے کا نتیجہ تھا۔ توکاریف نے اسے ایک تولیہ دیا تھا جسے وہ مفلر کی طرح استعمال کرتا تھا۔

دبلا پتلا پاویل پوری طاقت کے ساتھ برف کھودنے والا لکڑی کا بیلچہ چلا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ھو رھی تھیں۔

اتنے میں ایک سواری گاڑی دھک دھک کرتی ھوئی دھیمی رفتار سے اسٹیشن میں داخل ھوئی۔ اس کا دم توڑتا ھؤا انجن اسے وھاں تک بھی بڑی مشکل ھی سے کھینچ کر لایا تھا۔ انجن کے ایندھن والے ڈبے میں لکڑی کا ایک کندہ بھی نہیں بچا تھا، اور بھٹی میں آخری انگارے اپنا دم توڑ رہے تھے۔

«یا تو ھمیں ایندھن دلوا دو کہ ھم آگے چلے جائیں یا ھماری گاڑی سائیڈنگ میں لگوا دو ابھی ھمارے انجن میں کچھ بھاپ ھے بعد میں وہ بھی نہیں رہ جائے گی!» ڈرائیور نے چلاکر اسٹیشن ماسٹر سے کہا۔

گاڑی سائیڈنگ میں کھڑی کروا دی گئی۔ غصے سے جھنجلائے ھوئے مسافروں کو گاڑی روکنے کی وجہ سمجھائی گئی اور کھچاکھچ بھرے ھوئے ڈبوں میں گالی گلوج اور شکوہ شکایت کا سلسلہ شروع ھو گیا۔

«جاؤ اس بوڑھے سے بات کرکے دیکھو» اسٹیشن ماسٹر نے توکاریف کی طرف اشارہ کرکے ٹرین کے گارڈوں کو مشورہ دیا۔ توکاریف پلیٹ فارم پر اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ «وہ یہاں کی ریلوے لائن کی تعمیر کا سب سے بڑا حاکم ہے۔ ممکن ہے وہ سلیج گاڑی کے ذریعے تمہارے انجن کے لئے کچھ لکڑی منگوا دے۔ وہ لوگ ریلوے لائن کی سلیپروں کے لئے لکڑی استعمال کر رہے ہیں۔»

«میں لکڑی تو دلوا دوں گا۔ لیکن قیمت ادا کرنی پڑے گی» کنڈکٹروں کی درخواست کے جواب میں توکاریف نے کہا۔ «آخر یہ لکڑی ہم نے اپنے کام کے لئے مہیا کی ہے۔ اس وقت برف جم جانے کی وجہ سے ہمارا کام رکا ہوا ہے۔ آپ لوگوں کی گاڑی میں تقریباً چھ سات سو مسافر ہوں گے۔ عورتوں اور بچوں کو تو گاڑی میں ہی چھوڑ دیجئے، لیکن مردوں سے کہیے کہ ہماری مدد کرکے شام تک برف صاف کروا دیں تو ہم آپ کے انجن کے لئے ایندھن دلوا دیں گے۔ اگر وہ اس کے لئے راضی نہ ہوں تو نئے سال کی آمد تک یہیں پڑے رہیں۔»

«ارے دیکھو وہ مجمع کیسا چلا آ رہا ہے! دیکھو اس میں عورتیں بھی ہیں!» ــ کورچاگن نے اپنے پیچھے کسی کو حیرت سے کہتے ہوئے سنا۔ اس نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ اتنے میں توکاریف وہاں پہونچ گیا۔

«دیکھو میں تمہارے لئے سو مددگار لایا ہوں» اس نے کہا۔ «ان سب کو کام پر لگا دو اور دیکھو کوئی کام چوری نہ کرنے پائے۔»

کورچاگن نے نوواردوں کو کام پر لگا دیا۔ ایک لمبے سے شخص نے جو سمور کے کالر والی بہت ہی عمدہ قسم کی ریلوے

کی وردی اور نرم بالوں والی گرم ٹوپی پہنے ہوئے تھا، بڑے غصے سے بیلچا اپنے ہاتھ میں نچایا، اور اپنے ساتھ کی نوجوان عورت سے مخاطب ہؤا جو سگ ماہی کی کھال کی ٹوپی پہنے تھی جس پر ایک بڑا سا گول پھندنا لگا ہؤا تھا۔

«میں برف کھودنے سے قطعی انکار کرتا ہوں اور کسی کو بھی مجھے اس پر مجبور کرنے کا حق نہیں ہے۔ ریلوے انجنیر کی حیثیت سے اگر وہ لوگ چاہیں تو میں اس پورے کام کی نگرانی کا ذمہ لے سکتا ہوں لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی برف نہیں کھودے گا۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔ یہ بوڑھا قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ میں اس پر مقدمہ چلوا سکتا ہوں۔ تمہارا فورمین کہاں ہے؟» اس نے سب سے قریب کھڑے ہوئے مزدور سے پوچھا۔

اتنے میں کورچاگن وہاں آیا۔

«کیوں صاحب، آپ کام کیوں نہیں کر رہے ہیں؟»

اس شخص نے پاویل کو سر سے پاؤں تک حقارت آمیز نظروں سے دیکھا۔

«آخر تم ہو کون۔ پوچھنے والے؟»

«میں ایک مزدور ہوں۔»

«تو پھر مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ اپنے فورمین کو، یا تم جو بھی کہتے ہو اسے، میرے پاس بھیجدو۔»

کورچاگن نے غصے کی نظروں سے اسے دیکھا۔

«اگر آپ کام کرنا نہیں چاہتے تو مت کیجئے۔ لیکن جب تک آپ کے ٹکٹ پر ہم لوگوں کے دستخط نہیں ہوں گے تب تک آپ اس ٹرین پر واپس نہیں جا سکتے۔ اس ریلوے لائن کی تعمیر کے سب سے بڑے افسر کا یہی حکم ہے۔»

"اور خاتون آپ؟" پاویل اس عورت سے مخاطب ہوا اور اسے
دیکھتے ہی حیرت سے دنگ رہ گیا۔ اس کے سامنے تونیا تومانووا
کھڑی تھی!

تونیا کو کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ آوارہ گرد
شخص جو پھٹے پرانے کپڑے اور انتہائی مضحکہ خیز جوتے پہنے
اور گردن میں ایک گندہ سا تولیہ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا
اور جس کا چہرہ نہ جانے کتنے دنوں سے دھلا نہیں تھا، وہی
کورچاگن تھا جسے وہ ایک زمانے میں جانتی تھی۔ صرف اس کی
آنکھوں میں وہی ہمیشہ کی جیسی خوفناک چمک تھی۔ یہ وہی
پاویل کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک اس کی یاد میں محفوظ تھیں۔
ذرا سوچنے کی بات ہے کہ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے اس نے اس
غیرمہذب لاابالی شخص پر اپنی محبت نثار کی تھی۔ ہر چیز کتنی
تیزی سے بدل گئی تھی!

تونیا کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے
ہمراہ شہر جا رہی تھی جہاں وہ ریلوے کے محکمہ میں کسی اونچے
عہدے پر کام کرتا تھا۔ یہ بات کسی کے تصور میں بھی نہ آ
سکتی تھی کہ اس کے لڑکپن کی محبت کا مرکز اسے اس طرح اچانک
مل جائے گا؟ وہ اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھی ہچکچائی۔
واسلی کیا سوچے گا؟ کورچاگن نے اپنے کو اتنا نیچے گرا کر سچ مچ ہی
برا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئلہ جھونکنے والا وہ نوجوان زمین
کی کھدائی کرنے والے مزدور کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکا
تھا۔

وہ شش و پنج کے عالم میں کھڑی رہی۔ اس کے گال جل رہے
تھے۔ اتنے میں ریلوے کے اس انجینئر نے دیکھا کہ وہ گستاخ
آوارہ گرد چھوکرا مسلسل اسکی بیوی کو گھورے جا رہا ہے۔ اس کو

اس بیہودگی پر طیش میں آکر اس نے اپنا بیلچا پھینک دیا اور آکر اپنی بیوی کے قریب کھڑا ہو گیا۔

«آؤ تونیا، چلیں۔ میں اس لیزیرون* کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہیں کر سکتا۔»

کورچاگن «جیوسپ گیری بالڈی» پڑھ چکا تھا۔ اس لئے وہ اس لفظ کے معنی جانتا تھا۔

«ممکن ہے کہ میں لیزیرون ہی ہوں۔ لیکن تمہاری حقیقت ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ سرمایہ‌دار سے زیادہ اور کچھہ نہیں ہے» اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر تونیا کی طرف مخاطب ہوکر سختی کے ساتھہ بولا: «کامریڈ تمانووا ایک بیلچا اٹھاکر کام شروع کر دیجئے۔ اس نمائشی بیل کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش نہ کیجئے۔ اگر یہ آپ کے کوئی عزیز ہوں تو مجھے معاف کیجئے گا۔»

پاویل نے تونیا کے سمور والے جوتوں پر ایک نظر ڈالی اور تلخی سے مسکراتے ہوئے یونہی لگے ہاتھوں کہہ دیا:

«میں تو آپ کو یہاں ٹھیرنے کا مشورہ نہیں دوں‌گا۔ ابھی اس دفعہ رات کو لٹیروں نے ہمارے اوپر حملہ کر دیا تھا۔»

اتنا کہکر وہ مڑا اور وہاں سے سیدھا چل دیا۔ چلتے وقت اس کا برساتی بوٹ پھٹ پھٹ کی آواز کرتا جا رہا تھا۔

اس کے اس آخری جملے کا ریلوے کے انجنیر پر خاصا اثر ہوا، اور تونیا اسے وہاں رک‌کر کام کرنے کے لئے راضی کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس دن شام کو دن بھر کے کام کے بعد یہ مجمع قطار باندھے ہوئے اسٹیشن واپس لوٹا۔ تونیا کا شوہر گاڑی میں جگہ روکنے

---

* نیپلز میں گداگروں کو کہتے ہیں۔

کے لئے آگے بڑھ گیا تھا۔ تونیا مزدوروں کے ایک جتھے کو آگے نکل جانے کا موقع دینے کے لئے رکی ھی تھی کہ اس نے دیکھا کہ پاویل تکان سے بالکل چور اپنے بیلچے پر پوری طرح جھکا ھوا تمام لوگوں کے پیچھے پاؤں گھسیٹتا ھوا چلا آ رھا ھے۔

«ھلو پاولوشا»، اس نے اسے پکارا اور قدم ملاکر اس کے ساتھ چلنے لگی۔ «سچ کہتی ھوں مجھے کبھی یہ اندیشہ نہیں تھا کہ میں تمہیں اس بری حالت میں دیکھوں گی۔ یہاں کے حاکموں کو اتنا تو سمجھنا چاھئے کہ تم زمین کھودنے کے اس ذلیل کام سے کہیں بہتر کام کی صلاحیت رکھتے ھو۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم اب تک کمیسار یا اسی قسم کی کوئی چیز ھو گئے ھوں گے۔ بڑے افسوس کی بات ھے کہ زندگی تم پر اتنی نامہربان رھی ھے....»

پاویل رکا اور تعجب سے تونیا کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا۔

«اور مجھے بھی کبھی اس بات کی توقع نہ تھی کہ میں تمہیں اتنا.... اتنا بنا ٹھنا دیکھوں گا» اس نے اپنے جذبات ادا کرنے کے لئے سب سے نرم لفظ کا انتخاب کر کے کہا۔

تونیا کے کان کی لوئیں تک سرخ ھو گئیں۔

«تم ابھی تک پہلے ھی کی طرح اکھڑ ھو۔»

کورچاگن نے اپنا بیلچا اٹھاکر کندھے پر رکھ لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ھوا آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا۔

«کامریڈ تمانووا، میرا اکھڑپن» اس نے کہا «آپ کی اس نام نہاد شائستگی کے مقابلے میں آدھا بھی تکلیف دہ نہیں ھے۔ اور جہاں تک میری زندگی کا سوال ھے آپ اس کے بارے میں قطعی فکر نہ کریں۔ میری زندگی میں کوئی خرابی نہیں ھے۔ خرابی

ہے شروع سے آخر تک آپ کی زندگی میں ۔ آپ کی زندگی اس سے بھی بدتر ہے جتنا کہ مجھے اندیشہ تھا ۔ دو سال قبل آپ اس سے کہیں بہتر تھیں ۔ اس وقت آپ کو ایک مزدور سے ھاتھہ ملانے میں شرم محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ لیکن اب آپ کے جسم میں کافور کی گولیوں کی بو بسی ہوئی ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ اب ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لئے کچھہ بچا ہی نہیں ہے ۔»

پاویل کے پاس آرتیم کا خط آیا تھا کہ اسکی شادی ہونے والی ہے، اور اس نے پاویل کو شادی کے موقعے پر ضرور آنے کے لئے بڑے اصرار کے ساتھہ لکھا تھا ۔

ایک جھونکے نے کاغذ کا وہ ٹکڑا پاویل کے ھاتھہ سے جھپٹ لیا اور وہ ھوا میں ادھر اڑتا ھوا نہ جانے کہاں چلا گیا ۔ اس کے لئے شادی کی تقریبوں میں شرکت کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ اس موقع پر کام چھوڑکر وہ کیسے جا سکتا تھا؟ ابھی کل ہی وہ بھالو پانکراتوف اس کی ٹولی سے بازی لے گیا تھا ۔ اور اس کی ٹولی اتنی تیز رفتار سے کام کرتی ہوئی آگے بڑھی تھی کہ سب لوگ حیرت میں آ گئے تھے ۔ وہ جہازی مزدور اس مقابلے میں اول آنے کے لئے اپنی جان لڑائے ہوئے تھا ۔ اس کی وہ ھمیشہ والی بے پروائی یکایک نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی، اور وہ اپنی ٹولی کے «جہازگھاٹ کے مزدوروں» کو طوفانی رفتار سے کام کرنے کے لئے جوش دلا رہا تھا ۔

پاتوشکن نے جب ان تمام لوگوں کو خاموشی کے ساتھہ اس طرح بے تحاشہ کام کرتے دیکھا تو وہ متعجب ہوکر اپنا سر کھجانے لگا ۔ «یہ لوگ آدمی ہیں یا دیو؟» اس نے حیرت سے سوچا ۔ «آخر ان میں اتنی حیران کن طاقت کہاں سے آ گئی ہے؟ میری تو سمجھہ میں

نہیں آتا۔ اگر موسم آٹھ دن تک ہمارا ساتھ اور دیدے تو ہم لکڑی کے ذخیرے تک پہونچ جائیں گے۔ زندہ رہنا اور زندگی کے تجربے سے کچھ سیکھنا یہی تو ہمارا فرض ہے! یہ لوگ کام کی رفتار کے تمام قائم شدہ معیار توڑکر آگے نکل گئے ہیں اور انہوں نے ہمارے تمام اندازے غلط ثابت کر دئے ہیں۔»

کلاویچک شہر سے اپنی پکائی ہوئی آخری روٹیاں لےکر وہاں پہونچا۔ اس نے توکاریف سے گفتگو کی اور پھر کورچاگن سے ملنے چلا گیا۔ دونوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ کلاویچک نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے تھیلے کی گہرائی میں ہاتھ ڈالکر سویڈن کی بنی ہوئی سمور کے استر والی ایک بہت ہی خوبصورت چمڑے کی جیکٹ نکالی۔

«یہ تمہارے لئے لایا ہوں» اس نے ملائم چمڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ «اچھا بتاؤ کس نے بھیجی ہے؟ کیا کہا تمہیں نہیں معلوم؟ یار تم ہو نرے بدھو۔ ارے یہ بھیجی ہے کامریڈ استینووچ نے۔ اب تمہیں سردی لگنے کا خطرہ نہیں رہا۔ اسے یہ آلشنسکی نے دی تھی۔ اس کے ہاتھ سے لےکر اس نے سیدھے میرے حوالے کر دی اور کہا میں اسے تمہارے پاس پہونچا دوں۔ آکم نے اسے بتایا تھا کہ تم اس برف باری میں صرف ایک پتلی سی جیکٹ پہن کر کام کر رہے ہو۔ آلشنسکی اس کی اس حرکت پر بہت جزبز ہوا۔ وہ بولا «ان کامریڈ کے لئے میں فوجی کوٹ بھجوا دوں گا۔» لیکن ریتا اس کی بات ہنسی میں ٹال گئی وہ بولی «فکر مت کرو۔ وہ اس جیکٹ کو پہن کر زیادہ اچھی طرح کام کرے گا۔»

حیرت زدہ پاویل نے وہ نہایت شاندار جیکٹ لے لی، اور کچھ دیر تک جھجکنے کے بعد اسے اپنے ٹھٹھرے ہوئے جسم پر پہن لیا۔ جیکٹ پہنتے ہی اسے ایسا محسوس ہؤا کہ نرم سمور کی حرارت اس کے شانوں اور اس کے سینے تک پھیلی جا رہی ہے۔

ریتا نے اپنی ڈائری میں لکھا:

۲۰ دسمبر

ہم لوگوں کو مسلسل برف کے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ برف اور آندھی۔ بویارکا میں وہ لوگ تقریباً اپنی منزل تک پہونچ گئے تھے کہ برف باری اور طوفانوں نے ان کا کام بالکل روک دیا۔ وہاں ہر طرف برف کے پہاڑ بنے ہوئے ہیں اور جمی ہوئی مٹی کھودنا آسان نہیں۔ اب صرف آدھے میل لمبی لائن بنانی باقی رہ گئی ہے، لیکن یہی حصہ سب سے زیادہ مشکل ہے۔

توکاریف نے اطلاع بھیجی ہے کہ وہاں ٹائی فائیڈ شروع ہو گیا ہے۔ تین آدمی اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

۲۲ دسمبر

کومسومول کی گبرنیا کمیٹی کی ایک بڑی بیٹھک ہوئی تھی۔ لیکن بویارکا سے کوئی نہیں آیا۔ لٹیروں نے بویارکا سے تقریباً گیارہ میل کے فاصلے پر اناج سے لدی ہوئی ایک گاڑی الٹ دی تھی اور وزارت غذا کے ایک نمائندے نے حکم دیا کہ ریلوے لائن کی تعمیر کا کام کرنے والے تمام لوگ وہاں بھیجدئے جائیں۔

۲۳ دسمبر

بویارکا سے ٹائی فائیڈ کے سات اور مریض شہر لائے گئے ہیں۔ ان میں آکونیف بھی ہے۔ میں اسٹیشن گئی تھی وہاں میں نے ان لوگوں کی برف میں اکڑی ہوئی لاشیں دیکھیں جو ریل گاڑی کے بفر پر کھڑے ہوکر سفر کر رہے تھے۔ یہ لاشیں خارکوف والی گاڑی سے اتاری گئی تھیں۔ ہسپتالوں کو گرم رکھنے کا کوئی

انتظام نہیں ہے۔ یہ کم‌بخت برف کا طوفان! نہ جانے کب ختم ہوگا یہ؟

۲۴ دسمبر

ابھی ژوخرائی سے ملکر آئی۔ انہوں نے اس خبر کی تصدیق کی کہ کل رات آرلک نے اپنے پورے گروہ کے ساتھہ بویارکا پر حملہ کیا تھا۔ دو گھنٹے تک جم‌کر لڑائی ہوئی۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دئے گئے تھے، اس لئے آج صبح تک ژوخرائی کو مکمل رپورٹ نہیں مل پائی تھی۔ لٹیروں کے گروہ کو کھدیڑ دیا گیا، لیکن اس ٹکر میں توکاریف زخمی ہو گیا ہے۔ ایک گولی اس کے سینے کے آر پار نکل گئی ہے۔ اسے آج شہر لایا جائےگا۔ حملے کے وقت فرینز کلاویچک پہرے پر تھا۔ وہ جان سے مارا گیا۔ سب سے پہلے اسی نے لٹیروں کے گروہ کو دیکھا تھا اور سب کو خبردار کرنے کے لئے شور مچایا تھا۔ اس نے حملہ آوروں پر گولی چلانا شروع کیا لیکن اسکول کی عمارت تک پہونچنے سے پہلے ہی ان لوگوں نے اسے دھر دبوچا۔ تیغ کے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام ہو گیا۔ تعمیر پر کام کرنے والے گیارہ مزدور زخمی ہوئے۔ اب وہاں پر ایک زرہ بند ریل گاڑی اور گھوڑ سوار فوجوں کے دو رسالے پہونچ گئے ہیں۔

پانکراتوف نے ریلوے لائن کی تعمیر کے کام کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ لٹیروں کے گروہ کے ایک حصے کو پوزی‌ریوسکی نے گلوبوکی نامی گاؤں میں گھیرکر اس کا صفایا کردیا۔ کچھہ غیر پارٹی مزدور ریل گاڑی کا انتظار کئے بغیر ہی شہر کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے پیدل آ رہے ہیں۔

۲۵ دسمبر

توکاریف اور دوسرے زخمی لوگ یہاں پہونچ گئے، اور انہیں هسپتال میں بھرتی کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ اس

بوڑھے کو بچا لیں گے۔ وہ ابھی تک بےہوش ہے۔ باقی لوگوں کی جان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

بویارکا سے ہمارے اور گبرنیا پارٹی کمیٹی کے نام ایک تار آیا ہے «لٹیروں کے حملے کے جواب میں، اس میٹنگ میں شریک ہونے والے ہم تمام لوگ جو چھوٹی لائن کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں اور ہمارے ساتھ زرہ بند ٹرین «برائے سوویت اقتدار» پر کام کرنے والے لوگ اور گھوڑ سوار رجمنٹ کے سرخ سپاہی آپ کو قول دیتے ہیں کہ تمام دشواریوں کے باوجود یکم جنوری تک ایندھن شہر پہونچ جائے گا۔ اپنی تمام طاقت مجتمع کر کے ہم لوگ کام میں جٹ رہے ہیں۔ ہمیں یہاں بھیجنے والی کمیونسٹ پارٹی زندہ باد! ۔ میٹنگ کا صدر کورچاگن ۔ سکریٹری برزین ۔»

کلاویچک کو پورے فوجی اہتمام کے ساتھ سولومینکا میں دفن کیا گیا۔

وہ لوگ اپنی منزل مقصود کے بہت قریب آ گئے تھے۔ لیکن ان کی اس کی طرف بڑھنے کی رفتار بہت ہی تکلیف دہ حد تک سست تھی کیوں‌کہ ریلوے لائن کی تعمیر کرنے والوں کی صفوں میں سے ہر روز درجنوں لوگ، جن کی وہاں سخت ضرورت تھی، ٹائی‌فائیڈ کا شکار ہو جاتے تھے۔

ایک دن کام پر سے اسٹیشن واپس آتے وقت کورچاگن شرابیوں کی طرح لڑکھڑانے لگا اور اس کی ٹانگیں بالکل جواب دینے لگیں۔ کافی عرصے سے اس پر بخار کی کیفیت طاری تھی لیکن آج بخار کا غلبہ معمول سے بہت زیادہ خوفناک ہو گیا تھا۔

ٹائی‌فائیڈ بخار ریلوے لائن کے معماروں کی صفوں میں سے بہت سے لوگوں کو چھین چکا تھا۔ آج اسے ایک نیا شکار مل گیا۔ لیکن پاویل کا جفاکش جسم بیماری کا مقابلہ کرتا رہا اور

بخار کی حالت میں بھی متواتر پانچ دن تک وہ اپنی رہی سہی طاقت سمیٹ‌کر سمینٹ کے فرش پر بچھے ہوئے پیال کے بستر سے اٹھہ کر باقی لوگوں کے ساتھہ کام پر جاتا رہا ـ لیکن بخار نے اسے اپنے شکنجے میں پوری طرح جکڑ لیا تھا، اور اب کوئی بھی چیز اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی ـ نہ وہ گرم جیکٹ، نہ فیلٹ کے وہ جوتے جو فیودور نے تحفے کے طور پر اسے بھیجے تھے، اور جنہیں اس نے اپنے برف سے گلتے ہوئے پاؤں پر پہن لیا تھا ـ

ہر قدم کے ساتھہ اس کے سینے میں ایک شدید درد اٹھتا تھا، اس کے دانت بج رہے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا اندھیرا سا چھانے لگا تھا کہ اسے درخت ایک عجیب انداز میں چکر کاٹتے ہوئے نظر آ رہے تھے ـ

بڑی مشکل سے گھسٹتا ہؤا وہ کسی طرح اسٹیشن پہونچا ـ وہاں ایک غیرمعمولی ہنگامہ برپا دیکھہ‌کر وہ رک گیا، اور بخار سے دھندلائی ہوئی آنکھوں پر زور دینے لگا ـ اسنے کھلے ہوئے ڈبوں والی ایک لمبی سی مال گاڑی پلیٹ‌فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑی دیکھی ـ اس گاڑی کے ساتھہ آتے ہوئے لوگ چھوٹی لائن کے انجن، ریل کی پٹڑیوں اور سلیپر اتارنے میں مصروف تھے ـ پاویل آگے کی طرف لڑکھڑایا اور اپنے جسم کا توازن کھو بیٹھا ـ جب اس کا سر زمین سے ٹکرایا تو اسے ایک میٹھے میٹھے درد اور اپنے تپتے ہوئے گالوں پر برف کی خوشگوار ٹھنڈک کا احساس ہوا ـ

کئی گھنٹے بعد اس کا پتہ لگا اور اسے اٹھاکر بیرک میں لے جایا گیا ـ وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا، اور اپنے آس پاس کی ہر چیز سے بےخبر تھا ـ زرہ‌بند ٹرین سے ایک فوجی ڈاکٹر نے آکر اسے دیکھا اور تشخیص کرکے بتایا کہ وہ نمونیہ اور ٹائی‌فائیڈ میں مبتلا ہے ـ اسے ۱۰٦ ڈگری بخار تھا ـ ڈاکٹر نے اس

کے جوڑوں کی سوجن اور گردن کے پھوڑوں کو بھی دیکھا لیکن اس کی رائے میں نمونیہ اور ٹائی فائیڈ کے مقابلے میں ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اور یہ دو بیماریاں ہی اس کی جان لینے کو کافی تھیں۔

پانکراتوف اور دوباوا نے، جو شہر سے واپس آ گیا تھا، پاویل کی جان بچانے کے لئے کوئی بھی کوشش اٹھا نہ رکھی۔

آلیوشا کوخانسکی کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ پاویل کو اس کے گھر پہونچا آئے۔ آلیوشا بھی پاویل کے شہر کا رہنے والا تھا۔

کورچاگن کی ٹولی کے تمام لوگوں اور خصوصاً خولیاوا کی مدد سے جو بیشتر بار اپنے اوپر سنبھالے ہوئے تھا، پانکراتوف اور دوباوا نے کسی طرح آلیوشا اور بے ہوش پاویل کو بری طرح بھرے ہوئے ریل کے ڈبے میں سوار کرا دیا۔ مسافروں کو شبہ تھا کہ اسے ٹائیفیس ہے اس لئے انہوں نے اسے اندر آنے سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن جب وہ اندر داخل ہو ہی گئے تو انہوں نے مریض کو راستے میں چلتی گاڑی سے باہر پھینکدینے کی دھمکی دی۔

خولیاوا نے اپنے پستول سے انہیں دھمکاتے ہوئے گرج کر کہا:

«اس کی بیماری چھوت کی بیماری نہیں ہے! اور وہ اسی گاڑی سے جائے گا۔ چاہے اس کے لئے ہمیں تم سب لوگوں کو گاڑی سے نیچے پھینکدینا پڑے۔ اور یاد رکھنا سوروں اگر کسی نے اس پر انگلی بھی اٹھائی تو میں اگلے اسٹیشن پر خبر بھجوا کر تم سب لوگوں کو گاڑی سے اترواکر جیل میں بند کروا دوں گا۔ آلیوشا یہ لو پاوکا کا ماؤزر اور جو بھی اسے اتارنے کی کوشش کرے اسے فوراً گولی مار دینا» خولیاوا نے آخری فقرے پر مزید زور دیتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

گاڑی بھک بھک کرتی ہوئی اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ پانکراتوف دوباوا کے پاس گیا جو ویران پلیٹ فارم پر تنہا کھڑا تھا۔

«تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ ٹھیک ہو جائے گا؟»

اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

«آؤ متیائی چلیں۔ مجبوری ہے ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اب ہر چیز کے لئے ہمیں ہی جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ہمیں آج رات ہی میں وہ انجن اتروا لینے چاہیں اور کل صبح ہم انہیں گرمانے کی کوشش کریں گے۔»

خولیاوا نے اس پوری لائن پر چیکا کے اپنے تمام دوستوں کو ٹیلیفون کرکے ان سے اس بات کا خیال رکھنے کو کہہ دیا کہ بیمار کورچاگن کو کہیں راستے میں نہ اتارا جائے۔ جب تک اسے اس بات کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہو گیا تب تک وہ سویا نہیں۔

اسی لائن پر اگلے کسی اسٹیشن پر ادھر سے گذرنے والی سواری گاڑی کے ایک ڈبے سے سنہرے بالوں والے کسی گمنام نوجوان کی لاش اتارکر پلیٹ فارم پر رکھی گئی۔ کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ کون تھا اور کیسے مرا تھا۔ خولیاوا کی ہدایت یاد آتے ہی اس اسٹیشن پر تعینات چیکا کے آدمی دوڑکر اس ڈبے کے قریب آ گئے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ نوجوان مر چکا ہے، تو انہوں نے اس کی لاش مردہ گھر بھجوا دی، اور فوراً بویارکا ٹیلیفون کرکے خولیاوا کو اس کے دوست کی موت کی اطلاع دیدی جس کی جان بچانے کے لئے وہ اتنا پریشان تھا۔

بویارکا سے ایک مختصر سے تار کے ذریعے کومسومول کی گبرنیا کمیٹی کو کورچاگن کے انتقال کی اطلاع بھیج دی گئی۔

لیکن اسی دوران میں آلیوشا کوخانسکی بیمار کورچاگن کو اس کے عزیزوں کے پاس اس کے گھر پہونچا آیا تھا، اور خود بخار میں مبتلا ھوکر بستر سے لگ گیا تھا۔

«۹ جنوری

آج میرے دل میں یہ ٹیس سی کیوں اٹھہ رھی ھے؟ یہ لکھنے بیٹھنے سے پہلے میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اب تک بھلا کون یقین کر سکتا تھا کہ ریتا بھی رو سکتی ھے، اور وہ بھی اتنے کرب کے ساتھہ؟ لیکن کیا آنسو ھمیشہ کمزوری کی علامت ھوتے ھیں؟ آج میرے آنسو غم کے امنڈتے ھوئے ایک طوفان کے آنسو ھیں۔ لیکن آج فتح کے دن یہ غم کیوں، جب کہ سردی کی ھولناکیوں پر قابو پایا جا چکا ھے، جب کہ ریلوے اسٹیشنوں پر گران قدر ایندھن کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ھیں، جب کہ میں ابھی فتح کے جشن سے لوٹی ھوں۔ آج جشن منانے کے لئے شہر کی سوویت کی ایک خاص میٹنگ ھوئی تھی جہاں ریلوے لائن کی تعمیر میں حصہ لینے والے بہادروں کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ یہ ھماری فتح ھے لیکن اس فتح کو ممکن بنانے کے لئے دو آدمیوں کو — کلاویچک اور کورچاگن کو — اپنی جان کی قربانی دینی پڑی۔

پاویل کی موت نے مجھہ پر حقیقت پوری طرح واضح کر دی ھے۔ جتنا کہ میں سمجھتی تھی اس سے وہ مجھے کہیں زیادہ عزیز تھا۔

اور اب میں اس ڈائری کو ختم کرتی ھوں اور مجھے شبہ ھی ھے کہ میں دو بارہ کبھی بھی اسے شروع کر پاؤ گی۔ کل میں خارکوف خط لکھہ رھی ھوں۔ مجھے یوکرین کومسومول کی مرکزی کمیٹی میں کام کرنے کی دعوت دی گئی ھے۔ میں نے اسے قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ھے۔»

تیسرا باب

لیکن نوجوانی کی فتح ہوئی۔ پاویل ٹائی فائیڈ کے چنگل سے نکل آیا۔ یہ چوتھی مرتبہ وہ موت کی سرحد پار کرکے پھر زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ لیکن بستر سے اٹھنے کے قابل ہونے میں اسے پورا ایک مہینہ لگ گیا۔ وہ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گیا تھا، اور اس کا جسم پیلا پڑ گیا تھا۔ اپنی ڈگمگاتی ہوئی ٹانگوں پر دھیرے دھیرے لڑکھڑاتے ہوئے دیوار کا سہارا لےکر اس نے کمرے کو پار کیا۔ پھر اپنی ماں کی مدد سے وہ کھڑکی تک پہونچا اور بڑی دیر تک وہاں کھڑا سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ سڑک کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں بھری ہوئی پگھلی ہوئی برف موسم بہار کے ابتدائی دنوں کی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس سال برف پگھلنے کی ابھی ابتدا ہی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے ٹھیک سامنے بھورے سینے والی ایک گورئیا چیری کے درخت کی شاخ پر بیٹھی اپنی چونچ سے پروں کو سنوار رہی تھی اور بیچ بیچ میں وہ چپکے سے پاویل پر جلدی جلدی ایک گھبرائی ہوئی نظر ڈال لیتی تھی۔

«اچھا تو ہم نے اور تم نے دونوں ہی نے سردیاں خیریت سے گذار دیں، کیوں؟» پاویل نے کھڑکی کے شیشے کو دھیمے سے انگلی سے کھٹ کھٹاتے ہوئے کہا۔

اس کی ماں نے چونک کر دیکھا۔

«وہاں کھڑے کس سے باتیں کر رہے ہو؟»

«گورئیا سے... ارے لو وہ تو اڑ بھی گئی۔ شریر کہیں کی» اور پاویل کے چہرے پر ایک نقاہت آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔

موسم بہار جب اپنے پورے شباب پر پہونچا اس وقت تک پاویل شہر واپس جانے کی بابت سوچنے لگا تھا۔ اب اس میں چلنے پھرنے کے لائق طاقت آ گئی تھی۔ لیکن کوئی غیبی روگ اس کے جسم کی تمام قوت نچوڑے لے رہا تھا۔ ایک دن باغ میں ٹہلتے وقت اس کی ریڑھ کی ہڈی میں شدید تکلیف دہ درد اٹھا اور وہ لڑکھڑاکر گر پڑا۔ بڑی مشکل سے گھسٹتا ہوا کسی طرح وہ اپنے کمرے میں واپس پہونچا۔ دوسرے ہی دن اس نے بڑی تفصیل کے ساتھہ اپنا ڈاکٹری معائنہ کرایا۔ پاویل کی پیٹھہ کا معائنہ کرتے وقت ڈاکٹر کو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک گہرا سا خم نظر آیا، اور وہ تعجب سے بھاری آواز میں بولا:

«یہ کیا ہوا؟»

«یہ روونو کی لڑائی کے زمانے کا ہے۔ ایک بار تین انچی توپ کا ایک گولہ ہمارے پیچھے بڑی سڑک پر پھٹا اور ایک پتھر میری پیٹھہ پر لگا۔»

«لیکن تم اب تک چلتے کیسے رہے؟ کبھی اس میں تکلیف نہیں ہوئی؟»

«نہیں۔ اس واقعہ کے بعد بس ایک دو گھنٹے تک تو مجھہ سے اٹھا نہیں گیا، لیکن پھر رفتہ رفتہ درد غائب ہو گیا اور میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر آگے بڑھ گیا۔ اس وقت سے یہ پہلی بار اس میں تکلیف ہوئی ہے۔»

اس خم کا غور سے معائنہ کرتے وقت ڈاکٹر کا چہرہ بہت گمبھیر ہو گیا۔

«ہاں دوست یہ معاملہ ہے تو بڑا سنگین۔ ریڑھ کی ہڈی عام طور پر اس قسم کی گڑبڑ برداشت نہیں کرتی۔ خدا کرے کہ تکلیف دور ہو جائے۔»

ڈاکٹر بڑی ہمدردی کے ساتھہ اپنے مریض کو کپڑے پہنتے دیکھتا رہا ـ اس کے چہرے پر پریشانی بھی تھی جسے وہ چھپا نہیں سکتا تھا ـ

آرتیم اپنے سسرال والوں کے ساتھہ رہتا تھا ـ اس کی بیوی ستیوشا معمولی سے ناک نقشے کی ایک نوجوان کسان عورت تھی، اور وہ ایک بہت ہی مفلس خاندان کی بیٹی تھی ـ ایک دن پاویل اپنے بھائی سے ملنے گیا ـ ایک ترچھی آنکھوں والے، میلے سے چھوکرے نے جو اس چھوٹے سے گندے صحن میں کھیل رہا تھا پاویل کو گھور کر دیکھا، اور بڑے بھونڈوپن سے اپنی ناک پونچھتے ہوئے سوال کیا:

«کیا چاھئے تمہیں؟ شاید تم چور ہو؟ اگر خیریت چاھتے ہو تو یہاں سے بھاگ جاؤ نہیں تو ابھی ماں تمہاری خبر لیں گی!»

ایک بدنما پرانی سی جھونپڑی میں چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور آرتیم نے باہر جھانک کر دیکھا ـ

«اندر آ جاؤ پاویل» اس نے پکار کر کہا ـ

ایک بڑھیا جس کا چہرہ چرمی کاغذ کی طرح زرد تھا چولھے کے پاس بیٹھی کھانا پکانے میں مصروف تھی ـ جب پاویل ادھر سے گذرا تو اس بڑھیا نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا گویا اس کا وھاں آنا اسے سخت ناگوار تھا، اور پھر وہ اپنے برتن بھانڈوں میں مصروف ہو گئی ـ

لمبی لمبی چوٹیوں والی دو لڑکیاں چولھے کے اوپر چڑھ گئیں، اور وھاں سے ننھے جنگلیوں کے مخصوص تجسس کے ساتھہ منھہ کھولے اس نووارد کو دیکھنے لگیں ـ

میز کے قریب بیٹھا ہؤا آرتیم کچھہ بےچین سا نظر آ رہا تھا ـ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اس کی شادی سے نہ اس

کی ماں خوش تھی اور نہ اس کا بھائی۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ آخر کس وجہ سے آرتیم جس کا خاندان کئی پشتوں سے مزدور طبقے سے تعلق رکھتا تھا، سنگتراش کی خوبصورت بیٹی گالیا سے قطع تعلق کرکے، جس سے وہ پچھلے تین برس سے عشق کرتا تھا، جاکر ستیوشا جیسی نکمی اور جاہل عورت کے چکر میں پھنس گیا تھا جب کہ گالیا خود بھی سلائی کا کام کرتی تھی، اور یہاں تو آرتیم کو اکیلی اپنی کمائی سے پانچ آدمیوں کا پیٹ بھرنا پڑتا تھا۔ ریلوے کی ورکشاپ میں دن بھر سخت محنت کرنے کے بعد اب اسے اپنے سسرال والوں کی تباہ حال کھیتی باڑی کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے هل بھی چلانا پڑتا تھا۔

آرتیم جانتا تھا کہ پاویل اس سے بہت نالاں تھا، کیوں‌کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا بھائی آرتیم مزدور طبقے سے کنارہ کش ہوکر بقول اس کے «متوسط طبقے کے عناصر» میں جا ملا تھا۔ اور اسی لئے وہ خاموشی کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کو آس پاس کی چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ دونوں تھوڑی دیر تک بیٹھے اس قسم کی رسمی اور غیر اہم گفتگو کرتے رہے جیسی کہ عام طور پر اتفاق سے مل جانے والے دو شخصوں کے درمیان ہوتی ہے۔ پاویل جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن آرتیم نے اسے روک لیا۔

«ذرا دیر رک جاؤ۔ کچھ کھاکر جانا۔ ستیوشا ابھی دودھ لے کر آتی ہوگی۔ تو تم کل پھر چلے جاؤگے؟ پاوکا کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ تمہارے جسم میں کافی طاقت آ گئی ہے؟»

ستیوشا اندر داخل ہوئی اور پاویل کو سلام کرکے کھلیان سے کوئی چیز اٹھواکر لانے کے لئے آرتیم کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ پاویل وہاں اس کھوسٹ بڑھیا کے پاس اکیلا رہ گیا۔ کھڑکی سے

گرجا گھر کے گھنٹے کی آواز آ رہی تھی — بڑھیا نے سنڑانسی رکھ
دی اور بد مزاجی سے بڑبڑانے لگی:
«اے خدا تو گواہ ہے کہ گھر کے اس کم بخت کام کاج کے
جھنجھٹ میں دعا پڑھنے کی بھی تو فرصت نہیں ملتی —» اس نے اپنی
شال اتاری اور نووارد کو کنکھیوں سے دیکھ کر اس کونے کی طرف
چلی گئی جہاں مقدس شبیہیں ٹنگی ہوئی تھیں — وہ ایک
عرصہ دراز سے رکھے رکھے میلی کچیلی اور پرانی ہو گئی تھیں — اپنی
تین سوکھی ہوئی انگلیاں کس کر ایک دوسرے سے ملاکر اس نے
اپنے جسم پر صلیب کا نشان بنایا —
«اے میرے باپ تو جو کہ آسمان میں ہے تیرا نام ہمیشہ روشن
رہے» اس نے اپنے مرجھائے ہوئے ہونٹوں سے چپکے چپکے کہا —
باہر صحن میں کھیلنے والا چھوکرا کودکر لٹکتے ہوئے کانوں
والے سیاہ رنگ کے ایک سور پر سوار ہو گیا — اس نے اپنی چھوٹی
چھوٹی ننگی ایڑیاں اس کے پہلوؤں میں کس کر گاڑ لیں اور اس
کے سخت بال پکڑکر وہ اس بھاگتے ہوئے اور غراتے ہوئے جانور
سے چیخ چیخ کر کہنے لگا:
«چل بے چل! ٹخ ٹخ، چل جلدی!»
سور اس لڑکے کو اپنی پیٹھ پر لئے دیوانہ وار صحن میں ادھر
ادھر دوڑ رہا تھا اور اسے پیٹھ سے گرا دینے کی پوری کوشش کر
رہا تھا — لیکن وہ ترچھی آنکھوں کا شیطان بچہ مضبوطی کے ساتھ
اپنی جگہ پر جما بیٹھا تھا —
بڑھیا نے دعا پڑھنا روک کر کھڑکی سے باہر سر نکال کر
دیکھا —
«ارے دوزخی کتے اتر فوراً سور پر سے — نہیں تو میں تیری
چمڑی ادھیڑ کے رکھدوں گی — خدا کی مار ہو تجھ پر!»
سور نے آخرکار اپنے ایذا پہونچانے والے اس چھوکرے کو

زمین پر پٹک دیا اور بڑھیا مطمئن ہوکر اپنی شبیہوں کے پاس لوٹ گئی، اور اپنے چہرے پر تقدس کی کیفیت زبردستی طاری کرکے پھر دعا پڑھنے لگی:

«تیری سلطنت...»

اسی وقت وہ چھوکرا دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ آستین سے اپنی بہتی ہوئی ناک پونچھ‌کر اور درد کی وجہ سے سسکیاں لیتے ہوئے اس نے منمناکر کہا:

«نانی ہمیں ایک ٹکیہ دیدونا۔»

بڑھیا غصہ ہوکر اس پر برس پڑی:

«دیکھتا نہیں کہ میں دعا پڑھ رہی ہوں؟ ٹھیر جا بھینگے شیطان کے بچے ابھی تجھے ٹکیہ کا مزا چکھائے دیتی ہوں!...» اور یہ کہکر اس نے بینچ پر پڑا ہوا ایک چابک جھپٹ‌کر اٹھا لیا۔ لڑکا پلک جھپکاتے میں وہاں سے غائب ہو گیا۔ چولھے کے اوپر چڑھی ہوئی دونوں لڑکیاں منھہ دباکر کھی‌کھی کرکے ہنس دیں۔

بڑھیا تیسری بار اپنی عبادت کی طرف رجوع ہوئی۔

پاویل اپنے بھائی کا انتظار کئے بغیر ہی اٹھ‌کر چلا گیا۔ باہر کا پھاٹک بند کرتے وقت اس نے دیکھا کہ وہ بڑھیا مکان کے سرے والی کھڑکی سے جھانک‌کر اسے شبہ کی نظروں سے دیکھہ رہی ہے۔

«آرتیم پر نہ جانے کونسا بھوت سوار ہوا تھا کہ یہاں آکر پھنس گیا؟ اب وہ تمام عمر کے لئے یہیں کا ہوکر رہ جائےگا۔ ہر سال ستیوشا کے ایک بچہ ہوگا اور آرتیم گڑ کی مکھی کی طرح یہاں چپک‌کر رہ جائےگا۔ ممکن ہے کہ وہ کارخانے میں اپنا کام بھی چھوڑ دے» شہر کی سنسان سڑکوں پر جاتے وقت پاویل بہت

افسردہ ہوکر اسی قسم کے خیالات میں گم رہا۔ «اور میں نے سوچا تھا کہ میں اسے سیاسی کام میں دلچسپی دلاؤں گا۔»

پاویل اس خیال سے بہت خوش تھا کہ کل وہ یہ جگہ چھوڑ کر ایک بار پھر اپنے بہت ہی عزیز دوستوں اور ساتھیوں کے پاس بڑے شہر کے لئے روانہ ہو جائے گا۔ وہ بڑا شہر ایک مقناطیس کی طرح پاویل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ بڑے شہر میں زندگی تھی! طرح طرح کی سرگرمیوں کی چہل پہل تھی۔ وہاں انسانوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ وہاں ٹرامیں کھڑکھڑاتی تھیں اور موٹروں کے ہارن چیختے تھے لیکن وہ سب سے زیادہ بے قرار تھا فیکٹری کی ان بڑی بڑی پکی عمارتوں، دھوئیں سے کالی ورکشاپوں، مشینوں اور حرارت منتقل کرنے والی پٹیوں کے گھومنے کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ کے لئے۔ وہ بے قرار تھا مشینوں کے دیوھیکل پہیوں کی تیز گردش دیکھنے کے لئے، مشین کے تیل کی خوشبو کیلئے۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں اس کی زندگی کا ایک جز بن گئی تھیں۔ اس چھوٹے سے قصباتی شہر میں رہ کر جس کی سڑکوں پر وہ اسوقت چل رہا تھا، اس کے دل پر اداسی اور مایوسی کا ایک مبہم سا جذبہ چھا جاتا تھا۔ اسے اس بات پر تعجب نہیں تھا کہ وہ اب یہاں اپنے آپ کو ایک اجنبی محسوس کرنے لگا تھا۔ دن کے وقت شہر میں نکلنا بھی اس کے لئے ایک عذاب بن گیا تھا۔ اپنے مکانوں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر گپ لڑاتی ہوئی عورتوں کے قریب سے ہوکر جب وہ گزرتا تو ان کی بے معنی گفتگو کے کچھ حصے اس کے کان میں پڑ ہی جاتے تھے:

«ارے دیکھو تو یہ ہونق کون ہے؟»

«معلوم ہوتا ہے کہ دق کا کوئی مریض ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے پھیپھڑوں میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔»

«مگر جیکٹ تو دیکھو کیسی عمدہ پہنے ہے — میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یقیناً چوری کی ہوگی —»

اور اسی قسم کی نہ جانے کتنی مہمل باتیں — پاویل کو ان سب باتوں سے کوفت ہونے لگی تھی —

وہ بہت عرصہ پہلے ہی ان تمام چیزوں سے اپنا ناتا بالکل توڑ چکا تھا — وہ بڑا شہر اب اسے یہاں کے مقابلے میں زیادہ عزیز معلوم ہونے لگا تھا، کیوں‌کہ اس کے ساتھ وہ رفاقت اور محنت کے مضبوط اور زندگی بخش بندھنوں سے بندھا ہؤا تھا —

جب اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا تب تک وہ صنوبر کے جنگل میں پہونچ چکا تھا — اس دوراہے پر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا — اسکی داهنی طرف پرانا جیل خانہ تھا جس کے اور جنگل کے درمیان نوکدار چھڑوں کا ایک اونچا سا جنگلہ تھا، اور اس کے اس پار هسپتال کی سفید عمارتیں تھیں —

یہیں اسی کھلے میدان میں جلادوں کے پھانسی کے پھندوں نے والیا اور اس کے ساتھیوں کے گلے گھونٹ کر ان کے جسم سے زندگی کی حرارت نچوڑ لی تھی — پاویل تھوڑی دیر تک اس جگہ خاموش کھڑا رہا جہاں پھانسی کا تختہ تیار کیا گیا تھا — اس کے بعد وہ چٹان کی طرف چل دیا اور ڈھلان پر اترتا ہوا اس چھوٹے سے قبرستان میں پہونچ گیا جہاں سفید فوجوں کے جبر و تشدد کے شہید اپنی مشترکہ قبروں میں سو رہے تھے —

بامحبت ہاتھوں نے ان قبروں پر صنوبر کی ٹہنیاں رکھی تھیں اور قبرستان کے گرد ایک ستھرا سا ہرے رنگ کا جنگلہ بنوا دیا تھا — چٹان کے اوپر صنوبر کے نازک درخت سیدھے تن کر کھڑے ہوئے تھے اور نئی گھاس نے چٹان کی ڈھلانوں پر سبز رنگ کا ایک مخملی غالیچہ بچھا دیا تھا —

شہر کے باہر کے اس علاقے میں ایک افسردہ سی خاموشی تھی۔ درخت چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے تھے اور تازہ دم دھرتی سے موسم بہار کی تازی خوشبوئیں اٹھتی تھیں... اسی جگہ پر پاویل کے ساتھیوں نے بہادری کے ساتھ اپنی موت کا سامنا کیا تھا تاکہ مفلسی میں پیدا ہونے والے لوگوں کے لئے، ان لوگوں کے لئے جن کی پیدائش کے وقت سے ہی غلامی کی ابتدا ہو جاتی ہے، زندگی حسین بن سکے۔

پاویل نے دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ اٹھاکر اپنی ٹوپی اتار لی۔ اور ایک شدید غم کا جذبہ اس کے تمام جسم و روح پر طاری ہو گیا۔

انسان کی سب سے قیمتی دولت اس کی زندگی ہے۔ اور جینے کے لئے اسے صرف ایک ہی زندگی عطا کی جاتی ہے۔ اسے اپنی زندگی اس طرح گذارنی چاہئے کہ آئندہ چل‌کر اسے بےمصرف گذارے ہوئے ایام کے لئے کربناک پشیمانی اور تاسف نہ ہو، اسے اپنے ذلیل اور حقیر ماضی پر شدید شرمندگی سے دو چار نہ ہونا پڑے، اور مرتے وقت وہ کہہ سکے: میں نے اپنی تمام زندگی، اپنی تمام قوت دنیا کے سب سے اعلی مقصد کے لئے، انسان کی نجات کی جدوجہد کے لئے، وقف کر دی۔ اور انسان کو اپنی زندگی کے ہر لمحہ کا پورا پورا استعمال کرنا چاہئے کیوں‌کہ نہ جانے کب کوئی ناگہانی بیماری یا المناک حادثہ اس کی زندگی کے دھارے کو روک دے۔

انہیں خیالات میں ڈوبا ہؤا کورچاگن قبرستان سے چلا آیا۔

گھر پر اس کی ماں بہت افسردہ ہوکر اپنے بیٹے کے جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اسے دیکھ‌کر پاویل سمجھ گیا کہ وہ اس سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

«پاولوشا تم رک کیوں نہیں جاتے؟» اس نے ہمت کرکے کہا۔ «اس بڑھاپے میں اس طرح اکیلے رہنا میرے لئے بہت دشوار ہے۔ کسی کے چاہے جتنی اولادیں ہوں بڑی ہوکر سب چھوڑکر چلی جاتی ہیں۔ آخر تمہیں شہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم یہاں بھی رہ سکتے ہو۔ یا وہاں کسی کٹے ہوئے بالوں والی تتلی سے دل لگا لیا ہے؟ آجکل کے لڑکے اپنی بوڑھی ماں کو تو کچھہ بتاتے ہی نہیں۔ آرتیم نے مجھہ سے ایک لفظ کہے بغیر ہی شادی کرلی، اور اس معاملے میں تم تو اس سے بھی بدتر ہو۔ جب ہاتھہ پاؤں توڑکر چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو جاتے ہو تب کہیں تمہاری صورت دیکھنے کو ملتی ہے» اس کی ماں نے اس کا بہت تھوڑا سا سامان ایک صاف سے تھیلے میں رکھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں دھیرے سے کہا۔

پاویل نے اس کے کندھے پکڑکر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

«ماں ان تتلیوں سے مجھے کیا لینا! تم تو جانتی ہی ہو کہ «کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔» کیا تمہیں میں ان تتلیوں جیسا معلوم ہوتا ہوں؟»

اس کی ماں بے اختیار مسکرا دی۔

«نہیں ماں میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک ہم دنیا سے سرمایہداروں کا نام و نشان نہیں مٹا دیں‌گے تب تک میں لڑکیوں سے دور ہی رہوں‌گا۔ تم سوچتی ہوگی کہ اس میں تو بہت وقت لگ جائے‌گا؟ نہیں ماں اب یہ سرمایہدار تھوڑے ہی دن کے مہمان ہیں۔ جلد ہی دنیا کے تمام لوگوں کی ایک بہت بڑی جمہوریہ قائم ہو جائے‌گی، اور تمہارے ایسے بوڑھے لوگوں کو جنہوں نے عمر بھر محنت کی ہے اٹلی بھیج دیا جائے‌گا۔ اٹلی سمندر کے کنارے ایک بہت ہی خوبصورت ملک ہے۔ وہاں کی آب و ہوا بھی بہت معتدل ہے۔ ماں جاڑا تو وہاں پڑتا ہی نہیں۔ تم لوگوں کو ہم وہاں رئیسوں کے محلحوں میں رکھیں‌گے، اور تم وہاں دھوپ میں اپنی

ضعیف ھڈیوں کو آرام دینا، اور اسی عرصے میں ھم لوگ جاکر امریکه کے سرمایهداروں کو ختم کر دیں گے۔»

«بیٹا یه تو بہت ھی خوبصورت پریوں کی سی کہانی معلوم ھوتی ھے۔ لیکن میں وہ دن دیکھنے کے لئے بیٹھی تھوڑا ھی رھوں گی... تم بالکل اپنے دادا کی طرح ھو۔ وہ ملاح تھے اور انہیں بھی ھمیشه ایسی ھی عجیب عجیب باتیں سوجھتی رھتی تھیں۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے، وہ تو پورے قزاق تھے۔ آخر میں سیواستوپول کی لڑائی میں بالکل معذور ھو گئے۔ جب گھر لوٹے تو ایک ھاتھ اور ایک ٹانگ غائب تھی۔ ان کے سینے پر دو تمغے لگا دئے گئے تھے اور گلے میں ریشمی فیتوں سے زار کے مہر والے دو چاندی کے سکے لٹکا دئے گئے تھے۔ انہوں نے بہت بڑی عمر پائی اور جس وقت ان کا انتقال ھوا بےچارے بڑی مفلسی کی زندگی بسر کر رھے تھے۔ ان کا غصه بھی غضب کا تھا۔ ایک بار اپنی بیساکھی سے کسی افسر کا سر پھوڑ دیا تھا، جس کے لئے انہیں سال بھر کی سزا بھی کاٹنی پڑی۔ اس وقت ان کے فوجی تمغے بھی ان کی حفاظت نه کر سکے۔ تم بالکل اپنے دادا پر پڑے ھو۔ اس میں اب مجھے کسی قسم کا شبه نہیں رھا۔»

«اچھا ماں، ایسی دل دکھانے والی باتوں کے ساتھ ھم ایک دوسرے سے کیسے رخصت ھو سکتے ھیں۔ تمہیں بتاؤ؟ لاؤ ذرا مجھے میرا اکارڈین تو دو۔ بہت عرصے سے میں نے اسے چھوا بھی نہیں ھے۔»

سیپیوں کے بنے ھوئے پردوں پر اس نے اپنا سر جھکا لیا اور ساز چھیڑا۔ اس کی ماں غور سے سننے لگی اور اس کے بیٹے کی موسیقی میں جو ایک نئی خصوصیت پیدا ھو گئی تھی اس پر دل ھی دل میں حیران ھونے لگی۔

پہلے کبھی وہ اس طرح سے اکارڈین نہیں بجاتا تھا۔ وہ

مست و پر کیف دھنیں، وہ ان کی گٹکریاں اور الاپیں، وہ مدھوش کر دینے والی تانیں جن کے لئے وہ نوجوان اکارڈین بجانے والا سارے شہر میں مشہور تھا اب نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اس کی انگلیوں میں اب بھی وہی سبک دستی اور روانی تھی لیکن ان سے اب جو نغمہ نکلتا تھا وہ نسبتاً زیادہ لطیف، حسین اور عمیق ہوتا تھا۔

پاویل اکیلا ہی اسٹیشن گیا۔

اس نے اپنی ماں کو گھر ہی پر ٹھیرنے کے لئے راضی کر لیا تھا کیوں‌کہ وہ جانتا تھا کہ آخری جدائی وہ آسانی سے برداشت نہ کر سکے گی۔

گاڑی کا انتظار کرنے والے مسافر دھکم دھکا کرتے ہوئے ڈبے میں گھس گئے۔ پاویل سب سے اوپر والی سیٹ پر چڑھ گیا اور وہاں سے بیٹھا بیٹھا گھبرائے ہوئے مسافروں کی چیخ پکار، تو تو میں میں اور ان کا ھاتھہ مٹکا مٹکا کر باتیں کرنا دیکھتا رہا۔

حسب معمول ڈبے میں گٹھڑیوں اور پلندوں کی بہت افراط تھی اور انہیں جلدی جلدی سیٹوں کے نیچے چھپا دیا گیا تھا۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو یہ ھنگامہ کچھہ کم ہؤا اور مسافر کھانا کھانے کے لئے نشست جمانے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں پاویل سو گیا۔

کئیف پہونچ کر پاویل نے فوراً کریشچاتک اسٹریٹ کا رخ کیا جو شہر کے بیچ میں واقع تھی۔ وہ بہت دھیرے دھیرے پل پر چڑھا۔ ھر چیز بالکل پہلے جیسی ہی تھی، کوئی بھی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ چکنی ریلنگ پر ھاتھہ پھسلاتا ہوا پل پار کرنے لگا۔ نیچے اترنے سے پہلے وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ پل پر

کسی فرد بشر کا نام تک نہیں تھا۔ رات کی لا محدود وسعتیں اس کی مسحور آنکھوں کے سامنے ایک نہایت حسین اور شاندار منظر پیش کر رہی تھیں۔ افق تاریکی کی مخملی تہوں میں لپٹا ہؤا تھا، اور آسمان پر ننھے ننھے ستارے ایک تابناک دمک کے ساتھ درخشاں تھے۔ اور نیچے جہاں زمین کسی نا معلوم نقطہ پر جاکر آسمان سے مل جاتی تھی وہاں شہر نے اندھیرے کے دامن میں لاکھوں چھوٹی چھوٹی روشنیاں بکھیر دی تھیں...

بحث کرتی ہوئی آوازوں نے رات کا سکوت توڑ دیا، اور پاویل کو اپنے عالم خیال سے باہر آنا پڑا۔ کوئی اس طرف چلا آ رہا تھا۔ شہر کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں کی طرف سے نظریں ہٹاکر پاویل پل سے نیچے اتر آیا۔

حلقہ کے اسپیشل ڈیپارٹمنٹ کے سنتری نے پاویل کو اطلاع دی کہ ژوخرائی بہت عرصہ ہؤا وہاں سے چلا گیا تھا۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ نوجوان واقعی ژوخرائی کا ذاتی دوست ہے اس سنتری نے پاویل سے متعدد سوال پوچھے، اور جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے بتایا کہ ژوخرائی کو ترکستانی مورچے پر کام کرنے کے لئے تاشقند بھیجدیا گیا تھا۔ پاویل یہ خبر سنکر اتنا پریشان ہو گیا کہ اور تفصیلات پوچھے بغیر وہ الٹے پاؤں واپس لوٹا۔ اس پر اچانک ایسی تکان طاری ہو گئی کہ اسے آرام کرنے کے لئے وہیں دھلیز پر بیٹھ جانا پڑا۔

ایک ٹرام کھڑکھڑ کرتی ہوئی ادھر سے گذری اور تمام سڑک اس کے شور سے گونج اٹھی۔ اس کی نظروں کے سامنے انسانوں کا ایک لامتناھی سلسلہ رواں تھا۔ عورتوں کے چنچل قہقہے، ایک گونجتی ہوئی بھاری آواز، کسی نوجوان کی تیز آواز اور کسی بوڑھے کی خرخر کرتی ہوئی باریک آواز پاویل کے کانوں میں آ رہی تھی۔ بھاگم بھاگ جاتے ہوئے لوگوں کا جوار بھاٹا ختم ہونے

ھی میں نہیں آتا تھا ۔ تیز روشنیوں والی ٹرامیں، موٹروں کے سامنے کی چکاچوند کر دینے والی بتیاں، قریب کے سنیما گھر کے پھاٹک پر بجلی کے قمقموں کا ھجوم... اور ھر جگہ جدھر دیکھو لوگوں کا ھجوم، جن کی گفتگو کی بھنبھناھٹ سے سڑک مسلسل گونج رھی تھی! بڑے شہر میں رات کا وقت بھی کیا کیا منظر دکھاتا ھے!

فیودور کے وھاں سے چلے جانے کی خبر سے پاویل کو جو تکلیف ھوئی تھی اس کی شدت سڑک کی اس چہل پہل اور شور و غل سے کچھ کم ھو گئی ۔ وہ اب کہاں جائے؟ اس کے تمام دوست سولومینکا میں رہتے تھے اور وہ یہاں سے بہت دور تھا ۔ ایک دم اسے یونیورسٹی اسٹریٹ والے گھر کا خیال آیا جو وھاں سے بہت دور نہیں تھا ۔ ھاں، وہ وھیں جائے گا ۔ آخر فیودور کے بعد جس کامریڈ سے ملنے کی اسے سب سے زیادہ خواھش تھی وہ ریتا ھی تو تھی ۔ اور شاید رات گذارنے کا انتظام آکم کے یہاں ھو جائے ۔

اس نے دور ھی سے سرے والی کھڑکی میں روشنی دیکھی ۔ اپنے جذبات پر قابو رکھکر اس نے شاہ بلوط کی لکڑی کا بنا ھوا باھر والا بھاری دروازہ زور لگاکر کھینچا ۔ چند سیکنڈ تک وہ باھر کھڑا رھا ۔ ریتا کے کمرے سے کچھ آوازیں آ رھی تھیں اور کوئی گٹار بجا رھا تھا ۔

«اچھا تو اب یہاں گٹار بجانے کی بھی اجازت ھو گئی ۔ معلوم ھوتا ھے کہ قاعدے قانون اب اتنے سخت نہیں رھے» اس نے اپنے دل میں کہا ۔ پھر اس نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی اور دل میں امنڈتے ھوئے جذبات کو دبانے کے لئے وہ اپنا ھونٹ کاٹنے لگا ۔

پیچ دار گھنگریالی زلفوں والی ایک نوجوان عورت نے دروازہ کھولا اور کورچاگن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ۔

«کس سے ملنا چاھتے ھو؟»

وہ پورا دروازہ کھولے کھڑی تھی اور کمرے میں نظر ڈالتے ہی پاویل سمجھ گیا کہ اس کا وہاں آنا بے سود تھا۔

«کیا میں استیپنووچ سے مل سکتا ہوں؟»

«وہ تو یہاں نہیں ہے۔ وہ جنوری میں ہی خارکوف چلی گئی تھی اور میں نے سنا ہے کہ اب وہ ماسکو میں ہے۔»

«اچھا کامریڈ آکم تو یہیں رہتے ہیں نا۔ یا وہ بھی چلے گئے؟»

«کامریڈ آکم بھی یہاں نہیں ہیں۔ وہ اب اودیسا کی گبرنیا کومسومول تنظیم کے سکریٹری ہیں۔»

پاویل کے لئے وہاں سے واپس چلے آنے کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ شہر واپس آنے کی ساری خوشی اور جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

اب فوری مسئلہ یہ تھا کہ رات کہاں بسر کی جائے۔

«چلتے چلتے ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی لیکن کوئی پرانا دوست نہیں ملے گا، کیوں کہ معلوم ہوتا ہے یہاں کوئی ہے ہی نہیں» اپنی مایوسی کو برداشت کرکے وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ پھر بھی اس نے ایک جگہ اور قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ وہ پانکراتوف کا پتہ لگائے گا کہ وہ شہر میں ہے یا نہیں۔ وہ جہازی مزدور گھاٹ کے قریب ہی کہیں رہتا تھا، اور اس کا گھر سولومینکا سے نسبتاً قریب بھی تھا۔

پانکراتوف کے گھر پہونچتے پہونچتے وہ تھک کر بالکل چور ہو گیا تھا۔ پاویل نے دروازے پر دستک دی جسے کسی زمانے میں زرد روغن کا شرف حاصل تھا۔ اور دل ہی دل میں اس نے عہد کیا: «اگر یہ بھی نہ ملا تو میں اب کسی اور کو نہیں تلاش کروں گا۔ اسی کشتی کے نیچے گھس کر رات گزار دوں گا۔»

ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا جس کی ٹھوڑی کے نیچے رومال کی گرہبند ہی ہوئی تھی۔ وہ پانکراتوف کی ماں تھی۔

«ماں، اگنات گھر پر ھے؟»

«ھاں ابھی آیا ھے۔»

اس نے پاویل کو پہچانا نہیں اور مڑکر وہ اپنے بیٹے کو پکارنے لگی:

«اگنات، کوئی تم سے ملنے آیا ھے!»

پاویل اس کے پیچھے پیچھے کمرہ میں داخل ھؤا اور اس نے اپنے سامان کا تھیلہ فرش پر رکھدیا۔ پانکراتوف میز پر بیٹھا ھؤا کھانا کھا رھا تھا۔ اس نے گردن گھماکر اپنے مہمان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔

«مجھہ سے اگر کوئی کام ھے تو بیٹھہکر فوراً کہہ ڈالو۔ اتنے میں میں تھوڑا سا شوربہ پیٹ میں ڈال لوں» اس نے کہا۔ «صبح سے کچھہ کھایا نہیں ھے۔» یہ کہکر اس نے شوربہ پینے کے لئے لکڑی کا ایک بڑا سا چمچہ اٹھا لیا۔

پاویل ایک شکستہ سی کرسی پر ایک طرف کو بیٹھہ گیا۔ پھر اس نے اپنی ٹوپی اتارکر پرانی عادت کے مطابق اس سے اپنا ماتھا پونچھا۔

«کیا میں سچ مچ اتنا بدل گیا ھوں کہ اگنات نے بھی مجھے نہیں پہچانا؟» اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

پانکراتوف نے شوربے کے دو چار چمچے جلدی جلدی منھہ میں ڈالے اور جب اس کے مہمان نے کچھہ بھی نہ کہا تو اس نے گردن گھماکر اس کی طرف دیکھا۔

«بولو کیا بات ھے کس کام سے آئے ھو؟»

روٹی کا نوالہ لئے ھوئے اس کا ھاتھہ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ اس نے اپنے مہمان کو ٹکٹکی باندھکر دیکھا اور حیرت سے اپنی آنکھیں جھپکانے لگا۔

«میں... یہ کیا... ارے تم!..»

پانکراتوف کے سرخ چہرے پر حیرت اور بوکھلاھٹ کے آثار دیکھکر پاویل سے نہ رہا گیا، اور وہ قہقہہ مارکر ھنس پڑا۔

«پاوکا!» پانکراتوف نے چلاکر کہا۔ «ھم لوگ تو سمجھے تھے کہ تم سدھار گئے۔ اچھا ٹھیرو۔ بھلا تمہارا نام کیا ھے؟»

پانکراتوف کی بڑی بہن اور ماں اس کی چیخ سنکر دوسرے کمرے سے بھاگی ھوئی آئیں۔ ان تینوں نے پاویل پر سوالات کی بوچھار کر دی اور جب تک انہیں پورا اطمینان نہیں ھو گیا کہ وہ کوئی اور نہیں سچ مچ پاویل کورچاگن ھی ھے تب تک انہوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

گھر کے تمام لوگوں کے سو جانے کے بہت دیر بعد تک پانکراتوف بیٹھا گذشتہ چار مہینوں کے واقعات اسے بتاتا رھا:

«ژارکی اور متیائی تو پچھلے جاڑوں میں ھی خارکوف چلے گئے تھے۔ جانتے ھو وہ دونوں پھٹیچر کہاں گئے ھیں؟ کمیونسٹ یونیورسٹی میں، کسی ایسی ویسی جگہ بھی نہیں! وہ دونوں ابتدائی تعلیم کی جماعت میں بھرتی کر لئے گئے ھیں۔ شروع میں گئے تو ھم پندرہ آدمی تھے۔ تمہارے اس خاکسار نے بھی جوش میں آکر عرضی دی تھی۔ سوچا تھا کہ اب وقت آ گیا ھے کہ میں بھی اپنے بھیجے کا تھوڑا سا بھوسہ صاف کر ڈالوں۔ بھلا تم یقین کر سکتے ھو کہ ممتحنوں کے بورڈ نے مجھے ٹکا سا جواب دیدیا!»

اس دل شکن واقعہ کی یاد آنے پر پانکراتوف نے جھنجلاھٹ کا اظہار کیا، اور پھر کہنے لگا:

«شروع میں تو سب ٹھیک ٹھاک چلتا رھا۔ میں ھر اعتبار سے بھرتی کر لئے جانے کے قابل تھا: میرے پاس پارٹی کی ممبری کا کارڈ تھا، میں کافی عرصے تک کومسومول میں کام کر چکا تھا۔ میری گذشتہ زندگی کے بارے میں بھی کوئی قابل اعتراض بات نہیں

تھی، کوئی پچھلی شکایت نہیں تھی۔ لیکن جب سیاسی معلومات کا سوال آیا تو میں مصیبت میں پھنس گیا۔

«ممتحنوں کے بورڈ کے ایک کامریڈ سے میری جھڑپ ہو گئی۔ اس نے مجھ سے ایک چھوٹا سا انتہائی بے تکا سوال کیا۔ «اچھا بتاؤ کامریڈ پانکراتوف تم فلسفے کے بارے میں کیا جانتے ہو؟» سچ تو یہ ہے کہ میں فلسفے کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ہم لوگوں کے ساتھ جہاز گھاٹ پر ایک شخص کام کیا کرتا تھا جو اسکول کی پڑھائی ترک کرکے آوارہ گردی میں مبتلا ہو گیا تھا اور محض تفریحاً جہاز گھاٹ پر کام کرنے لگا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ہم لوگوں کو یونان کے کچھ بہت ہی عقلمند لوگوں کے بارے میں بتایا کرتا تھا جو کہ اپنے خیال میں ہر بات کا جواب جانتے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ انہیں لوگوں کو فلسفی کہتے تھے۔ ہاں تو ان میں ایک شخص تھا — بھلا سا نام تھا اس کا — ڈایا جنیز یا ایسا ہی کچھ نام تھا جو ساری عمر ایک پیپے میں رہا تھا... ان لوگوں میں سب سے ہوشیار تو وہ تھا جو چالیس بار سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید ثابت کر سکتا تھا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ سب سے سب جعلئے تھے۔ جب مجھ سے وہ سوال کیا گیا تو مجھے اس طالبعلم کی بتائی ہوئی بات یاد آئی، اور میں نے دل میں سوچا: «اچھا تو یہ مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔» میں نے اس ممتحن کو شرارت بھری آنکھوں سے اپنی طرف تکتے دیکھا۔ میں نے بھی اسے دو ٹوک جواب دیدیا۔ میں نے کہا۔ «فلسفہ بالکل مہمل بکواس ہے۔ اور میں اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا کامریڈ۔ اب جیسے پارٹی کی تاریخ ہے وہ بالکل الگ بات ہے۔ میں اس میں اپنا سر کھپانے کے لئے خوشی سے تیار ہوں۔» یہ سنکر تو وہ لوگ میرے پیچھے ہی پڑ گئے۔ پوچھنے لگے کہ میں نے فلسفے کے بارے میں یہ عجیب و غریب رائے کس

بنا پر قائم کی تھی۔ میں نے انہیں اس طالبعلم کے بارے میں بتایا اور اس کی سکھائی ہوئی چند باتوں کا بھی حوالہ دیا۔ تمام ممتحن میری باتوں پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ظاہر ہے وہ لوگ مجھ پر ہی ہنس رہے تھے۔ میں بہت برہم ہوا اور بس اتنا کہہ کر «کیا مجھے بےوقوف سمجھ رکھا ہے؟» میں باہر چلا آیا۔

«بعد میں گبرنیا کمیٹی میں اس ممتحن نے ایک بار مجھے گھیر لیا اور تین گھنٹے تک وہ مجھے لیکچر پلاتا رہا۔ معلوم یہ ہؤا کہ جہاز گھاٹ پر کام کرنے والے اس طالبعلم کا بالکل نیم ملا خطرۂ ایمان والا حال تھا اس کے دماغ میں سب چیزیں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ مجھے بعد میں جاکر معلوم ہوا کہ فلسفے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ دراصل وہ بہت ہی ضروری چیز ہے۔

دوباوا اور ژارکی امتحان میں پاس ہو گئے۔ متیائی تو خیر ہمیشہ ہی سے پڑھنے کے معاملے میں بہت اچھا تھا، لیکن ژارکی مجھ سے کچھ خاص بہتر نہیں ہے۔ شاید اسے اس کے تمغے کی وجہ سے لے لیا ہوگا۔ خیر کچھ بھی ہو میں یہیں کا یہیں رہ گیا۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد مجھے جہاز گھاٹ کے انتظامی صیغے میں ایک کام دیا گیا۔ جہازوں پر مال لادنے والے گھاٹ کے اسسٹینٹ چیف کا کام۔ میں ہمیشہ نوجوانوں کی طرف سے منیجروں سے لڑا کرتا تھا اور اب میں خود منیجر ہوں۔ آجکل اگر میں کسی کو کام چوری کرتے ہوئے پکڑتا ہوں یا کوئی آدمی حماقت کی کوئی حرکت کرتا ہے تو میں منیجر اور کومسومول کے سکریٹری دونوں ہی کی حیثیت سے اس کی اچھی طرح خبر لیتا ہوں۔ وہ میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ خیر میں اپنے بارے میں بہت بتا چکا۔ اچھا اب اور کس کے بارے میں بتاؤں؟ تمہیں آکم کے بارے میں تو معلوم ہی ہو چکا ہے۔ پرانے لوگوں میں سے گبرنیا کمیٹی میں اب صرف تفتہ رہ گیا ہے۔ وہ ابھی تک اپنے

اسی پرانے کام پر ہے۔ توکاریف سولومینکا میں پارٹی کی ضلع کمیٹی کا سکریٹری ہے۔ تمہارا کمیون کا ساتھی آکونیف کومسومول کی ضلع کمیٹی میں ہے۔ تالیا سیاسی تعلیم کے محکمے میں کام کرتی ہے۔ سویتائیف کار ورکشاپ میں تمہارا والا کام کر رہا ہے۔ میں اسے زیادہ اچھی طرح نہیں جانتا۔ بس کبھی کبھی گبرنیا کمیٹی میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ کافی سمجھدار آدمی معلوم ہوتا ہے، لیکن ذرا خشک مزاج ہے۔ اچھا تمہیں آنا بورہارٹ یاد ہے نا؟ وہ بھی سولومینکا میں ہے۔ پارٹی کی ضلع کمیٹی کے عورتوں کے محکمے کی صدر ہے۔ باقی لوگوں کے بارے میں تو میں نے تمہیں بتلا ہی دیا ہے۔ ہاں پاولوشا پارٹی نے بہت سے لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ تمام پرانے سرگرم کارکن گبرنیا کی سوویت اور پارٹی کے اسکول میں جاتے ہیں۔ انہوں نے اگلے سال مجھے بھی بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔»

جس وقت وہ سونے کے لئے لیٹے آدھی رات سے کافی زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ دوسرے دن صبح جب پاویل سوکر اٹھا اس وقت تک پانکراتوف اپنے کام پر جا چکا تھا۔ اس کی بہن دوسیا نے جو بالکل اپنے بھائی کی شکل کی مضبوط، لمبی تڑنگی لڑکی تھی پاویل کو چائے پلائی اور تمام وقت شگفتہ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ پانکراتوف کا باپ جو جہاز پر انجینیر تھا کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

جب پاویل چلنے لگا تو دوسیا نے اسے یاد دلایا:

«دیکھو بھول مت جانا۔ ہم لوگ کھانے پر تمہارا انتظار کریں گے۔»

پارٹی کی گبرنیا کمیٹی میں حسب معمول خوب چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ سامنے کا دروازہ بار بار کھلتا اور بند ہوتا تھا۔

برآمدوں اور دفتروں میں بہت لوگ جمع تھے اور انتظامی محکمے کے دروازے کے پیچھے سے ٹائپ رائٹروں کی دبی ہوئی کھٹ کھٹ کی آواز آ رہی تھی۔

پاویل کسی جانی پہچانی شکل کی تلاش میں تھوڑی دیر تک برآمدہ میں ٹہلتا رہا، لیکن جب اسے اپنا کوئی واقف وہاں نظر نہیں آیا تو وہ سیدھا سکریٹری سے ملنے چلا گیا۔ سکریٹری روسی فیشن کی نیلی قمیص پہنے ایک بڑی سی میز کے قریب بیٹھا ہؤا تھا۔ پاویل کے داخل ہونے پر اس نے سر اٹھاکر سرسری طور پر اوپر دیکھا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

پاویل سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور آکم کے جانشین کے چہرے مہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

«میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟» سکریٹری نے جو اونچے کالر والی قمیص پہنے ہوئے تھا اپنی تحریر ختم کرکے پوچھا۔

پاویل نے اسے اپنا پورا قصہ سنایا۔

«کامریڈ اب کرنا یہ ہے کہ کامسومول کے ممبروں کی فہرست میں میرا نام دوبارہ چڑھاکر مجھے ریلوے کی ورکشاپ میں اپنے کام پر بھیجدیا جائے» پاویل نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ «مہربانی کرکے اس سلسلے میں ضروری ہدایات جاری کر دیجئے۔»

سکریٹری کرسی پر پیچھے کی طرف تن کر بیٹھ گیا۔

«خیر یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ہم کامسومول کے ممبروں کی فہرست میں تمہارا نام دو بارہ چڑھا دیں گے» اس نے کچھ تامل سے جواب دیا۔» لیکن تمہیں ورکشاپ بھیجنے میں کچھ دشواری سی معلوم ہوتی ہے۔ سویتائیف وہاں کام کر رہا ہے۔ وہ گبرنیا کمیٹی کا ممبر ہے۔ ہمیں تمہارے لئے کوئی دوسرا کام تلاش کرنا ہوگا۔»

کورچاگن نے اپنی آنکھیں سکیڑ لیں۔

«میں سویتائیف کے کام میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتا» اس

نے کہا۔ «میں تو وہاں اپنے کام پر واپس جانا چاہتا ہوں۔ سکریٹری کی حیثیت سے نہیں۔ اور چونکہ ابھی میری صحت بھی کافی خراب ہے اس لئے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ کوئی اور کام میرے سپرد نہ کیا جائے۔»

سکریٹری راضی ہو گیا۔ اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر جلدی سے چند الفاظ گھسیٹ دئے۔

«یہ لیکر کامریڈ تفتہ کے پاس چلے جاؤ۔ وہ سب انتظام کر دے گا۔»

عملہ کے محکمہ میں پہونچ کر پاویل نے دیکھا کہ تفتہ اپنے نائب کی خبر لے رہا ہے۔ پاویل ایک دو منٹ تک تو کھڑا ان کی گرما گرم گفتگو سنتا رہا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ یہ معاملہ تو طول پکڑتا جا رہا ہے تو اس نے عملہ کے محکمہ کے اس کارکن کی دھواں دھار تقریر کا سلسلہ بیچ ہی میں کاٹ دیا:

«تفتہ یہ بحث پھر کبھی ختم کر لینا۔ یہ تمہارے لئے ایک رقعہ لایا ہوں۔ میرے کاغذات ٹھیک ٹھاک کرنے کے بارے میں ہے۔»

تفتہ کی کچھہ بھی سمجھہ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک نظر کاغذ کے اس پرزے کو دیکھتا اور پھر کورچاگن کو، یہاں تک کہ آخرکار حقیقت اس پر روشن ہوئی۔

«ارے یہ لو! تو تم مرے نہیں تھے؟ چہ چہ اب ہم کیا کریں گے۔ تمہارا تو نام فہرست سے کاٹ دیا گیا ہے۔ میں نے خود ہی تو مرکزی کمیٹی کو تمہارا کارڈ واپس کیا تھا۔ اور اس کے علاوہ مردم شماری کے وقت بھی تم موجود نہیں تھے۔ اور کومسومول کی مرکزی کمیٹی کے ایک سرکلر کے مطابق جن لوگوں کے نام مردم شماری کے دوران میں درج نہیں کئے گئے تھے وہ سب خارج کر دئے گئے ہیں۔ اب تو تمہیں دوبارہ باقاعدہ عرضی دینی پڑے گی۔» تفتہ کے لہجے نے بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

پاویل کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

«پھر وهی اپنے پرانے هتهکنڈے دکھانے لگے۔ کیوں؟ تم ابھی هو تو نوجوان لیکن سرکاری کاغذات کے دفتر کے پرانے سے پرانے خرانٹ چوهے کو بھی مات کرتے هو۔ ولودکا آخر تمهارا بچپن کب ختم هوگا اور تم میں کب عقل آئے گی؟»

تفتہ اچھل کر کھڑا هو گیا جیسے اسے پسو نے کاٹ لیا هو۔

«برائے مهربانی آپ مجھے نصیحت نہ کیجئے۔ یہاں کے کام کا ذمے دار میں هوں۔ سرکلر میں جو هدایات دی جاتی هیں وہ تعمیل کے لئے هوتی هیں، پڑھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دینے کے لئے نہیں۔ اس وقت تم نے میری جو توهین کی هے تو میں بھی تمہیں سمجھ لوں گا کہ تم نے مجھے چوها کیسے کہا۔»

یہ آخری الفاظ بہت هی دهمکی کے لہجے میں کہے گئے تھے، اور انہیں ادا کرتے وقت تفتہ نے اپنا هاتھ اس انداز سے هلایا کہ پاویل پر یہ واضح هو جائے کہ ملاقات ختم هو گئی هے۔ اور اس کے بعد تفتہ نے خطوں کا بنڈل اپنے سامنے سرکا لیا جو کہ ابھی تک کھولے نہیں گئے تھے۔

پاویل دهیرے دهیرے دروازے کی طرف چل دیا۔ لیکن دفعتاً کچھ یاد کرکے وہ میز کے قریب واپس گیا اور تفتہ کے سامنے پڑا هؤا سکریٹری کا رقعہ اٹھا لیا۔ تفتہ اسے غور سے دیکھنے لگا عملہ کے محکمہ کے اس کلرک کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی جو نا خوشگوار بھی تھی اور مضحکہ خیز بھی۔ وہ بوڑھوں کی طرح دقیانوس اور بد مزاج تھا اور اس کے بڑے بڑے کان هر دم چوکنے رهتے تھے۔

«اچھی بات هے» پاویل نے پرسکون طنزیہ آواز میں کہا۔ «اگر چاهو تو مجھ پر یہ الزام لگا سکتے هو کہ میں نے تمهارے اعداد و شمار میں گڑبڑ ڈال دی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ جو لوگ

پہلے سے اطلاع دئے بغیر مر جاتے ہیں ان کے ساتھ تم یہ ڈانٹ پھٹکار کس طرح کرتے ہو؟ بھائی جس کا جی چاہے وہ بیمار پڑ سکتا ہے اور اگر طبیعت چاہے تو مر بھی سکتا ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہدایات میں ان باتوں کے بارے میں کچھہ نہیں کہا گیا ہوگا۔»

«ہوا! ہوا! ہوا!» تفتہ کا نائب اپنی غیرجانبداری اور زیادہ دیر تک قائم نہ رکھہ سکا، اور قہقہہ مارکر ہنسنے لگا۔

تفتہ کی پینسل کی نوک ٹوٹ گئی اور اس نے جھلاکر اسے فرش پر پھینکدیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے حریف کو کچھہ جواب دیتا بہت سے لوگ باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں آکونیف بھی تھا۔ جب ان لوگوں نے پاویل کو پہچانا تو ایک کھلبلی سی مچ گئی اور اس پر سوالوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ چند منٹ بعد کچھہ نوجوانوں کی ایک ٹولی اور آئی اس میں آلگا یورینیوا بھی تھی۔ پاویل کو زندہ دیکھہکر آلگا حیرت اور خوشی کے مارے مبہوت رہ گئی اور اس سے ہاتھہ ملانے کے بعد وہ بڑی دیر تک اس کا ہاتھہ پکڑے کھڑی رہی۔

پاویل کو اپنی پوری داستان پھر سے سنانی پڑی۔ ساتھیوں کی پرخلوص مسرت، ان کی ظاہر بظاہر دوستی اور ہمدردی، بڑی گرم جوشی کے ساتھہ ان کا ہاتھہ ملانا اور پیٹھہ پر دوستانہ انداز میں دھپ مارنا، ان تمام باتوں کے درمیان پاویل وقتی طور پر تفتہ والے واقعہ کو بھول گیا۔

پوری داستان سنا چکنے کے بعد جب اس نے ساتھیوں کو تفتہ کے ساتھہ اپنی ملاقات کی روداد سنائی تو سب کے سب برہم ہوکر بیک وقت تفتہ کو برا بھلا کہنے لگے۔ آلگا تفتہ پر ایک قہرآلود نظر ڈالکر سکریٹری کے دفتر میں داخل ہو گئی۔

«آؤ چلو ہم سب لوگ نیژدانوف کے پاس جائیں گے» آکونیف

نے بلند آواز میں کہا ۔ «وہ اسکی عقل ٹھکانے لگا دیگا۔» یہ کہکر اس نے پاویل کے کندھے پر ھاتھ رکھا اور نوجوان دوستوں کی ٹولی آلگا کے پیچھے پیچھے سکریٹری کے دفتر میں داخل ہوئی ۔

«تفتہ کو تو اس کام سے ھٹاکر سال بھر کے لئے پانکراتوف کی ماتحتی میں جہاز گھاٹ پر مال ڈھونے کے لئے بھیجدینا چاھئے۔ وہ سر سے پاؤں تک انتہائی ضابطہ‌پرست ھے!» آلگا نے بپھر کر کہا ۔

جب آکونیف، آلگا اور دوسرے لوگوں نے مطالبہ کیا کہ تفتہ کو عملہ کے محکمہ سے برخاست کر دیا جائے تو گبرنیا کمیٹی کا سکریٹری نہایت شفیقانہ انداز میں مسکراتا رھا ۔

«کورچاگن کو یقیناً پھر سے فہرست میں شامل کر لیا جائےگا» اس نے آلگا کو یقین دلاتے ہوئے کہا ۔ «اسے ممبری کا نیا کارڈ بھی فوراً مل جائےگا ۔ میں تم سے متفق ہوں کہ تفتہ ضرورت سے زیادہ ضابطے کا پابند ھے ۔ یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ھے» وہ کہتا رھا ۔ «لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے کام میں اتنا برا ثابت نہیں ہوا ۔ اب تک میں نے جہاں بھی کام کیا ھے، وھاں میں نے کومسومول کے اراکین سے متعلق اعداد و شمار اتنی بے ترتیبی کی حالت میں پائے ھیں کہ بتا نہیں سکتا ۔ ایک بھی اطلاع پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ ھمارے عملہ کے محکمہ میں تمام اعداد و شمار کافی ترتیب کے ساتھہ رکھے گئے ھیں ۔ تم تو خود جانتی ہو کہ تفتہ اکثر رات میں بڑی دیر تک بیٹھا کام کرتا رھتا ھے ۔ میں تو اس مسئلے کو اس طرح دیکھتا ہوں: اسے کسی وقت بھی کام سے ھٹایا جا سکتا ھے ۔ لیکن اگر اس کی جگہ کوئی آزاد منش اور آرام طلب شخص رکھہ دیا گیا جسے حساب کتاب رکھنے کا کوئی علم نہ ھوا تو یہ تو ممکن ھے کہ یہاں کے

کام میں حد سے زیادہ ضابطہ‌پرستی نہ رہ جائے، لیکن ساتھہ ھی کوئی نظم و ترتیب بھی باقی نہیں رہےگی۔ اسے کام کرنے دو۔ میں اسے بلاکر اچھی طرح ڈانٹ دوں‌گا۔ کچھہ دن تک تو اس کا اثر رہےگا ھی۔ پھر بعد میں دیکھا جائےگا۔»

«اچھی بات ھے، رھنے دو» آکونیف نے اس سے اتفاق ظاھر کرتے ھوئے کہا۔ «آؤ پاولوشا چلو سولومینکا چلیں۔ آج رات کو کلب میں سرگرم اراکین کی ایک میٹنگ ھے۔ ابھی تک کسی کو تمہارے واپس آنے کی خبر نہیں ھے۔ ذرا سوچو کہ جب ھم لوگ اعلان کریں‌گے «اب آپ کے سامنے کورچاگن تقریر کرےگا!» تو سب کو کتنا تعجب ھوگا۔ پاولوشا تم نے بھی نہ مرکر کتنا شاندار کام کیا ھے۔ مر جاتے تو مزدور طبقے کے کس کام کے رہ جاتے؟» یہ کہہ‌کر آکونیف اپنے دوست کے گلے میں باھیں ڈال‌کر اسے ساتھہ لئے ھوئے برآمدہ میں نکل گیا۔

«آلگا چلتی ھو؟»

«ھاں ھاں ضرور۔»

کورچاگن کھانا کھانے کے لئے پانکراتوف کے گھر نہیں گیا۔ دراصل وہ دن بھر وھاں گیا ھی نہیں۔ آکونیف اسے سوویت کی عمارت میں اپنے کمرے پر لے گیا۔ اپنے امکان بھر اس نے اسے بہترین کھانا کھلایا، اور پھر اخباروں کا ایک بنڈل اور کومسومول کی ضلع کمیٹی کے بیورو کی میٹنگوں کی روداد کے دو موٹے موٹے فائیل اس کے سامنے رکھہ‌کر کہا:

«ان سب کو ایک سرسری نظر سے دیکھہ جاؤ۔ جب تم ٹائی‌فائیڈ میں پڑے اپنا وقت ضائع کر رھے تھے اس عرصے میں بہت سی باتیں ھو گئی ھیں۔ میں شام تک واپس آؤں‌گا۔ پھر ھم دونوں ساتھہ کلب چلیں‌گے اگر تھک جاؤ تو تھوڑی دیر سو لینا۔»

اپنی جیبوں میں مختلف قسم کے کاغذ اور دستاویز! ٹھونس کر (آکونیف کو پورٹ فولیو استعمال کرنے سے اصولاً چڑ تھی، اور وہ بری حالت میں پلنگ کے نیچے پڑا گرد کھا رہا تھا)، ضلع کمیٹی کے سکریٹری نے خدا حافظ کہا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس دن شام کو جب وہ گھر لوٹا تو دیکھتا کیا ہے کہ اس کے کمرے میں پورے فرش پر اخبار پھیلے ہوئے ہیں۔ اور پلنگ کے نیچے سے نکال کر کتابوں کا ایک ڈھیر لگا دیا گیا ہے۔ کچھ کتابیں میز پر بھی ڈھیر تھیں۔ پاویل پلنگ پر بیٹھا مرکزی کمیٹی کے تازہ ترین خطوط پڑھ رہا تھا جو اسے اپنے دوست کے تکیے کے نیچے ملے تھے۔

«تو نے میرے کمرہ کی یہ کیا گت بنا دی۔ لفنگے!» آکونیف نے بناوٹی غصے کے ساتھ کہا۔ «ارے کامریڈ تم یہ کیا کر رہے ہو! وہ جو تم پڑھ رہے ہو وہ خفیہ دستاویزات ہیں! تمہارے جیسے کھوجی لوگوں کو اپنے کمرہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے!»

پاویل نے کھیسیں نکالتے ہوئے خط رکھ دیا۔

«جو خط میں پڑھ رہا تھا وہ تو خیر خفیہ نہیں ہے» اس نے کہا۔ «لیکن وہ جو تم لیمپ کے شیڈ کی طرح استعمال کر رہے ہو اس پر «خفیہ» ضرور لکھا ہے۔ دیکھو چاروں طرف سے اس کے کنارے جھلس گئے ہیں!»

آکونیف نے جھلسے ہوئے کاغذ کا وہ ٹکڑا لیمپ پر سے اتار لیا اور اس کی، سرخی پر ایک نظر دوڑاکر دہشت زدہ ہوکر اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

«میں اسے کمبخت کو تین دن سے ڈھونڈ رہا ہوں! کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ کہاں چلا گیا۔ اب یاد آیا۔ اس دن والنتسیف نے اس کا لیمپ کا شیڈ بنایا تھا اور پھر وہ خود بھی اسے

هر جگہ تلاش کرتا رہا ۔» آکونیف نے اس دستاویز کو احتیاط کے ساتھہ تہہ کرکے اپنے گدے کے نیچے چھپا دیا ۔ «اچھا ان سب چیزوں کو ہم بعد میں ٹھیک کر دیں گے» اس نے پاویل کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا ۔ «ابھی تو کچھہ کھاکر فوراً کلب چلنا ہے آؤ پاویل یہاں میز پر آ جاؤ!»

ایک جیب سے اس نے اخبار میں لپٹی ہوئی ایک لمبی سی سوکھی مچھلی اور دوسری سے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے نکالے ۔ اس نے اخبار میز پر پھیلا دیا اور مچھلی کا سر پکڑکر اسے میز کے سرے پر زور سے پٹکا ۔

کھاتے وقت آکونیف کے جبڑے بڑی مستعدی سے چل رہے تھے ۔ اس دوران میں اس نے پاویل کو شہر کی تمام خبریں سنائیں، اور تمام وقت ہنسی مذاق کرتا رہا ۔

کلب میں آکونیف کورچاگن کو پچھلے دروازے سے اسٹیج کے پیچھے لے گیا ۔ اس بڑے سے ہال کے ایک کونے میں، اسٹیج کی داہنی طرف پیانو کے قریب تالیا لاگوتینا اور آنا بورہارٹ ریلوے کی بستی کے کچھہ کومسومولوں کے ایک گروہ میں بیٹھی ہوئی تھیں ۔ ریلوے ورکشاپ کے کومسومول کا سکریٹری والنتسیف آنا کے مقابل بیٹھا تھا ۔ اس کا چہرہ ماہ اگست کے سیب کی طرح سرخ اور بال اور بھنویں پکے ہوئے گیہوں کی طرح سنہری تھیں ۔ اس کی انتہائی پھٹی پرانی چمڑے کی جیکٹ کسی زمانے میں یقیناً سیاہ رہی ہوگی ۔

اس کے برابر سویتائیف لاپرواہی سے پیانو کے ڈھکنے پر کہنی ٹکائے بیٹھا تھا ۔ وہ بھورے بالوں اور پتلے پتلے نازک ہو نٹوں والا ایک خوبصورت سا نوجوان تھا ۔ اس کی قمیص کا اوپری بٹن کھلا ہوا تھا ۔

اس گروہ کے قریب پہونچنے پر آکونیف نے آنا کو کہتے سنا:
«کچھہ لوگ تو اس بات کی پوری کوشش میں ھیں کہ کسی طرح نئے ممبروں کا داخلہ زیادہ سے زیادہ دشوار اور پیچیدہ ہو جائے۔ سویتائیف کا شمار انہیں لوگوں میں ھے۔»
«کومسومول پکنک کرنے کی جگہ نہیں ھے» سویتائیف نے سرکش حقارت کے ساتھہ تڑ سے جواب دیا۔
«ذرا نکولائی کو تو دیکھو» آکونیف کو دیکھتے ھی تالیا چلائی۔ «آج تو وہ بالکل منجھے ھوئے سماوار کی طرح چمک رہا ھے!»
آکونیف کو بھی وہ لوگ اپنے حلقے میں گھسیٹ لائے اور اس پر سوالوں کی بارش ھونے لگی:
«کہاں گئے تھے آج!؟»
«اچھا اب جلسے کی کارروائی شروع کرنا چاھئے۔»
آکونیف نے ھاتھہ اٹھاکر سب سے خاموش رھنے کو کہا۔
«دوستوں آپ لوگ خاموش رھیں۔ توکاریف کے آتے ھی ھم میٹنگ شروع کر دیں گے۔»
«وہ آ ھی گئے» آنا نے کہا۔
اور واقعی ضلع پارٹی کمیٹی کا سکریٹری آ گیا تھا۔ آکونیف اس سے ملنے کے لئے لپکا۔
«دادا آئیے، میں آپ کو اسٹیج کے پیچھے اپنے ایک دوست سے ملانا چاھتا ھوں۔ لیکن معجزے کے لئے تیار رھیےگا!»
«آخر یہ کیا قصہ شروع کیا ھے تم نے؟» بوڑھے نے سگریٹ کا ایک کش کھینچ کر خفگی سے کہا۔ لیکن آکونیف اس کا ھاتھہ پکڑکر اسے گھسیٹ ھی لے گیا۔
... آکونیف نے میٹنگ کے صدر کی گھنٹی اتنے زور سے بجائی کہ مجمع میں باتونی سے باتونی شخص بھی خاموش ھو گیا۔

توکاریف کے پیچھے سے «کمیونسٹ مینی فیسٹو» کے جینئس مصنف کا شیروں جیسا سر سدابہار لکڑی کے چوکھٹے میں سے مجمع کا جائزہ لے رہا تھا۔ آکونیف جلسے کی کارروائی شروع کرنے میں مصروف تھا لیکن توکاریف کی نظریں تمام وقت کورچاگن پر جمی ہوئی تھیں جو پردے کے پیچھے ایک بازو میں کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

«ساتھیوں! ایجنڈا میں موجودہ تنظیمی سوالات پر بحث شروع ہونے سے پہلے ایک کامریڈ نے بولنے کی اجازت مانگی ہے۔ توکاریف کی اور میری رائے ہے کہ انہیں بولنے کی اجازت دے دیجائے۔»

ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اتفاق ظاہر کیا اور آکونیف نے میز پر مکا مار کر دفعتاً اعلان کیا:

«اب میں پاوکا کورچاگن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آکر تقریر کرے!»

اس ہال میں بیٹھے ہوئے سو لوگوں میں سے کم سے کم اسی ایسے تھے جو کورچاگن کو جانتے تھے۔ اور جب اس کی مانوس شکل اسٹیج کی تیز روشنیوں میں ان کے سامنے آئی اور اس لمبے سے زرد رو نوجوان نے تقریر شروع کی تو تمام مجمع خوشی سے پاگل ہوکر چلانے لگا، اور زوردار تالیوں کی گھن گرج سے پورا ہال گونج اٹھا۔

«پیارے ساتھیوں!»

کورچاگن کی آواز جمی جمائی تھی۔ لیکن وہ اپنے جذبات کو چھپا نہیں پا رہا تھا۔

«تو دوستوں، میں آپ لوگوں کی صفوں میں اپنی جگہ لینے کے لئے واپس آ گیا ہوں۔ مجھے یہاں لوٹ آنے کی بہت خوشی ہے۔ مجھے یہاں اپنے بہت سے دوست نظر آ رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ سولومینکا کی کومسومول تنظیم کے ممبروں کی تعداد پہلے کے

مقابلے میں تیس فی صدی بڑھ گئی ہے۔ اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کارخانوں اور یارڈوں میں سگریٹ لائٹر بننا بند ہو گیا ہے۔ اور ریلوے کے قبرستان سے انجنوں کی پرانی لاشیں بنیادی مرمت کے لئے نکالی جا رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے ملک میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے اور ہمارا ملک اپنی طاقت کو مجتمع اور منظم کر رہا ہے۔ یہی تو زندہ رہنے کا زمانہ ہے! ایسے وقت پر میں کیسے مر سکتا تھا!» کورچاگن کی آنکھوں میں خوشی کی مسکراہٹ چمکنے لگی۔

تالیوں کی زبردست گونج اور مبارک‌باد کے نعروں کے درمیان وہ اسٹیج سے اترا اور اس طرف چل دیا جہاں آنا اور تالیا بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے آگے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو اس نے بڑے تپاک سے تھام لیا اور پھر تمام دوستوں نے ادھر ادھر کھسک کر اپنے بیچ میں اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ کر دی۔ تالیا نے پاویل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کس کر دبا دیا۔

آنا کی آنکھیں ابھی تک حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کی پلکیں ہلکے ہلکے کانپ رہی تھیں، اور اس نے جن نظروں سے پاویل کو دیکھا وہ پرخلوص استقبال کے جذبہ سے لبریز تھیں۔

دن تیزی سے گذرتے گئے۔ لیکن ان کے اس طرح گذرنے میں کوئی اکتا دینے والی یکسانیت نہیں تھی، کیوں‌کہ روز کوئی نہ کوئی نئی بات ہوتی رہتی تھی۔ اور صبح کے وقت جب پاویل اپنے دن بھر کے کام کا پروگرام بنانے بیٹھتا تو اسے سخت جھنجھلاہٹ کے ساتھ یہ احساس ہوتا کہ دن کتنا چھوٹا ہوتا ہے اور نہ جانے کتنے کام جن کا وہ منصوبہ بناتا تھا بغیر کئے ہی رہ جاتے تھے۔

پاویل آکونیف کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اسے ریلوے کی ورکشاپ میں مددگار بجلی فٹر کا کام مل گیا تھا۔

اسے آکونیف سے بہت لمبی بحث کرنی پڑی تب کہیں جاکر وہ اس بات پر راضی ہوا کہ اسے عارضی طور پر کومسومول تنظیم کی رہنمائی کے کام سے چھٹی دیدیجائے۔

«ہمارے پاس لوگوں کی اتنی کمی ہے کہ ہم تمہیں ورکشاپ میں عیش کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے» آکونیف نے اعتراض کیا تھا۔ «مجھ سے یہ نہ کہو کہ تم بیمار ہو۔ میں خود ٹائی فائیڈ کے بعد مہینے بھر تک چھڑی لےکر لنگڑاتا ہوا مارا مارا پھرا ہوں۔ پاوکا، تم مجھے بےوقوف نہیں بنا سکتے۔میں جانتا ہوں کہ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے؟» آکونیف نے کہا۔

«کولیا تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ راز تو ہے۔ بات یہ ہے کہ میں پڑھنے کے لئے وقت نکالنا چاھتا ہوں۔»

«دیکھا نا!» آکونیف خوش ہوکر چلایا۔ «میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ دال میں کالا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں میں پڑھنا نہیں چاھتا؟ یہ تمہاری انتہائی خود غرضی ہے۔ تم چاھتے ہو کہ ہم لوگ خون پسینہ ایک کرکے کام کرتے رہیں اور تم پڑھنے میں مصروف رہو۔ نہیں دوست یہ سب نہیں ہو سکتا۔ کل سے تمہیں تنظیم کا کام شروع کر دینا ہوگا۔»

لیکن ایک طویل بحث کے بعد آکونیف راضی ہو گیا۔

«اچھی بات ہے۔ میں تمہیں دو مہینے کے لئے چھوڑے دیتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ تم میری اس دریا دلی کے لئے ممنون ہوں گے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ سویتائیف سے تمہاری بنےگی نہیں۔ وہ حد سے زیادہ مغرور ہے۔»

ورکشاپ میں پاویل کی واپسی نے سویتائیف کے کان کھڑے کر دیئے تھے۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ پاویل کے آ جانے سے اس

کی لیڈری خطرہ میں پڑ جائےگی ۔ اس بات سے اس کے جذبۂ خودپسندی کو بہت ٹھیس پہونچی، اور وہ زبردست مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا ۔ لیکن تھوڑے ھی عرصے میں اسے معلوم ھو گیا کہ وہ غلطی پر تھا ۔ جب کورچاگن کو معلوم ھؤا کہ اسے کومسومول کے بیورو کا ممبر بنانے کی کچھہ بات چل رھی ھے تو وہ سیدھا کومسومول کے سکریٹری کے دفتر میں گیا، اور آکونیف کے ساتھہ اپنے معاھدے کا حوالہ دےکر اس نے سکریٹری کو ایجنڈا میں سے وہ سوال کاٹ دینے پر راضی کر لیا ۔ وہ ورکشاپ میں کومسومولوں کی ایک ٹولی کی سیاسی تعلیم دینے کا کام کرنے لگا لیکن بیورو میں کام کرنے کا مطالبہ نہیں کیا ۔ حالانکہ کومسومول تنظیم کی رھنمائی کے کام میں باضابطہ طور پر پاویل کا کوئی ھاتھہ نہیں تھا، لیکن اس تنظیم کے اجتماعی کام کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس میں پاویل کا اثر محسوس نہ کیا جاتا ھو ۔ اپنے رفیقانہ اور بےلاگ انداز سے اس نے دشواریوں کو حل کرنے میں سویتائیف کی بارھا مدد کی تھی ۔

ایک دن کھانے میں پہونچ کر سویتائیف نے حیرت کےساتھہ دیکھا کہ وھاں کی کومسومول تنظیم کے تمام ممبر اور کومسومول کے باھر کے تقریباً پینتیس چالیس لڑکے کھڑکیاں دھونے اور مشینوں پر سے برسوں کا جما ھؤا میل صاف کرنے میں مصروف ھیں، اور ٹھیلے پر ڈھو ڈھوکر منوں کوڑا باھر میدان میں لے جاکر پھینک رھے ھیں۔ پاویل بھی ھاتھہ میں ایک بڑا سا جھاڑن لئے مشین کے تیل اور چکنائی سے چکٹے ھوئے سیمنٹ کے فرش کو صاف کرنے میں پورے جوش و خروش کے ساتھہ جٹا ھؤا تھا ۔

«دلدر صاف کیا جا رھا ھے؟ آخر صفائی کا یہ کون سا موقع ھے؟» سویتائیف نے پاویل سے پوچھا ۔

«ھم لوگ اس کچرے سے عاجز آ گئے ھیں ۔ میرے خیال میں

بیس برس سے اس جگہ کی صفائی نہیں کی گئی ہے۔ ہفتے بھر کے اندر ہم اسے چمکا کر بالکل نیا بنا دیں گے» کورچاگن نے مختصر سا جواب دیا۔

سویتائیف اپنے کندھے جھٹک کر چلا گیا۔

ان لوگوں کو اپنی ورکشاپ صاف کر کے ہی تسکین نہیں ہوئی۔ بجلی کے کھاتے کے نوجوانوں نے اس کے بعد یارڈ کی صفائی کا بیڑہ اٹھا لیا۔ برسوں سے اس لمبے چوڑے یارڈ میں دنیا بھر کی فضول ناقابل استعمال چیزیں ڈھیر کی جا رہی تھیں۔ وہاں ریل گاڑیوں کے سینکڑوں پہیے اور دھرے، زنگ خوردہ لوہے کے انبار، ریل کی پٹڑیاں، بفر، ایکسل بکس — غرضیکہ لاکھوں من دھات وہاں کھلے آسمان کے نیچے پڑی زنگ کھا رہی تھی۔ لیکن کارخانے کے منتظمین نے ان نوجوانوں کی اس مہم کو روک دیا۔

ان سے کہہ دیا گیا «اس سے زیادہ اہم کام کرنے کو پڑے ہیں۔ یارڈ کی صفائی آئندہ بھی کی جا سکتی ہے۔»

اس لئے بجلی والوں کو اپنے کھاتے کے دروازے کے سامنے یارڈ کے ایک چھوٹے سے حصے میں اینٹیں بچھا کر پکا فرش بنا لینے اور دروازہ کے باہر تار کا ایک پائیدان بچھا دینے پر ہی قناعت کرنی پڑی۔ لیکن کھاتے کے اندر کام کے اوقات کے بعد صفائی کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک ہفتہ بعد جب کارخانے کا بڑا انجینیر استریژ ورکشاپ میں آیا تو اس نے دیکھا کہ ورکشاپ تو خوب روشن ہو گئی ہے۔ گرد اور تیل کی موٹی سی تہہ ہٹ جانے کی وجہ سے لوہے کی سلاخوں والی بڑی بڑی کھڑکیوں سے اب سورج کی روشنی آزادی کے ساتھ اندر داخل ہوتی تھی۔ اور ڈیزل انجنوں کے پالش کئے ہوئے تانبے کے حصے سورج کی کرنوں سے چمک اٹھتے تھے۔ مشینوں کے بھاری حصوں پر بھی سبز روغن کر دیا گیا تھا، اور کسی نے پہیوں کے آروں پر زرد رنگ کے تیر بھی بنا دئے تھے۔

«خوب، خوب...» استریژ نے حیرت کے ساتھہ زیرلب کہا۔
کھاتے کے دور کے ایک کونے میں کچھہ لوگ اپنا کام ختم کر رہے تھے۔ استریژ ادھر ہی چل دیا۔ راستے میں اسے کورچاگن روغن کا ایک ڈبہ لئے ہوئے ملا۔
«دوست ذرا ایک بات تو سنو» انجینیر نے اسے روک کر کہا۔ «تم نے یہاں جو کچھہ کیا ہے اس سے تو میں بہت خوش ہوں لیکن تمہیں یہ روغن کہاں سے ملا؟ میں نے سخت تاکید کر دی تھی کہ میری اجازت کے بغیر روغن قطعی استعمال نہ کیا جائے۔ اس قسم کے کاموں پر روغن ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے پاس جتنا بھی روغن ہے وہ سب انجنوں کے پرزوں کے لئے درکار ہے۔»
«یہ روغن تو ہم نے پرانے ڈبوں کی تلی سے کھرچ کھرچ کر نکالا ہے۔ دو دن محنت تو ضرور کرنی پڑی لیکن اس طرح ہم لوگوں نے پچیس پونڈ روغن جمع کر لیا۔ کامریڈ انجینیر ہم لوگ کوئی قانون نہیں توڑ رہے ہیں۔»
انجینیر نے پھر ایک نئی پخ نکالی لیکن اس بار وہ کافی کھسیایا ہوا تھا۔
«اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ شاباش بہت اچھا۔ یہ تو بہت ہی دلچسپ بات ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ سب تم لوگوں نے کیا کیسے... اسے کیا کہنا چاھئے... میرا مطلب ہے کھاتے کی صفائی کی یہ رضاکارانہ مہم؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کام کارخانے کے اوقات کے بعد ہی کیا گیا ہوگا۔»
کورچاگن نے دیکھا کہ انجینیر کے لہجے سے سچ مچ پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔
«اور نہیں تو کیا» کورچاگن نے کہا۔ «آپ کیا سمجھے؟»
«ہاں لیکن...»
«کامریڈ استریژ، اس میں تعجب کرنے کی کوئی بات نہیں

ہے۔ آپ سے یہ کس نے کہہ دیا تھا کہ بالشویک گندگی کو یوں ہی پڑا رہنے دیں گے؟ ابھی کیا ہے ذرا اس صفائی کو پورے زور شور سے شروع ہونے دیجئے۔ تب دیکھئے گا۔ ابھی تو آپ کے لئے اس سے بھی زیادہ حیرت کے بہت سے موقع آئیں گے۔»

اتنا کہکر بڑی احتیاط کے ساتھہ انجینیر سے بچتا ہوا کہ کہیں اس پر روغن کے چھینٹے نہ پڑ جائیں کورچاگن آگے بڑھہ گیا۔

روز شام کے وقت پاویل پبلک لائبریری میں پایا جاتا تھا۔ وہ وہاں کافی رات گئے تک پڑھتا رہتا تھا۔ اس نے تینوں لائبریرینوں سے دوستی کر لی تھی اور مسلسل کوششوں کے بعد انہیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ پوری آزادی کے ساتھہ لائبریری میں کتابیں دیکھہ سکتا ہے۔ کتابوں کی اونچی الماریوں پر سیڑھی لگاکر اپنی پسند کی کتابیں تلاش کرکے وہ وہاں گھنٹوں بیٹھا کتابوں کے ورق الٹتا رہتا تھا۔ بیشتر کتابیں پرانی تھیں۔ جدید تصنیفات کی صرف ایک چھوٹی سی الماری تھی جس میں خانہ جنگی سے متعلق چند کتابچے، مارکس کا «سرمایہ»، جیک لنڈن کی «آئرن ہیل» اور اسی قسم کی کچھہ اور کتابیں تھیں۔ پرانی کتابوں کا جائزہ لیتے وقت «اسپارٹیکس» نام کی ایک کتاب اس کے ھاتھہ لگ گئی۔ دو راتوں میں اس نے اسے پڑھہ ڈالا اور ختم کر چکنے کے بعد الماری پر میکسم گورکی کی تصنیفات کے پاس رکھدیا۔ اس قسم کی دلچسپ کتابوں کی بتدریج تلاش جن میں زمانۂ حال کے لائق انقلابی پیغام بھی ہو کچھہ عرصے تک جاری رہی۔

لائبریرینوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ان کے لئے فرق بھی کیا پڑتا تھا۔

ریلوے کے کارخانے میں کومسومول کی زندگی نہایت پرسکون ڈھرے پر چل رہی تھی۔ لیکن ایک ناگہانی حادثے کی وجہ سے جو شروع میں بہت غیر اہم معلوم ہوتا تھا اس میں خلل پڑ گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ اس کھاتے کی کومسومول تنظیم کے بیورو کے ایک ممبر کوستیا فدین نے، جو چپٹی ناک والا چیچک رو آلکسی سا لڑکا تھا اور مرمت کا کام کرتا تھا، لوہے کے ایک ٹکڑے میں سوراخ کرتے وقت ایک بہت ہی قیمتی بدیشی برما توڑ دیا۔ یہ حادثہ سراسر اس کی لاپرواہی کا نتیجہ تھا۔ بات شاید اس سے بھی زیادہ سنگین تھی کیوں‌کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شرارت اس نے جان بوجھ‌کر کی تھی۔

یہ حادثہ صبح کے وقت پیش آیا۔ مرمت کے سینیر فورمین خودوروف نے کوستیا سے لوہے کی ایک پٹی میں کچھ سوراخ کرنے کو کہا تھا۔ کوستیا نے پہلے تو انکار کیا، لیکن فورمین کے مصر ہونے پر اس نے لوہے کی پٹی اٹھا لی اور اس میں سوراخ کرنے لگا۔ فورمین کام لینے کے معاملے میں بہت سخت تھا، اور اس لئے مزدور اسے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ پہلے وہ منشویک رہ چکا تھا۔ وہ کارخانے کی سماجی زندگی میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا اور کومسومولوں کو وہ قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اپنے کام میں مہارت رکھتا تھا اور بڑی ایمانداری اور لگن کے ساتھ کام کرتا تھا۔ خودوروف نے دیکھا کہ کوستیا «سوکھا» برما چلا رہا ہے۔ اس نے برمے میں تیل نہیں ڈالا تھا۔ وہ بھاگا ہؤا گیا اور مشین روک‌دی۔

«اندھے ہو گیا؟ تمہیں برما چلانے کی بھی تمیز نہیں ہے!» اس نے کوستیا کو ڈانٹا کیوں‌کہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح برما زیادہ دیر نہیں چلے گا۔

کوستیا نے اسے جھڑک دیا اور مشین پھر چالو کر دی۔

خودوروف کھاتے کے بڑے حاکم کے پاس شکایت کرنے گیا۔ اسی عرصے میں کوستیا مشین کو چلتا چھوڑ کر تیل کی کپی لینے کے لئے لپکا تاکہ بڑے حاکم کے آنے تک سب معاملہ ٹھیک ہو جائے۔ لیکن جب تک وہ کپی لےکر لوٹے برما ٹوٹ چکا تھا۔ بڑے حاکم نے اس واقعہ کی رپورٹ بھیجتے وقت فدین کو برخاست کر دینے کی تجویز رکھی۔ لیکن اس کھاتے کی کومسومول تنظیم کے بیورو نے فدین کی طرفداری کی، کیوں‌کہ خودوروف کو کومسومول کے تمام سرگرم کارکنوں سے بغض تھا۔ منتظمین فدین کے برخاست کر دئے جانے پر مصر تھے اس لئے معاملہ پورے کارخانے کی کومسومول تنظیم کے بیورو کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں ایک اچھا خاصا جھگڑا شروع ہو گیا۔

بیورو کے پانچ ممبروں میں سے تین اس بات کے حق میں تھے کہ کوستیا کو باضابطہ طور پر تنبیہہ دےکر وہاں سے کسی دوسرے کام پر تبدیل کر دیا جائے۔ سویتائیف بھی ان تین میں سے ایک تھا۔ باقی دو کہتے تھے کہ فدین کو کوئی سزا نہ دی جائے۔

اس معاملے پر غور کرنے کے لئے بیورو کی میٹنگ سویتائیف کے دفتر میں بلائی گئی تھی۔ ایک بڑی سی میز کے گرد جس پر سرخ رنگ کا میزپوش بچھا ہؤا تھا بڑھئی کھاتے کے کومسومولوں کی بنائی ہوئی کئی بینچیں اور اسٹول پڑے تھے۔ دیوار پر لیڈروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور میز کے پیچھے والی پوری دیوار پر ریلوے کی ورکشاپ کا جھنڈا لگا ہؤا تھا۔

سویتائیف اب کومسومول کا «کل وقتی» کارکن تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ لوہار تھا۔ لیکن اس کی تنظیمی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ترقی دےکر اسے کومسومول تنظیم کے ایک اعلی عہدے پر تعینات کر دیا گیا تھا۔ وہ اب کومسومول کی ضلع کمیٹی کے بیورو کا ممبر تھا اور اس کے علاوہ گبرنیا کمیٹی کا بھی۔ وہ مشینیں

بنانے کے ایک کارخانے کے صفارخانے میں کام کرتا تھا ـ ریلوے کی ورکشاپ میں تو وہ ابھی نیا نیا ھی آیا تھا ـ اس نے آتے ھی انتظام کی باگ ڈور مضبوطی سے اپنے ھاتھہ میں سنبھال لی تھی ـ اپنی بات کے آگے وہ اور کسی کی سنتا ھی نہیں تھا ـ اور اس کے مزاج میں جلدبازی بھی بہت تھی ـ شروع ھی سے اس نے کومسومول کے دوسرے ممبروں کی حوصلہ شکنی کرکے انہیں پہل قدمی کرنے کا موقع ھی نہیں دیا تھا ـ وہ ھر کام خود کرنے پر مصر رھتا تھا اور جب کام پورا نہیں ھو پاتا تھا تو وہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں پر نکمےپن کا الزام لگاکر انہیں خوب ڈانٹتا پھٹکارتا تھا ـ

یہاں تک کہ دفتر کی سجاوٹ بھی اس کی نگرانی میں کی گئی تھی ـ

وہ اس کمرے کی واحد نرم گدے دار آرام کرسی پر بیٹھا ھؤا میٹنگ کی کارروائی چلا رھا تھا ـ یہ کرسی کلب سے لائی گئی تھی ـ وہ میٹنگ صرف بیورو کے ممبروں کی تھی ـ پارٹی کے آرگنائیزر خوموتوف نے بولنے کی اجازت مانگی ھی تھی کہ اتنے میں بند دروازے پر کسی نے دستک دی ـ اس خلل پر سویتائیف کی تیوریاں چڑھ گئیں ـ دروازے پر پھر دستک ھوئی اور کاتیا زیلینووا نے اٹھہ‌کر دروازہ کھول دیا ـ کورچاگن دروازے پر کھڑا تھا ـ کاتیا نے اسے اندر آ جانے دیا ـ

پاویل ایک خالی کرسی کی طرف بڑھا ھی تھا کہ سویتائیف نے اس سے مخاطب ھو کر کہا:

«کورچاگن یہ میٹنگ صرف بیورو کے ممبروں کی ھے ـ»

پاویل کا چہرہ سرخ ھو گیا ـ اور وہ دھیرے سے میز کی طرف مڑا ـ

«مجھے معلوم ھے ـ میں فدین کے معاملے کے بارے میں تم

لوگوں کی رائے سننا چاھتا ھوں۔ مجھے اس سلسلے میں ایک سوال اٹھانا ھے۔ آخر بات کیا ھے۔ کیا تمھیں میری موجودگی پر اعتراض ھے؟»

«اعتراض تو نہیں ھے۔ لیکن تمھیں معلوم ھونا چاھئے کہ اس قسم کی محدود میٹنگوں میں صرف بیورو کے ممبر ھی شریک ھو سکتے ھیں۔ جتنے زیادہ لوگ ھوتے ھیں کھل کر بحث کرنا اور مسئلے کو پوری طرح سلجھانا اتنا ھی دشوار ھو جاتا ھے۔ لیکن اب آ گئے ھو تو بیٹھہ سکتے ھو۔»

کورچاگن نے ابھی تک کبھی ایسی توھین برداشت نہیں کی تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک شکن اور پڑ گئی۔

«آخر قاعدے قانون کے بارے میں اس قدر بحث کیوں ھو رھی ھے؟» خوموتوف نے جھنجلاکر کہا۔ لیکن کورچاگن ھاتھہ کے اشارہ سے اسے منع کرکے بیٹھہ گیا۔ «ھاں تو میں یہ کہنا چاھتا ھوں کہ» خوموتوف کہتا رھا۔ «یہ تو سچ ھے کہ خودوروف دقیانوس قسم کا آدمی ھے۔ لیکن ڈسپلن کے بارے میں ھمیں کچھہ کرنا ھی پڑے گا۔ اگر کومسومول کے تمام ممبر اسی طرح برمے توڑتے رھے تو کچھہ دن میں کام کرنے کے لئے کوئی برما ھی نہیں رہ جائے گا۔ اس کے علاوہ اس طرح کی حرکتوں سے ھم غیر پارٹی مزدوروں کے سامنے بہت بری مثال قائم کر رھے ھیں۔ میری رائے میں تو اس نوجوان کو سخت تنبیہہ کر دینی چاھئے۔»

سویتائیف نے اسے اپنی تقریر ختم کرنے کا موقع ھی نہیں دیا اور اعتراض کرنے لگا۔ دس منٹ گذر گئے۔ اس عرصے میں کورچاگن کو اندازہ ھو گیا کہ ھوا کا کیا رخ ھے۔ جب اس معاملے پر آخرکار ووٹ لیا جانے لگا تو اس نے اٹھکر بولنے کی اجازت مانگی۔ سویتائیف نے بڑی بے دلی سے اسے بولنے کی اجازت دی۔

«ساتھیوں، میں آپ لوگوں کو فدین کے معاملے کے بارے میں اپنی رائے بتانا چاھتا ھوں۔» پاویل نے کہنا شروع کیا۔ پوری کوشش کے باوجود اس کی آواز میں سختی تھی۔

«فدین کا معاملہ ایک خطرے کا اشارہ ھے۔ اور سب سے زیادہ اھمیت بذات خود کوستیا کی غلطی کی نہیں ھے۔ میں نے کل کچھہ اعداد و شمار جمع کئے ھیں۔» پاویل نے اپنی جیب سے ایک نوٹ بک نکالی۔ «میں نے یہ اطلاع ٹائم کیپر سے حاصل کی ھے۔ آپ لوگ ذرا غور سے سنئے: ھمارے کومسومول کے ممبروں میں سے تینتیس فی صدی روز کام پر پانچ سے لیکر پندرہ منٹ تک دیر سے آتے ھیں۔ یہ تقریباً ایک عام بات ھو گئی ھے۔ سترہ فی صدی ایسے ھیں جو ھر مہینے میں ایک یا دو دن کام پر آتے ھی نہیں۔ غیر پارٹی نوجوان مزدوروں میں ناغہ کا اوسط چودہ فی صدی ھے۔ ساتھیوں یہ اعداد و شمار ھمارے منھہ پر ایک زبردست طمانچہ ھیں۔ میں نے کچھہ اور بھی درج کئے ھیں: ھمارے پارٹی ممبروں میں چار فی صدی مہینے میں ایک دن غیر حاضر رھتے ھیں اور چار فی صدی کام پر دیر سے آتے ھیں۔ غیر پارٹی مزدوروں میں گیارہ فی صدی مہینے میں ایک دن ناغہ کرتے ھیں اور تیرہ فی‌صدی ھمیشہ دیر سے کام پر آتے ھیں۔ کارخانے میں جتنی ٹوٹ پھوٹ ھوتی ھے اس کا نوے فی صدی حصہ نوجوان مزدوروں کی وجہ سے ھوتا ھے جن میں نئے مزدوروں کی تعداد صرف سات فی‌صدی ھے۔ ان اعداد و شمار سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ پارٹی ممبروں اور بڑی عمر کے مزدوروں کے مقابلے میں ھم کومسومولوں کا کام بہت ھی برا ھے۔ لیکن صورت حال ھر جگہ یکساں نہیں ھے۔ صفارخانے کا کام بہت عمدہ ھے اور بجلی کے کھاتے میں بھی کام اتنا برا نہیں ھے۔ لیکن باقی تمام لوگ کم و بیش ایک ھی سطح پر ھیں۔ میری رائے میں تو کامریڈ خوموتوف نے ڈسپلن کے بارے

میں جو کچھہ کہا وہ بہت ھی ناکافی ھے۔ اس سے بہت زیادہ کہنے کی ضرورت ھے۔ اب فوری مسئلہ ان پیچیدگیوں کو سلجھانے کا ھے۔ میں یہاں پرچار کا کام شروع کرنے نہیں آیا ھوں۔ لیکن ھمیں اپنے کام میں لاپرواھی اور بے ڈھنگے پن کو ختم کرنا ھوگا۔ پرانے مزدور کھلے طور پر تسلیم کرتے ھیں کہ وہ پہلے اپنے مالکوں کے لئے یعنی سرمایہداروں کے لئے اب سے کہیں بہتر کام کرتے تھے۔ لیکن اب جب کہ ھم خود مالک ھیں تو کوئی وجہ نہیں ھے کہ ھم خراب ڈھنگ سے کام کریں۔ قصور کوستیا یا کسی دوسرے فرد کا اتنا نہیں ھے۔ قصور ھمارا، میرا مطلب ھے ھم سب کا ھے۔ کیوںکہ اپنی خرابیوں کے خلاف ٹھیک سے لڑنے کے بجائے ھم لوگ کبھی کبھی کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرکے کوستیا جیسے مزدوروں کی پشت پناھی کرتے ھیں۔

ساموخن اور بتیالیاک نے ابھی یہاں کہا ھے کہ فدین بہت اچھا لڑکا ھے۔ وہ بہترین لڑکوں میں سے ھے۔ کومسومول کا سرگرم کارکن ھے اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں۔ اگر اس نے ایک برما توڑ دیا تو کیا ھؤا۔ یہ غلطی کسی سے بھی سرزد ھو سکتی تھی۔ وہ ھمارا اپنا آدمی ھے جب کہ فورمین ھمارا آدمی نہیں ھے... لیکن کیا کبھی کسی نے خودوروف سے بھی اس سلسلے میں گفتگو کرنے کی کوشش کی؟ وہ چڑچڑا ھے سب کچھہ ھے مگر یہ مت بھولئے کہ اس کے پیچھے تیس سال کے کام کا تجربہ ھے! ھم اس کی سیاست کے بارے میں گفتگو نہیں کر رھے ھیں۔ اس معاملے میں وہ حق بجانب ھے کیوںکہ وہ باھر کا آدمی ھو کر بھی سرکاری مال کی حفاظت کر رھا ھے جب کہ ھم بیش قیمت اوزار توڑ رھے ھیں۔ آپ اس قسم کے حالات کو کیا کہیں گے؟ میں سمجھتا ھوں کہ ھمیں ابتدا ابھی سے کر دینی چاھئے اور اس مورچے پر ایک زبردست مہم چلانی چاھئے۔

میری تجویز ہے کہ فدین کو کام چوری اور پیداوار میں رکاوٹ ڈالنے کے جرم میں کومسومول تنظیم سے نکال دیا جائے۔ اس کے معاملے کے بارے میں دیواری اخبار میں بحث کی جائے اور اس بات کا خوف کئے بغیر کہ اس کا کیا انجام ہوگا یہ اعداد و شمار کھلے طور پر ایک اداریہ مضمون کی شکل میں شائع کر دئے جائیں۔ ہم طاقتور ہیں اور ہماری پشت پر ایسی قوتیں ہیں جن پر ہم بھروسہ کر سکتے ہیں۔ کومسومول کے بیشتر ممبر اچھے مزدور ہیں۔ ان میں سے ساٹھہ تو بویارکا کی مصیبتیں جھیل چکے ہیں اور وہ بہت ہی سخت امتحان تھا۔ ان کی مدد اور تعاون سے ہم دشواریاں دور کر سکتے ہیں۔ صرف ہمیں اس پورے مسئلے کی طرف اپنا رویہ بنیادی طور پر تبدیل کرنا ہوگا۔»

کورچاگن جو عموماً بہت پرسکون اور کم سخن رہتا تھا اس وقت اتنے جوش کے ساتھہ بول رہا تھا کہ سویتائیف حیرت میں آگیا۔ وہ پہلی بار پاویل کو اس کی اصلی شکل میں دیکھہ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ پاویل کی بات ٹھیک ہے۔ لیکن وہ اس قدر محتاط تھا کہ کھلے عام اس سے اتفاق ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کورچاگن کی تقریر کا یہ مطلب نکالا کہ وہ تنظیم کی عام حالت پر ایک سخت تنقید اور اس کے یعنی سویتائیف کے اختیارات چھیننے کی ایک کوشش تھی، اس لئے اس نے اپنے حریف کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنی تقریر کی ابتدا ہی کورچاگن پر یہ الزام لگاکر کی کہ وہ خودوروف جیسے منشویک کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

یہ گرماگرم بحث تین گھنٹے تک چلتی رہی۔ اس دن بہت رات گئے یہ معاملہ اپنی پوری شدت کو پہونچ گیا۔ حقائق کی ناقابل تردید دلیل کے سامنے شکست کھاکر اور اکثریت کو کورچاگن کے حق میں کھو دینے کے بعد سویتائیف نے ایک بہت ہی غلط

قدم اٹھایا۔ تمام جمہوری اصولوں کو توڑ کر اس نے آخری ووٹ لینے سے پہلے پاویل کو کمرے سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔

«اچھی بات ہے میں چلا جاتا ہوں گو سویتائیف تمہاری یہ حرکت تمہیں زیب نہیں دیتی۔ میں تمہیں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اگر تم اپنی بات پر اڑے رہے تو کل میں اس معاملے کو عام ممبروں کی میٹنگ میں اٹھاؤں گا، اور وہاں تم اکثریت کو اپنے حق میں کرنے میں کامیاب نہیں ہوگے۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے۔ سویتائیف تم غلطی پر ہو۔ کامریڈ خوموتوف، میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا یہ فرض ہے کہ اس معاملے کو عام ممبروں کی میٹنگ میں اٹھانے سے پہلے آپ پارٹی کے گروپ میں اس پر بحث کر لیں۔»

«مجھے دھمکانے کی کوشش نہ کرو» سویتائیف نے سرکشی سے چلاکر کہا۔ «پارٹی کے گروپ کے سامنے میں بھی جا سکتا ہوں اور مجھے ان سے تمہارے بارے میں کچھ باتیں بھی کہنی ہیں۔ اگر تم خود کام کرنا نہیں چاہتے تو کم سے کم جو لوگ کام کرنا چاہتے ہیں ان کے راستے میں رکاوٹ تو نہ ڈالو۔»

باہر نکل‌کر پاویل نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اپنے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور خالی دفتر میں سے ہوتا ہوا باہر کے پھاٹک کی طرف چل دیا۔ باہر سڑک پر نکل‌کر اس نے تازی ہوا میں ایک گہرا سانس لیا اور پھر سگریٹ سلگاکر باتیوا ہل کے اس چھوٹے سے مکان کی طرف چلدیا جہاں توکاریف رہتا تھا۔

جس وقت وہ وہاں پہونچا بوڑھا مستری کھانا کھا رہا تھا۔

«آؤ کیا خبر ہے؟ داریا اس لڑکے کے لئے بھی ایک پلیٹ میں کچھ کھانا لا دو» توکاریف نے پاویل کو کھانے کی میز پر بلاتے ہوئے کہا۔

توکاریف کی بیوی داریا فومینچنا اتنی ہی زیادہ لمبی اور موٹی

تازی تھی جتنا کہ اس کا شوہر چھوٹا اور دبلا تھا ۔ اس نے ایک پلیٹ میں جوار کی کھچڑی لاکر پاویل کے سامنے رکھدی اور پھر اپنے گیلے ھاتھوں کو سفید پیش بند کے دامن سے پونچھتے ہوئے بڑی محبت کے ساتھہ کہا :

«کھاؤ نا بیٹا ۔»

جب وہ بوڑھا کار ورکشاپ میں کام کرتا تھا اس زمانے میں پاویل اکثر توکاریف کے یہاں جایا کرتا تھا ۔ اور ان بوڑھے بڑھیا کے ساتھہ اس نے نہ جانے کتنی خوشگوار شامیں بتائی تھیں ۔ لیکن اس بار شہر واپس آنے کے بعد سے وہ اب پہلی بار ان کے یہاں گیا تھا ۔

بوڑھے مستری نے پاویل کی داستان بڑے غور سے سنی اس کا کھانے کا چمچہ مستقل چل رہا تھا اور بیچ بیچ میں «هوں هاں» کر دینے کے علاوہ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ۔ دلیہ کا پیالہ خالی کرکے اس نے رومال سے اپنی مونچھہ پونچھی اور پھر گلا صاف کرکے بولا:

«یقیناً تم ٹھیک بات کہتے ہو۔ وقت آ گیا ھے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے ۔ جتنے کمیونسٹ ورکشاپ میں ھیں اتنے ضلع بھر میں اور کہیں نہیں ھیں ۔ اس لئے ھمیں وھیں سے کام کی ابتدا کرنی چاھئے ۔ تو آخرکار تمہاری اور سویتائیف کی ٹکر ھو ھی گئی ۔ کیوں؟ بہت برا ھوا ۔ وہ تھوڑا سا چھچھورا ضرور ھے لیکن تم تو ھر قسم کے لڑکوں کے ساتھہ نباہ کر لیتے تھے ۔ کیوں ھے نا؟ اچھا ھاں یہ تو بتاؤ کہ ورکشاپ میں تم دراصل کام کیا کرتے ھو؟»

«میں ایک کھاتے میں کام کر رھا ھوں ۔ اور عام طور پر وھاں جو کچھہ بھی ھوتا ھے اس میں شریک ھوتا ھوں ۔ اپنے ٹولی مرکزہ میں سیاسی تعلیم کا ایک حلقہ بھی چلا رھا ھوں ۔»

«اور بیورو میں؟»

کورچاگن جھجکا ۔

«چونکہ میری صحت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے اور اس کے علاوہ میں کچھ پڑھائی بھی کرنا چاهتا تھا اس لئے میں نے سوچا کہ کچھ عرصے تک تنظیم کی رہنمائی کے کام میں باضابطہ طور پر کوئی حصہ نہیں لوں گا ۔»

«تو یہ کہو!» توکاریف نے اس کی بات پر ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا ۔ «میرے بچے اگر تمہاری صحت کا سوال نہ ہوتا تو میں ابھی تمہاری اچھی طرح خبر لیتا ۔ اچھا اب کیسی ہے تمہاری صحت؟ کچھ بہتر ہے؟»

«جی ہاں ۔»

«اچھا تو اب تم اچھی طرح دل لگاکر کام شروع کر دو ۔ یہ ھیرے پھیرے کی باتیں چھوڑ دو ۔ کنارہ‌کش ہوکر بیٹھ رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا! تم محض ذمےداری سے بچنے کی کوشش کر رہے ہو، اور تم خود بھی اس بات کو جانتے ہو ۔ اچھا تو اب کل ہی سے اپنی یہ غلطی درست کر لو ۔ میں اس سلسلے میں آکونیف کی اچھی طرح خبر لوں گا ۔» توکاریف کے لہجے سے اس کی جھنجلاہٹ صاف ظاہر تھی ۔

«نہیں دادا» پاویل نے جلدی سے اعتراض کرتے ہوئے کہا ۔ «میں نے خود ہی اس سے کہا تھا کہ مجھے کوئی کام نہ دے ۔»

توکاریف حقارت سے سیٹی بجانے لگا ۔

«تم نے کہا اور اس نے چھٹی دیدی کیوں؟ اف! میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کومسومولوں کا کیا کیا جائے ... اچھا بیٹا ذرا مجھے اخبار پڑھ‌کر تو سناؤ جیسے پہلے سنایا کرتے تھے ۔ میری آنکھیں اب کمزور ہو چلی ہیں ۔»

ورکشاپ کی پارٹی کے بیورو نے کومسومول کے بیورو کی اکثریت کا فیصلہ منظور کر لیا، اور پارٹی اور کومسومول کے ممبروں کی ٹولیاں مزدوروں کے ڈسپلن کی مثال قائم کرنے کے اہم اور مشکل کام میں جٹ گئیں۔ بیورو میں سویتائیف کی اچھی طرح خبر لی گئی۔ اس نے شروع میں تو بہت ھنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی لیکن جب پارٹی کے سکریٹری لوپاخن نے اس کے لئے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ ھی نہ چھوڑا تو سویتائیف نے ھتھیار ڈالدئے اور کچھہ حد تک اپنی غلطی بھی تسلیم کر لی۔ لوپاخن ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور اس کے چہرے کی بےآب زردی اس بات کا ثبوت تھی کہ تپ دق اسے اندر ھی اندر کھائے جا رھی ھے۔

دوسرے دن دیواری اخباروں پر کئی مضامین لگے ھوئے تھے جنھوں نے ریلوے کی ورکشاپ کے کھاتوں میں ایک تہلکہ سا مچا دیا ھے۔ یہ مضامین زور زور سے پڑھے گئے اور ان پر خوب گرماگرم بحث ھوئی۔ اس دن شام کو نوجوانوں کی میٹنگ میں غیرمعمولی مجمع تھا اور وھاں صرف ان مضامین میں اٹھائے ھوئے سوالوں پر بحث کی گئی۔

فدین کو کومسومول سے نکال دیا گیا اور کومسومول کے بیورو میں سیاسی تعلیم کی ذمےداری سنبھالنے کیلئے ایک نیا ممبر شامل کر لیا گیا۔ وہ کورچاگن تھا۔

اس نئی منزل پر ریلوے کی ورکشاپ کے سامنے جو نئے کام تھے ان کی تشریح کرتے ھوئے نیژدانوف نے جو تقریر کی اسے غیر معمولی توجہ کے ساتھہ سنا گیا اور ھال میں مکمل خاموشی رھی۔

میٹنگ کے بعد جب سویتائیف باھر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کورچاگن اس کا انتظار کر رھا ھے۔

«آؤ ذرا میرے ساتھه چلو، مجھے تم سے کچھه باتیں کرنی ھیں» پاویل نے کہا ـ

«کاھے کے بارے میں؟» سویتائیف نے ترشی کے ساتھه پوچھا ـ

پاویل اس کا ھاتھه پکڑکر اسے لے چلا اور کچھه دور جاکر وہ دونوں ایک بینچ کے قریب رک گئے ـ

«تھوڑی دیر یہاں بیٹھیں گے» اس نے تجویز کی اور خود بینچ پر بیٹھه گیا ـ

سویتائیف کی سگریٹ کا جلتا ھوا سرا کبھی سلگ کر سرخ ھو جاتا تھا اور کبھی بجھه سا جاتا تھا ـ

«سویتائیف، تمہیں میرے خلاف کیا شکایت ھے؟»

چند منٹ تک مکمل خاموشی رھی ـ

«اچھا تو یہ بات ھے؟ میں سمجھا تھا کہ تمہیں کچھه کام کی بات کرنی ھے» سویتائیف نے بناوٹی تعجب کے ساتھه کہا ـ لیکن اس کی آواز لڑکھڑا رھی تھی ـ

پاویل نے اپنا ھاتھه مضبوطی کے ساتھه اس کے گھٹنے پر رکھدیا ـ

«دیمکا اتنے اونچے سے باتیں نہ کرو ـ اس قسم کی گفتگو صرف سفیروں کو زیب دیتی ھے ـ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے اتنا ناپسند کیوں کرتے ھو؟»

سویتائیف بڑی بےچینی سے اپنی جگہ پر بیٹھا ھوا پہلو بدلنے لگا ـ

«کیسی باتیں کر رھے ھو؟ مجھے بھلا تم سے کیوں شکایت ھونے لگی؟ میں نے خود تمہیں کام دیا تھا کہ نہیں؟ تمہیں نہ انکار کر دیا ـ اور اب تم مجھه پر یہ الزام لگا رھے ھو کہ میں تمہیں باھر رکھنے کی کوشش کر رھا ھوں ـ»

لیکن اس کے الفاظ میں یقین کی کمی تھی، اور پاویل سویتائیف

کے گھٹنے پر اپنا ھاتھہ رکھے ھوئے نہایت خلوص کے ساتھہ کہتا رھا:

«اگر تم نہیں بتاتے تو میں بتاتا ھوں۔ تمہارا خیال ھے کہ میں تمہارے کام کرنے کے طریقے کی راہ میں روڑے اٹکانا چاھتا ھوں۔ تم سمجھتے ھو کہ میں تمہارے کام پر دانت لگائے بیٹھا ھوں۔ اگر ایسا نہ سمجھتے ھوتے تو کوستیا والے معاملے میں مجھہ سے اس طرح نہ جھگڑتے۔ اس قسم کے تعلقات سے ھمارا کام تباہ ھو جائے گا۔ اگر اس کا تعلق صرف ھم دونوں کی ذات سے ھوتا تو میں ذرہ برابر پرواہ نہ کرتا۔ مجھے اس بات کی قطعی فکر نہ ھوتی کہ تم میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ھو۔ لیکن کل سے ھم دونوں کو ساتھہ کام کرنا ھے۔ بھلا اس طرح کیسے کام چلے گا؟ دیکھو سنو۔ ھم دونوں کے درمیان کسی قسم کا جھگڑا نہیں ھونا چاھئے۔ ھم اور تم دونوں مزدور ھیں۔ اگر تم ھم لوگوں کے مقصد کو ھر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ھو تو تم میرے ھاتھہ میں ھاتھہ دے کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دوگے اور آپس کے اس جھگڑے کو بھلا دوگے، اور کل سے ھم دونوں دوشتوں کی طرح کام شروع کریں گے۔ لیکن جب تک تم اپنے دماغ سے ان تمام خرافات باتوں کو نکال نہیں دوگے اور تکڑم بازی سے دور نہیں رھوگے تب تک کام کے دوران میں پیش آنے والی ھر دشواری پر میری اور تمہاری جوتم پیزار ھوتی رھے گی۔ لو میں اپنا دوستی کا ھاتھہ بڑھا ھوں ابھی وقت ھے اگر چاھو تو تم بھی اسی جذبے کے ساتھہ اسے تھام لو۔»

جب سویتائیف کی کھردری انگلیوں نے کورچاگن کا ھاتھہ تھام لیا تو اسے بہت عمیق اطمینان کا احساس ھوا۔

ایک ھفتہ گذر گیا۔ پارٹی کی ضلع کمیٹی میں کام ختم کرنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ دفتر میں خاموشی چھا گئی تھی۔ لیکن

توکاریف ابھی تک کام کر رہا تھا ـ آرام کرسی پر بیٹھا ہؤا وہ تازہ ترین رپورٹوں کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اتنے میں دروازہ پر دستک ہوئی ـ

«اندر آ جاؤ!»

کورچاگن اندر داخل ہؤا اور اس نے سوال ناموں کے دو بھرے ہوئے فارم سکریٹری کی میز پر رکھدئے ـ

«یہ کیا ہے؟»

«یہ غیر ذمےداری کا خاتمہ ہے، دادا ـ اور اگر آپ مجھہ سے پوچھیں تو یہ کام اب سے پہلے ہی ہو جانا چاہئے تھا ـ اگر آپ میرے ہم خیال ہوں تو میں آپ کی تائید کے لئے بہت شکرگذار ہوں گا ـ»

توکاریف نے سوال نامے کی سرخی پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر جلدی سے اس نوجوان کی طرف دیکھا ـ پھر اس نے قلم اٹھا کر سوال نامے کی اس فقرے کے سامنے «روسی کمیونسٹ پارٹی (بالشویک) کی ممبری کی امیدواری کے لئے پاویل آندریوچ کورچاگن کی سفارش کرنے والے ساتھیوں کی پارٹی ممبری کی مدت» اس نے بڑے اعتماد کے ساتھہ لکھدیا: «۱۹۰۳ء سے» اور نیچے اپنے دستخط کر دئے ـ

«یہ لو بیٹا ـ مجھے پکا یقین ہے کہ تم ہمیشہ میرے ان سفید بالوں کی لاج رکھوگے ـ»

کمرے میں سخت گرمی اور گھٹن تھی ـ ہر شخص کے ذہن میں یہی خیال سب سے اہم تھا کہ کس طرح جلد سے جلد سولومینکا کے چیسٹنٹ کے درختوں کے سکون بخش سائے میں پہونچا جائے ـ

«پاوکا بس ختم کرو، اب ایک منٹ بھی برداشت نہیں ہوتا» سویتائیف نے منت کے ساتھہ کہا ـ وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا کاتیوشا اور دوسرے لوگوں نے اس کی تائید کی ـ

پاویل کورچاگن نے کتاب بند کر دی اور تعلیمی حلقہ کا کام ختم ہو گیا۔

جوں ہی وہ لوگ ایک ساتھ اٹھے دیوار پر لگے ہوئے پرانے ڈھنگ کے ایرکسن ٹیلیفون کی گھنٹی ٹن ٹنا اٹھی۔ سویتائیف نے بڑھ کر ٹیلیفون اٹھا لیا۔ کمرے میں اتنا شور ہو رہا تھا کہ اسے بہت چلاکر بولنا پڑا تاکہ دوسری طرف اس کی آواز سنی جا سکے۔

ٹیلیفون رکھکر وہ کورچاگن سے مخاطب ہوا۔

«پولستانی سفارت خانے کے دو ریل کے ڈبے اسٹیشن پر کھڑے ہیں۔ ان کی بتیاں کام نہیں کر رہی ہیں۔ شاید بجلی کے تار میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ ٹرین گھنٹے بھر بعد چھٹنے والی ہے۔ پاویل تم اپنے اوزار لےکر ذرا لپک تو جاؤ۔ یہ کام بہت ضروری ہے۔»

صیقل شدہ پیتل اور اعلی درجے کے موٹے شیشے سے چمکتے ہوئے وہ دونوں سلیپنگ کاریں پہلے پلیٹ فارم پر کھڑی تھیں۔ چوڑی چوڑی کھڑکیوں والا بیٹھنے کا ڈبہ تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، لیکن اس کے قریب والے ڈبے میں بالکل اندھیرا تھا۔

پاویل اس ٹھاٹ دار پل‌مین ڈبے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور اندر داخل ہونیکے ارادے سے اس نے ڈبے کے باہر لگا ہؤا ڈنڈا پکڑا۔

اتنے میں اسٹیشن کی دیوار کے قریب سے جھپٹ کر ایک شخص نے اس کا کندھا پکڑ لیا۔

«کہاں جا رہے ہو؟»

آواز مانوس سی تھی۔ پاویل نے مڑکر اس شخص کی چمڑے کی جیکٹ، چوڑے چھجے والی ٹوپی، اس کی پتلی سی چونچ دار ناک اور اس کی آنکھوں کے شکی اور محتاط انداز کو دیکھا۔

وہ آرتیوخن تھا۔ پہلے تو اس نے پاویل کو پہچانا ہی نہیں، لیکن اسے پہچانتے ہی اس نے اس کا کندھا چھوڑ دیا۔ اس کے سنجیدہ چہرے کا تناؤ کچھ کم ہؤا۔ حالانکہ اس کی نگاہیں سوالیہ انداز میں پاویل کے اوزاروں کے تھیلے پر ہی جمی رہیں۔

«کہاں جا رہے تھے؟» اس نے نسبتاً بےتکلفی سے پوچھا۔

پاویل نے مختصراً اسے بتا دیا۔ ڈبے کے پیچھے سے ایک اور شخص نکلا۔

«ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی ان کے کنڈکٹر کو بلائے لاتا ہوں۔»

جس وقت کورچاگن کنڈکٹر کے پیچھے پیچھے اس سیلون گاڑی میں داخل ہؤا اس وقت وہاں کئی لوگ نہایت عمدہ سفری لباس پہنے، نک سک سے درست بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک میز کے قریب جس پر مشجر کا میزپوش بچھا ہؤا تھا ایک عورت دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ جب پاویل اندر داخل ہؤا اس وقت وہ عورت اپنے رو برو کھڑے ہوئے ایک لمبے قد کے افسر سے باتیں کر رہی تھی۔ بجلی کے مستری کے داخل ہوتے ہی ان دونوں نے اپنی گفتگو بند کر دی۔

کورچاگن نے جلدی سے اس ڈبے کی آخری بتی سے گلیارے میں جانے والے بجلی کے تار کا معائنہ کیا اور اسے درست پاکر وہ خرابی کی تلاش جاری رکھنے کے لئے ڈبے کے باہر چلا گیا۔ بیلوں جیسی گردن والا وہ تگڑا سا کنڈکٹر جس کی وردی پر پولستانی عقاب کے نقش والے پیتل کے بڑے بڑے بٹن چمک رہے تھے مستقل اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

«ذرا دوسرے ڈبے میں چلکر دیکھیں۔ یہاں تو سب ٹھیک ہے۔ بیٹری بھی کام کر رہی ہے۔ وہیں کوئی خرابی ہوگی۔»

کنڈکٹر نے چابی گھماکر دروازہ کھولا. اور وہ دونوں اس تاریک گلیارے میں داخل ہوئے۔ تار پر اپنی ٹارچ کی روشنی

ڈاکٹر پاویل نے فوراً پتہ لگا لیا کہ تار کہاں پر جل گیا تھا۔ چند ہی منٹ بعد گلیارے میں پہلی بتی جلی اور وہاں ایک دھندلی سی روشنی پھیل گئی۔

«کمپارٹمنٹ کے بلب بدلنے پڑیں گے۔ سب فیوز ہو گئے ہیں» کورچاگن نے کنڈکٹر سے کہا جو کہ اسے راستہ دکھا رہا تھا۔

«تب تو مجھے میم صاحب کو بلانا پڑے گا۔ چابی انہیں کے پاس ہے۔» کنڈکٹر بجلی کے مستری کو وہاں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے اسے ساتھہ آنے کو کہا۔

کمپارٹمنٹ میں پہلے وہ عورت داخل ہوئی اور اس کے پیچھے کورچاگن۔ کنڈکٹر راستہ روکے دروازے پر کھڑا رہا۔ پاویل نے چمڑے کے دو نہایت عمدہ سفری تھیلوں، سیٹ پر لاپرواهی سے پڑے ہوئے ریشمی گاؤن، عطر کی شیشی، اور کھڑکی کے نیچے والی میز پر رکھے ہوئے ملاکیٹ کے چھوٹے سے سنگاردان کو غور سے دیکھا۔ وہ عورت گدے دار کوچ پر ایک کونے میں بیٹھہ گئی اور اپنے سنہرے بالوں پر ہاتھہ پھیرتے ہوئے بجلی کے مستری کو کام کرتے دیکھنے لگی۔

«میڈم کیا آپ مجھے کچھہ دیر کے لئے جانے کی اجازت دیں گی؟» کنڈکٹر نے ذرا مشکل سے اپنی بیلوں جیسی موٹی گردن جھکاکر انتہائی خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ «میجر صاحب نے ٹھنڈی بیئر منگوائی ہے۔»

«تم جا سکتے ہو» اس عورت نے بہت تصنع کے ساتھہ کہا۔ یہ گفتگو پولستانی زبان میں ہوئی تھی۔

گلیارے کی بتی کی شعاعیں اس عورت کے کندھے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے نہایت عمدہ گاؤن میں بھی، جو بہترین فرانسیسی سلک کا بنا ہؤا تھا اور جسے پیرس کے بہترین لباس بنانے والوں نے تیار کیا تھا، اس کے شانے اور بازو برہنہ نظر آ رہے تھے۔

اس کے نازک کانوں کی دونوں لؤوں میں ہیرے کے بندے چمک رہے تھے ـ کورچاگن کو اس کا صرف ایک مرمریں شانہ اور بازو دکھائی دے رہا تھا ـ اس کا چہرہ اندھیرے میں چھپا ہوا تھا ـ اپنا پینچ کش تیزی سے گھماتے ہوئے پاویل نے چھت کا نکاس بدلا، اور ایک لمحہ بعد اس ڈبے کی بتیاں بھی روشن ہو گئیں ـ اب صرف صوفے کے اوپر والا بلب دیکھنا باقی رہ گیا تھا جہاں پر کہ وہ خاتون بیٹھی ہوئی تھی ـ

«مجھے وہ بلب ٹیسٹ کرنا ہے» کورچاگن نے اس کے سامنے جاکر کہا ـ

«ہاں شائد میں تمہارے کام میں حائل ہوں؟» خاتون نے نہایت شستہ روسی میں کہا ـ وہ بڑی نزاکت کے ساتھ اٹھی اور بالکل اس کے برابر کھڑی ہو گئی ـ اب اسے اس کا پورا چہرہ دکھائی دے رہا تھا ـ اس کے کمان جیسے ابرو اور حقارت کے انداز میں بھنچے ہوئے ہونٹ وہ بخوبی پہچانتا تھا ـ اسے کوئی شبہ ھی نہیں تھا کہ وہ وکیل کی بیٹی نیلی لیش چینسکی تھی ـ اس نے بھی پاویل کی حیرت بھری نظروں کو دیکھا ـ پاویل نے تو اسے پہچان لیا تھا ـ لیکن ان چار برسوں میں وہ خود اتنا بدل گیا تھا کہ لیش چینسکی کے لئے یہ پہچاننا دشوار تھا کہ یہ بجلی کا مستری اس کا وھی فسادی پڑوسی تھا ـ

اس کے اس طرح حیرت کے ساتھ گھورنے پر جھنجھلاکر وہ اپنی تیوریاں چڑھاکر کمپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف چلی گئی اور وھاں بڑی بے صبری کے ساتھ اپنے پٹینٹ لیدر کے جوتے کی ایڑی فرش پر کھٹکھٹاتی رھی ـ پاویل نے دوسرے بلب کی طرف توجہ کی ـ اس نے بلب گھماکر نکالا اور اسے بتی کے سامنے دیکھتے ہوئے پولستانی زبان میں پوچھا:

«کیا وکٹر بھی یہیں ھے؟»

اپنے اس سوال پر اسے خود بھی تقریباً اتنا ہی تعجب ہوا جتنا کہ اس عورت کو۔

پاویل نے اس کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ہی یہ سوال کیا تھا اس لئے وہ نیلی کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ لیکن اس سوال پر اس کی طویل خاموشی اس بات کی شاہد تھی کہ وہ بوکھلا گئی تھی۔

«کیوں کیا تم اسے جانتے ہو؟»

«ہاں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ دراصل ہم دونوں پڑوسی تھے» پاویل مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

«تم ... تم پاویل ہو۔ میری...» نیلی بالکل بوکھلا گئی تھی۔

«جی ہاں آپ کی باورچن کا بیٹا» کورچاگن نے اس کی دشواری حل کر دی۔

«لیکن تم کتنا بڑھ گئے ہو! جب میں نے دیکھا تھا تب تو تم بالکل لا ابالی سے چھوکرے تھے۔»

نیلی نے سرد مہری سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

«وکٹر کو کیوں پوچھ رہے ہو؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہاری اور اس کی دوستی تو قطعی نہیں تھی» اس نے اپنی شوخ باریک آواز میں کہا۔ یہ اچانک ملاقات اس کی اکتاہٹ کو دور کرنے کا ایک خوشگوار ذریعہ بن سکتی تھی۔

پینچ تیزی سے دیوار میں دھنستا جا رہا تھا۔

«وکٹر پر میرا ایک قرض ہے جو اس نے ابھی تک چکایا نہیں۔ جب اس سے ملاقات ہو تو کہہ دینا کہ میں اس کا خاطر خواہ فیصلہ ہونے کی طرف سے ابھی تک ناامید نہیں ہوا ہوں۔»

«بتاؤ کتنی رقم ہے۔ میں اس کی طرف سے ادا کر دوں گی۔»

وہ بخوبی جانتی تھی کہ کورچاگن کس قرض کا ذکر کر رہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ پیتلورا کے سپاہیوں سے پاویل کو گرفتار کرانے میں وکٹر کا ہی ہاتھ تھا۔ لیکن اس «چیتھڑے لگے شخص»

کا مذاق اڑانے کی غرض سے اس نے یہ توہین آمیز لہجہ اختیار کیا ـ

کورچاگن کچھ نہ بولا ـ

«اچھا بتاؤ کیا یہ سچ ہے کہ ہمارا گھر لوٹ لیا گیا ہے ـ اور وہ اب بالکل بےمرمت حالت میں پڑا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ سمر ہاؤس اور جھاڑیاں وغیرہ تو سب نوچ ڈالی گئی ہوں‌گی» نیلی نے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا ـ

«وہ گھر اب تمہارا نہیں رہا ـ وہ اب ہمارا ہے اور ہم لوگ اپنی چیز کیوں ضائع کرنے لگے ـ»

نیلی تضحیک کے انداز میں دھیرے سے ہنس دی ـ

«اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں سکھایا پڑھایا خوب گیا ہے! لیکن یہ نہ بھولو کہ یہ گاڑی پولستانی سفارت خانے کی ہے ـ یہاں میں مالکن ہوں اور تم آج بھی اسی طرح نوکر کے نوکر ہی ہو جیسے ہمیشہ تھے ـ تم یہاں بجلی کی مرمت کرنے آئے ہو تاکہ میں آرام سے صوفے پر لیٹ کے پڑھ سکوں ـ سمجھے؟ تمہاری ماں ہمارے یہاں کپڑے دھویا کرتی تھی اور تم پانی بھرتے تھے ـ آج بھی ہم عین مین انہیں حالات میں ملے ہیں ـ»

اس کے لہجے میں اپنی فتح پر کینہ ور خوشی کی آمیزش تھی ـ پاویل نے اپنے چاقو سے تار کے سرے کو صاف کرتے ہوئے اس پولستانی عورت پر کھلی ہوئی حقارت کی نظر ڈالی ـ

«تمہارے لئے تو میں ایک تنکا بھی ہلانے والا نہیں ـ لیکن چون‌کہ تم سرمایہ‌داروں نے سفیروں کا طریقہ ایجاد کیا ہے، اس لئے ہم کو بھی وہی کھیل کھیلنا پڑتا ہے ـ ہم سفیروں کے سر قلم نہیں کرتے صرف یہی نہیں، بلکہ ان کے ساتھہ نہایت شرافت کے ساتھہ پیش آتے ہیں تمہارے لئے تو اتنا بھی نہیں کہا جا سکتا ـ»

نیلی کا چہرہ سرخ ہو گیا ـ

«اگر تم وارسا پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تم میرے ساتھہ کیا کروگے؟ تم میری بوٹیاں اڑا دوگے یا شاید مجھے اپنی داشتہ بنا لوگے؟»

وہ بڑی ادا کے ساتھہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے زودحس نتھنے جو کوکین کے عادی تھے کانپنے لگے۔ صوفے کے اوپر والی بتی روشن ہوئی اور پاویل سیدھا کھڑا ہو گیا۔

«تم؟ تمہارے جیسے لوگوں کو مارنے کی کسے فرصت ہے! ہمارے مارے بغیر تم کوکین کے استعمال سے خود ہی مر جاؤگے۔ اور جہاں تک داشتہ کا سوال ہے میں ایک آوارہ طوائف کو تم پر کہیں زیادہ ترجیح دوں گا!»

وہ اپنا اوزاروں کا تھیلا اٹھاکر دروازے کی طرف چلدیا۔ اسے راستہ دینے کے لئے نیلی ایک طرف کو ہٹ گئی۔ وہ گلیارے میں ابھی آدھی دور ہی گیا ہوگا کہ اس نے اپنے پیچھے نیلی کے منھہ سے نکلی ہوئی یہ گالی سنی: «ذلیل بالشویک!»

دوسرے دن شام کو لائبریری جاتے وقت پاویل کی ملاقات کاتیوشا زیلینووا سے ہو گئی۔ اس نے اپنے چھوٹے سے ہاتھہ سے اس کی آستین پکڑکر مذاق سے اس کا راستہ روک لیا۔

«کہاں بھاگے چلے جا رہے مجسمۂ تعلیم و سیاست، بڑے میاں؟»

«لائبریری جا رہا ہوں چاچی۔ مجھے جانے دو» پاویل نے بھی دل لگی کے اسی انداز میں کہا اور دھیرے سے اس کا شانہ پکڑکر اسے ایک طرف کو ہٹا دیا۔ کاتیوشا اپنا کندھا چھڑاکر اس کے ساتھہ چلنے لگی۔

«پاولوشا، میری بات سنو! تم جانتے ہو کہ ہر وقت پڑھائی ممکن نہیں ہے۔ میں بتاتی ہوں تمہیں کہ تم کیا کرو۔ آج شام کو ہمارے ساتھہ ایک پارٹی میں چلو۔ آج ذینا گلیڈش کے یہاں محفل جمے گی۔

تمام لڑکیاں تمہیں بلانے کے لئے میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں ۔ لیکن تمہیں تو آجکل سیاسی تعلیم کے علاوہ اور کسی چیز کا ہوش ہی نہیں ہے ۔ کیا تمہارا کبھی تفریح کو دل نہیں چاہتا؟ ایک دن اگر نہ بھی پڑھوگے تو تمہارا ایسا کیا نقصان ہو جائےگا ۔ شاید کچھ فائدہ ہی ہو» کاتیوشا نے اسے پھسلاتے ہوئے کہا ۔

«کیسی پارٹی ہے؟ وہاں کیا کیا ہوگا؟»

«کیا کیا ہوگا؟» کاتیوشا نے اسے چڑھاتے ہوئے مسکرا کر اس کے الفاظ دہرائے ۔ «وہاں کوئی عبادت کرنے کو تو آئےگا نہیں ۔ یوں ہی تھوڑی دیر ہنسی مذاق میں وقت اچھا گذر جائےگا، اور کیا ۔ تم اکارڈین بجا لیتے ہو نا؟ میں نے کبھی تمہیں بجاتے نہیں سنا ۔ آج شام چلکر ہم لوگوں کو بھی سناؤ ۔ بولو چلوگے نا؟ اچھا میری خاطر؟ ڈینا کے چچا کے پاس ایک اکارڈین ہے ۔ لیکن اسے بجانا بالکل نہیں آتا ۔ ارے کتاب کے کیڑے لڑکیاں تیرے پیچھے دیوانی ہیں ۔ اچھا تم سے یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ کومسومول کے ممبروں کو تفریح اور جشن سے دور رہنا چاہئے؟ آؤ چلو میں اب زیادہ خوشامد نہیں کروں گی ۔ نہیں چلوگے تو میں خفا ہو جاؤں گی، اور پھر مہینے بھر تک تم سے بات بھی نہیں کروں گی ۔»

کاتیا مکانوں کی رنگائی پتائی کا کام کرتی تھی ۔ وہ بہت ہی اچھی کامریڈ اور اعلی درجے کی کومسومول کی ممبر تھی ۔ پاویل اس لڑکی کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا اس لئے وہ راضی ہو گیا، حالانکہ ایسی پارٹیوں میں جاکر اسے ہمیشہ کچھ عجیب عجیب سا لگتا تھا اور وہ وہاں اپنے آپ کو اجنبی سا محسوس کرتا تھا ۔

انجن ڈرائیور گلیڈش کے مکان پر نوجوانوں کا اچھا خاصہ پرشور مجمع ہو گیا تھا ۔ رہنے کا بڑا کمرہ اور سامنے والے باغیچے کے رخ کی برساتی ان پندرہ بیس لڑکے، لڑکیوں کے حوالے کرکے گھر کے بڑے لوگ دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے ۔ جس وقت

کاتیوشا پاویل کو ساتھ لئے باغیچے کو پار کرکے برساتی میں داخل ہوئی اس وقت وہاں ایک کھیل جاری تھا جسے «کبوتروں کو دانہ چگانا» کہتے تھے۔ برساتی کے بیچ میں دو کرسیاں پیٹھ جوڑ کر رکھدی گئیں تھیں۔ میزبان لڑکی کے آواز دینے پر ایک لڑکا اور ایک لڑکی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھ جاتے تھے۔ اور پھر کھیل چلانے والی میزبان لڑکی کہتی تھی «کبوتروں کو دانہ چگاؤ!» تو دونوں پیچھے کی طرف اپنی گردنیں جھکانا شروع کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے ہونٹ مل جاتے تھے اور اس بات پر تماشبین بےحد لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے «انگوٹھی» اور «ڈاکیہ آیا» نام کے کھیل کھیلے۔ یہ دونوں بھی بوسے بازی کے کھیل تھے۔ لیکن «ڈاکیہ آیا» میں خاص بات یہ تھی کہ اس کھیل کو کھیلنے والے روشن برساتی میں سرعام ایک دوسرے کا بوسہ لینے کے بجائے کمرے میں جاکر بتیاں گل کرکے یہ کام انجام دیتے تھے۔ جن لوگوں کو ان کھیلوں میں دلچسپی نہیں تھی ان کے لئے کونے میں ایک چھوٹی سی گول میز پر پھولوں کے ناموں والے خاص قسم کے تاشوں کی ایک گڈی رکھی ہوئی تھی۔ پاویل کے بالکل برابر بیٹھی ہوئی کنجی آنکھوں والی ایک سولہ سالہ لڑکی نے، جس نے اپنا نام مورا بتایا تھا، بہت شرمائی ہوئی نظروں سے دیکھکر اسے ایک پتا پکڑا دیا اور بڑے نرم لہجے میں کہا:

«وائیلیٹ۔»

چند سال پہلے پاویل اس قسم کی پارٹیوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اور حالانکہ وہ خود ان نکمی، غیر سنجیدہ حرکتوں میں براہ راست حصہ نہیں لیتا تھا لیکن وہ انہیں غیرفطری یا معیوب بھی نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن چونکہ اب وہ نچلے متوسط طبقے کی قصباتی زندگی سے ہمیشہ کے لئے ناتا توڑ چکا تھا اس لئے اسے یہ پارٹی

انتہائی قابل نفرت اور کچھہ مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔

لیکن پھر بھی وہ پھولوں کے نام والے تاش کے پتے ہاتھہ میں لئے وہاں بیٹھا تھا۔

اس تاش کے پتے پر اس نے لفظ «وائیلیٹ» کے سامنے یہ تحریر پڑھی «میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں۔»

پاویل نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی بلاکسی جھجک یا پریشانی کے اسے جواباً دیکھا۔

«کیوں؟»

اس نے یہ سوال بہت ہی روکھےپن سے کیا تھا۔ لیکن مورا پہلے ہی سے جواب سوچے بیٹھی تھی۔

«گلاب» اس نے زیرلب کہا اور اسے دوسرا پتا تھما دیا۔

«گلاب» والےپتے پر یہ خرافات درج تھی: «تم میرے لئے معیاری آدمی ہو۔» کورچاگن اس لڑکی کی طرف مخاطب ہؤا اور شعوری طور پر اپنے لہجے میں نرمی لانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پوچھا:

«آخر تم ان سب خرافات باتوں میں حصہ کیوں لیتی ہو؟»

مورا یہ سنکر اتنی حیران ہوئی کہ اس کی سمجھہ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

«کیا تم برا مان گئے» اس نے نخرے کے ساتھہ اپنا ہونٹ لٹکاکر پوچھا۔

پاویل نے اس کے سوال کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر بھی اس کے دل میں اس لڑکی کی بابت اور زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے مورا سے کئی سوال پوچھے جن کا اس نے بڑی خوشی سے جواب دیا۔ چند ہی منٹ بعد پاویل یہ معلوم کر چکا تھا کہ وہ ثانوی اسکول میں پڑھتی تھی، اس کا باپ کار کی ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ اور وہ پاویل کو بہت

عرصے سے جانتی تھی، اور اس کے ساتھ جان پہچان پیدا کرنے کی خواهش رکھتی تھی -

«تمہارا پورا نام کیا ھے؟» پاویل نے پوچھا -

«مورا والنتسیوا -»

«تمہارا بھائی یارڈ کے کومسومول کی تنظیم کا سکریٹری ھے نا؟»

«هاں -»

اب پاویل اسے پہچان گیا تھا - ظاهر تھا کہ والنتسیف نے، جو کہ ضلع کی کومسومول تنظیم کے سب سے زیادہ سرگرم کارکنوں میں سے ایک تھا، اپنی بہن کی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی، اور وہ ایک عامیانہ خیالات کی جاهل اور سطحی لڑکی بنتی جا رهی تھی - گذشتہ ایک سال کے دوران میں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بوسے بازی کی ایسی متعدد پارٹیوں میں شریک هو چکی تھی - اس نے پاویل کو بتایا کہ وہ اسے کئی بار اپنے بھائی کے گھر پر دیکھ چکی تھی -

مورا کو احساس هؤا کہ اس کے ساتھی کو اس کا انداز کچھ پسند نہیں آیا تھا - کورچاگن کے چہرے پر ایک حقارت آمیز مسکراهٹ دیکھ‌کر اس نے اپنی باری پر جاکر «کبوتروں کو دانہ چگانے» سے صاف انکار کر دیا - وہ دونوں کچھ دیر تک وهاں بیٹھے باتیں کرتے رهے - اس عرصے میں مورا نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں - اتنے میں زیلینووا وهاں آئی -

«میں تمہیں اکارڈین لا دوں؟» اس نے پاویل سے پوچھا - اور پھر مورا پر ایک شرارت بھری نظر ڈالکر کہا - «اچھا تو اتنی دیر میں تم نے دوستی بھی کر لی؟»

پاویل نے کاتیوشا کو زبردستی اپنی میز پر بٹھا لیا اور چاروں طرف شور و غل اور قہقہوں کا فائدہ اٹھاکر اس نے کہا:

«میں اکارڈین نہیں بجاؤں گا۔ میں اور مورا تو جا رہے ہیں۔»

«اوخو! اوھو! تو آپ کو یہ سب بہت ناگوار گذرا ہے کیوں؟» زیلینووا نے طعنہ دیا۔

«ہاں یہی بات ہے۔ اچھا کاتیوشا یہ بتاؤ کہ ہمارے علاوہ یہاں اور بھی کوئی کومسومول ہے یا ہمیں اکیلے، کبوتر باز، ہیں؟»

«ارے نہیں۔ یہ مذاق تو اب ختم ہو گیا» کاتیوشا نے اسے منانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ «اب ہم لوگ ناچنے جا رہے ہیں۔»

کورچاگن کھڑا ہو گیا۔

«اچھا دوست تم لوگ ناچو۔ میں اور مورا تو چلے۔»

ایک دن شام کو آنا بورھارٹ یوں ہی آکونیف سے ملنے اس کے گھر گئی۔ اس وقت وہاں کورچاگن اکیلا ہی تھا۔

«پاویل کیا تم بہت مصروف ہو؟ کیا تم میرے ساتھہ شہر کی سوویت کے مکمل اجلاس نہیں چل سکتے؟ میں اکیلے نہیں جانا چاھتی۔ خصوصاً اس لئے کہ وہاں سے لوٹنے میں بڑی دیر ہو جائے گی۔»

کورچاگن فوراً چلنے کو تیار ہو گیا۔ وہ اپنا پلنگ کے سرھانے ٹنگا ہوا مازر پستول بھی لے جانا چاھتا تھا۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہ بہت بھاری ہوگا۔ اس لئے اس نے میز کی دراز میں سے آکونیف کا ریوالور نکالکر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس نے آکونیف کے نام ایک پرچہ لکھکر چھوڑ دیا اور کمرہ بند کرکے چابی ایسی جگہ چھپاکر رکھدی کہ آکونیف کے علاوہ اور کسی کو نہ ملے۔

تھیٹر میں جہاں وہ مکمل اجلاس ہو رہا تھا ان کی ملاقات پانکراتوف اور آلگا یورینیوا سے ہوئی۔ وہ سب لوگ ہال میں اکٹھے بیٹھے اور وقفوں میں سب ایک ساتھ باہر ٹہلنے گئے۔ جیسا کہ آنا کو اندیشہ تھا میٹنگ بہت دیر میں ختم ہوئی۔

«میری رائے میں تو آج رات تم میرے گھر پر ہی رہ جاؤ» آلگا نے تجویز کی۔ «بہت دیر ہو گئی ہے اور تمہیں جانا بھی بہت دور ہے۔»

لیکن آنا نے انکار کر دیا۔ «پاویل نے کہا ہے کہ وہ مجھے گھر تک پہونچا آئے گا» اس نے جواب دیا۔

پانکراتوف اور آلگا تو بڑی سڑک کی طرف چلے گئے اور وہ دونوں پہاڑی پر ہوکر سولومینکا جانے والی سڑک پر چلدئے۔

وہ رات بہت تاریک تھی، اور گھٹن بھی کافی تھی۔ میٹنگ میں شریک ہونے والے لوگ جس وقت اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوئے اس وقت تمام شہر سو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے قدموں کی آہٹ اور ان کی آوازیں بھی رات کی خاموشی میں کھو گئیں۔ آنا اور پاویل شہر کے وسطی علاقے سے تیز قدم بڑھاتے ہوئے شہر سے باہر کی طرف چلے جا رہے تھے۔ سنسان بازار میں انہیں گشتی پہرے داروں کے ایک دستے نے روکا اور ان کے کاغذات کی جانچ کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ وہ دونوں سایہ‌دار کشادہ سڑک پار کرکے ایک اندھیری ویران سڑک پر آ نکلے جو ایک خالی میدان میں سے ہوکر جاتی تھی۔ بائیں طرف گھوم کر وہ ریلوے کے خاص گوداموں کے متوازی جانے والی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ گودام سیمنٹ کی ہیبتناک تاریک عمارتوں کے ایک سلسلے کی شکل میں یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے تھے۔ آنا کے دل میں ایک موہوم سا خوف بیٹھ گیا۔ وہ بڑی فکرمندی سے تاریکی میں گھور رہی تھی اور اپنے ساتھی کے سوالوں کا جواب بہت گھبرا کر اٹک اٹک

کر دیے رہی تھی۔ دور ایک سایہ دیکھکر وہ بہت دہشت زدہ ہوئی۔ لیکن قریب پہونچنے پر جب وہ سایہ ٹیلیفون کے کھمبے سے زیادہ ڈراونی چیز نہیں ثابت ہوا تو وہ زور سے ہنس پڑی اور اس نے پاویل سے اپنی گھبراہٹ کا اقرار کیا۔ اس نے پاویل کا بازو پکڑ لیا اور اس کا کندھا اپنے کندھے سے ملاکر اسے بہت تقویت حاصل ہوئی۔

«میں ابھی ہوں تو تیئیس برس کی لیکن ڈرتی ایسا ہوں جیسے بوڑھی عورتیں۔ لیکن اگر تم کہو کہ میں بزدل ہوں تو یہ بات نہیں ہے۔ مگر آج رات مجھے نہ جانے کیوں اتنا ڈر لگ رہا ہے۔ اگرچہ تم ساتھہ ہو اس لئے میں بالکل محفوظ محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن سچ مچ میں اپنے خوف پر بہت شرمندہ ہوں۔»

تاریک رات، راستے کی ویرانی اور شہر کے گرد و نواح کے علاقے میں پرسوں رات ایک ہولناک قتل کی خبر سے جو ان لوگوں نے ابھی میٹنگ میں سنی تھی، آنا کے دل میں کافی دہشت بیٹھہ گئی تھی۔ لیکن پاویل کا اطمینان اور اس کی جلتی ہوئی سگریٹ کی مدھم سی روشنی جو اس کے چہرے کے ایک حصے کو لمحہ بھر کے لئے روشن کر دیتی تھی اور جس میں اس کے دلیری کا ثبوت دینے والے کھنچے ہوئے ابرو چمک اٹھتے تھے، یہ سب دیکھکر آنا کے تمام خوف دور ہو گئے۔

ریلوے کے گودام پیچھے رہ گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کھاڑی تھی جس پر پل بنا ہوًا تھا۔ انہوں نے اس پل کو پار کیا اور ریلوے لائن کے نیچے نیچے چلنے والی سرنگ کی طرف جانے والی سڑک پر بڑھتے رہے۔ یہی سرنگ شہر کے اس حصے کو ریلوے کے علاقے سے جوڑتی تھی۔

اسٹیشن کی عمارت ان کی داھنی طرف بہت پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ ڈپو کے آگے جاکر یہ سڑک ایک بند گلی سے مل جاتی

تھی۔ وہ دونوں اپنی منزل کے بہت قریب پہونچ گئے تھے۔ اوپر ریلوے لائن کے کنارے سگنلوں اور پٹڑی بدلنے والے سوئچوں کی رنگین بتیاں تاریکی میں اپنی آنکھیں جھپکا رہی تھیں۔ اور ڈپو کے قریب ایک انجن دن کا کام ختم کر کے گاڑی سے علیحدہ ہوکر رات بھر کے لئے گھر جاتے وقت تھکی ہوئی آہیں بھر رہا تھا۔

ریل کی سرنگ کے باہر ایک زنگ آلود کڑے سے سڑک کی بتی لٹک رہی تھی جو ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی تھی اور اس کی دھندلی زرد روشنی سرنگ کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک جھولا جھولنے لگتی تھی۔

سرنگ سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر بڑی سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا بنگلہ تن تنہا کھڑا تھا۔ دو سال قبل توپ کے ایک بھاری سے گولے سے اس کا اندرونی حصہ بالکل مسمار ہو گیا تھا اور سامنے والا حصہ بھی کھنڈر بن چکا تھا۔ اب اس بنگلے کے نام پر سامنے والی دیوار میں صرف ایک بڑا سا سوراخ منھ پھاڑے سڑک کے کنارے بھکاری کی طرح کھڑا اپنی مفلسی اور بےسروسامانی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اوپر پشتے پر ایک ریل گاڑی گڑگڑاتی ہوئی گذر گئی۔

«اب تو ہم بالکل گھر کے قریب پہونچ گئے» آنا نے اطمینان کا سانس لےکر کہا۔

پاویل نے چوری چوری اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، لیکن آنا بھلا کب چھوڑنے والی تھی۔ وہ اس ویران بنگلے کے سامنے سے گذرے۔

یک بیک ان کے پیچھے ایک دھماکا سا ہؤا اور بھاگتے ہوئے قدموں اور گہرے گہرے سانس لینے کی آواز آئی۔ وہ دونوں ناگہانی پکڑے گئے تھے۔

کورچاگن نے جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن آنا دہشت زدہ ہوکر پوری طاقت کے ساتھہ اس سے چمٹی رہی – اور جب تک وہ اپنا بازو چھڑائے چھڑائے موقع ہاتھہ سے نکل گیا تھا اس کی گردن ایک آہنی شکنجے میں جکڑ لی گئی اور دوسرے ہی لمحے قاتل نے اسے جھٹکا دے کر اپنے رو برو کھڑا کر لیا – اس نے اپنا ہاتھہ بڑھاکر پاویل کی قمیص کا کالر اتنے کس کر اینٹھا کہ اس کا دم گھٹتے گھٹتے بچا – وہ اس کے چہرے کے سامنے ایک ریوالور تانے ہوئے تھا، اور مستقل ریوالور کی نلی اس کی آنکھوں کے سامنے گھما رہا تھا –

پاویل کی مبہوت و مسحور آنکھیں زندگی اور موت کی اس اعصاب شکن کشاکش میں ریوالور کے دہانے کے ساتھہ ساتھہ گھوم رہی تھیں – ریوالور کی نلی میں سے موت اسے گھور رہی تھی، اور اس طرف سے اپنی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے بھی ہٹانے کی نہ تو اس میں جرائت تھی نہ خواہش – وہ اپنے انجام کا منتظر تھا – لیکن قاتل نے گولی نہیں چلائی، اور پاویل نے اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس رہزن کا چہرہ، اس کی بڑی سی کھوپڑی، اس کا چوکور جبڑہ اور اس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور مونچھوں کی سیاہی دیکھی – لیکن ٹوپی کے چوڑے چھجے کے نیچے اس کی آنکھیں نہیں دکھائی دے رہی تھیں – کورچاگن نے کنکھیوں سے آنا کے کھریا جیسے سفید چہرے کی ایک مختصر جھلک دیکھی – ان تین غنڈوں میں سے ایک اسے گھسیٹ کر دیوار کے سوراخ میں لے جا رہا تھا – غنڈے نے اس کے ہاتھہ بڑی بے رحمی سے مڑوڑ کر اسے زمین پر گرا دیا تھا – ایک دوسرا سایہ پاویل کی طرف لپکا – لیکن وہ صرف سرنگ کی دیوار پر اس کا عکس ہی دیکھہ پایا – اسے پیچھے سے کھنڈر کے اندر ہونے والی ہاتھا پائی کی آواز سنائی دے رہی تھی – آنا اپنی جان کی بازی لگاکر لڑ رہی

تھی۔ اس کی گھٹی ہوئی چیخ یک لخت رک گئی کیوں‌کہ اس کے منھہ میں اس غنڈے نے اپنی ٹوپی ٹھونس دی تھی۔ وہ بڑی کھوپڑی والا غنڈا جس کے ہاتھہ میں کورچاگن کی زندگی اور موت کا فیصلہ تھا زنابا الجبر کے اس مقام کی طرف اس طرح کھنچا چلا گیا جیسے جنگلی درندہ اپنے شکار کی طرف کھنچتا ہے۔ ظاہر تھا کہ وہ اس گروہ کا سردار تھا، اور ان حالات میں ایک بے عمل تماشبین کا کردار اسے زیب نہیں دیتا تھا۔ جس چھوکرے کو وہ اپنی زد میں لئے کھڑا تھا وہ تو ابھی بالکل ناپختہ چوزہ ہی تھا۔ «ڈپو کے چھوکروں» میں سے ایک معلوم ہوتا تھا۔ ایسے کل کے لونڈے سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔

«اس کی کھوپڑی پر ایک دو ہاتھہ کس کے رسید کر دو اور اس سے کہدو کہ کھیت کھیت چلا جائے۔ دم دباکر بھاگےگا، سیدھا شہر پہونچ‌کر ہی دم لےگا۔ پلٹ‌کر ادھر دیکھےگا بھی نہیں۔» غنڈوں کے سردار نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔

«بھاگ جاؤ یہاں سے... جس راستے آئے ہو اسی راستے لوٹ جاؤ اور اگر ذرا بھی چوں چپڑ کی تو گولی گدی کے پار ہو جائےگی۔» یہ کہہ‌کر غنڈے نے ریوالور کی نلی کورچاگن کے ماتھے پر رکھہ دی۔ «بس اب رفو چکر ہو جاؤ» اس نے بھرائی ہوئی آواز میں چپکے سے کہا اور ریوالور نیچے کر کے اسے یقین دلایا کہ اسے گولی کا خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

کورچاگن پیچھے کی طرف لڑکھڑایا، اور اپنے قاتل پر نظر جماکر آڑا آڑا بھاگنے لگا۔ غنڈے نے جب یہ دیکھا کہ وہ ابھی تک ڈر رہا ہے کہ کہیں اس پر گولی نہ چلا دی جائے تو وہ مڑکر کھنڈر کی طرف چلایا۔

کورچاگن کا ہاتھہ فوراً جیب کی طرف گیا۔ کاش اس کا ہاتھہ کافی تیز چل سکے! وہ پھرتی سے گھوما اور ہاتھہ بڑھاکر اس نے جلدی سے نشانہ لےکر گولی چلا دی۔

اس غنڈے کو اپنی غلطی کا احساس بہت دیر میں ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنا ہاتھ اٹھائے گولی اس کے پہلو میں پیوست ہو چکی تھی۔

گولی لگتے ہی وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر چکر کھاتا ہوا سرنگ کی دیوار پر گرا، اور دیوار میں اپنے پنجے گاڑنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا وہ رفتہ رفتہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ کھنڈر سے ایک سایہ نکل کر نیچے نالے کی طرف چلا۔ کورچاگن نے اسے نشانہ بنا کر ایک گولی اور چلائی۔ اتنے میں ایک دوسرا سایہ اپنی کمر دوھری کئے چھتے کی تاریک گہرائیوں کی طرف تیر سا جھپٹا۔ ایک اور گولی چلی۔ وہ تاریک سایہ گولی سے اڑے ہوئے پلستر کی گرد میں اٹا ہوا ایک طرف کو کودا اور رات کی سیاہی میں گم ہو گیا۔ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی براؤننگ پستول سے ایک اور گولی چلی۔ دیوار کے قریب وہ بڑی کھوپڑی والا غنڈہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا تھا۔

کورچاگن نے سہارا دے کر آنا کو اٹھایا۔ ابھی اس پر جو کچھ گذری تھی اس سے وہ اتنی دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ وہ اس تڑپتے ہوئے غنڈے کو تکتی رہی پھر بھی اسے یقین نہیں ہوا کہ وہ اب بالکل محفوظ ہے۔

کورچاگن اسے روشنی کے دائرے سے ہٹا کر واپس شہر کی طرف اندھیرے میں گھسیٹ لے گیا۔ جس وقت وہ دونوں بھاگتے ہوئے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے، سرنگ کے قریب ریلوے لائن کے پشتے پر کچھ ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں اور ریل کی پٹڑیوں پر گولی چلنے کی آواز گونج گئی۔

جس وقت وہ باتیوا ہل پر آنا کے گھر پہونچے مرغ بانگ دے رہے تھے۔ آنا جاتے ہی پلنگ پر لیٹ گئی۔ کورچاگن میز کے قریب بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور لہرا کر اوپر اٹھتے ہوئے دھوئیں

کے سرمئی بادلوں کو دیکھ رہا تھا... اپنی زندگی میں اس نے یہ چوتھی بار قتل کیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ہمت واقعی کوئی چیز ہوتی ہے، ایک ایسی چیز جو ہمیشہ بالکل بے عیب شکل میں ظہور میں آتی ہے؟ اپنے اس سانحے کے دوران کے احساسات و تاثرات پر نظرثانی کرتے ہوئے اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ شروع میں چند سیکنڈ تک جب ریوالور کا سیاہ منحوس دھانہ اس کے سامنے ناچ رہا تھا، اس وقت اس کے دل پر واقعی ایک دھشت طاری ہو گئی تھی۔ ان دو تاریک سایوں کے بچ کر نکل جانے کی وجہ کیا محض یہ تھی کہ اس کی آنکھیں کچھ کمزور ہو گئی ہیں اور اسے بائیں ہاتھ سے گولی چلانی پڑی تھی؟ نہیں، ایسا نہیں تھا۔ وہ لوگ چند ہی قدموں کے فاصلے پر تھے اور اس کا نشانہ اس طرح چوکنا نہیں چاہئے تھا، لیکن ذہنی کشاکش اور تعجیل، جو خوف و اضطراب کی بین علامتیں ہیں، ان کی وجہ سے اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا۔

میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں اس کا سر صاف نظر آ رہا تھا۔ آنا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے کی ہر حرکت کو ذہن نشین کرتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل پرسکون تھیں، صرف اس کی پیشانی پر پڑے ہوئے بل اس کے شدید ذہنی غور و فکر کی غمازی کر رہے تھے۔

«کیا سوچ رہے ہو پاویل؟»

اس اچانک سوال سے چونک کر اس کے خیالات روشنی کے حلقے سے باہر دھوئیں کی طرح ادھر ادھر پھیل گئے اور اس کے ذہن میں جو بات سب سے پہلے آئی وہی اس نے کہدی:

«مجھے کمانڈنٹ کے دفتر جاکر فوراً اس معاملے کی رپورٹ کرنی چاہئے۔»

وہ بڑی بےدلی سے اٹھا۔ وہ بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔

آنا اس کا ہاتھہ تھامے رہی، کیوں کہ وہ وہاں اکیلے رہنے کے تصور سے گھبرا رہی تھی۔ پھر وہ اسے دروازہ تک چھوڑنے گئی اور جب تک وہ نوجوان جس کا اس پر اتنا بڑا احسان تھا رات کی تاریکی میں غائب نہیں ہو گیا، تب تک وہ دہلیز پر کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ریلوے کے سنتریوں کے لئے وہ قتل ایک معمہ بن کر رہ گیا تھا، لیکن کورچاگن کی رپورٹ سے مسئلہ بالکل حل ہو گیا۔ یہ تو فوراً پہچان لیا گیا تھا کہ وہ لاش فمکا نامی ایک نمبری بدمعاش کی تھی جو کئی بار کا سزایافتہ قاتل اور ڈاکو تھا۔

دوسرے دن ریل کی سرنگ والے اس واقعے کا ذکر ہر شخص کی زبان پر تھا۔ اور یہی واقعہ پاویل اور سویتائیف کی ایک اچانک ٹکر کا سبب بن گیا۔

سویتائیف کام کے اوقات کے دوران میں ہی ورکشاپ میں آیا اور کورچاگن کو باہر بلا لے گیا۔ خاموشی کے ساتھہ اس کے آگے آگے چلتے ہوئے سویتائیف اسے برآمدہ کے دور والے کونے میں لے گیا۔ وہ بہت ہیجانی حالت میں تھا اور اس کی سمجھہ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کی ابتداء کس طرح کرے۔ آخرکار اس نے ایک دم سوال کر ہی ڈالا:

«مجھے بتاؤ کل کیا ہوا تھا؟»

«میرا تو خیال تھا کہ تمہیں معلوم ہو گا۔»

سویتائیف نے بےچینی سے اپنے کندھے جھٹکے۔ پاویل کو یہ علم نہیں تھا کہ ریل کی سرنگ والے واقعے میں سویتائیف کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسکی تمام ظاہری بے توجہی کے باوجود اس لوہار کے دل میں آنا بورہاٹ کے لئے ایک گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ واحد شخص نہیں تھا جو اس لڑکی کی کشش کا شکار ہوا تھا، لیکن اوروں

کے مقابلے میں اس کی حالت زیادہ نازک تھی۔ لاگوتینا کی زبانی اسے ابھی رات والے واقعے کی اطلاع ملی تھی اور اس وقت صرف ایک سوال جس کا وہ کوئی جواب ابھی تک نہیں پا سکا تھا اسے ذہنی اذیت پہونچا رہا تھا۔ وہ اس سوال کو بجلی کے مستری سے سیدھے سیدھے تو نہیں پوچھ سکتا تھا، لیکن اس کے لئے جواب حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کے شریفانہ احساسات تو کہتے تھے کہ اس قسم کا اندیشہ کرنا خودغرضی اور ذلالت کا ثبوت ہے۔ لیکن دل میں امنڈتے ہوئے متعدد جذبات کی کشمکش میں وحشیانہ اور غیرمہذبانہ جذبات کی فتح ہوئی۔

«کورچاگن بات سنو» اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ «یہ گفتگو محض ہم دونوں تک محدود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم آنا کے خیال سے اس کے بارے میں ذکر نہیں کرنا چاہتے ہو لیکن تم مجھ پر پوری طرح بھروسہ کر سکتے ہو۔ مجھے تم صرف یہ بتا دو کہ جس وقت وہ غنڈہ تمہیں پستول کا نشانہ بنائے کھڑا تھا اس عرصے میں کیا دوسرے غنڈوں نے آنا کے ساتھ زنا کی تھی؟»

اپنے سوال پر خود ہی بوکھلاکر اس نے بات ختم کرنے سے پہلے ہی اپنی نظریں جھکا لیں۔

رفتہ رفتہ پاویل کو ایک موہوم سا احساس اور اندازہ ہونے لگا کہ اس شخص کو کیا چیز پریشان کر رہی تھی۔ «اگر اسے آنا میں کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی تو وہ اس واقعے پر اس قدر پریشان نہ ہو جاتا۔ لیکن اگر آنا سچ مچ اسے عزیز ہے تو...» اور اس سوال میں آنا کی طرف جو توہین آمیز رویہ پوشیدہ تھا اس پر پاویل جل اٹھا:

«آخر تم یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟»

سویتائیف نے بدبداکر چند بے ربط سے فقرے کہے ۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ پاویل اس کے شبہات کو بخوبی سمجھتا ہے اس لئے اس نے غصہ ہوکر کہا:

«دیکھو الٹے مجھ سے سوال کرکے مجھے چکمہ دینے کی کوشش نہ کرو ۔ میں صرف اپنے سوال کا سیدھا سیدھا جواب چاہتا ہوں ۔»

«کیا تم آنا سے محبت کرتے ہو؟»

بڑی دیر تک خاموشی رہی ۔ آخرکار سویتائیف نے بڑی کوشش کرکے جواب دیا:

«ہاں ۔»

کورچاگن بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو رکھکر پیچھے مڑا اور برآمدے میں تیز قدم رکھتا ہوا چل دیا ۔ اس نے پلٹکر ایک بار بھی پیچھے نہیں دیکھا ۔

ایک دفعہ رات کے وقت جب پاویل اپنے پلنگ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا آکونیف کافی دیر تک عجیب شش و پنج کے عالم میں اپنے دوست کے پلنگ کے گرد منڈلاتا رہا ۔ آخرکار وہ پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گیا، اور پاویل کی کتاب پر اس نے اپنا ہاتھ رکھدیا ۔

«سنو پاولوشکا ۔ میرے سینے پر ایک بوجھ ہے جسے میں ہلکا کرنا چاہتا ہوں ۔ اگر دیکھا جائے تو کوئی خاص اہم بات نہیں ہے، لیکن ایک اعتبار سے اہم ہے بھی ۔ بات یہ ہے کہ میرے اور تالیا لاگوتینا کے درمیان کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے ۔ صورت یہ ہے کہ میں اسے شروع میں کافی پسند کرتا تھا ۔» آکونیف نے جھینپتے ہوئے اپنا سر کھجایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے دوست کے چہرے پر ہنسی کے کوئی آثار نہیں ہیں تو اس کی ہمت بندھی ۔ «لیکن پھر تالیا... خیر تم تو جانتے ہی ہو ۔ اچھا میں تمہیں یہ سب غیر دلچسپ تفصیلات نہیں سناؤں گا ۔ ان کے بغیر

بھی بات کافی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔ ہاں تو کل میں نے اور اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں، اور دیکھیں کہ گاڑی کیسی چلتی ہے۔ میں اب بائیس برس کا ہوں۔ اور ہم دونوں کو ووٹ دینے کا حق ہے۔ ہم دونوں برابری کی بناء پر ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟»

کورچاگن سوال پر غور کرنے لگا۔

«کولیا میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ تم دونوں ہی میرے دوست ہو۔ ہم سب ایک ہی قبیلہ کے رکن ہیں۔ اور ہم لوگوں میں باقی تمام باتیں بھی مشترک ہیں۔ تالیا بہت اچھی لڑکی ہے۔ کوئی دشواری ہی نہیں۔»

دوسرے دن کورچاگن وہاں سے ڈپو کے مزدوروں کے ہوسٹل میں چلا گیا۔ اور چند دن بعد آنا نے تالیا اور نکولائی کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ ایک معمولی سی کمیونسٹ دعوت جس میں کھانے پینے کا جھنجھٹ نہیں تھا۔ اس شام کو بہت سی پچھلی یادیں تازہ کی گئیں اور سب کی پسندیدہ کتابوں کے اقتباسات پڑھے گئے۔ ان لوگوں نے بہت سے گانے گائے اور اچھے گائے۔ ان کا پرجوش نغمہ دور دور تک گونج اٹھا۔ بعد میں کاتیوشا زیلینووا اور والنتسیوا ایک اکارڈین اٹھا لائیں، اور پرکیف موسیقی کی تانوں اور نقرئی زیروبم سے کمرہ گونجنے لگا۔ اس دن شام کو پاویل نے معمول سے اچھا اکارڈین بجایا۔ اور جب بے ڈول پانکراتوف ناچنے کے لئے میدان میں آیا تو سب لوگ بہت خوش ہوئے، اور پاویل اپنے افسردہ سے طرز کو، جو اس نے حال میں اختیار کیا تھا چھوڑ کر خوب لہک لہک کر اکارڈین بجانے لگا:

دینکن کو جب ملیگی چٹھی
کولچک کی ہوئی خراب مٹی،
اسکی گم ہو جائیگی سٹی

اکارڈین پر بیتے ہوئے طوفانی اور پرحوادث دنوں کے نغمے بھی بج رہے تھے، اور موجودہ دوستی، جدوجہد اور خوشی کے بھی۔ لیکن جب ساز والنتسیف کے ھاتھہ میں دیا گیا اور اس نے «یابلوچکو» ناچ کی پھڑکتی ہوئی دھن چھیڑی تو کورچاگن خود نہایت جوش کے ساتھہ ایڑیاں پٹک پٹک کر ناچتا ھوا میدان میں اترا۔ اپنی زندگی میں اس کے ناچنے کا یہ تیسرا اور آخری موقع تھا۔

چوتھا باب

یہ سرحد ھے۔ دو کھمبے خاموش عداوت کے انداز میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوئے ھیں، اور دونوں دو مختلف دنیاؤں کے علم بردار ھیں۔ ایک کھمبا بہت چکنا اور پالش کیا ھوا ھے، اور اس پر سفید اور سیاہ رنگ کی پٹیاں ھیں، بالکل ویسی ھی جیسی کہ پولیس والے کے کھڑے ہونے کی کیبن پر ھوتی ھیں۔ اس کھمبے کے اوپر مضبوط کیلوں سے ایک سر والا عقاب جڑا ھوا ھے۔ عقاب کے پر پھیلے ہوئے ھیں، وہ اپنے پنجے پٹیوں دار کھمبے میں گاڑے ہوئے ھے اور اس کی مڑی ہوئی چونچ ایک تناؤ کے ساتھہ آگے کی طرف بڑھی ہوئی ھے۔ وہ سامنے والے کھمبے پر لگی ہوئی ھنسیے اور ھتوڑے کے نشان والی لوھے کی ڈھال کو للچائی ہوئی نگاھوں سے دیکھہ رھا ھے۔ یہ کھمبا دراصل شاہ بلوط کا ایک کھردرا لیکن مضبوط اور گول شہتیر ھے جو مضبوطی سے زمین میں گڑا ھوا ھے۔ دونوں کھمبے ایک ھی سطح پر گڑے ہوئے ھیں لیکن ان کے درمیان اور ان دنیاؤں کے درمیان جن کے وہ علمبردار ھیں ایک گہری خلیج حائل ھے۔ ان کے درمیان کا چھہ قدم کا فاصلہ بغیر جان کی بازی لگائے پار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سرحد ہے۔

بحیرۂ اسود سے لیکر دور شمال میں بحر منجمد تک ہزاروں میل لمبی سرحد پر سوویت اشتراکی جمہوریتوں کے ان خاموش سنتریوں کی قطار اپنی لوہے کی ڈھالوں پر محنت کا یہ عظیم الشان نشان لئے بے حس و حرکت کھڑی ہے۔ اور جس جگہ وہ خونی پرندے والا کھمبا لگا ہے وہیں سے سوویت یوکرین اور سرمایہ‌دار پولینڈ کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ یہ مقام یوکرینی علاقے کے ایک چھوٹے سے شہر بریزدوف سے چھہ میل کے فاصلے پر واقع ہے جو یوکرین کے عقبی علاقے میں ایک طرف سمٹا سا کھڑا ہے، اور اس کے دوسری طرف چھوٹا سا پولستانی قصبہ کوریتس ہے۔ سلاووتا سے اناپول تک کی سرحد «این» سرحدی بٹالین کے پہرے میں ہے۔

سرحد کے یہ کھمبے برف سے ڈھکے ہوئے کھیتوں کو پار کرتے ہوئے، جنگلوں کو کاٹ‌کر صاف کئے ہوئے راستوں پر آگے بڑھتے ہوئے وادیوں میں اتر جاتے ہیں، پھر پہاڑیوں پر چڑھ‌کر ان کی چوٹیوں کے پیچھے گم ہو جاتے ہیں، اور کسی دریا کے اونچے سے ساحل پر پہونچ‌کر اس کڑاکے کی سردی میں اجنبی دیس کے میدانوں کی کیفیت کا جائزہ لینے کے لئے رک جاتے ہیں۔

کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ ایسے ہی دن تو پالے کی وجہ سے برف فیلٹ کے جوتوں کے نیچے چرمر کرنے لگتی ہے۔ سرخ فوج کا ایک دیو قامت سپاہی قدیم زمانے کے دیوپیکر سورماؤں جیسا بڑا سا فوجی خود پہنے ہنسیے اور ہتوڑے کے نشان والے ایک کھمبے کے قریب سے بھاری قدم رکھتا ہوا اپنے گشت پر چل پڑا۔ وہ بھورے رنگ کا ایک بڑا سا فوجی کوٹ جس کے کالر کا سامنے والا حصہ سبز رنگ کا ہے، اور فیلٹ کے جوتے پہنے ہے۔ اس فوجی کوٹ کے اوپر وہ بھیڑ کی کھال کا ایک اور کوٹ پہنے ہے جو اس کی ایڑیوں تک پہونچتا ہے اور جس کا کالر بھی اسی

تناسب سے کافی بڑا ہے۔ یہ کوٹ تو انسان کے جسم کو تیز سے تیز برفانی طوفان میں بھی گرم رکھ سکتا ہے۔ وہ سر پر کپڑے کی ایک فوجی ٹوپی پہنے ہے اور اس کے ہاتھ بھیڑ کی کھال کے دستانوں میں محفوظ ہیں۔ اس نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکا رکھی ہے اور گشت لگاتے وقت اوپر والے کوٹ کا دامن برف پر ایک لکیر بناتا چلتا ہے۔ وہ سنتری دیسی تمباکو کا بنا ہوا سگریٹ بہت مزا لے لےکر پی رہا ہے۔ کھلے میدانوں میں سوویت سنتری سرحد پر تقریباً پانچ پانچ فرلانگ کے فاصلے پر تعینات ہیں۔ اس طرح ہر سنتری اپنے پاس والے سنتری کو ہمیشہ دیکھ سکتا ہے۔ پولستانی سرحد پر اتنے ہی فاصلے کے لئے ایک یا دو سنتری تعینات ہیں۔

پولستانی پیدل فوج کا ایک سپاہی گشت لگاتا ہوا سرخ فوج کے اس سپاہی کی طرف آ رہا ہے۔ وہ انتہائی کھردرے قسم کے فوجی بوٹ، سبزی مائل بھورے رنگ کی وردی اور اس پر سیاہ رنگ کا ایک کوٹ پہنے ہے، جس پر بٹنوں کی دو قطاریں چمک رہی ہیں۔ اس کے سر پر چوکور چندیا والی فوجی ٹوپی ہے جس پر سفید عقاب کا بلا لگا ہوا ہے۔ اس کے کندھے کی پٹیوں اور کالر کے سامنے والے حصے پر اور بھی کئی سفید عقاب بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ان سے اس کے جسم میں کوئی حرارت پیدا نہیں ہوتی۔ سخت پالے کی وجہ سے اس کی ہڈیاں تک اکڑ گئی ہیں۔ وہ اپنے ٹھٹھرے ہوئے کانوں کو مسلتا ہے اور چلتے وقت اس کی ایڑیاں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں۔ پتلے پتلے دستانوں میں اس کے ہاتھ بالکل اکڑ گئے ہیں۔ وہ پولستانی سپاہی ایک لمحہ کے لئے بھی چلنا بند نہیں کر سکتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو وہ بھاگنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اگر وہ رک جائے تو ایک لمحہ میں اس کا ایک ایک جوڑ اکڑکر رہ جائے۔ جب دونوں سنتری ایک دوسرے کے مقابل آئے،

تو پولستانی سپاھی پیچھے گھوم کر سرخ فوج کے سپاھی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

سرحد پر گفتگو کرنے کی سخت ممانعت ھے۔ لیکن جب دور دور تک کوئی نہ ھو اور سب سے قریب کا سنتری بھی تقریباً پون میل کے فاصلے پر ھو تو کون بتا سکتا ھے کہ سنتری خاموشی سے گشت لگا رھے ھیں یا بین الاقوامی قوانین کے خلاف کوئی حرکت کر رھے ھیں۔

پولستانی سپاھی کو سگریٹ کی طلب ستا رھی ھے۔ لیکن وہ اپنی ماچس بیرک میں بھول آیا ھے۔ اور اس وقت گویا محض اسے جلانے کے لئے ھوا کا رخ بھی ایسا ھے کہ سوویت سرحد کی طرف سے تمباکو کی دلفریب خوشبو اس کی ناک میں آ رھی ھے۔ پولستانی سپاھی نے اپنے کانوں کو مسلنا بند کرکے گردن گھماکر پیچھے دیکھا کہ کون جانے کپتان صاحب یا حضور لیفٹننٹ صاحب گھوڑ سوار گشت کو ساتھ لےکر کسی ٹیلے کے پیچھے سے سامنے آ جائیں۔ وہ اکثر نگرانی کے لئے نکلا کرتے ھیں۔ لیکن سورج کی روشنی میں چمکتی ھوئی دور تک پھیلی برف کی سفیدی کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ آسمان پر بادل کا ایک دھبہ تک نہیں تھا۔

«کامریڈ تمہارے پاس ماچس ھے؟» قانون شکنی کی ابتدا اس پولستانی سپاسی نے کی۔ اور تلوار جیسی سنگین والی فرانسیسی رائفل کو کندھے پر لٹکاکے اس نے بڑی محنت سے اپنے کوٹ کی جیب کی گہرائی سے اپنی ٹھٹھری ھوئی انگلیوں سے سستی سگریٹوں کا ایک پیکٹ نکالا۔

سرخ فوج کے سپاھی نے اس کی آواز سنی لیکن سرحدی فوجی قوانین کے مطابق سرحد کے پار کسی سے گفتگو کرنا سخت منع تھا۔ اس کے علاوہ وہ ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ سپاھی کہنا کیا چاھتا ھے۔ اس لئے وہ خاموشی سے اپنے راستے پر

چلتا رہا ۔ فیلٹ کے نرم جوتوں میں گرمائے ہوئے اس کے قدم مضبوطی کے ساتھ چرمراتی ہوئی برف پر پڑ رہے تھے ۔

«کامریڈ بالشویک آپ کے پاس بھلا ماچس ہے؟ کیا آپ ذرا دیر کے لئے اپنی ماچس ادھر پھینک دیں گے؟» اس بار پولستانی سپاہی روسی زبان میں بولا ۔

سرخ فوج کے سپاہی نے اپنے پڑوسی پر گہری نظر ڈالکر اس کا جائزہ لیا ۔ «سردی کے مارے میاں کا حلیہ خراب ہو گیا ہے ۔» اس نے دل میں سوچا ۔ «یہ بے چارہ غریب سرمایہ‌دار فوج کا سپاہی سہی مگر اس کی زندگی ہے بڑی مصیبت کی ۔ ذرا سوچنے کی بات ہے اس سردی میں یہ لباس پہناکر پہرہ دینے کے لئے کھدیڑ دیا گیا ہے ۔ اسی لئے تو خرگوش کی طرح اچک کر چلتا ہے ۔ اور اس پر ستم یہ کہ سگریٹ پینے کا بھی انتظام نہیں ۔» بغیر مڑے ہوئے سرخ فوج کے اس سپاہی نے دیاسلائی کی ڈبیہ سرحد کے پار اس کی طرف پھینکی ۔ اس نے ہوا میں ہی اسے دبوچ لیا ۔ اور کئی ناکام کوششوں کے بعد اپنی سگریٹ جلاکر ماچس اسی طرح سرحد کے پار واپس پھینک دی ۔ سرخ فوج کے سپاہی نے اپنی خواہش کے باوجود فوجی قانون توڑتے ہوئے کہا:

«تم رکھ لو، میرے پاس اور ہے ۔»

سرحد کی دوسری طرف سے جواب ملا:

«بہت بہت شکریہ میں اسے نہیں رکھ سکتا ۔ ورنہ اگر تمہاری ڈبیہ میرے پاس پکڑی گئی تو مجھے دو سال جیل میں کاٹنے پڑیں گے ۔»

سرخ فوج کے سپاہی نے ماچس کو غور سے دیکھا ۔ اس کے لیبل پر ایک ہوائی جہاز بنا ہوا تھا جس کے سامنے والے پنکھے کی جگہ پر ایک مضبوط گھونسہ بنا تھا اور ماچس کا نام تھا «الٹی میٹم ۔»

«ٹھیک ھی کہتا ھے یہ ماچس وہ لوگ برداشت نہ کر سکیں گے ۔»

وہ سپاھی سرخ فوج کے سپاھی کے متوازی چلتا رھا ۔ اس ویران میدان میں تنہائی کا احساس اسے کھائے جا رھا تھا ۔

گھوڑے ھموار سکون بخش رفتار سے قدم بڑھائے چلے جا رھے تھے، اور ان کی زینیں ھم آھنگی کے ساتھ چرمرا رھی تھیں ۔ گھوڑوں کے سانس برفانی ھوا میں جم کر ایک لمحہ کے لئے سفید بھاپ کے چھوٹے چھوٹے بادلوں میں تبدیل ھو جاتے تھے ۔ سیاہ گھوڑے کے نتھنوں کے گرد سفید کہرے کا ایک مستقل دائرہ سا بنا ھوا تھا ۔ بٹالین کمانڈر کی چت کبری گھوڑی نہایت شاندار انداز میں قدم بڑھاتی ھوئی اپنی حسین گردن کو محراب کی شکل میں خم کر کے اپنی لگام کا دھانہ چبا رھی تھی ۔ دونوں گھوڑ سوار لمبے فوجی کوٹ پہنے ھوئے تھے جن کی کمر پر پٹیاں کسی ھوئی تھیں ۔ اور آستینوں پر سرخ رنگ کے تین تین چوکور نشان بنے تھے ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بٹالین کمانڈر گاوریلوف کے کوٹ کے کالر کا سامنے والا حصہ سبز رنگ کا تھا، اور اس کے ساتھی کا سرخ ۔ گاوریلوف سرحد کی حفاظت کرنے والی فوج کے ساتھ تھا ۔ اس علاقے کی تقریباً پینتالیس میل لمبی سرحد کی چوکیوں پر اسی کی بٹالین کے سپاھی تعینات تھے ۔ سرحد کی اتنی پٹی کی حفاظت کی ذمہ داری اس پر تھی ۔ اس کے ساتھ والا افسر بریزدوف سے آیا تھا ۔ وہ عام فوجی تعلیم کی تنظیم کا بٹالین کمیسار کورچاگن تھا ۔

رات بھر برفباری ھوئی تھی اور تازہ سفید برف کی تہوں کا ایک شفاف بے داغ غالیچہ بچھا ھوا تھا جسے کسی انسان یا حیوان نے ھاتھ بھی نہیں لگایا تھا ۔ وہ دونوں اپنے گھوڑے بڑھائے ھوئے جنگل سے نکلے، اور سرحد پر لگے ھوئے کھمبوں کی متوازی قطاروں

سے تقریباً چالیس قدم کے فاصلے پر واقع ایک کھلے میدان کو پار کرنے ہی والے تھے کہ گاوریلوف نے دفعتاً اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کورچاگن نے گھوڑا موڑ کر دیکھا کہ گاوریلوف گھوڑے کی پیٹھ پر سے جھکا ہوا برف پر بنی ہوئی ایک عجیب و غریب لیک کا غور سے معائنہ کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی شخص ایک چھوٹا سا دانتےدار پہیہ برف پر چلاتا ہؤا لے گیا ہو۔ یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ وہ مخلوق کس سمت سے آئی تھی لیکن بٹالین کمانڈر کے رکنے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ وہاں سے دو ہی قدم کے فاصلے پر برف کی ایک سفوف جیسی پتلی سی تہہ کے نیچے ایک دوسری لیک تھی لیکن یہ کسی انسان کے قدموں کے نشان تھے۔ قدموں کے ان نشانوں کے بارے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں تھا۔ یہ سلسلہ سیدھا جنگل کی طرف چلا گیا تھا اور یہ قطعی یقینی تھا کہ وہ جاسوس سرحد کے پار پولستانی علاقے کی طرف سے آیا تھا۔ بٹالین کمانڈر نے اپنا گھوڑا بڑھایا اور لیک کے پیچھے پیچھے سنتری کی سمت میں چلا۔ پیر کے نشانوں کا یہ سلسلہ سرحد کے اس پار تک چلا گیا تھا اور پولستانی علاقے میں بھی دس بارہ قدم کے فاصلے تک صاف نظر آ رہا تھا۔

«رات کو کسی نے سرحد ضرور پار کی ہے» بٹالین کمانڈر نے زیرلب کہا۔ «معلوم ہوتا ہے تیسری پلیٹون پھر سو رہی ہے۔ آج صبح کی رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر تک نہیں ہے۔ خدا کی مار ہو ان پر!» گاوریلوف کی کھچڑی مونچھوں کے بالوں پر اسکے جمے ہوئے سانس کے چھوٹے چھوٹے بخارات چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور اسکی مونچھیں شدید خفگی کے انداز میں اسکے ہونٹ پر لٹک آئی تھیں۔

دور کچھ فاصلے پر دو انسانی جسم گھوڑسواروں کی سمت آتے ہوئے دکھائی دئے۔ ان میں سے ایک تو سیاہ لباس پہنے ہوئے ایک

دبلا پتلا سا شخص تھا جسکی رائفل کی فرانسیسی سنگین سورج میں چمک رہی تھی اور دوسرا بھیڑ کی کھال کے زرد رنگ کے کوٹ میں ملبوس ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ اپنے پہلو میں ایڑی کی ٹھوکر کھاکر چتکبری گھوڑی فوراً اچک پڑی اور گھوڑسوار ان دونوں ادھر آتے ہوئے آدمیوں کی سمت چل دئے۔ گھوڑ سواروں کے قریب پہنچتے ہی سرخ فوج کے سپاہی نے اپنی کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل جھٹکے سے اتار لی اور اپنی سگریٹ کا باقی حصہ برف پر گرا دیا۔

«سلام کامریڈ۔ تمہارے گشت کے علاقے کا کیا حال چال ہے؟» بٹالین کمانڈر نے اپنا ھاتھہ سرخ فوج کے سپاہی کی طرف بڑھاکر پوچھا۔ اس نے بھی ھاتھہ ملانے کے لئے جلدی سے اپنا دستانہ اتار دیا۔ سرحد کا وہ سنتری اتنا لمبا تھا کہ اس سے ھاتھہ ملانے کے لئے بٹالین کمانڈر کو گھوڑے پر سے جھکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

پولستانی دور سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ حیرت کر رہا تھا کہ سرخ فوج کے وہ دو افسر ایک معمولی سپاہی سے اس طرح مل رہے تھے جیسے کوئی اپنے قریبی دوست سے ملتا ھے۔ ایک لمحے کے لئے اس نے خود اپنے کو میجر زاکرزیوسکی سے ھاتھہ ملاتے ہوئے تصور کیا لیکن یہ تو خیال ھی اتنا بے تکا تھا کہ وہ گھبراکر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

«کامریڈ بٹالین کمانڈر، میں تو ابھی ڈیوٹی پر آیا ھوں» سرخ فوج کے سپاہی نے اطلاع دی۔

«وھاں پر وہ لیک دیکھی تم نے؟»

«نہیں۔ ابھی تو نہیں دیکھی۔»

«رات دو بجے سے چھہ بجے تک یہاں ڈیوٹی پر کون تھا؟»

«سروتینکو تھا، کامریڈ بٹالین کمانڈر۔»

«اچھی بات ہے۔ لیکن ذرا چوکس رہو۔»

اور اپنا گھوڑا بڑھانے سے پہلے کمانڈر نے سختی کے ساتھ تنبیہ کے انداز میں کہا:

«اور ہاں دیکھو ذرا ان لوگوں کے ساتھ کم ٹہلو۔»

سرحد سے بریزدوف جانے والی چوڑی سڑک پر اپنا گھوڑا آہستہ آہستہ دوڑاتے ہوئے کمانڈر نے اپنے ساتھی سے کہا «سرحد پر بہت چوکس رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی لغزش ہوئی تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ہمارے اس کام پر ایک لمحے کے لئے بھی غافل رہنا ناممکن ہے۔ دن دہاڑے تو سرحد پار کرنا اتنا آسان نہیں ہے لیکن رات کے وقت بہت ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ کامریڈ کورچاگن اب تمہیں بتاؤں، سرحد کا جتنا حصہ میری نگرانی میں ہے وہ چار گاؤں میں سے ہوکر گزرتا ہے جسکی وجہ سے مسئلہ اور بھی ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ سنتری چاہے جتنے قریب قریب کھڑے کئے جائیں لیکن ہر شادی بیاہ یا دعوت کے موقعے پر دونوں طرف کے لوگ مستقل اپنے دوستوں اور عزیزوں کے یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ سرحد کے دونوں طرف کی جھونپڑیوں کے درمیان بس چند قدم کا فاصلہ ہے اور بیچ میں جو چھوٹی سی ندی ہے وہ بھی اتنی اتھلی ہے کہ چوزہ بھی پارکرلے اور اسی لئے چوری چھپے ادھر سے ادھر مال کی درآمد برآمد ہوتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ سچ ہے یہ کاروبار بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتا ہے مثلاً کوئی بڑھیا چوری سے پولستانی شراب کی ایک دو بوتلیں ادھر لے آئی یا اسی قسم کی دوسری حرکتیں۔ لیکن غیر قانونی طور پر سرحد کے پار بڑے پیمانے کی آمد و رفت بھی خاصی ہوتی ہے اور اس کے پیچھے بڑے بڑے پیسے والے لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اور تم نے سنا کہ سرحد کے تمام گاؤں میں پولستانیوں نے ایسی دوکانیں کھول دی ہیں جہاں ہر چیز مل سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ دوکانیں ان لوگوں نے اپنے افلاس زدہ کسانوں کے لئے تو کھولی نہیں ہیں۔»

بٹالین کمانڈر کی باتیں سن کر کورچاگن سوچنے لگا کہ سرحد پر کی زندگی سراغ رسانی کے مسلسل کام کی طرح ہے۔

«ممکن ہے کہ چوری سے مال کی درآمد برآمد کے علاوہ اس سے بھی زیادہ سنگین کوئی بات ہو رہی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کامریڈ گاوریلوف؟»

«یہی تو مصیبت ہے» بٹالین کمانڈر نے بڑی آزردگی سے جواب دیا۔

بریزدوف ایک چھوٹا سا جنگل کے درمیان آباد قصبہ تھا جسکا شمار یہودیوں کی بستی میں ہوتا تھا۔ اس میں دو یا تین سو بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے مکان تھے اور ایک بڑا سا بازار کا چوک تھا جس کے بیچ میں بیس پچیس دوکانیں تھیں۔ یہ چوک ہمیشہ لید اور گوبر سے گندا رہتا تھا۔ قصبے کے اطراف کسانوں کی جھونپڑیاں تھیں اور وسطی علاقے میں جہاں یہودی رہتے تھے قصائی باڑے جانے والی سڑک پر ایک بوسیدہ سی افسردہ کن عمارت میں یہودیوں کا ایک پرانا عبادت خانہ تھا۔ حالانکہ اس عبادت خانے میں سنیچر کے دن اب بھی کافی مجمع جمع ہو جاتا تھا لیکن اب اسکی بہار لٹ چکی تھی۔ اور ربی* جس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا وہ اسے قطعی پسند نہیں تھی۔ ۱۹۱۷ء کا واقعہ یقیناً کوئی بہت ہی منحوس واقعہ ہوگا جبھی تو اس دور دراز علاقے میں بھی نوجوان اب اسکی ویسی عزت نہیں کرتے تھے جیسی کہ انہیں اسکی حیثیت کو دیکھتے ہوئے کرنی چاہئے تھی۔ بوڑھے لوگ تو ضرور ابھی تک شرع کے مطابق حلال کھانا کھاتے تھے لیکن نہ جانے کتنے نوجوان چھوکرے سور کا گوشت کھاتے

---

*یہودیوں کے علمائے دین۔

تھے جسے شرعاً حرام قرار دیا گیا تھا ۔ اس خیال سے ھی گھن آتی تھی، اور ربی بورخ نے غصے میں آکر قریب کھڑے ھوئے سور کے پیٹ میں ایک ٹھوکر ماری جو غلاظت کے ڈھیر میں کھانے کے لئے کچھه تلاش کر رھا تھا ۔ ربی اس بات سے قطعی خوش نہیں تھا کہ بریزدوف کو ایک ضلع کا مرکز بنا دیا گیا تھا اور نہ ھی وہ ان کمیونسٹوں کو پسند کرتا تھا جو نہ جانے کہاں سے آکر اس قصبے پر ٹوٹ پڑے تھے اور ھر چیز کو الٹ پلٹ کئے دے رھے تھے ۔ ھر روز کوئی نہ کوئی ناخوشگوار بات ھو جاتی تھی ۔ مثال کے طور پر کل اس نے پادری کے گھر کے پھاٹک پر ایک نئی تختی لگی دیکھی تھی جس پر یہ تحریر تھی: «بریزدوف ضلع کمیٹی، یوکرین کی نوجوان کمیونسٹ لیگ ۔»

ربی سوچنے لگا کہ یہ تختی برے شگون کے علاوہ اور کسی چیز کی علامت نہیں ھو سکتی ۔ وہ اپنے خیالات میں ایسا گم تھا کہ اس نے اپنے عبادت خانے کے دروازے پر چپکا ھؤا نوٹس اس وقت تک دیکھا ھی نہیں جب تک کہ وہ بالکل اسکی ناک کے سامنے نہیں آ گیا:

«آج کلب میں محنت کش نوجوانوں کا ایک عام جلسہ ھوگا ۔ اس جلسے میں ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر لستسن اور نوجوان کمیونسٹ لیگ کی ضلع کمیٹی کے ایکٹنگ سکریٹری کورچاگن کی تقریریں ھونگی ۔ جلسے کے بعد نوسالہ تعلیم کے اسکول کے طالب علم ناچ گانے کا ایک پروگرام بھی دینگے ۔»

غصے میں آکر ربی نے وہ کاغذ نوچ ڈالا ۔

«اچھا تو ان لوگوں نے پر نکالنا شروع کر دیا!»

مقامی گرجا سے ملے ھوئے بڑے سے باغ کے بیچ میں ایک بہت بڑا پرانا سا مکان تھا جو کسی زمانے میں وھاں کے پادری کی ملکیت

تھا۔ جن کمروں میں پادری اور اسکی بیوی رہا کرتے تھے انکے پھپھوندی لگے ہوئے سنسان پن میں ایک عجیب موت کی سی گھٹن تھی۔ وہ بوڑھا اور بڑھیا بھی اس مکان جیسے ہی پرانے اور غیر دلچسپ تھے اور کافی عرصے سے ایک دوسرے سے اکتا چکے تھے۔ نئے مالکوں کے آتے ہی مکان کی اداسی ہوا ہو گئی۔ وہ بڑا ہال جس میں وہاں کے پرانے پارسا مکین گرجا کے تیوہاروں کے دن اپنے مہمانوں کی دعوتیں کیا کرتے تھے، اب ہر وقت لوگوں سے بھرا رہتا تھا کیونکہ اب اس مکان میں بریزدوف کی کمیونسٹ پارٹی کمیٹی کا دفتر تھا۔ سامنے والے ہال کے فوراً بعد داہنی طرف کے ایک چھوٹے سے کمرے کے دروازے پر کھریا سے لکھا تھا «کومسومول ضلع کمیٹی»۔ کورچاگن جو عام فوجی تعلیم کی دوسری بٹالین کے فوجی کمیسار کے علاوہ حال ہی میں منظم شدہ کومسومول کی ضلع کمیٹی کا ایکٹنگ سکریٹری بھی ہوگیا تھا، دن میں کچھہ دیر اسی کمرے میں بیٹھہ کر کام کرتا تھا۔

آنا کے گھر والی دعوت کو آٹھہ مہینے گزر گئے تھے لیکن اسے ایسا لگتا تھا جیسے ابھی کل ہی کا واقعہ ہو۔ کورچاگن نے کاغذات کا گڈا اپنے سامنے سے ہٹاکر ایک طرف کو سرکا دیا اور آرام سے کرسی پر ٹیک لگاکر خیالات میں گم ہو گیا...

مکان میں مکمل خاموشی تھی۔ رات کافی ہو چکی تھی اور پارٹی کمیٹی کے دفتر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کمیٹی کا سکریٹری تروفیموف کچھہ دیر ہوئے گھر جا چکا تھا اور کورچاگن اس عمارت میں اکیلا رہ گیا تھا۔ برف نے کھڑکی پر عجیب عجیب بیل بوٹے بنا رکھے تھے لیکن اندر کمرہ گرم تھا۔ میز پر مٹی کے تیل کا ایک لیمپ جل رہا تھا۔ کورچاگن گذشتہ کچھہ دنوں کے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اگست میں کار ورکشاپ کی کومسومول تنظیم نے کس طرح اسے نوجوانوں

کو منظم کرنے کا کام سونپ کر ایک مرمت گاڑی کے ساتھہ
یکاترینوسلاو بھیجا تھا ۔ خزاں کے آخری دنوں تک اس گاڑی کے ڈیڑھہ
سو کارکنوں کے ساتھہ اسٹیشن اسٹیشن گھوم کر اس نے جنگ کی
لائی ہوئی تباہی اور بدنظمی کو درست کرنے، ٹوٹ پھوٹ کی مرمت
کرنے اور بالکل ہی ٹوٹے اور جلے ہوئے ریل کے ڈبوں کا ملبہ صاف
کرنے میں سرگرمی سی حصہ لیا تھا ۔ اس دوران میں ان لوگوں نے
سنلنیکووو سے پولوگی تک کا چکر لگایا تھا ۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں
کسی زمانے میں ماخنو کے لٹیرے گروھوں نے لوٹ مار مچا رکھی
تھی اور وھاں سے بھاگنے سے پہلے وہ لوگ بلاوجہ بہت کچھہ نقصان
اور تباھی کر گئے تھے ۔ گلیائی پولے میں پانی کی ٹنکی کے اینٹوں
کے ستون کی مرمت کرنے اور بارود سے اڑائی ہوئی پانی کی ٹنکی
پر لوھے کی چادر کے پیوند لگانے میں پورا ایک ھفتہ لگ گیا
تھا ۔ حالانکہ کورچاگن لوھار کا کام بالکل نہیں جانتا تھا اور سخت
مشقت کے اس کام کی اسے عادت بھی نہیں تھی پھر بھی بجلی کا
وہ مستری بھی رنچ لےکر دوسروں کے ساتھہ کام میں جٹا رہا تھا
اور اس عرصے میں اس نے نہ جانے کتنے ھزار زنگ لگے پینچ کسے
ھونگے کہ اب اسے ان کی ٹھیک تعداد یاد بھی نہیں تھی ۔

خزاں کا موسم کافی گزار کر گاڑی اپنے گھر واپس لوٹی اور
کار ورکشاپ میں پھر ڈیڑھہ سو تجربہ کار کام کرنے والوں کا
اضافہ ھو گیا...

بجلی کا مستری کورچاگن اب آنا کے گھر اکثر جانے لگا تھا ۔
اسکی ماتھے کی شکنیں غائب ھو گئی تھیں اور اسکی روتوں کو بھی
ھنسا دینے والی ھنسی پھر واپس آ گئی تھی ۔

ایک بار پھر میلے کچیلے چہروں والے ریلوے کے کارخانے کے
جوان مزدور جدوجہد کے گزرے ھوئے ایام کی داستانیں سننے کے لئے

اسکے گرد جمع ہونے لگے — اس تاج پوش دیو کا تختہ الٹنے کے لئے جو انکی گردنوں پر سوار تھا روس کے غلام لیکن عزم بغاوت رکھنے والے کسانوں کی کوششوں اور استیپان رازین اور پگاچوف ایسے سورماؤں کی بغاوتوں کی داستانیں سننے کے لئے۔

ایک دن شام کو آنا کے گھر پر، جب وہاں نوجوانوں کا اجتماع معمول سے کچھہ زیادہ ہی تھا، پاویل نے اعلان کیا کہ وہ سگریٹ پینا چھوڑ دیگا۔ یہ غیر صحت مند عادت اسے بچپن سے ہی پڑ گئی تھی۔

«اب میں کبھی سگریٹ نہیں پیونگا» اس نے پختہ ارادے کے ساتھہ اعلان کیا۔

یہ واقعہ بالکل اچانک پیش آیا تھا۔ وہاں پر موجود کسی نوجوان نے غالباً کہا تھا کہ عادت — مثلاً سگریٹ پینے کی عادت — قوت ارادی سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر لوگوں میں اختلاف رائے تھا۔ شروع میں تو بجلی کے مستری نے کچھہ بھی نہ کہا لیکن بعد میں تالیا کے کہنے پر آخرکار وہ بھی بحث میں شریک ہو گیا۔

«انسان کی عادتیں اسکی غلام ہوتی ہیں نہ کہ وہ اپنی عادتوں کا۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہمارا نہ جانے کیا حال ہو؟»

«کہنا تو بہت آسان ہے» سویتایف نے ایک کونے سے بیٹھے بیٹھے کہا۔ «کورچاگن کو لمبی چوڑی باتیں کرنے کا بڑا شوق ہے۔ وہ اپنی عقل خود اپنے لئے استعمال کیوں نہیں کرتا؟ وہ خود بھی تو سگریٹ پیتا ہے نا؟ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ بہت بری عادت ہے۔ یقیناً جانتا ہے لیکن اس میں اس عادت کو چھوڑ دینے کی طاقت نہیں ہے۔» پھر اپنا لہجہ بدلتے ہوئے سویتایف بڑے طنز کے ساتھہ کہتا رہا «ابھی زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے وہ تعلیمی کلاسوں میں لوگوں کو تہذیب یافتہ بنانے کے کام میں مصروف تھا۔

لیکن کیا اس وجہ سے وہ خود بیہودہ الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتا تھا؟ جو بھی پاویل کو جانتا ہے وہ بتا سکتا ہے کہ حالانکہ وہ اکثر گالی نہیں بکتا لیکن جب اسکی زبان کھل جاتی ہے تب کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ دوسروں کو نصیحت کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے، خود اس پر عمل کرنا پڑے تو معلوم ہو۔»

کچھہ دیر ایک پرکھچاؤ خاموشی طاری رہی۔ سویتایف کے لہجے کی ترشی سے تمام مجمعے پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کورچاگن نے فوراً جواب نہیں دیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے ہونٹوں سے سگریٹ نکالی اور پرسکون لہجے میں کہا:

«میں اب کبھی سگریٹ نہیں پیوں گا۔»

پھر کچھہ دیر رک کر وہ بولا:

«میں یہ فیصلہ سویتایف کے کہنے سے نہیں بلکہ خود اپنی خاطر کر رہا ہوں۔ جو آدمی اپنی بری عادت پر قابو نہیں پا سکتا وہ انسان کہلانے کے لائق نہیں۔ اب صرف گالی بکنے کا سوال رہ جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ابھی تک اس شرمناک عادت پر پوری طرح قابو نہیں پا سکا ہوں لیکن اس بات کو تو سویتایف بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس نے مجھے اکثر گالی بکتے نہیں سنا ہے۔ سگریٹ چھوڑنے کے مقابلے میں گندے الفاظ استعمال کرنے کی عادت چھوڑنا بہت مشکل ہے۔ لاکھہ کوشش کرنے پر بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ زبان سے نکل ہی جاتے ہیں۔ میں ابھی یہ وعدہ تو نہیں کر سکتا کہ اب کبھی میری زبان سے گالی کا لفظ نہیں نکلے گا لیکن جلد ہی میں یہ بھی کر کے دکھا دوں گا۔»

برف باری شروع ہونے سے پہلے دریا کے دھارے کے ساتھہ بہہ کر آنے والے ایندھن کے لٹھوں نے نہر کا راستہ روک لیا اور وہیں جم کر رہ گئے۔ پھر موسم خزاں کے سیلاب نے ان لٹھوں کو

تتر بتر کر دیا اور دریا کا تند دھارا اس بے حد ضروری ایندھن کو بہا لے چلا۔ ایک بار پھر سولومینکا کے باشندوں کو مدد کے لئے جانا پڑا، اس بار بیش قیمت ایندھن کو بچانے کے لئے۔

کورچاگن بھی اس کام میں کسی سے پیچھے رهنا نہیں چاهتا تھا۔ اسلئے هفتے بھر تک، جب تک ساحل پر ایندھن کے اونچے اونچے ڈھیر نہیں لگ گئے اس نے کسی کو بتایا هی نہیں که اسے سردی لگ گئی هے۔ برفانی پانی اور خزاں کی مرطوب سردی نے اسکے خون میں چھپے هوئے دشمن کو شه دی اور وه تیز بخار میں مبتلا هو گیا۔ دو هفتے تک اسکے جوڑ جوڑ میں شدید تکلیف هوتی رهی اور اسکا جسم بالکل نڈھال هو گیا۔ جب وه هسپتال سے لوٹا تو اتنا کمزور هو چکا تھا که اسے کارخانے میں بنچ پر بیٹھے بیٹھے کام کرنا پڑتا تھا۔ فورمین اسے دیکھ‌کر بہت مغموم هوکر سر هلاتا۔ چند دن بعد ڈاکٹری بورڈ نے اسے کام کے نا قابل قرار دے دیا اور اسے پنشن دیکر کام سے علحده کر دیا گیا اور علیحدگی کی تنخواه کے علاوه اسے پنشن کی سند بھی دے دی گئی۔ لیکن اس نے بہت خفگی کے ساتھ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

بہت اداس هوکر وه کار ورکشاپ سے چلا آیا۔ وه اپنی چھڑی پر اپنے جسم کا بوجھ ڈال‌کر بہت دھیرے دھیرے چل رها تھا لیکن قدم اٹھاتے هی شدید درد ٹیسیں مارنے لگتا تھا۔ اس کی ماں نے کئی بار اسے گھر آنے کو لکھا لیکن جب بھی اسے اپنی ماں کا خیال آتے هی اسے اسکے آخری الفاظ یاد آ جاتے تھے:

«جب هاتھ پاؤں توڑکر چلنے پھرنے سے بالکل معذور هو جاتے هو تب جاکر مجھے تمهاری صورت دیکھنے کو ملتی هے۔»

گبرنیا کمیٹی کے دفتر میں اسے کومسومول اور پارٹی کے کارڈ دے دیئے گئے اور حتی‌الامکان کم سے کم لوگوں سے مل‌کر، تاکه درد جدائی بھی کم سے کم هو، وه چپکے سے شہر چھوڑ کر اپنی

ماں کے پاس چل دیا ۔ دو ہفتے تک اسکی بوڑھی ماں اسکی سوجی ہوئی ٹانگیں بھاپ سے سینکتی اور انکی مالش کرتی رہی اور مہینے بھر بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ چھڑی کا سہارا لئے بغیر چل سکتا تھا ۔ رات کی سیاہی چھٹ گئی اور ایک نئے دن کا آغاز ہوا ۔ اسکا دل پھر خوشی سے بھر گیا ۔ ایک دن اس نے پھر گاڑی پکڑی اور گبرنیا کے مرکز جا پہنچا ۔ وہ تین دن تک وہاں رہا اور اسکے بعد محکمۂ تنظیم نے اسے خط دے کر علاقائی فوجی کمیسار کے پاس بھیج دیا اور لکھہ دیا اسے کسی فوجی ٹریننگ کے دستے کے ساتھہ سیاسی کارکن کی حیثیت سے لگا دیا جائے ۔

ہفتے بھر بعد پاویل کو دوسری بٹالین کا فوجی کمیسار بنا کر ایک چھوٹے سے شہر بھیج دیا گیا ۔ جب وہ وہاں پہنچا تو چاروں طرف برف جمی ہوئی تھی ۔ اس علاقے کی کومسومول کمیٹی نے بھی اس شہر میں بکھرے ہوئے کومسومول کے ممبروں کو یکجا کر کے ضلعے کی نوجوان لیگ کی تنظیم قائم کرنے کا کام اسکے سپرد کر دیا ۔ اور اس طرح اسکی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ۔

باہر بہت گرمی اور گھٹن تھی ۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر کے دفتر کی کھڑکی سے چیری کے درخت کی ایک شاخ اندر جھانک رہی تھی ۔ سڑک کے پار پولستانی گرجا کے گھنٹا گھر پر لگی ہوئی سنہری صلیب سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی ۔ اور کھڑکی کے سامنے والے صحن میں ایگزیکٹو کمیٹی کی عمارت کے نگراں کے مخملی پروں والے چھوٹے چھوٹے ہنس کے بچے جو آس پاس کی گھاس کی ہی طرح سبز رنگ کے تھے، کھانے کی تلاش میں ادھر ادھر پھدک رہے تھے ۔

ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر نے وہ خط شروع سے آخر تک پڑھہ ڈالا جو ابھی اسے ملا تھا ۔ اسکے چہرے پر ایک سیاہی سی دوڑ

گئی اور اس نے اپنا بڑا سا کھردرا ھاتھ اپنے گھنے بالوں میں پھیرا اور پھر ھاتھ بالوں میں ھی رک گیا ـ

بریزدوف کی ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر نکولائی نکولائیوچ لستسن کی عمر ابھی صرف چوبیس سال کی تھی لیکن اس کے دفتر میں کام کرنے والے لوگوں اور پارٹی کے مقامی کارکنوں میں سے کسی کو بھی اس پر یقین نہیں آتا تھا ـ وہ لمبا چوڑا اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی، جس کی صورت شکل سے سختی اور اکثر اوقات رعب و دبدبہ ٹپکتا تھا، کم سے کم پینتیس برس کا معلوم ھوتا تھا ـ تنومند جسم، موٹی سی گردن پر مضبوطی سے جما ھوا بڑا سا سر، تیز بھوری آنکھوں میں فولادی چمک اور چوڑا سا مضبوط جبڑا ـ وہ نیلے رنگ کی برجس اور بھوری ٹیونک پہنتا تھا جو پرانی ھوکر کافی گھس گئی تھی ـ اس کے سینے پر بائیں جیب کے اوپر «آرڈر آف دی ریڈ بینر» کا تمغہ لگا رہتا تھا ـ

اپنے باپ اور دادا کی طرح لستسن بھی تقریباً بچپن سے ھی دھات کا کام کرنے لگا تھا اور اکتوبر انقلاب سے پہلے وہ تولا کے بندوق کے کارخانے میں خراد چلانے کا کام کرتا تھا ـ

خزاں کی اس رات کے بعد سے جب تولا کا وہ بندوق ساز کندھے پر رائفل رکھ‌کر مزدوروں کا اقتدار قائم کرنے کے لئے لڑائی پر چلا گیا تھا، وہ واقعات کے طوفان میں پھنس گیا تھا ـ انقلاب اور پارٹی کی ضروریات کے مطابق کولیا لستسن کو ایک ایک کرکے کئی دشوار معرکوں کو سر کرنے کے لئے بھیجا گیا اور ترقی کی شاندار راہ طے کرتا ھوا وہ سرخ فوج کے ایک معمولی سپاھی سے بڑھ‌کر ایک کمانڈر اور رجمنٹ کا کمیسار بن گیا ـ

لڑائیوں کی گولہ باری اور توپوں کی گرج اب ایک قصۂ پارینہ بن‌کر رہ گئی تھی ـ نکولائی لستسن اب سرحد کے اس ضلع میں تعینات تھا ـ زندگی پرامن نپی تلی رفتار سے چل رھی تھی اور

ایگزیکٹو کمیٹی کا صدر روز رات کو بہت دیر تک اپنے دفتر میں بیٹھا فصل سے متعلق رپورٹوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے ہاتھہ میں جو خط تھا اس نے ایک لمحے کے لئے ماضی قریب کی یادیں تازہ کر دی تھیں۔ وہ خط تار برقی کی مختصر اور جامع زبان میں ادا کی ہوئی ایک تنبیہہ تھی:

«قطعی خفیہ۔ بریزدوف کی ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر لستسن کے نام۔

پچھلے کچھہ دنوں سے سرحد پر کافی سرگرمی دیکھی گئی ہے اور سرحدی علاقوں کے لوگوں کے دلوں میں دہشت بٹھانے کے لئے پولستانی ایک بہت بڑا گروہ سرحد کے پار بھیجنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ محتاط رہو۔ محکمۂ مال کی تمام قیمتی اور اہم چیزیں مع ٹیکس کی وصول شدہ رقم کے ایریا سنٹر بھجوا دو۔»

لستسن اپنی کھڑکی سے ضلع ایگزیکٹو کمیٹی کی عمارت میں داخل ہونے والے ہر شخص کو دیکھہ سکتا تھا۔ اس نے سر اٹھایا تو کورچاگن کو برساتی کے قریب دیکھا۔ ایک لمحے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

«بیٹھہ جاؤ۔ مجھے تم سے کچھہ باتیں کرنی ہیں» لستسن نے پاویل سے ہاتھہ ملاتے ہوئے کہا۔

گھنٹے بھر تک وہ دونوں دفتر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

کورچاگن دفتر سے نکلا تو دو پہر ہو چکی تھی۔ وہ عمارت سے باہر آیا ہی تھا کہ لستسن کی چھوٹی بہن، ایک شرمیلی سی بچی جو اپنی عمر کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھی، باغ سے اس کی طرف بھاگی ہوئی آئی۔ کورچاگن کو دیکھتے ہی وہ ہمیشہ بڑے تپاک سے مسکراتی تھی اور کورچاگن بھی اسے بڑے

پیار سے انیوتکا کے نام سے پکارتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ماتھے پر سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کی ایک لٹ پیچھے ہٹاتے ہوئے بہت شرماکر اس کا استقبال کیا:

«کیا کولیا کام کر رہا ہے!» اس نے پوچھا۔ «ماریا مخایلوونا بڑی دیر سے اسکا کھانا تیار کرکے بیٹھی ہوئی ہے۔»

«انیوتکا اندر چلی جاؤ وہ اکیلا ہی ہے۔»

دوسرے دن صبح پوپھٹنے سے بہت پہلے ہی تین گاڑیاں جن میں موٹے تازے گھوڑے جتے ہوئے تھے آکر ایگزیکٹو کمیٹی کے دفتر کے سامنے رکیں۔ گاڑیوں کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں نے نہایت دبی زبان میں کچھہ باتیں کیں اور پھر محکمۂ مال سے کئی مہربند تھیلے لاکر گاڑی پر لاد دئے گئے۔ چند منٹ بعد ہی وہ گاڑیاں بڑی سڑک پر گڑگڑاتی ہوئی آنکھہ سے اوجھل ہو گئیں۔ انکی حفاظت کے لئے کورچاگن کی رہنمائی میں مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ علاقائی مرکز تک کا تقریباً پچیس میل کا راستہ (جس میں سے پندرہ سولہ میل کا راستہ جنگل میں ہوکر جاتا تھا) بہ خیر و عافیت طے کر لیا گیا اور وہ قیمتی اشیاء علاقائی محکمۂ مال کی تجوریوں میں رکھہ دی گئیں۔

اس کے چند دن بعد ایک گھوڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہؤا سرحد کی سمت سے بریزدوف آیا۔ گھوڑے کے منہہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ جس وقت وہ گھوڑ سوار شہر کی سڑکوں پر سے ہوکر گزرا تو شہر کے کاہل نکمے لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔

ایگزیکٹو کمیٹی کے دفتر کے پھاٹک پر پہنچ کر گھوڑ سوار اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور ایک ہاتھہ سے اپنی جھولتی ہوئی تیغ سنبھال کر سامنے والی سیڑھیوں پر اپنے بھاری بوٹ پٹکتا ہؤا تیزی سے اوپر چڑھہ گیا۔ لستسن نے فکرمندی سے پیشانی پر بل ڈال کر اسکے لائے ہوئے خط کو لے لیا اور لفافے پر دستخط کرکے اسے

واپس کر دیا۔ خط حوالے کر کے وہ سرحدی سنتری پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہؤا اور اسے سستانے کا موقع دئے بغیر ایڑ لگاکر پھر اسی سمت میں گھوڑا سرپٹ بھگاتا ہوا واپس چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔

ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر کے علاوہ کسی کو بھی اس خط کے مضمون کی اطلاع نہیں تھی اور اس نے ابھی ابھی خط پڑھا تھا۔ لیکن شہر والوں کی ناک بہت تیز تھی انہیں ہر بات کی اطلاع پہلے ہی سے مل جاتی تھی۔ یہاں کے تین چھوٹے چھوٹے تاجروں میں سے دو چھوٹے پیمانے پر چوری سے مال کی درآمد برآمد کرتے رہتے تھے اور یہ کاروبار کرتے کرتے وہ آنے والے خطرے کو ہمیشہ پہلے سے بھانپ لیتے تھے۔

فوجی ٹریننگ کی بٹالین کے ہیڈکوارٹر کی طرف جانے والے فٹ پاتھ پر دو شخص تیز قدم بڑھائے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک پاویل کورچاگن تھا۔ وہ اپنا پستول لگائے ہوئے تھا لیکن دیکھنے والوں کو اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ یہ تو اسکا معمول تھا۔ لیکن یہ بات کہ دوسرا شخص پارٹی کمیٹی کا سکریٹری تروفیموف بھی پستول لگائے تھا کچھہ تشویشناک ضرور تھی۔

چند منٹ بعد دس بارہ آدمی رائفلوں پر سنگینیں چڑھائے ہیڈکوارٹر سے بھاگتے ہوئے باہر نکلے اور چوراہے والی چکی کی طرف چل دئے۔ کمیونسٹ پارٹی اور کومسومول کے باقی ممبروں کو پارٹی کمیٹی کے دفتر میں ہتھیار تقسیم کئے جا رہے تھے۔ ایگزیکٹو کمیٹی کا صدر سر پر قضاقوں جیسی ٹوپی پہنے اور حسب معمول اپنی پیٹی میں مازر پستول لٹکائے گھوڑا دوڑاتا ہوا ادھر سے گزرا۔ یقیناً کوئی اہم بات ہونے والی تھی۔ شہر کا بڑا چوک اور چھوٹی چھوٹی سڑکیں ویران ہو گئیں۔ وہاں کسی فرد بشر کا نام نشان

تک باقی نہیں رہا۔ پلک جھپکاتے چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے دروازوں پر باوا آدم کے زمانے کے بڑے بڑے تالے ٹھونک دئے گئے اور کھڑکیاں بند کر لی گئیں۔ صرف نڈر مرغیاں اور سور گرمی سے پریشان، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کر رہے تھے۔

طلایہ کے سپاھیوں نے شہر کے کنارے پر باغوں میں مورچہ جما لیا جہاں سے انہیں کھلے کھیت اور دور تک پھیلی ہوئی سیدھی سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔

لستسن کے پاس جو پیغام آیا تھا وہ بہت ھی مختصر تھا:

«کل رات پودبزی کے علاقے میں مختصر سی لڑائی کے بعد تقریباً سو گھوڑسواروں کا گروہ سرحد پار کرکے سوویت علاقے میں داخل ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کے پاس دو ھلکی مشین‌گنیں بھی ھیں۔ حفاظتی تدابیر کرو۔ سلاووتا کے جنگل میں جاکر یہ گروہ کہیں غائب ہو گیا اور اسکا پتہ نہیں چل سکا۔ سرخ قضاقوں کا ایک رسالہ اس کا تعاقب کرنے کے لئے روانہ کر دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ کل دن میں کسی وقت بریزدوف سے ہوکر گزرے گا۔ انہیں دشمن نہ سمجھ بیٹھنا۔ گاوریلوف، کمانڈر، مخصوص سرحدی بٹالین۔»

ایک گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ شہر آنےوالی سڑک پر ایک گھوڑسوار نظر آیا۔ اس کے پیچھے تقریباً پانچ فرلانگ کے فاصلے پر گھوڑسواروں کا ایک گروہ آ رہا تھا۔ کورچاگن کی تیز نگاھیں انکی نقل و حرکت کو بڑے غور سے دیکھہ رہی تھیں۔ وہ آگے والا اکیلا گھوڑسوار ساتویں سرخ قضاق رجمنٹ کا ایک نوجوان سپاھی تھا اور سراغ رسانی کے کام میں ابھی بالکل مبتدی

معلوم ہوتا تھا۔ اسی لئے حالانکہ وہ بہت محتاط ہوکر چل رہا تھا لیکن پھر بھی وہ سڑک کے کنارے کے باغوں میں چھپے ہوئے سپاہیوں کو نہیں دیکھہ پایا۔ قبل اسکے کہ اسے علم ہوتا پیڑوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے مسلح سپاہیوں نے نکل کر اسے گھیر لیا، اور جب اس نے انکی ٹیونکوں پر کومسومول کے بلے دیکھے تو وہ کھسیا کر مسکرانے لگا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد وہ واپس مڑا اور گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہؤا گھوڑسواروں کے قریب پہنچ گیا جو دلکی چال سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ سنتریوں نے سرخ قضاقوں کو گزر جانے دیا اور پھر پہرے پر باغ میں جا کھڑے ہوئے۔

کئی دن بڑی فکر کے ساتھہ گزارنے کے بعد لستسن کو اطلاع ملی کہ دہشت پھیلانے والوں کا وہ گروہ اپنے مقصد میں نا کام رہا تھا اور سرخ گھوڑسواروں کے مسلسل تعاقب کی وجہ سے حملہآوروں کو دم دباکر سرحد کے پار واپس چلے جانے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

مٹھی بھر بالشویک ـــ انکی کل تعداد انیس تھی ـــ اس ضلعے میں سوویت طرز زندگی کی تعمیر کرنے میں سرگرمی سے جٹ گئے۔ یہ ایک نیا علاقہ تھا اور اسلئے ہر کام نئے سرے سے شروع کرنا پڑ رہا تھا۔ اسکے علاوہ سرحد وہاں سے قریب ہونے کی وجہ سے مستقل انتھک چوکسی ہر شخص پر لازم تھی۔

لستسن، تروفیموف، کورچاگن، سرگرم اراکین کی اس چھوٹی سی ٹولی کے ساتھہ جو انہوں نے اپنے گرد منظم کی تھی صبح سے شام تک کام میں لگے رہتے تھے۔ حفاظتی انتظامات کو مضبوط بنانے سے متعلق پارٹی اور کومسومول کے کاموں کے علاوہ وہ سوویتوں کے نئے انتخابات کی تیاریاں کرنے، لٹیروں کے خلاف لڑنے، تہذیبی

سرگرمیوں کی تنظیم کرنے اور چوری چھپے مال کی درآمد برآمد بند کروانے میں مصروف رہتے تھے۔

گھوڑے پر گشت لگایا، وہاں سے اترے تو دفتر کی میز پر جا بیٹھے، وہاں سے اٹھے تو میدان تک چلے گئے جہاں فوجی تعلیم پانے والے نوجوان بڑی محنت سے قواعد کرتے رہتے تھے۔ پھر کلب اور اسکول اور دن میں کمیٹی کی دو یا تین میٹنگیں۔ دوسری بٹالین کے فوجی کمیسار کا سارا دن اسی چکر میں نکل جاتا تھا۔ اکثر تو وہ اپنا مازر پستول کمر پر لگائے راتیں بھی گھوڑے کی پیٹھ پر ہی گزار دیتا تھا، راتیں جن کا سکوت بس کبھی کبھی «ٹھہرو، کون ہے؟» کی تیز آواز اور سرحد کے اس پار سے چوری سے لائے ہوئے مال سے لدی ہوئی گاڑی کے تیزی سے بھاگتے ہوئے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے منتشر ہو جاتا تھا۔

کومسومول کی بریزدوف ضلع کمیٹی تین افراد پر مشتمل تھی: کورچاگن، والگا کے علاقے کی چیاں جیسی آنکھوں والی ایک لڑکی لیڈا پولیوخ جو عورتوں کے محکمہ کی ذمہ‌دار تھی اور تیسرا ایک لمبا سا خوبصورت نوجوان ژینکا رازوالیخین جو ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک کالج میں پڑھتا تھا۔ رازوالیخین ہیجان انگیز قسم کے جانبازی کے کارناموں سے بے حد دلچسپی رکھتا تھا اور شرلاک ہومس اور لوئی بوسینار کے متعلق تو اس کا قول سند تھا۔ پہلے وہ پارٹی کی ضلع کمیٹی کے دفتر کا کام سنبھالتا تھا اسی لئے حالانکہ کومسومول تنظیم میں داخل ہوئے اسے ابھی صرف چار ہی مہینے ہوئے تھے لیکن نوجوان ساتھیوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو بہت «پرانا بالشویک» ظاہر کرتا تھا۔ علاقائی کمیٹی نے کافی پس و پیش کے بعد اسے سیاسی تعلیم کا کام سنبھالنے کے لئے بریزدوف بھیجا تھا محض اس لئے کہ انکے پاس بھیجنے کے لئے کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔

سورج بالکل سر پر چمک رہا تھا ۔ گرمی سے کہیں چھٹکارا نہیں تھا اور تمام جاندار سائے کی پناہ ڈھونڈھتے رہتے تھے ۔ کتے تک سائبانوں میں گھس گئے تھے اور کاہلی اور نیند کے مارے لیٹے ہانپ رہے تھے ۔ گاؤں بھر میں زندگی کا نشان صرف اس سور میں مل رہا تھا جو کنویں کے پاس کیچڑ میں عیش کے ساتھ لوٹ رہا تھا ۔

کورچاگن نے اپنا گھوڑا کھولا اور گھٹنے کے شدید درد کی وجہ سے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا ۔ اسکول کی معلمہ سورج کی چمک سے بچنے کے لئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے سیڑھیوں پر کھڑی تھی ۔

«کامریڈ ملٹری کمیسار امید ہے کہ جلد ہی آپ سے پھر ملاقات ہوگی» اس نے مسکراکر کہا ۔

گھوڑے نے بےصبری کے ساتھ اپنے سم پٹکے اور اپنی گردن تان‌کر لگام کو جھٹکا دینے لگا ۔

«اچھا اب میں جاتا ہوں، کامریڈ راکیتنا ۔ تو یہ طے رہا: کل سے آپ پڑھانا شروع کر دینگی ۔»

لگام کو کچھ ڈھیلا محسوس کرتے ہی گھوڑا دلکی چال سے چل دیا ۔ دفعتاً پاویل کے کانوں میں کسی کے زور زور سے چیخنے کی آواز آئی جیسے گاؤں میں آگ لگ جانے کے وقت عورتیں چیختی ہیں ۔ جلدی سے اپنا گھوڑا پھراکر فوجی کمیسار نے دیکھا کہ ایک نوجوان کسان عورت بےتحاشہ گاؤں کی طرف بھاگی چلی آ رہی ہے ۔ راکیتنا نے آگے بڑھ‌کر اسے روکا ۔ آس پاس کی جھونپڑیوں سے لوگوں نے جھانک‌کر دیکھا ۔ زیادہ‌تر تو بوڑھے اور بڑھیائیں ہی تھیں کیونکہ جتنے لوگ کام کرنے لائق تھے سب کھیتوں پر کام کرنے چلے گئے تھے ۔

«ارے لوگوں! دوڑو! جلدی چلو! جلدی چلو! وہ لوگ وہاں ایک دوسرے کو مارے ڈال رہے ہیں ۔»

جس وقت کورچاگن اپنا گھوڑا بھگاکر وھاں پہنچا تو لوگ اس عورت کے گرد جمع ھونے لگے تھے اور اسکا سفید شلوکا کھینچ کھینچ کر اس پر بے تابانہ سوالات کی بارش کر رھے تھے- لیکن اسکی بے ربط چیخوں کا وہ کوئی بھی مطلب نہیں نکال سکے تھے- «ارے خون ھو گیا! وہ لوگ انہیں کاٹے ڈال رھے ھیں...» وہ بس یہی کہے جا رھی تھی- اتنے میں الجھی ھوئی ڈاڑھی والا ایک بوڑھا اپنا گاڑھے کا پاجامہ ایک ھاتھہ سے تھامے عجیب بے تکے انداز میں پھدکتا ھؤا ادھر آیا-

«آخر یہ کیا چیخ پکار مچا رکھی ھی- بند کرو اسے!» بوڑھے نے اس اختلاجی عورت کو ڈانٹ‌کر کہا- «کون مارے ڈال رھا ھے؟ کسے مارے ڈال رھا ھے؟ کیا ھوا کیا؟ کمبخت چیں چیں کئے چلی جا رھی ھے- چپ رہ!»

«ارے ھمارے لوگ ھیں اور وہ پودبزی والے ھیں... مینڈ پر جھگڑا ھو رھا ھے- وہ ھمارے لوگوں کو مارے ڈال رھے ھیں!»

اب ساری بات سمجھہ میں آ گئی- عورتیں رونے لگیں بوڑھے غصے سے چلانے لگے- سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی اور جگہ جگہ اس کا چرچا ھونے لگا: «پودبزی والے ھمارے آدمیوں کو ھنسیوں سے کاٹے ڈال رھے ھیں... پھر وھی مینڈوں پر جھگڑا ھے!» صرف ان لوگوں کو چھوڑکر جو بیماری کی وجہ سے بستر سے لگے تھے باقی تمام لوگ باھر گاؤں کی سڑک پر نکل آئے اور لاٹھیوں، کدالوں، کلہاڑیوں وغیرہ سے لیس ھوکر ان کھیتوں کی طرف بھاگے جہاں دونوں گاؤں کے لوگ اپنے کھیتوں کی مینڈوں کے سلسلے میں ھر سال کی طرح زبردست لڑائی کر رھے تھے-

کورچاگن نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ سرپٹ بھاگ پڑا- اپنے سوار کی للکار پر گھوڑا آندھی کی طرح بھاگتا ھوا ان دوڑتے ھوئے گاؤں والوں سے آگے نکل گیا- اپنے کان پیچھے چپکائے اور

طوفانی رفتار سے اپنے پاؤں تلے زمین کو روندتا ہوا وہ اپنی رفتار مسلسل تیز کرتا جا رہا تھا ۔ سامنے ایک ٹیلے پر ایک ہوا چکی اپنے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی گویا اس کا راستہ روکنا چاہتی ہو۔ داھنی طرف دریا کے کنارے چراگاھیں تھیں اور بائیں طرف رائی کا ایک کھیت اونچی نیچی سطح پر افق تک پھیلا ہوا تھا ۔ پکی ہوئی رائی کی بالیں ہوا میں جھوم رہی تھیں ۔ سڑک کے کنارے پوست کے سرخ پھول کھلے ہوئے تھے ۔ چاروں طرف مکمل خاموشی اور ناقابل برداشت گرمی تھی ۔ لیکن دور سے جہاں دریا کی روپہلی پٹی سورج کی دھوپ کا مزا لے رہی تھی، لڑائی کا شور و غل سنائی دے رہا تھا ۔

گھوڑا اسی برق رفتاری کے ساتھ نیچے چراگاھوں کی طرف چلا جا رہا تھا ۔ «اگر کہیں لڑکھڑایا تو ہم دونوں کا خاتمہ ہے» ایک لمحے کے لئے یہ خیال پاویل کے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا ۔ لیکن اب رکنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا ۔ گھوڑے کی پیٹھ پر جھک کر چپ چاپ سنسناتی ہوئی ہوا کی سیٹیاں سننے کے علاوہ اب اسکے پاس کوئی چارہ ہی نہ تھا ۔

طوفان کی طرح گھوڑا دوڑاتا ہوا وہ اس کھیت میں داخل ہوا جہاں غصے سے پاگل ہوکر لوگ بڑی درندگی کے ساتھ لڑائی میں لگے ہوئے تھے ۔ کئی آدمی زمین پر زخمی پڑے تھے، اور انکے زخموں سے خون کے دھارے جاری تھے ۔

ایک ڈاڑھی والا کسان ہاتھ میں ھنسیا کا ٹوٹا ہوا موٹھہ لئے ایک نوجوان کا پیچھا کر رہا تھا جسکے چہرے سے خون کی دھار بہہ رہی تھی ۔ ڈاڑھی والا کسان گھوڑے سے ٹکراکر گر پڑا ۔ قریب ہی ایک دھوپ سے سنولایا ہوا قوی ہیکل شخص اپنے زمین پر پڑے ہوئے حریف کی گدی پر کس کس کر اپنے بھاری بوٹوں کی ٹھوکریں جما رہا تھا ۔

جھگڑتے ہوئے لوگوں کے بیچ میں پوری رفتار سے گھوڑا دوڑاکر کورچاگن نے انکو منتشر کر دیا ۔ قبل اسکے کہ وہ لوگ اس حیرت انگیز واقعہ کو پوری طرح سمجھہ سکتے پاویل اندھادھند گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک ایک کو کھدیڑنے لگا ۔ وہ جانتا تھا کہ درندگی کے جذبے سے لڑنے والے ان لہو لہان لوگوں کو منتشر کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں دہشت زدہ کر دیا جائے ۔

«بدمعاشوں الگ ہٹ جاؤ!» اس نے غصے سے چلاکر کہا ۔ «ورنہ میں ایک ایک کو گولی سے اڑا دونگا ۔ کمبخت لٹیرے کہیں کے!»

اور پھر اپنا پستول نکال‌کر اس نے ایک شخص کے سر کے اوپر سے گولی چلائی جس کا چہرہ وحشیانہ غصے سے اینٹھا ہؤا تھا ۔ گھوڑا پھر تیزی سے گھوما اور ایک بار پھر پستول سے گولی چھوٹی ۔ لڑنے والوں میں سے کچھہ نے اپنے ہنسیے پھینک دئے اور واپس لوٹ پڑے ۔ کھیت میں اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور مسلسل گولیاں چلاتے ہوئے کمیسار نے صورت حال پر قابو پا لیا ۔ کسان بھاگ کھڑے ہوئے اور ادھر ادھر بکھر گئے تاکہ ان پر اس خون خرابے کی ذمہ‌داری بھی نہ آنے پائے اور وہ اس خوفناک گھوڑسوار سے بھی محفوظ رہیں جو غصے سے پاگل ہوکر مسلسل گولیاں چلا رہا تھا ۔

خیریت یہ ہوئی کہ کوئی مارا نہیں گیا اور جو زخمی ہوئے تھے وہ اچھے ہو گئے ۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد پودبزی میں اس معاملے کی تحقیقات کے لئے ضلعے کی عدالت کا ایک اجلاس ہوا لیکن تمام کوششوں کے باوجود جج سرغنوں کا پتہ نہ لگا سکا ۔ ایک سچے بالشویک کے صبر اور استقلال کے ساتھہ جج نے اپنے روبرو کھڑے ہوئے ان اکل کھرے کسانوں پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ انکی یہ حرکت کس قدر وحشیانہ تھی اور ساتھہ ہی انہیں یہ بھی اچھی طرح سمجھا دیا کہ آئندہ اس قسم کا دنگا فساد برداشت نہیں کیا جائیگا ۔

«کامریڈ جج ـ سارا قصور ان مینڈوں کا ہے» ان لوگوں نے کہا ـ «نہ جانے کیسے ہمیشہ یہ گڈمڈ ہو جاتی ہیں اور ہر سال ہم لوگوں کو ان پر لڑنا پڑتا ہے ـ»

پھر بھی کچھہ کسانوں کو اس لڑائی کے لئے جواب دہ ہونا پڑا ـ

ہفتہ بھر بعد ایک کمیشن وہاں بھیجا گیا اور اس نے باعث نزاع زمین کی حدیں مقرر کرنے کے لئے کھونٹیاں گاڑنی شروع کر دیں ـ

«میں تیس برس سے کھیتوں کی پیمائش کا کام کر رہا ہوں اور ہمیشہ جھگڑا انہیں مینڈوں پر ہوتا ہے» کمیشن کے بوڑھے امین پیمائش نے اپنا فیتہ لپیٹتے ہوئے کہا ـ اس گرمی میں اس بوڑھے کو اتنی بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی کہ وہ پسینے میں نہا گیا تھا ـ «یہ چراگاہیں جس طرح تقسیم کی گئی ہیں اگر دیکھو تو تمہیں یقین نہیں آ سکتا ـ کوئی شرابی بھی اس سے زیادہ سیدھی لکیریں کھینچ سکتا تھا ـ اور کھیتوں کی حالت تو اور بھی بدتر ہے ـ تین تین قدم چوڑی پٹیاں اور وہ بھی ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی ـ انہیں الگ کرنے کی کوشش میں ہی آدمی پاگل ہو جائے ـ اور یہ کھیت تقسیم ہوکر اور بھی چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹتے جا رہے ہیں ـ جیسے ہی بیٹے جوان ہوتے ہیں وہ اپنے باپ کی زمین میں سے اپنا حصہ الگ کروا لیتے ہیں ـ میں سچ کہتا ہوں اب سے بیس برس بعد کھیتی کے لائق زمین رہ ہی نہیں جائیگی بس مینڈیں ہی مینڈیں ہونگی ـ ابھی یہ حال ہے کہ کم سے کم دس فیصدی زمین اس طرح مینڈوں میں ضائع ہو گئی ہے ـ»

کورچاگن مسکرا دیا ـ

«بیس برس بعد تو ایک بھی مینڈ باقی نہیں رہیگی، کامریڈ سرویر ـ»

بوڑھے نے اس پر ایک شفیقانہ نظر ڈالی ـ

«تمہارا مطلب کمیونسٹ سماج سے ہے؟ ارے وہ تو بہت دور کی بات ہے ـ نہ جانے کب آئے گا وہ دن!»
«آپ نے بدانووکا کے اجتماعی کھیت کے بارے میں سنا ہے؟»
«ہاں ہاں ـ میں سمجھا تمہارا کیا مطلب ہے ـ»
«تو پھر؟»
«میں بدانووکا ہو آیا ہوں ـ لیکن کامریڈ کورچاگن، وہ تو اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے ـ ہمارے یہاں کتنے ہیں اس قسم کے اجتماعی کھیت؟»
کمیشن زمین کی پٹیوں کی پیمائش کرتا رہا ـ دو نوجوان کھونٹیاں گاڑتے جا رہے تھے اور دونوں طرف کھڑے ہوئے کسان بڑے غور سے یہ دیکھہ رہے تھے کہ کھونٹیاں وہیں پر گاڑی جائیں جہاں اس سے پہلے والی حدوں کی آدھی سڑی ہوئی کھونٹیاں گھاس میں چھپی ہوئی بمشکل نظر آ رہی تھیں ـ

اپنے مریل گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے باتونی کوچوان اپنی سواریوں سے مخاطب ہؤا:
«میری تو سمجھہ میں نہیں آتا کہ یہ کومسومول والے چھوکرے کہاں سے آ گئے ہیں» وہ بولا ـ «میری یاد میں تو اب سے پہلے اس نام کی کوئی چیز تھی نہیں ـ مجھے یقین ہے کہ یہ سب جھگڑا اسکول کی اس استانی کا شروع کیا ہؤا ہے ـ اسکا نام راکیتنا ہے شاید تم بھی اسے جانتے ہوگے؟ ہے تو وہ جوان عورت مگر کسی کام کی نہیں ـ اس نے گاؤں بھر کی تمام عورتوں کو بھڑکا دیا ہے انکے دماغ میں نہ جانے کیسی الٹی سیدھی باتیں بھر دی ہیں ـ اور تمام جھگڑے اسی وجہ سے شروع ہوتے ہیں اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو بھی نہیں مار سکتا! پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ جب کبھی کسی بات پر غصہ آیا اور بیوی کے ایک گھونسہ

جڑ دیا تو وہ چپکے سے کھسک جاتی تھی اور جاکر منھہ پھلاکر بیٹھہ جاتی تھی۔ لیکن اب تو وہ اتنا ھنگامہ مچاتی ھے کہ کچھہ کہنے کی بھی ھمت نہیں ھوتی۔ اب تو وہ عوامی عدالت کی دھمکی دیتی ھے اور جو نوجوان عورتیں ھیں وہ تو طلاق کی دھمکی دیتی ھیں اور دنیا بھر کے قانون بگھارنے لگتی ھیں۔

میری گنکا کو ھی دیکھہ لو۔ اس سے زیادہ خاموش اور سیدھی چھوکری ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی تھی اب وہ جاکر ڈیلی گیٹ بن گئی ھے۔ میرا خیال ھے کہ یہ ڈیلی گیٹ عورتوں کی کسی قسم کی مکھیا ھوتی ھے۔ اس کے پاس سارے گاؤں کی عورتیں آتی ھیں۔ میں نے جب یہ سنا تو میں تو اسی چابک سے اسکی خبر لینے والا تھا لیکن پھر میں ٹال گیا کچھہ کہا ھی نہیں۔ میری بلا سے جہنم میں جائیں، میں کیا کر سکتا ھوں! جہاں تک گھر کے کام کاج وغیرہ کا تعلق ھے اس میں وہ چھوکری اتنی بری نہیں ھے۔»

گاڑی والے نے اپنے بالوں سے بھرے ھوئے سینے کو کھجایا جو اسکی گاڑھے کی قمیص کے کھلے ھوئے گریبان میں سے نظر آ رھا تھا اور گھوڑے کے پیٹ پر ایک چابک گھماکر رسید کر دیا۔ گاڑی میں رازوالیخین اور لیڈا بیٹھے ھوئے تھے۔ وہ دونوں کام سے پودبزی جا رھے تھے۔ لیڈا عورتوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کرنا چاھتی تھی اور رازوالیخین کو وھاں مقامی مرکزہ کے کام کو منظم کرنے میں مدد دینے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

«تو تم کومسومول والوں کو پسند نہیں کرتے؟» لیڈا نے مذاق میں گاڑی والے سے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے وہ تھوڑی دیر تک اپنی چھوٹی سی ڈاڑھی کو نوچتا رھا۔

«نہیں مجھے ان پر کوئی اعتراض تو نہیں ھے... میں تو اس کے حق میں ھوں کہ نوجوانوں کو خوشیاں منانے اور مست رھنے

اور ناٹک وغیرہ کرنے کا پورا موقع دینا چاہئے۔ مجھے تو خود ہنسی مذاق والے ناٹک بہت پسند ہیں بشرطیکہ اچھے ہوں۔ شروع شروع میں تو ہمارا یہ خیال ضرور تھا کہ یہ چھوکرے ہاتھہ سے نکل جائیں گے لیکن ہوا اس کا بالکل الٹا۔ میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ یہ لوگ شراب پینے اور دنگا فساد مچانے وغیرہ کے بہت خلاف ہیں۔ وہ کتابیں پڑھنے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ خدا کے سخت خلاف ہیں اور مستقل اس فکر میں رہتے ہیں کہ گرجا پر قبضہ جماکر اسے کلب بنا دیں۔ یہ بات تو اچھی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے بوڑھے لوگ انکے خلاف ہو گئے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر وہ برے لوگ نہیں ہیں۔ لیکن اگر مجھہ سے پوچھو تو وہ لوگ یہ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ گاؤں کے تمام مفلس اور پھٹے حال لوگوں کو ہی اپنے ساتھہ لیتے ہیں جو دوسروں کے یہاں مزدوری کرتے ہیں یا جو اپنی کھیتی باڑی ٹھیک سے نہیں چلا پاتے۔ وہ لوگ امیر کسانوں کے بیٹوں سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھتے۔

گاڑی کھڑکھڑ کرتی ہوئی پہاڑی کی ڈھلان پر اتری اور اسکول کی عمارت کے سامنے جاکر رک گئی۔

اسکول کی نوکرانی ان نوواردوں کے ٹھہرنے کا انتظام کرکے خود پیال پر سونے چلی گئی تھی۔ لیڈا اور رازوالیخین ابھی ایک میٹنگ سے لوٹے تھے جو ذرا دیر سے ختم ہوئی تھی۔ جھونپڑی کے اندر اندھیرا تھا۔ لیڈا جلدی سے کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گئی اور فوراً ہی سو گئی۔ اپنے جسم پر رازوالیخین کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرکے وہ چونک کر جاگ پڑی۔ وہ اسکے جسم پر اس طرح ہاتھہ پھیر رہا تھا کہ لیڈا کو اسکی نیت کے بارے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں رہ گیا۔

«کیا چاھتے ھو؟»

«ھش لیڈا ۔ شور نہ کرو۔ میں تو وھاں اکیلے لیٹے لیٹے اکتا گیا ۔ یہاں پڑے پڑے خراٹے لینے سے زیادہ دلچسپ کام تمہارے خیال میں اور کوئی نہیں ھے؟»

«اچھا اپنا ھاتھ ھٹاؤ اور فوراً میرے بستر پر سے چلے جاؤ!» لیڈا نے اسے دھکا دیکر کہا ۔ رازوالیخین کی خوشامدانہ چکنی چپڑی مسکراھٹ سے اسے ھمیشہ سے نفرت تھی اور وہ اسے بہت ھی توھین آمیز اور ذلیل کرنے والی باتیں سنا دینا چاھتی تھی لیکن نیند اس پر غالب آ گئی اور اس نے پھر اپنی آنکھیں بندکر لیں ۔

«بس بس رھنے دو! آخر اتنے نخرے کیوں کر رھی ھو؟ تم نے خانقاہ میں تو پرورش پائی نہیں ھے؟ مجھہ سے اتنا پاکباز بننے کی کوشش نہ کرو تم مجھے چرکا نہیں دے سکتیں ۔ اگر تم واقعی روشن خیال عورت ھوتیں تو میری خواھش پوری کرنے کے بعد جی بھر کے سوتیں ۔»

معاملہ طے سمجھہ کر وہ پھر جاکر پلنگ کے سرے پر بیٹھہ گیا اور اس نے لیڈا کے کندھے پر اس طرح ھاتھہ رکھا گویا وہ اسکی ملکیت ھو ۔

«جہنم میں جاؤ!» لیڈا اب پوری طرح بیدار تھی ۔ «میں کل کورچاگن سے یہ سب کہونگی ۔»

رازوالیخین نے اس کا ھاتھہ پکڑ لیا اور جھلاکر کہا:

«میں تمہارے کورچاگن کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتا اور دیکھو زیادہ ھاتھہ پاؤں نہ چلاؤ نہیں تو مجھے تمہارے ساتھہ زبردستی کرنی پڑیگی ۔»

اسکے بعد کچھہ دیر تک ھاتھا پائی ھوتی رھی اور پھر اندھیرے میں دو زوردار چانٹوں کی آواز آئی ۔ رازوالیخین کودکر لگ ھٹ گیا اور لیڈا اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ھوئی دروازے پر پہنچی

اور پھر دھکا دیکر دروازہ کھولا اور باھر صحن میں چلی گئی۔ وہ وھاں چاندنی میں غصہ اور نفرت میں بھری کھڑی رھی۔

«اندر آ جاؤ بیوقوف کہیں کی!» رازوالیخین نے جل کر اس سے پکار کر کہا۔

وہ اپنی چارپائی باھر لے گیا اور رات وھیں چھجے کے نیچے بسر کی۔ لیڈا نے اندر سے دروازے کی کنڈی لگا لی اور بستر میں دبک کر پھر سو گئی۔

صبح وہ دونوں گھر کے لئے روانہ ھوئے۔ رازوالیخین بوڑھے کوچوان کے پاس بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رھا تھا۔

«کہیں وہ چھوئی موئی سچ مچ ھی نہ جاکر پاویل سے سارا بھانڈا پھوڑ دے، کمبخت! یہ کسے خیال تھا کہ یہ ایسی تنگ خیال نکلے گی۔ بنتی ایسا ھے کہ جیسے بڑی حسینہ ھو اور صورت شکل خاک بھی نہیں۔ لیکن مجھے اس سے سمجھوتہ کر لینا چاھئے ورنہ بعد میں بڑی مصیبت ھوگی۔ یوں ھی کورچاگن میرے پیچھے پڑا ھے۔»

وہ اٹھکر لیڈا کے پاس چلا آیا۔ اس نے پشیمانی کا اظہار کیا اور چہرے پر ندامت کا انداز لاتے ھوئے معافی مانگتے ھوئے بدبداکر کچھ کہا۔

ترکیب کارگر ثابت ھوئی۔ گاؤں میں داخل ھونے سے پہلے لیڈا نے وعدہ کیا کہ وہ رات والے واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کریگی۔

سرحد کے گاؤں میں ایک ایک کرکے کومسومول تنظیم کے مرکزے قائم ھونے لگے۔ ضلع کمیٹی کے ممبروں نے کمیونسٹ تحریک کی ان نوخیز کونپلوں کی بڑی توجہ کے ساتھ پرورش کی۔ لیڈا پولیوخ اور کورچاگن مختلف جگہوں پر جاکر وھاں تنظیم کے مقامی اراکین کے ساتھ کام کرنے میں کافی وقت صرف کرتے تھے۔

رازوالیخین دیہات میں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ کسان لڑکوں کا اعتماد حاصل کرنا نہیں جانتا تھا اور اسی لئے جہاں بھی وہ جاتا تھا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا تھا۔ لیڈا اور پاویل کو کسان نوجوانوں کے ساتھہ دوستی پیدا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ لڑکیاں تو لیڈا سے فوراً مانوس ہو جاتی تھیں اور اسے اپنے میں سے ھی ایک سمجھنے لگتی تھیں اور وہ رفتہ رفتہ ان میں کومسومول تنظیم کے لئے دلچسپی پیدا کرتی تھی۔ جہاں تک کورچاگن کا تعلق تھا ضلعے کے تمام نوجوان اسے جانتے تھے۔ سولہ سو نوجوانوں نے جو فوج میں بھرتی کئے جانے والے تھے اسکی بٹالین میں ابتدائی فوجی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسکے ایکارڈین نے پرچار کے کام میں کبھی اتنا اہم حصہ نہیں لیا تھا جتنا کہ یہاں دیہات میں۔ اپنے اس باجے کی وجہ سے پاویل نوجوانوں میں بہت مقبول ہو گیا تھا جو شام کے وقت گاؤں کی گلی کے نکڑ پر تفریح کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ اور بہت سے بانکے چھیلے نوجوان تو اسی راہ سے کومسومول میں داخل ہوئے۔ ایکارڈین کی مسحور کن موسیقی سنتے سنتے ھی انکے دلوں میں کومسومول کے لئے بھی دلچسپی پیدا ہوئی، وہ موسیقی جو کبھی پرجوش اور دل کو گرمانے والی ہوتی تھی اور کبھی جنگی جوش اور شجاعت سے بھری ہوئی۔ اور کبھی اس سے نرم اور لطیف دھنیں بھی نکلتی تھیں جیسی کہ صرف یوکرین کے درد اور حسرت بھرے گیتوں کی ہو سکتی ھیں۔ وہ ایکارڈین بھی سنتے تھے اور ایکارڈین بجانے والے نوجوان کی بات بھی جو کسی زمانے میں ریلوے میں مزدور تھا اور اب فوجی کمیسار اور کامسومول کا سکریٹری تھا۔ اور انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایکارڈین کی موسیقی اور اسکی باتوں میں ایک ہم آہنگی تھی۔ جلد ھی گاؤں میں نئے گیت گونجنے لگے اور کسانوں کی جھونپڑیوں میں انجیل اور زبور کے علاوہ اور کتابیں بھی نظر آنے لگیں۔

چوری سے مال کی درآمد برآمد کرنے والوں کیلئے اب سرحد کے سنتریوں کے علاوہ ایک نئی دشواری کا سامنا ہونے لگا۔ کومسومول تنظیم کے اراکین میں سوویت حکومت کو بہت پکے دوست اور سرگرم مددگار مل گئے۔ کبھی کبھی سرحد کے گاؤں کی کومسومول مرکزے جوش میں آکر دشمن کا پتہ لگانے کے سلسلے میں حد سے آگے بڑھ جاتے تھے اور تب پاویل کو اپنے نو عمر ساتھیوں کی مدد کے لئے آنا پڑتا تھا۔ ایک بار پودد بزی کے مرکزے کے سکریٹری گرشوتکا خوروواد کو کو ذاتی ذرائع سے اطلاع ملی کہ اس دن رات کو چوری سے کچھ مال گاؤں کی چکی پر لایا جائیگا۔ نیلی آنکھوں والا یہ گرم مزاج لڑکا بحث کرنے کا بہت شوقین تھا اور مذہب کے خلاف تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ یہ خبر پاتے ہی اسنے کومسومول کے تمام ممبروں کو اکٹھا کیا اور ایک ٹریننگ رائفل اور دو سنگینیں لیکر وہ تمام لوگ رات کی سنسان گھڑیوں میں نکل پڑے اور چکی کے قریب اپنے شکار کی گھات میں چھپ گئے۔ گ۔ پ۔ ا۔* کی سرحدی چوکی کو بھی چوری سے مال آنے کی اطلاع مل گئی تھی اور ان لوگوں نے بھی اپنے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیج دیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ان دونوں ٹولیوں کی ٹکر ہو گئی اور اگر سرحدی سنتریوں نے چوکسی سے کام نہ لیا ہوتا تو نوجوانوں کو اس معرکے میں کافی نقصان اٹھانا پڑتا۔ ہوا صرف یہ کہ نوجوانوں کے ہتھیار چھین لئے گئے اور انہیں وہاں سے تین میل دور ایک گاؤں میں لے جاکر بند کر دیا گیا۔

کورچاگن اس وقت اتفاق سے گاوریلوف کے گھر پر تھا۔ جب بٹالین کمانڈر نے صبح اس واقعہ کی اطلاع دی تو وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوکر ان لڑکوں کو چھڑوانے کے لئے بھاگا۔

---

* ریاستی سیاسی ادارہ۔

ان پر نگرانی رکھنے والے گ۔ پ۔ ا۔ کے آدمی نے ہنستے ہوئے اسکو یہ کہانی سنائی۔

«کامریڈ کورچاگن میں بتاؤں کہ ہم لوگ کیا کریں» وہ بولا۔ «یہ سب بڑے اچھے نوجوان ہیں اور ہم انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتے۔ مگر تم ذرا انہیں ڈانٹ دو کہ وہ آئندہ ہمارا کام کرنے کی کوشش نہ کریں۔»

سنتری نے سائبان کا دروازہ کھولا اور وہ گیارھوں لڑکے کھسیائے ہوئے اٹھے اور کھڑے پہلو بدلتے رہے۔

«ان کو دیکھو» گ۔ پ۔ ا۔ کے اس سنتری نے بناوٹی غصے کے ساتھہ کہا۔ «ان لوگوں نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا اب مجھے ان لوگوں کو ایریا کے ہیڈکوارٹر بھیجنا پڑیگا۔»

اب گرشوتکا سے نہ رہا گیا۔

«لیکن کامریڈ سخاروف۔» اس نے مشتعل ہوکر کہنا شروع کیا۔ «لیکن ہم لوگوں کا جرم کیا ہے؟ ہم بہت دنوں سے ان لوگوں کی تاک میں تھے۔ ہم تو صرف سوویت حکام کی مدد کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ہمیں یہاں ڈاکوؤں کی طرح حوالات میں بند کر دیا ہے۔» یہ کہہ‌کر اس نے اس طرح منہہ پھیر لیا جیسے اسکے ساتھہ کوئی بہت بڑی بے انصافی کی گئی ہو۔

تھوڑی دیر تک نہایت سنجیدگی کے ساتھہ آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد سخاروف اور کورچاگن نے فیصلہ کیا کہ اب لڑکوں کو کافی ڈرایا جا چکا تھا، حالانکہ اس عرصے میں انہیں اپنی سنجیدگی قائم رکھنے میں بڑی دشواری ہوئی۔

«اگر تم ان لوگوں کی ضمانت لینے کو تیار ہو اور وعدہ کرو کہ یہ لوگ کبھی سرحد پر گشت لگانے نہیں نکلیں گے تو میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں» سخاروف نے پاویل سے کہا۔ «اگر مدد ہی کرنا چاہتے ہیں تو اور بہت سے طریقے ہیں۔»

«اچھی بات ھے میں انکی ضمانت لیتا ھوں اور مجھے امید ھے کہ یہ لوگ اب کبھی مجھے اس طرح شرمندہ نہیں کریں گے ۔»

تمام نوجوان گانے گاتے ھوئے پودبزی واپس چلے گئے ۔ معاملہ وھیں رفع دفع کر دیا گیا ۔ اور تھوڑے ھی دن بعد وہ چکی والا بھی پکڑ لیا گیا لیکن اس بار قانونی طور پر ۔

میدان ولا کے جنگلوں میں امیر جرمن کسانوں کی ایک بستی تھی ۔ ان امیر کسانوں کے فارم چوتھائی چوتھائی میل کے فاصلے پر واقع تھے اور ایسے مضبوط بنے ھوئے تھے گویا چھوٹے موٹے قلعے ھوں ۔ آنتونیوک نام کا لٹیرا اپنے گروہ کے ساتھہ یہیں میدان ولا میں اڈا جمائے تھا اور یہیں سے چھاپے مارتا تھا ۔ آنتونیوک ایک زمانے میں زار کی فوج میں سارجنٹ میجر تھا ۔ اس نے اپنے عزیزوں رشتہ داروں میں سے سات قاتل جمع کرکے ایک گروہ تیار کر لیا تھا اور پستولوں سے مسلح ھو کر وہ لوگ دیہات کی سڑکوں پر رہزنی کرتے تھے ۔ اسے خون بہانے میں ذرا بھی جھجک نہیں ھوتی تھی ۔ اسے رئیس قسم کے سٹے بازوں کو لوٹنے میں بھی کوئی عار نہیں تھا لیکن ساتھہ ھی وہ سوویت کارکنوں کو بھی نہیں چھوڑتا تھا ۔ تیزرفتاری آنتونیوک کا اصولی قول تھا ۔ آج وہ کوآپریٹو سوسائٹی کے دو کلرکوں کو لوٹتا تو کل وھاں سے دس بارہ میل دور کے گاؤں میں جا کر ڈاکخانے کے کسی ملازم کے ھتھیار وغیرہ چھین لیتا اور اسکے پاس جو کچھہ ھوتا، کوڑی کوڑی لوٹ لیتا ۔ آنتونیوک کا ایک رقیب بھی تھا، گوردیئی ۔ دونوں ایک ھی تھیلی کے چٹے بٹے تھے صرف نام کا فرق تھا اور ان دونوں کی وجہ سے اس علاقے کی ملیشیا اور چیکا کے سپاھیوں کا ناک میں دم تھا ۔ آنتونیوک بریزدوف کے گرد و نواح میں لوٹ مار کیا کرتا تھا اور رفتہ رفتہ شہر جانے والی سڑکوں پر نکلنا بھی خطرناک ھو گیا تھا ۔ وہ لٹیرا ابھی تک گرفت میں

نہیں آ سکا تھا ۔ جب وہ ہر طرف سے گھر جاتا تھا تو وہ چپ چاپ سرحد کے پار دم دبا کر بھاگ جاتا تھا اور جب اسکے لوٹنے کا لوگوں کو قطعی اندیشہ نہیں رہ جاتا تھا وہ پھر واپس آ جاتا تھا ۔ ہر بار گرفت سے بچ کر نکل جانے کی وجہ سے ھی وہ بہت بڑی مصیبت بن گیا تھا ۔ جب بھی اس لٹیرے کی کسی نئی حرکت کی رپورٹ آتی تو لستسن غصے سے اپنے ھونٹ چبانے لگتا ۔

«آخر یہ زھریلا سانپ کب تک ھمیں ڈستا رھیگا؟ یہ بدمعاش اگر باز نہ آیا تو مجھے خود اسکی سرکوبی کے لئے جانا ھوگا» اس نے دانت پیس کر کہا ۔ ضلعے کی ایگزیکٹو کمیٹی کا صدر دوبار کورچاگن اور تین دوسرے کمیونسٹوں کو ساتھہ لیکر تعاقب کرنے گیا لیکن دونوں بار آنتونیوک بھاگ نکلا ۔

ان لٹیروں کے خلاف لڑنے کے لئے ایریا کے مرکز سے ایک خاص دستہ بریزدوف بھیجا گیا ۔ اس دستے کا کمانڈر فلاتوف نام کا ایک بانکا نوجوان تھا ۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر کو اپنے آنے کی اطلاع دینے کے بجائے، جیسا کہ سرحدی ضابطوں کا مطالبہ تھا، یہ چھیلا نوجوان سیدھے سب سے قریبی گاؤں سیماکی گیا ۔ رات کے سناٹے میں وہ گاؤں میں پہونچا اور گاؤں کے باھر کی طرف کے ایک مکان میں اپنے آدمیوں کے ساتھہ اس نے ڈیرا ڈال دیا ۔ اس مکان کے پڑوس میں رھنے والے کومسومول تنظیم کے ایک رکن نے ان مسلح آدمیوں کو اس پراسرار طریقے سے آکر وھاں ٹھہرتے دیکھا اور وہ فوراً گاؤں کی سوویت کے صدر کے پاس اس بات کی اطلاع کرنے گیا ۔ گاؤں کی سوویت کے صدر کو اس دستے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی اس لئے اس نے اس نوجوان کمیونسٹ کو مدد حاصل کرنے کے لئے فوراً ضلعے کے مرکز روانہ کر دیا کیونکہ وہ سمجھا کہ یہ لوگ یقیناً لٹیرے ھونگے ۔ فلاتوف کی

حماقت کی وجہ سے اس رات کتنی لوگوں کی جان گئی ہوتی۔ لستسن نے آدھی رات کے وقت ملیشیا والوں کو جگایا اور بارہ آدمیوں کو ساتھہ لیکر فوراً سیما کی میں «لٹیروں» سے نبٹنے کے لئے چل پڑا۔ وہ لوگ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس مکان کے قریب پہنچے اور گھوڑوں سے اتر کر چہار دیواری پھاند کر انہوں نے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دروازے پر جو سنتری کھڑا پہرا دے رہا تھا اسے پستول کی موٹھہ کے ایک ہی وار میں گرا دیا گیا۔ اسکے بعد لستسن نے اپنے کندھے سے دھکا دیکر دروازہ توڑا اور اپنے سپاہیوں کے ساتھہ کمرے میں داخل ہوا جہاں چھت سے لٹکے ہوئے مٹی کے تیل کے لیمپ کی دھندلی سی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک ہاتھہ میں دستی بم اور دوسرے میں پستول لئے ہوئے لستسن اتنے زور سے گرجا کہ کھڑکیوں کے شیشے کانپ گئے:

«ہتھیار ڈال دو ورنہ میں ابھی تم سب کو گولی سے اڑا دوں گا!»

ایک سکنڈ کی بھی دیر ہوتی تو نیند سے چونک کر جاگتے ہوئے وہ لوگ جو اچھل کر کھڑے ہو رہے تھے گولیوں کی بوچھار سے وہیں ڈھیر کر دئے جاتے۔ لیکن اپنے سامنے اس شخص کو ہاتھہ میں دستی بم لئے کھڑا دیکھہ کر ان لوگوں کے دل میں اتنی دہشت بیٹھہ گئی کہ انہوں نے اپنے ہاتھہ اوپر اٹھا دئے۔ چند منٹ بعد جب «لٹیروں» کو جانگھئے پہنے ہوئے ہی باہر لاکر کھڑا کیا گیا تو فلاتوف کی نظر لستسن کی ٹیونک پر لگے ہوئے تمغے پر پڑی۔ اور اس نے فوراً صفائی دینی شروع کی۔

لستسن غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے شدید حقارت کے ساتھہ زمین پر تھوک کر کہا:

«بیوقوف کہیں کا!»

جرمن انقلاب کی خوش خبری، همبرگ کے بیریکیڈوں پر گولیاں چلنے کی هلکی سی گونج سوویت کے سرحدی علاقوں میں بھی پہنچی ـ سرحد پر ایک تناؤ کی فضا طاری هو گئی ـ اخبار بڑی پراشتیاق امید سے پڑھے جانے لگے ـ مغرب سے انقلاب کی هوا کے جھونکے آرهے تھے ـ کومسومول کی ضلع کمیٹی کے دفتر میں نوجوان کمیونسٹوں کی عرضیاں سرخ فوج میں بھرتی هونے کے لئے آنے لگیں ـ کورچاگن کو تمام وقت کومسومول کے مرکزوں کے نوجوانوں کو یہ سمجھانا پڑتا تھا کہ سوویت دیس امن کی پالیسی پر چل رها تھا اور اسکا اپنے پڑوسیوں سے جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا ـ لیکن اس کا کوئی اثر نہیں هوتا تھا ـ هر اتوار کو تمام ضلعے کے کومسومول کے ممبروں کی میٹنگ پادری کے گھر کے بڑے سے باغ میں هوتی تھی اور ایک دن دوپہر کے وقت پودبزی کی تنظیم کے تمام ممبر فوجی صفوں کی شکل میں مارچ کرتے هوئے ضلع کمیٹی کے دفتر کے صحن میں داخل هوئے ـ کورچاگن نے کھڑکی سے انہیں دیکھا اور باهر برساتی میں نکل آیا ـ گیارہ نو عمر لڑکے لمبے لمبے بوٹ پہنے اور کندھوں پر کرمچ کے بڑے بڑے تھیلے لٹکائے هوئے دروازے پر آکر رک گئے ـ خورووادکو انکے آگے آگے تھا ـ

«گریشا یہ کیا هے؟ کورچاگن نے تعجب سے پوچھا ـ

جواب دینے کے بجائے خورووادکو نے پاویل کو آنکھہ سے اشارہ کیا اور اسے ساتھہ لیکر عمارت کے اندر چلا گیا ـ لیڈا، رازوالیخین اور کومسومول کے دو اور ممبر اس نووارد کو گھیرے هوئے اس سے اس واقعہ کے بارے میں دریافت کر رهے تھے ـ خورووادکو نے دروازہ بند کر لیا اور اپنی بھوری بھویں چڑھا کر اعلان کیا :

«کامریڈ، میں نے امتحان کے طور پر ان لوگوں کو فوجی ڈیوٹی پر طلب کیا هے ـ یہ ترکیب خود میں نے سوچی تھی ـ آج صبح

میں نے ان نوجوانوں سے کہا کہ ضلعے کے دفتر سے ایک بہت ھی خفیہ تار کے ذریعہ اطلاع آئی ھے کہ ھم لوگ جرمن سرمایہ‌دار قوتوں کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے جا رھے ھیں اور جلد ھی ھم لوگ پولستانی روئسا کے خلاف لڑائی شروع کردیں‌گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ماسکو سے آئے ھوئے حکم کے مطابق تمام نوجوان کمیونسٹوں کو جنگ کے مورچے پر لڑنے کے لئے طلب کیا گیا ھے۔ جسے جانے سے ڈر لگتا ھو وہ عرضی دے سکتا ھے اسے یہیں چھوڑ دیا جائیگا۔ وہ آرام سے اپنے گھر پر رہ سکتا ھے۔ میں نے انہیں حکم دیا کہ وہ جنگ کے بارے میں کسی سے ذکر نہ کریں اور ایک ایک ڈبل روٹی اور ایک ایک گوشت کا ٹکڑا لیکر، اور جنہیں گوشت نہ مل سکے وہ پیاز یا لہسن ھی لیکر، چلے آئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ھم لوگ خفیہ طور پر گاؤں کے باھر جمع ھوکر ضلعے کے مرکز جائینگے اور وھاں سے ایریا سنٹر، جہاں ھم لوگوں کو ھتھیار دئے جائینگے۔ ارے تم لوگ دیکھتے کہ اس بات کا لڑکوں پر کیسا اثر ھؤا! انہوں نے کھود کھودکر مجھ سے اور تفصیلات معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ سوال پوچھنے کے بجائے وہ لوگ فوراً تیاریاں شروع کر دیں۔ میں نے ان لوگوں سے پھر کہا کہ جو لوگ رکنا چاھیں وہ صاف صاف بتا دیں۔ ھمیں صرف رضاکاروں کی ضرورت ھے۔ خیر میرے تمام لڑکے چلے گئے اور مجھے بڑی فکر ھونے لگی۔ فرض کر لو کوئی نہ آیا تو؟ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ایسا ھؤا تو میں یہاں کی تنظیم کو ھی توڑ دوں‌گا اور کہیں دوسری جگہ چلا جاؤں‌گا۔ میں گاؤں کے باھر بیٹھا انتظار کر رھا تھا۔ میرا دل دھڑک رھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آنا شروع ھوئے، ایک ایک کرکے۔ ان میں سے کچھ جاکر اپنے گھروں پر روئے تھے۔ یہ انکی صورتوں سے صاف ظاھر تھا حالانکہ وہ اسے چھپانے کی کوشش

کر رہے تھے۔ دس کے دس وہاں حاضر ہو گئے۔ ایک بھی پیچھے نہیں رہا۔ یہ ہے ہماری پودبزی کی تنظیم دیکھا آپ نے!» اس نے بڑے فاتحانہ انداز میں اپنی تقریر ختم کی۔

لیڈا پولیوخ اسکا یہ قصہ سن کر بالکل حیران رہ گئی اور اسے ڈانٹنے لگی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

«کیا مطلب ہے تمہارا! انہیں پرکھنے کا یہی بہترین طریقہ ہے، میں جو کہتا ہوں۔ ایک ایک کی اصلیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی دھوکہ باز نہیں ہے۔ میں تو انہیں رگڑاکر ایریا سنٹر لے جاتا تاکہ انہیں میری بات کا اعتبار قائم رہتا لیکن بیچارے تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ کورچاگن تمہیں انکے سامنے ایک تقریر کرنی ہوگی۔ بولو کروگے نا؟ تقریر کے بغیر کام نہیں چلےگا۔ ان سے کہہ دینا کہ فوجی بھرتی کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دی گئی ہے یا اسی قسم کا اور کوئی بہانہ کر دینا لیکن یہ ضرور کہہ دینا کہ بہرحال ہمیں ان لوگوں پر فخر ہے۔»

کورچاگن ایریا سنٹر بہت کم جاتا تھا کیونکہ راستے میں کئی دن لگ جاتے تھے اور پھر کام اتنا زیادہ تھا کہ ضلعے میں ہر وقت اسکا موجود رہنا سخت ضروری تھا۔ لیکن اسکے برخلاف رازوالیخین شہر جانے کا بہانہ ہی ڈھنڈتا رہتا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک پوری طرح ہتھیاروں سے لیس ہوکر سفر پر نکلتا تھا گویا فینی‌مور کوپر کے کسی ناول کا ہیرو ہو۔ گاڑی پر جنگل سے ہوکر گزرتے وقت وہ کووں یا بھاگتی ہوئی گلہریوں پر نشانہ لگاتا تھا۔ راھگیروں کو روک کر ان سے بڑی سختی سے پوچھتا تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ شہر پہنچ کر وہ اپنے ہتھیار اتار دیتا تھا، رائفل گاڑی میں پیال کے نیچے

چھپا دیتا تھا اور پستول اپنی جیب میں ڈال کر معمولی حالت میں کومسومول کی ایریا کمیٹی کے دفتر میں داخل ہوتا تھا۔

ایک دن اسی طرح جب رازوالیخین دفتر میں داخل ہؤا تو ایریا کمیٹی کے سکریٹری فیدوتوف نے پوچھا «کہو بریزدوف کی کیا خبریں ہیں؟»

فیدوتوف کے دفتر میں ہمیشہ لوگوں کی بھیڑ رہتی تھی اور تمام لوگ ایک ساتھہ باتیں کرتے تھے۔ ان حالات میں کام کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی کہ چار مختلف آدمیوں کی باتیں سن رہے ہیں جواب پانچویں کو دے رہے ہیں اور ساتھہ ہی کچھہ لکھہ بھی رہے ہیں۔ حالانکہ فیدوتوف ابھی بہت کم عمر تھا لیکن وہ ۱۹۱۹ء سے پارٹی کا ممبر تھا۔ ان طوفانی دنوں میں ہی یہ ممکن تھا کہ پندرہ سال کا لڑکا پارٹی میں داخل کر لیا جائے۔

«ارے بہت سی خبریں ہیں» رازوالیخین نے بےپرواہی سے جواب دیا۔ «اتنی ہیں کہ ایک بار میں بتانا بھی مشکل ہے۔ صبح سے رات تک مسلسل کولھو کے بیل کی طرح کام میں جٹے رہنا پڑتا ہے اتنی بہت سی چیزوں کی طرف توجہ دینی ہوتی ہے تمہیں معلوم نہیں۔ ہمیں سب کام نئے سرے سے شروع کرنا پڑا۔ میں نے کومسومول کے دو نئے مرکزے منظم کئے۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ مجھے یہاں بلایا کس لئے ہے؟» یہ کہہ کر وہ بڑے کار و باری انداز سے ایک آرام کرسی پر بیٹھہ گیا گویا اسے کام کے بارے میں بڑی فکر ہے۔

محکمۂ معاشیات کے صدر کرمسکی نے ایک لمحے کے لئے اپنے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کے ڈھیر سے نظر اٹھا کر دیکھا۔

«ہم نے تو کورچاگن کو بلایا تھا تمہیں نہیں» اس نے کہا۔

رازوالیخین نے سگریٹ کے دھوئیں کا ایک گہرا سا بادل اڑاتے ہوئے کہا:

«کورچاگن یہاں آنا پسند نہیں کرتا اسی لئے مجھے اپنے تمام کام کے علاوہ یہاں بھی آنا پڑتا ہے... عام طور پر کچھہ سکریٹری تو بالکل عیش کرتے ہیں۔ کوئی کام وہ خود کرتے ہی نہیں۔ میرے ایسے گدھوں کو سارا بار سنبھالنا پڑتا ہے۔ جب کبھی کورچاگن سرحد پر چلا جاتا ہے تو دو تین ہفتے تک لوٹتا ہی نہیں اور سارا کام مجھے دیکھنا پڑتا ہے۔»

رازوالیخین کا یہ کھلا اشارہ کہ ضلعے کے سکریٹری کے عہدے کے لئے وہ زیادہ مناسب آدمی ہے سب لوگ سمجھہ گئے۔

رازوالیخین کے چلے جانے کے بعد فیدوتوف نے دوسرے لوگوں سے کہا «یہ شخص مجھے زیادہ پسند نہیں ہے۔»

رازوالیخین کی چالاکی کا پردہ اتفاق سے فاش ہو گیا۔ ایک دن لستسن اپنی ڈاک لینے فیدوتوف کے دفتر آیا کیونکہ یہ دستور تھا کہ ضلعے سے جو بھی وہاں آتا تھا وہ ڈاک ساتھہ لیکر جاتا تھا۔ ان دونوں کی گفتگو کے دوران میں رازوالیخین کی قلعی کھل گئی۔

«اچھا کورچاگن کو ہمارے پاس بھیج تو دینا» فیدوتوف نے اسکے چلتے وقت کہا۔ «ہم لوگ اسے بہت ہی کم جانتے ہیں۔»

«اچھی بات ہے لیکن دیکھو اسے ہم سے چھیننے کی کوشش نہ کرنا۔ ہم یہ نہیں کرنے دینگے۔»

اس سال سرحد پر اکتوبر انقلاب کی سالگرہ کا جشن معمول سے کچھہ زیادہ ہی جوش و خروش کے ساتھہ منایا گیا۔ سرحد کے دیہات میں جشن کی تیاریاں کرنےوالی کمیٹی کا صدر کورچاگن کو چنا گیا۔ پودبزی میں میٹنگ ہونے کے بعد آس پاس کے تین گاؤں کے پانچ ہزار کسانوں کا تقریباً تین فرلانگ لمبا جلوس سرخ پرچم لہراتا ہؤا سرحد تک گیا۔ جلوس کے آگے آگے ایک فوجی

بینڈ اور ٹریننگ بٹالین کے سپاہی تھے۔ وہ لوگ سرحد کے اس پار سوویت علاقے میں سرحد کے کھمبوں کی قطار کے متوازی بڑے نظم اور ترتیب کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے ان دیہات کی طرف جا رہے تھے جنہیں سرحد نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پولستانیوں نے اب سے پہلے اپنی سرحد پر اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ بٹالین کمانڈر گاوریلوف اور کورچاگن اس جلوس کے آگے گھوڑوں پر سوار چلے جا رہے تھے۔ انکے پیچھے بینڈ والے بینڈ بجاتے چل رہے تھے، پرچم ہوا میں لہرا رہے تھے اور لوگوں کے گانے کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ گاؤں کے نوجوان اپنی سب سے اچھی پوشاکیں پہنے ہوئے بہت خوش اور مسرور نظر آ رہے تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں بڑے چنچل انداز میں ہنس رہی تھیں اور باتیں کر رہی تھیں۔ مرد اور عورتیں سنجیدگی کے ساتھ مارچ کر رہے تھے اور بوڑھوں کے چہروں پر فاتحانہ متانت کا انداز تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی انسانوں کا یہ سمندر پھیلا ہؤا تھا۔ اس کا ایک کنارہ سرحد کا خط تھا لیکن ان لوگوں میں سے ایک نے بھی سرحد کے پار قدم نہیں رکھا۔ کورچاگن اس انسانی سمندر کو آگے بڑھتا ہؤا دیکھہ رہا تھا۔ کومسومول کے ترانے «گھنے جنگلوں سے برطانیہ کے ساحل تک سرخ فوج کا کوئی ثانی نہیں ہے!» کے ختم ہوتے ہی لڑکیوں نے کورس میں گانا شروع کیا «دور پہاڑی کے اس پار لڑکیاں کھیت کاٹ رہی ہیں...»

سوویت سنتریوں نے کھلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھہ اس جلوس کا خیر مقدم کیا۔ پولش سنتری حیران کھڑے دیکھہ رہے تھے۔ حالانکہ پولستانی کمان کو پہلے سے اس جلوس کی اطلاع دے دی گئی تھی لیکن پھر بھی سرحد کے اس پار اس کی وجہ سے کافی کھلبلی مچی۔ خفیہ پولیس کے گھوڑسوار سپاہی بڑی بیچینی سے گشت لگا رہے تھے۔ سرحد کے سنتریوں کی تعداد پانچ گنا بڑھا دی

گئی تھی اور اسکے علاوہ پہاڑیوں کے پیچھے اور بھی بہت سے سپاہی ناگہانی ضرورت کے لئے تیار چھپے بیٹھے تھے۔ لیکن جلوس اپنی حد سے باہر نہیں گیا۔ لوگ بہت مست ہو کر مارچ کر رہے تھے اور انکے نغموں سے فضا گونج رہی تھی۔

ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ایک پولستانی سنتری کھڑا تھا۔ جلوس نپی تلی چال سے اس ٹیلے کے قریب آتا جا رہا تھا اور کوچ کا ترانہ گونج اٹھا۔ پولستانی سنتری نے بڑی مستعدی سے رائفل اتار کر فوجی سلام کیا اور کورچاگن نے صاف طور پر اسکے الفاظ سنے:

«کمیون زندہ باد!»

سپاہی کی آنکھوں سے پاویل سمجھ گیا کہ یہ الفاظ اسی نے کہے تھے۔ پاویل مسحور سا ہوکر اسے دیکھنے لگا۔

دوست! فوجی وردی کے نیچے ایک ایسا دل دھڑک رہا تھا جو سرحد کے اس پار کے مظاہرہ کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ پاویل نے دھیرے سے پولستانی زبان میں جواب دیا:

«کامریڈ سلام!»

جتنی دیر تک جلوس ادھر سے گزرتا رہا وہ سپاہی اسی طرح کھڑا رہا۔ اس چھوٹے سے شخص کی شکل دیکھنے کے لئے پاویل نے کئی بار پیچھے مڑکر دیکھا۔ اب وہ ایک دوسرے پولستانی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اسکے گل مچھوں کے بال کہیں کہیں سفید ہونے لگے تھے لیکن اسکی فوجی ٹوپی کے چمکدار چھجے کے نیچے اسکی آنکھیں جذبات سے بالکل عاری تھیں۔ پاویل کے ذہن پر ابھی تک اس پہلے سپاہی کے الفاظ کا اثر تھا اس لئے اس نے پولستانی زبان میں زیرلب کہا گویا اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو:

«کامریڈ سلام!»

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

گاوریلوف مسکرا دیا - اس نے پاویل کا یہ فقرہ سن لیا تھا -

«تم ضرورت سے زیادہ کی امید کر رہے ہو» اس نے کہا - «وہ سب کے سب سیدھے سادے پیدل فوج کے سپاہی نہیں ہیں - ان میں سے کچھ فوجی پولیس کے سپاہی بھی ہیں - تم نے اس کی آستین پر لگا ہؤا وہ بلہ نہیں دیکھا؟ وہ یقیناً فوجی پولیس کا آدمی تھا -»

جلوس کا اگلا سرا پہاڑی سے اتر کر ایک ایسے گاؤں کی طرف جا رہا تھا جسے سرحد نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا - سوویت علاقے والے گاؤں کے آدھے حصے نے ان مہمانوں کا شاندار استقبال کرنے کی تیاریاں کی تھیں - گاؤں کے تمام باشندے چشمے کے کنارے سرحد والے پل پر کھڑے انتظار کر رہے تھے - نوجوان سڑک کے دونوں طرف قطاریں باندھے کھڑے تھے - سرحد کے پار پولستانی علاقے میں لوگ جھونپڑیوں اور سائبانوں کی چھتوں پر جھنڈ کے جھنڈ بیٹھے ہوئے شدید دلچسپی کے ساتھ چشمے کے دوسری طرف کی سرگرمیاں دیکھ رہے تھے - چوپالوں میں اور باغیچوں کی چہار دیواریوں کے قریب کسانوں کے غول کھڑے تھے - جس وقت جلوس انسانوں کی قطاروں کے بیچ سے ہوکر گزرا تو بینڈ نے انٹرنیشنل کی دھن چھیڑی - اسکے بعد پھول پتیوں سے سجے ہوئے ایک ڈائس پر سے پرجوش تقریریں کی گئیں - نوجوانوں اور سفید بالوں والے تجربہ‌کار مجاہدوں نے مجمع کے سامنے تقریریں کیں - کورچاگن بھی اپنی مادری زبان «یوکرینی» میں بولا - اس کے الفاظ دریا کے اس پار سرحد کے دوسری طرف بھی سنائی دے رہے تھے - یہ دیکھ کر خفیہ پولیس نے گاؤں والوں کو تتر بتر کرنا شروع کر دیا کہ کہیں ان پرجوش الفاظ کو سن کر ان لوگوں کے دلوں میں بغاوت کی آگ نہ بھڑک اٹھے، چابکوں

کی سڑاسڑ کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی اور لوگوں کو ڈرانے کے لئے ہوا میں کچھہ فائر کئے گئے۔

سڑکیں خالی ہو گئیں۔ پولیس کی گولیوں سے خوف زدہ ہوکر نوجوان چھتوں سے کود کود کر بھاگ گئے۔ سوویت علاقے سے لوگوں نے یہ سب کچھہ دیکھا اور انکے چہرے اداس ہو گئے۔ جو کچھہ ابھی اس نے دیکھا تھا اس پر بےحد خفا ہو کر ایک بوڑھا گڈریا گاؤں کے کچھہ لڑکوں کی مدد سے ڈائس پر چڑھہ گیا اور بہت مشتعل ہوکر مجمعے کے سامنے تقریر کرنے لگا:

«میرے بچوں! تم نے دیکھا کیا ہو رہا ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے ساتھہ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتا تھا۔ لیکن اب کسان گاؤں کا مالک ہے۔ اب کہیں نگاڈکا نہیں ہے۔ جاگیرداروں کی حکومت ختم ہو گئی ہے اور اب ہماری پیٹھہ پر انکے کوڑے نہیں برستے۔ میرے بیٹوں، اب اس کا دارومدار تم پر ہے کہ جاگیردار پھر کبھی نہ واپس آنے پائیں۔ میں بوڑھا آدمی ہوں مجھے تقریر کرنا نہیں آتا لیکن اگر میں کہہ پاتا تو تمہیں بہت سی باتیں بتاتا۔ زار کی حکومت میں ہم لوگ بیلوں کی طرح کام کرتے تھے پھر بھی ہماری زندگی مفلسی اور فاقوں میں ہی گزرتی تھی... بالکل ان بیچاروں کی طرح!» یہ کہہ کر اس نے اپنا سوکھا ہؤا ہڈیالا ہاتھہ دریا کے دوسرے کنارے کی طرف اٹھایا اور پھر اسکی عنان صبر چھوٹ گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جس طرح صرف چھوٹے بچے یا بہت بوڑھے لوگ ہی رو سکتے ہیں۔

اسکے بعد گرشکا خورووادکو بولا۔ گاوریلوف نے اسکی غصے سے بھری تقریر سن کر اپنا گھوڑا پھراکر دریا کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا کہ کوئی اس کی تقریر کی رپورٹ تو نہیں لکھہ رہا ہے۔ لیکن دریا کے کنارے بالکل سناٹا تھا۔ پل پر کا سنتری بھی ہٹا لیا گیا تھا۔

«اچھا تو معلوم ہوتا ہے کہ وزارت امور خارجہ کے پاس احتجاجی خط نہیں بھیجا جائےگا» اس نے ہنس کر کہا ـ

خزاں کے ختم کے قریب ایک دفعہ رات کو جب بارش ہو رہی تھی آنتونیوک اور اسکے سات ساتھیوں کی لوٹ مار کا خونی باب ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ـ وہ لٹیرا میدان ولا کی جرمن بستی کے ایک امیر کسان کے یہاں شادی کی دعوت کے موقع پر پکڑ لیا گیا ـ اسے گرفتار کرنے کا سہرا خرولنسکی کمیون کے کسانوں کے سر رہا ـ

اس بستی کی شادی کی دعوت میں ان مہمانوں کی موجودگی کی خبر مقامی عورتوں کے ذریعے حاصل ہوئی تھی ـ خبر پاتے ہی وہاں کی کومسومول تنظیم کے ممبروں نے فوراً ایک آدمی کے ہاتھہ یہ اطلاع بریزدوف بھیجوائی اور خود وہ بارہ کے بارہ جتنے ہتھیار دستیاب ہو سکے لیکر گاڑی پر بیٹھہ کر میدان ولا کی طرف چل پڑے ـ سیماکی میں اس نامہ بر کی ملاقات اتفاق سے فلاتوف کے دستے سے ہو گئی اور وہ لوگ فوراً اس ڈاکو کی تلاش میں چل پڑے ـ خرولنسکی کے ان نوجوانوں نے فارم کو گھیر لیا اور آنتونیوک کے گروہ اور انکے درمیان گولیاں چلنے لگیں ـ اس گروہ کے لوگ فارم میں بنے ہوئے مکان کے ایک حصے میں چھپ کر بیٹھہ گئے اور جو بھی قریب آتا تھا اس پر وہ گولی چلا دیتے تھے ـ ان لوگوں نے جھپٹ کر وہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کی لیکن انہیں پھر عمارت کے اندر کھدیڑ دیا گیا اور اس کوشش میں گروہ کے ایک آدمی کی جان گئی ـ آنتونیوک پہلے بھی کئی بار اس طرح گھر چکا تھا لیکن وہ ہر بار اندھیرے کا فائدہ اٹھاکر اور دستی بموں کی مدد سے لڑتا ہوا بھاگ نکلتا تھا ـ وہ اس بار بھی بھاگ نکلتا کیونکہ خرولنسکی کے نوجوان کمیونسٹوں میں سے دو مارے

جا چکے تھے - لیکن فلاتوف عین وقت پر پہنچ گیا - آنتونیوک سمجھہ گیا کہ اب اس کی شامت آ گئی ہے - وہ صبح تک ہر کھڑکی سے گولیاں چلاتا رہا لیکن پوپھٹنے سے پہلے ہی اسے گرفتار کر لیا گیا - ان ساتوں میں سے ایک نے بھی ہتھیار نہیں ڈالے اور سانپوں کی اس بانبی کو نیست و نابود کرنے میں چار جانیں گئیں - ان میں سے تین تو خرولنسکی کی حال ہی میں منظم کی ہوئی کومسومول تنظیم کے رکن تھے -

کورچاگن کی بٹالین علاقائی فوجوں کی موسم خزاں کی فوجی قواعد کے لئے طلب کی گئی - بٹالین نے ڈویژن کے کیمپ تک تقریباً پچیس میل کا فاصلہ موسلادھار بارش میں ایک ہی دن کے اندر طے کر لیا - وہ لوگ صبح سویرے ہی روانہ ہو گئے تھے اور کافی رات گئے اپنی منزل پر پہنچے - بٹالین کا کمانڈر گسیف اور اس کا کمیسار دونوں گھوڑوں پر گئے تھے - بٹالین کے آٹھہ سو رنگروٹ تھک کر بالکل چور وہاں پہنچے اور فوراً سو گئے - قواعد دوسرے دن صبح کو شروع ہونےوالی تھی - علاقائی ڈویژن کے ہیڈکوارٹر نے بٹالین کو اطلاع دینے میں دیر کی تھی معائنے کے لئے جس وقت بٹالین کے سپاہی پوری وردی پہن کر اور رائفلیں لیکر کھڑے ہوئے تو اس وقت انکی صورت ہی بالکل بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی - گسیف اور کورچاگن دونوں ہی نے ان نوجوانوں کو ٹریننگ دینے میں کافی وقت صرف کیا تھا اور انہیں یقین تھا کہ انکی بٹالین معائنے میں پوری اتریگی - سرکاری معائنے کے بعد جب بٹالین پریڈ کے میدان میں اپنی مشاقی کا ثبوت دے چکی تو ایک کمانڈر نے، جو خوبصورت لیکن بے جان سا شخص تھا، کورچاگن سے مخاطب ہوکر سختی کے ساتھہ پوچھا:

«تم گھوڑے پر کیوں سوار ہو؟ ارینگ کی بٹالینوں کے کمانڈروں اور کمیساروں کو گھوڑے رکھنے کا حق نہیں ہے۔ اپنے گھوڑے کو اصطبل میں چھوڑکر پیدل قواعد پر حاضر ہو۔»

کورچاگن جانتا تھا کہ اگر وہ گھوڑے سے اترا تو وہ قواعد میں حصہ نہیں لے سکےگا کیونکہ اسکی ٹانگیں اس لائق نہیں تھیں کہ وہ ان پر میل بھر بھی چل سکے۔ لیکن وہ اپنی حالت اس شیخی مارنے والے چھیلے کو کیسے سمجھا سکتا تھا جو اوپر سے نیچے تک چمڑے کے تسموں میں کسا ہؤا تھا؟

«میں پیدل قواعد میں حصہ نہیں لے سکوں گا۔»

«کیوں نہیں لے سکوگے؟»

یہ محسوس کر کے کہ اسے کوئی نہ کوئی تسلی بخش وجہ تو بتانی ہی پڑیگی کورچاگن نے دبی زبان میں کہا:

«میری ٹانگیں سوجی ہوئی ہیں اور میں ہفتے بھر تک بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا۔ لیکن کامریڈ کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟»

«پہلی بات یہ کہ میں تمہاری رجمینٹ کا چیف آف اسٹاف ہوں اور دوسری یہ کہ میں ایک بار پھر تمہیں گھوڑے سے اترنے کا حکم دیتا ہوں۔ اگر تم چلنے پھرنے سے معذور ہو تو تمہیں فوج میں نہیں ہونا چاہئے۔»

پاویل کو ایسا محسوس ہؤا کہ جیسے کسی نے اسکے منھہ پر ایک چابک رسید کر دی ہو۔ اس نے طیش میں آ کر اپنے گھوڑے کی لگام زور سے پکڑ لی لیکن گسیف کے مضبوط ہاتھہ نے اسے روک لیا۔ چند لمحوں کے لئے پاویل کے دل میں احساس توہین اور ضبط کے درمیان کش‌مکش چلتی رہی۔ لیکن اب پاویل کورچاگن سرخ فوج کا وہ سپاہی نہیں تھا جو اپنی مرضی کے مطابق ایک رسالہ چھوڑکر دوسرے میں جاکر بھرتی ہو سکتا تھا۔ وہ اب بٹالین

کمیسار تھا اور اسکی بٹالین اسکے پیچھے کھڑی تھی ۔ اگر اس وقت اس نے حکم کی تعمیل نہ کی تو اسکے سپاھیوں کے سامنے ڈسپلن کی بہت بری مثال قائم ہوگی! اس نے اس بٹالین کو اس بر خود غلط گدھے کی خاطر اتنا تیار نہیں کیا تھا ۔ وہ چپ چاپ رکابوں میں سے پیر نکال کر گھوڑے سے اترا اور جوڑوں کے شدید درد کو کسی طرح دباکر پیدل چلتا ہؤا اپنی بٹالین کے دائیں بازو میں جاکر کھڑا ہو گیا ۔

کئی دن تک موسم خلاف معمول بہت خوشگوار رہا ۔ قواعد کے پانچویں دن فوجیں شپیتووکا کے قریب تھیں ۔ قواعد یہیں ختم ہونے والی تھی ۔ بریزدوف کی بٹالین کے سپرد کلیمینتووچی گاؤں کی سمت سے اسٹیشن پر قبضہ کرنے کا کام کیا گیا تھا ۔

کورچاگن اب اپنے وطن کی زمین پر تھا اس لئے اس نے گسیف کو تمام راستے بتا دئے ۔ بٹالین دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور بہت لمبا چکر لگاکر فرضی دشمن کی پشت پر جا پہنچی اور فاتحانہ نعرے لگاتی ہوئی اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئی ۔ اس حربی تدبیر کو بہت سراھا گیا بریزدوف کی بٹالین اسٹیشن پر قابض رہی اور مفتوح بٹالین جو اسٹیشن کی حفاظت کر رہی تھی جنگلوں میں بھاگ گئی اور یہ قرار پایا گیا کہ اسکے آدھے باعمل سپاھی لڑائی میں «مارے» گئے ۔

بٹالین کا آدھا حصہ کورچاگن کے کمان میں تھا ۔ اپنے سپاھیوں کو ایک صف میں کھڑا ہونے کا حکم دیکر وہ سڑک کے بیچ میں کھڑا تیسری کمپنی کے کمانڈر اور سیاسی تعلیم دینے والے افسر سے باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں سرخ فوج کا ایک سپاھی بھاگا ہؤا اس کے پاس آیا ۔

«کامریڈ کمیسار» اس نے ھانپتے ہوئے کہا ۔ « بٹالین کمانڈر

نے دریافت کرایا ہے کہ آیا مشین گن چلانے والے سپاہی ریلوے لائن کے چوراہوں پر مورچہ جمائے ہوئے ہیں یا نہیں ۔ کمیشن ادھر ہی آ رہا ہے ۔»

پاویل اور اسکے ساتھہ کے کمانڈر ایک چوراہے کی طرف چل دئے ۔ رجمینٹ کا کمانڈر اور اسکے ایڈی کانگ وہاں موجود تھے ۔ گسیف کو کامیابی کے ساتھہ معرکہ سر کر لینے کے لئے مبارکباد دی گئی ۔ ہاری ہوئی بٹالین کے نمائندے کھسیائے ہوئے کھڑے رہے ۔ انہوں نے اپنی شکست کا کوئی عذر پیش کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ۔

گسیف نے کہا ۔ «اس فتح کا سہرا میں قبول نہیں کر سکتا ۔ ہمیں راستہ تو کورچاگن نے دکھایا تھا ۔ وہ اسی علاقے کا رہنے والا ہے ۔»

چیف آف اسٹاف اپنے گھوڑے پر سوار پاویل کے قریب آیا اور بڑے طنز کے ساتھہ بولا ۔ «کامریڈ تم تو اچھا خاصہ بھاگ لیتے ہو ۔ میں سمجھتا ہوں وہ گھوڑا محض رعب ڈالنے کے لئے رکھہ چھوڑا تھا؟» وہ کچھہ اور کہنے جا رہا تھا لیکن پاویل کے چہرے کا انداز دیکھہ کر وہ رک گیا ۔

«تمہیں اس کا نام تو نہیں معلوم ہے؟» کورچاگن نے بڑے کمانڈروں کے چلے جانے کے بعد گسیف سے پوچھا ۔

گسیف نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھہ مارا ۔

«ارے اس چھچھورے کی بات کی فکر نہ کرو ۔ اس کا نام چوژانن ہے ۔ میرا خیال ہے پہلے زار کی فوج میں وہ لفٹننٹ تھا ۔»

اس دن پاویل اپنے ذہن پر زور دیکر بار بار یہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ اس نے یہ نام کہاں سنا ہے لیکن اسے یاد نہ آیا ۔

فوجی قواعد ختم ہو گئی۔ کورچاگن کی بٹالین کی بہت تعریف کی گئی اور وہ بریزدوف واپس چلی گئی۔ کورچاگن اپنی ماں سے ملنے کے لئے دو چار دن کے لئے رک گیا کیونکہ اسکی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ دو دن تک تو وہ مسلسل بارہ بارہ گھنٹے تک سوتا رہا اور پھر تیسرے دن وہ آرتیم سے ملنے یارڈ گیا۔ اس گندی دھوئیں سے کالی عمارت کا ماحول پاویل کو اپنے مزاج کے موافق معلوم ہوتا تھا۔ وہ ندیدوں کی طرح کوئلے کے دھوئیں میں سانس لینے لگا۔ وہ اسی ماحول کے لئے بنا تھا اور وہ اسی ماحول میں رہنا بھی چاہتا تھا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ گویا اس سے اس کی کوئی بے انتہا عزیز چیز چھن گئی ہو۔ مہینوں سے اس نے انجن کی سیٹی کی آواز نہیں سنی تھی، اور وہ بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والا اور بجلی کے کھاتے میں کام کرنے والا نوجوان اس مانوس ماحول کے لئے اسی طرح بےقرار ہو اٹھا جیسے کوئی ملاح بہت عرصے تک ساحل پر رہنے کے بعد سمندر کی بیکراں وسعتوں کے لئے تڑپتا ہے۔ بہت دیر تک وہ اپنے اس جذبے پر قابو نہیں پا سکا۔ اس نے آرتیم سے بہت زیادہ باتیں نہیں کیں۔ آرتیم اب لوہا گلانے کی بھٹی پر کام کرتا تھا۔ پاویل نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پر ایک نئی شکن پڑ گئی تھی۔ وہ اب دو بچوں کا باپ تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ بہت دشوار زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے پاویل سے اپنے مصائب کا دکھڑا نہیں رویا لیکن وہ خود ہی سمجھ گیا۔

گھنٹے دو گھنٹے تک وہ دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے رہے اور پھر ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ ریلوے کے چوراہے پر پاویل نے اپنا گھوڑا روکا اور بڑی دیر تک اسٹیشن کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گھوڑے کو چابک لگایا اور جنگل میں ہوتا ہوا سرپٹ سڑک پر نکل گیا۔

جنگل کی سڑکوں پر اب کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ بالشیوکوں نے چھوٹے بڑے تمام لٹیروں کا صفایا کر دیا تھا اور اس علاقے کے گاؤں والے اب سکون سے زندگی بسر کرتے تھے۔

پاویل دو پہر کے قریب بریزدوف پہنچا۔ اس کا استقبال کرنے کے لئے لیڈا پولیوخ ضلع کمیٹی کے دفتر کی برساتی میں بھاگی ہوئی آئی۔

«خوش آمدید!» اس نے بڑے تپاک سے مسکراکر کہا۔ «ہم لوگ تمہاری بہت کمی محسوس کرتے تھے۔» یہ کہتے ہوئے اس نے پاویل کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور دونوں اندر چلے گئے۔

«رازوالیخین کہاں ہے؟» اس نے اپنا کوٹ اتارتے ہوئے لیڈا سے پوچھا۔

«معلوم نہیں» لیڈا نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔ «ارے ہاں۔ یاد آیا وہ صبح کہہ رہا تھا کہ تمہاری جگہ عمرانیات کا کلاس لینے وہ اسکول جائیگا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کام تمہارا نہیں اس کا ہے؟»

پاویل کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور اسے اس پر تعجب بھی ہوا۔

رازوالیخین کو وہ ہمیشہ سے ناپسند کرتا تھا۔ «وہ شخص تو اسکول میں سب گوڑکے رکھہ دیگا» اس نے جھنجھلا کر سوچا۔

«خیر اس کا ذکر چھوڑو» پاویل نے لیڈا سے کہا۔ «یہاں کی کچھہ اچھی خبریں سناؤ۔ کیا تم گروشیوکا گئی تھیں؟ وہاں کے نوجوانوں کا کیا حال چال ہے؟»

جتنی دیر لیڈا اسے وہاں کی خبریں سناتی رہی پاویل کوچ پر لیٹ کر اپنے دکھتے ہوئے اعضا کو آرام دینے لگا۔

«پرسوں راکیتنا کو پارٹی میں امیدوار ممبر کی حیثیت سے بھرتی کر لیا گیا۔ اب ہماری پودبزی کی تنظیم کافی مضبوط ہو گئی ہے۔

راکیتنا بہت اچھی لڑکی ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔ رفتہ رفتہ مدرس ہماری طرف آنے شروع ہو گئے ہیں۔ کچھہ تو پوری طرح ہمارے ساتھہ آ بھی گئے ہیں۔"

کورچاگن اور پارٹی کی ضلع کمیٹی کا نیا سکریٹری لچیکوف اکثر شام کے وقت لستسن کے گھر پر جمع ہوتے تھے اور تینوں تقریباً صبح تک ایک بڑی سی میز پر بیٹھے پڑھتے رہتے تھے۔ سونے کے کمرے میں جانے والا دروازہ جہاں لستسن کی بہن اور بیوی سوتی تھیں مضبوطی سے بند کر دیا جاتا تھا اور تینوں ایک چھوٹی سی کتاب پر جھک کر چپکے چپکے باتیں کرتے تھے۔ لستسن کو صرف رات کو ہی پڑھنے کا وقت ملتا تھا۔ پھر بھی جب پاویل گاؤں سے اپنے گشت پر سے لوٹتا تھا تو اسے یہ دیکھہ‌کر بڑی خفت ہوتی تھی کہ اس کے ساتھی اس سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔

ایک دن پودبزی سے ایک شخص یہ خبر لایا کہ پرسوں رات نہ جانے کن لوگوں نے گرشوتکا خورووادکو کو قتل کر دیا۔ خبر سنتے ہی پاویل اپنی ٹانگوں کی تکلیف کا خیال کئے بغیر ایگزیکٹو کمیٹی کے اصطبل کی طرف بھاگا اور جلدی سے گھوڑے پر زین کس کر سرپٹ گھوڑا بھگاتا ہوٗا سرحد کی طرف چل دیا۔

گاؤں کی سوویت کے دفتر والی جھونپڑی میں ایک میز پر صنوبر کی شاخوں کے درمیان گرشوتکا کی لاش رکھی ہوئی تھی اور سوویت کا سرخ پرچم اسکی لاش پر ڈال دیا گیا تھا۔ سرحد کا ایک سنتری اور کومسومول کا ایک ممبر دروازے پر پہرہ دے رہے تھے اور حاکموں کے آنے سے پہلے وہ کسی کو اندر داخل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ کورچاگن جھونپڑی میں داخل ہوا اور میز کے قریب جاکر اس نے سرخ پرچم الٹ دیا۔

گرشوتکا کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا ۔ اسکی پھٹی ہوئی آنکھوں کی پتلیاں موت کا کرب لئے ایک جگہ جم کر رہ گئی تھیں اور اسکا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا ۔ اسکی گدی پر جہاں کسی تیز ھتھیار سے گہرا زخم لگایا گیا تھا ایک صنوبر کی شاخ رکھہ کر زخم کو ڈھک دیا گیا تھا ۔

آخر اس نوجوان کی جان کس نے لی تھی؟ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ اس کا باپ جو پہلے چکی پر کام کرتا تھا اور بعد میں غریب کسانوں کی کمیٹی کا ممبر بن گیا تھا، انقلاب کے لئے لڑتا ھؤا مارا گیا تھا ۔

اپنے بیٹے کی موت کے صدمے سے وہ بڑھیا بستر سے لگ گئی ۔ اسکے پڑوسی اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے ۔ اور اس کا بیٹا اپنی بے وقت موت کا راز اپنے سینے میں چھپائے خاموش، بے حس و حرکت لیٹا تھا ۔

گرشوتکا کے قتل سے تمام گاؤں والوں کا غصہ بھڑک اٹھا تھا ۔ اس گاؤں میں کومسومول کے اس نوجوان لیڈر اور غریب کسانوں کے حمائتی کے دوستوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی ۔

راکیتنا کو اس خبر سے بہت صدمہ پہنچا تھا اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ۔ جب کورچاگن کمرے میں داخل ھؤا تو اس نے سر اٹھاکر دیکھا بھی نہیں ۔

«راکیتنا تمہارے خیال میں اسے کس نے مارا ھوگا؟» کورچاگن نے بھرائی ھوئی آواز میں کہا اور دھم سے ایک کرسی پر بیٹھہ گیا ۔

«وھی چکی والے غنڈے ھونگے ۔ ان چوروں کی آنکھہ میں گرشا ھمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا ۔»

گرشا خوروواد کو کے جنازے میں دو گاؤں کے لوگ شریک ہوئے ۔ کورچاگن بھی اپنی بٹالین کو ساتھ لایا اور کومسومول تنظیم کے تمام اراکین اپنے ساتھی کو اپنا آخری خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آئے ۔ گاوریلوف نے گاؤں کی سوویت کے سامنے والے چوک میں ڈھائی سو سرحدی سنتریوں کا ایک رسالہ لاکر کھڑا کر دیا ۔ ماتمی راگ کی غمناک دھنوں کے درمیان سرخ کفن میں لپٹا ہؤا جنازہ باہر نکال کر چوک میں رکھہ دیا گیا جہاں خانہ جنگی کے دوران میں مارے جانے والے بالشویک چھاپے ماروں کی قبروں کے برابر ایک نئی قبر ابھی تازہ تازہ کھودی گئی تھی ۔

گرشوتکا کی موت نے ان تمام لوگوں کو یکجا کر دیا جنکے مفاد کے لئے وہ ہمیشہ مضبوطی سے لڑتا آیا تھا ۔ نوجوان کھیت مزدوروں اور غریب کسانوں نے کومسومول کا ساتھہ دینے کا عہد کیا اور جتنے لوگوں نے اسکے جنازے پر تقریریں کیں ان سب نے بڑے غصے کے ساتھہ یہ مطالبہ کیا کہ قاتلوں کو قرار واقعی سزا دی جائے ۔ انہیں گرفتار کرکے یہیں اس چوک میں انکے مقتول کے اس مزار کے قریب ان پر مقدمہ چلایا جائے تاکہ ہر شخص دیکھہ سکے کہ دشمن کون لوگ تھے ۔

گولیوں کی تین سلامیاں داغی گئیں اور قبر پر صنوبر کی تازہ ٹہنیاں رکھہ دی گئیں ۔ اسی دن شام کو وہاں کی کومسومول تنظیم نے راکیتنا کو اپنا نیا سکریٹری چنا ۔ کورچاگن کے پاس گ۔پ۔ا۔ کی سرحدی چوکی سے یہ خبر آئی کہ ان لوگوں کو قاتلوں کا سراغ مل گیا ہے ۔

ایک ہفتے بعد شہر کے تھیٹر میں سوویتوں کی دوسری ضلع کانگریس شروع ہوئی اور اس موقعے پر لستسن نے بڑی فاتحانہ متانت کے ساتھہ اعلان کیا:

«کامریڈ اس کانگریس کے سامنے یہ اطلاع دیتے ہوئے مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ ہم نے گذشتہ ایک سال میں بہت

کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ ضلعے میں سوویت اقتدار مضبوطی سے قائم کر دیا گیا ہے۔ لوٹ مار اور رہزنی جڑ سے ختم کر دی گئی ہے اور چوری سے مال کی درآمد برآمد بھی تقریباً پوری طرح روک دی گئی ہے۔ گاؤں میں غریب کسانوں کی مضبوط تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں، کومسومول تنظیمیں اب پہلے کے مقابلے میں دس گنا مضبوط ہیں اور پارٹی کی تنظیموں نے بھی ترقی کی ہے۔ پودبزی میں کولکوں کی آخری غنڈہ گردی کا پردہ فاش کر دیا گیا ہے۔ آپ لوگوں کو یاد ہوگا کہ اس حادثے میں ہمارے کامریڈ خوروواد کو کی جان گئی تھی۔ یہ قتل چکی کے مالک اور اسکے داماد نے کیا تھا۔ دونوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور چند دن میں گبرنیا کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا جائیگا۔ مختلف گاؤں کی طرف سے کئی وفدوں نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ یہ کانگریس تجویز پاس کرے کہ ان لٹیروں اور دہشت پھیلانے والوں کو موت کی سزا دی جائے...»

ہال میں موجود تمام لوگوں نے پوری آواز سے اس تجویز کی تائید کی:

«بالکل ٹھیک! یہی ہونا چاہئے! سوویت اقتدار کے دشمنوں کو سزائے موت!»

لیڈا پولیوخ ایک بغلی دروازے پر آئی اور اس نے اشارے سے پاویل کو بلایا۔

باہر برآمدے میں جاکر اس نے اسے ایک لفافہ دیا جس پر لکھا ہؤا تھا «ضروری» ۔ اس نے لفافہ کھول کر خط پڑھا:

«کومسومول کی بریزدوف ضلع کمیٹی کے نام۔ نقل پارٹی کی ضلع کمیٹی کو۔ گبرنیا کمیٹی کے بیورو کے فیصلے کے مطابق کامریڈ کورچاگن کو ضلعے سے ہٹاکر گبرنیا کمیٹی کے تحت کومسومول کے کام کے سلسلے میں ایک اہم ذمہداری سپرد کی جا رہی ہے۔»

پاویل اس ضلعے سے رخصت ہؤا جہاں اس نے پچھلے سال بھر کام کیا تھا۔ اسکے جانے سے قبل پارٹی کی ضلع کمیٹی کی آخری میٹنگ کے سامنے دو سوالات زیرغور تھے: (۱) کامریڈ کورچاگن کو کمیونسٹ پارٹی کی ممبری دینا۔ (۲) کومسومول کی ضلع کمیٹی کے سکریٹری کے عہدے سے علحدہ ہوتے وقت اسکی سند کی تصدیق۔

رخصت ہوتے وقت لستسن اور لیڈا نے پاویل کا ہاتھہ بہت کس کر دبایا اور بڑی محبت سے اسے گلے لگایا۔ اور جب اس کا گھوڑا صحن سے نکل کر سڑک پر آیا تو بارہ پستولوں سے اسے الوداعی سلامی دی گئی۔

پانچواں باب

ٹرام بڑے دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی فندوکلیف سڑک کی چڑھائی پر چڑھہ رہی تھی اور اس میں اسے اتنی مشقت پڑ رہی تھی کہ اسکی مشین کراہ رہی تھی۔ آپرا ہاؤس پر جاکر ٹرام رکی اور اس پر سے نوجوانوں کی ایک ٹولی اتری، اور اسکے بعد ٹرام پھر اوپر چڑھنے لگی۔

«ذرا جلدی جلدی چلنا چاھئیے» پانکراتوف نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ «ورنہ ہم لوگوں کو یقیناً دیر ہو جائیگی۔»

تھیٹر کے دروازے پر آکونیف بھی ان لوگوں میں آ ملا۔

«گینکا، تمہیں یاد ھے اب سے تین برس پہلے بھی ہم انہیں حالات میں یہاں آئے تھے؟ اس وقت جب دوباوا، مزدور مخالفت، کے ممبروں کے ساتھہ پھر ہم لوگوں کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔ بڑی شاندار میٹنگ تھی! اور آج رات ہمیں پھر اس سے ٹکر لینی ھے۔»

وہ لوگ اپنے پاس دکھاکر ہال میں داخل ہو گئے تھے تب پانکراتوف نے اس کی بات کا جواب دیا:

«ہاں تاریخ اسی جگہ پر اپنے کو دھرا رہی ہے۔»

انہیں شی، شی، کی آوازوں کے ذریعے خاموش کر دیا گیا۔ کانفرنس کا شام کا اجلاس شروع ہوگیا تھا اور انہیں جہاں بھی جگہ ملی بیٹھہ جانا پڑا۔ ڈائس پر ایک نوجوان عورت کھڑی مجمع کے سامنے تقریر کر رہی تھی۔

«ہم لوگ بڑے وقت سے پہنچ گئے۔ اب چپ چاپ بیٹھہ کے سنو کہ تمہاری گھروالی کیا کہہ رہی ہے» پانکراتوف نے آکونیف کی پسلیوں میں کہنی مار کر دبی زبان میں کہا۔

«یہ سچ ہے کہ ہم لوگ اس بحث پر کافی وقت اور محنت صرف کر چکے ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ہم سب کو اس بحث سے بہت فائدہ ہوا ہے۔ آج ہمیں اس بات پر بہت خوشی ہے کہ ہماری تنظیم میں ٹراٹسکی کے چیلوں کی شکست ہو گئی۔ انہیں اس بات کی شکایت بھی نہیں ہو سکتی کہ انہیں اپنی بات کہنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اسکے برخلاف انہیں اپنے خیالات پیش کرنے کا پورا پورا موقع دیا گیا۔ دراصل ہم نے انہیں جو آزادی دی تھی اس کا انہوں نے بیجا فائدہ اٹھایا اور پارٹی کے ڈسپلن کے خلاف کئی بہت سنگین حرکتیں کیں۔»

تالیا بہت جوش و اضطراب کی حالت میں بول رہی تھی۔ بولتے وقت اسکی آنکھوں پر بالوں کی جو لٹ آ جاتی تھی اسے جس انداز سے وہ جھٹک کر پیچھے کرتی تھی اسی سے اس کے ہیجان کا پتہ چلتا تھا۔

«ضلعوں کے کئی ساتھیوں نے یہاں تقریریں کی ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے ٹراٹسکی کے مقلدین کے ہتھکنڈوں کے بارے میں کچھہ نہ کچھہ ضرور کہا ہے۔ اس کانفرنس میں بھی ٹراٹسکی

کے بہت سے چیلے موجود ہیں۔ ضلعوں سے انہیں جان بوجھکر بھیجا گیا ہے کہ یہاں شہر کی پارٹی کانفرنس میں ہم لوگ ایک بار پھر انکی بات سنیں۔ اگر وہ اس موقعے کا پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ظاہر ہے کہ ضلعوں میں اور چھوٹے چھوٹے مرکزوں میں اپنی مکمل شکست سے انہوں نے کچھہ سبق لیا ہے۔ ابھی کل تک وہ جو باتیں کہتے تھے وہ یہاں اس کانفرنس میں کہنے کی انکی ہمت نہیں ہوئی۔»

ہال کے داھنے کونے سے ایک کرخت آواز نے تالیا کو اس مقام پر ٹوک دیا:

«ابھی ہم نے اپنی بات کہی ہی کہاں ہے!»

تالیا اس آواز کی طرف مڑی:

«اچھی بات ہے دوباوا تو اب آکر بول لو۔ ہم لوگ تمہاری بات غور سے سنینگے۔»

دوباوا نے بہت آزردگی سے اسے گھور کر دیکھا اور غصے سے اس کے ھونٹوں پر بل پڑ گئے۔

«جب وقت آئیگا تب ہم چپ نہیں بیٹھے رہیں گے!» اس نے چلاکر جواب دیا۔ اسے اپنی زبردست ہار کا خیال آیا جو ایک روز پہلے اسے اپنے ضلعے میں ہوئی تھی۔ اسکی تکلیف دہ یاد ابھی تک رہ رہ کر اسکے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔

ہال میں کچھہ کاناپھوسی سی ہونے لگی۔ پانکراتوف ضبط نہ کر سکا۔ اس نے چلاکر کہا:

«تو کیا پھر پارٹی میں گڑبڑ مچانے کا ارادہ ہے، ہوں؟»

دوباوا نے آواز پہچان لی لیکن گھوم کر دیکھا نہیں۔ اسنے صرف اپنے نیچے کے ھونٹ میں مضبوطی سے دانت گاڑ کر سر جھکا لیا۔

«دوباوا خود اس بات کی ایک نمایاں مثال ہے کہ ٹراٹسکی کے چیلے پارٹی کا ڈسپلن کس طرح توڑ رہے ہیں» تالیا نے اپنی تقریر

جاری رکھی - «وہ کومسومول میں کافی عرصے سے کام کر رہا ہے - ہم میں سے بہت سے لوگ اسے جانتے ہیں، خاص طور پر ہتھیار بنانے کے کارخانے کے مزدور - وہ خارکوف کی کمیونسٹ یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ہم سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ شمسکی کے ساتھہ پچھلے تین ہفتوں سے یہیں ہے - یونیورسٹی کی پڑھائی اس طرح چھوڑکر وہ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں؟ شہر کی ایک بھی بستی ایسی نہیں ہے جہاں ان لوگوں نے میٹنگ نہ کی ہو - یہ سچ ہے کہ پچھلے کچھہ دنوں میں شمسکی کا دماغ تو کچھہ حد تک درست ہؤا ہے - انہیں یہاں بھیجا کس نے؟ ان دونوں کے علاوہ یہاں پر مختلف تنظیموں کی طرف سے ٹراٹسکی کے اور بھی بہت سے چیلے آئے ہیں - وہ پہلے کبھی نہ کبھی یہاں کام کر چکے ہیں اور اب وہ پھر پارٹی میں گڑبڑ پھیلانے آئے ہیں - کیا ان لوگوں کی پارٹی تنظیموں کو معلوم ہے کہ یہ لوگ کہاں ہیں؟ ہرگز نہیں -»

کانفرنس میں اس بات کی امید کی جاتی تھی کہ ٹراٹسکی کے چیلے آکر اپنی غلطیاں تسلیم کر لیں گے - انکو اس بات پر راضی کر لینے کی امید سے تالیا نے نہایت خلوص کے ساتھہ ان سے اپیل کی - وہ براہ راست ان سے مخاطب ہوئی گویا کسی بے تکلف رفیقانہ مباحثے میں حصہ لے رہی ہو:

«تین سال قبل اسی ہال میں دوباوا، مزدور مخالفت، کے سابق ممبروں کے ساتھہ پھر ہماری صفوں میں شامل ہوا تھا - آپ لوگوں کو یاد ہے نا؟ اور آپ لوگوں کو یاد ہے کہ اس نے اس وقت کہا تھا: ،ہم پارٹی کے پرچم کو کبھی اپنے ہاتھہ سے گرنے نہیں دینگے، - لیکن ابھی تین برس بھی مشکل سے گزرے ہیں کہ دوباوا نے وہی کیا جو نہ کرنے کا اس نے عہد کیا تھا - ہاں میں پھر ایک بار کہتی ہوں کہ اس نے پارٹی کے جھنڈے کو اپنے ہاتھہ سے گرا دیا ہے - اس نے ابھی کہا تھا: ،ہم لوگوں نے ابھی اپنی بات کہی

کہاں ہے!۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے ساتھ کے دوسرے ٹراٹسکی کے چیلے ابھی اور کچھ بھی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔»

«تفتہ سے پوچھو وہ بتائےگا کہ ہوا کس رخ چلنے والی ہے» پیچھے کی سیٹ سے کسی نے کہا ۔ «ان لوگوں میں وہی موسم کا حال بتانے میں مہارت رکھتا ہے ۔»

اس پر لوگوں نے خفگی سے احتجاج کیا:

«یہ حماقت کے مذاق کرنے کا وقت نہیں ہے!»

«یہ لوگ پارٹی کے خلاف لڑنا چھوڑیں گے کہ نہیں؟ یہ لوگ اس سوال کا جواب دیں ۔»

«ان لوگوں سے اس بات کا جواب طلب کیا جائے کہ پارٹی کے خلاف وہ اعلان نامہ کس نے لکھا تھا؟»

لوگوں کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی گیا اور صدر کو متواتر اور کافی دیر تک گھنٹی بجانی پڑی تاکہ لوگ خاموش رہیں ۔ تالیا کی آواز شور و غل میں گم ہوکر رہ گئی ۔ کافی دیر بعد یہ ہنگامہ کچھ کم ہوا اور اس نے پھر اپنی تقریر شروع کی:

«دوردراز علاقوں کے ساتھی ہم لوگوں کو جو خطوط بھیجتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ ہمارے ساتھ ہیں اور یہ بات کافی حوصلہ افزا ہے ۔ میں آپ لوگوں کے سامنے ایک خط پڑھ کر سنانا چاہتی ہوں جو ہمیں حال ہی میں ملا ہے ۔ یہ خط آ لگا یورینیوا نے بھیجا ہے ۔ آپ میں سے بہت سے لوگ اسے جانتے ہونگے ۔ وہ کومسومول کی ایک حلقہ کمیٹی کے محکمۂ تنظیم کی انچارج ہے ۔»

یہ کہہ کر تالیا نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر ایک سرسری سی نظر دوڑا کر پڑھنا شروع کیا:

«عملی کام کی طرف قطعی کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے ۔ پچھلے چار دن سے بیورو کے تمام ممبر باہر ضلعوں میں گئے ہوئے ہیں جہاں ٹراٹسکی کے چیلوں نے اتنا زیادہ کینہ پرورانہ پرچار چلا رکھا ہے جتنا آج سے پہلے کبھی نہیں چلایا تھا ۔ کل ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے تنظیم کے تمام ممبروں کا غصہ بھڑک اٹھا ۔ جب انہیں شہر کے ایک بھی پارٹی مرکزہ میں اکثریت حاصل نہیں ہو سکی تو مخالفین نے اپنی تمام طاقت مجتمع کرکے حلقے کی فوجی کمیساریٹ کے پارٹی مرکزہ میں ٹکر لینے کی تیاریاں کیں ۔ اس مرکزے میں حلقے کے پلاننگ کمیشن اور محکمۂ تعلیم میں کام کرنے والے کمیونسٹ بھی شامل ہیں ۔ اس میں بیالیس ممبر ہیں لیکن ٹراٹسکی کے تمام چیلے اسی میں جمع ہیں ۔ اس میٹنگ میں پارٹی کے خلاف جیسی تقریریں کی گئیں ویسی ہم لوگوں نے آج تک نہیں سنی تھیں ۔ فوجی کمیساریٹ کے ایک ممبر نے کھڑے ہوکر صاف صاف الفاظ میں کہا: «اگر پارٹی کی تنظیم ہماری بات نہیں مانتی تو ہم اسے زبردستی توڑ دینگے» پارٹی کے مخالفین نے اس بیان پر بہت تالیاں بجائیں ۔ اس کے بعد کورچاگن تقریر کرنے کے لئے اٹھا ۔ «آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ آپ اس فاشسٹ کی تعریف کرتے ہیں اور پھر بھی پارٹی ممبر ہونے کا دعوی کرتے ہیں؟» اس نے کہا ۔ لیکن ان لوگوں نے اتنا شور غل مچایا، اتنا ہنگامہ برپا کیا اور اپنی کرسیاں اتنے زور زور سے ٹکرائیں کہ اس کے لئے تقریر کرنا ناممکن ہو گیا ۔ اس مرکزے کے جو لوگ ان کے اس رویے سے تنگ آئے ہوئے تھے انہوں نے مطالبہ کیا کہ کورچاگن کو بولنے کا موقع دیا جائے ۔ لیکن جوں ہی وہ دو بارہ بولنے کے لئے کھڑا ہوا ہنگامہ پھر شروع ہو گیا ۔ اس شور و غل کی

پرواہ نہ کرکے اس نے چیخ کر کہا «تو یہ ہے آپ لوگوں کا جمہوری طریقہ! لیکن میں اپنی بات کہے بغیر یہاں سے نہیں ہٹوں گا!» اس موقع پر ان میں سے کئی لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے ڈائس سے نیچے گھسیٹنے کی کوشش کی۔ بڑا ہنگامہ مچا۔ پاویل نے انکا مقابلہ کیا اور بولتا رہا۔ لیکن ان لوگوں نے اسے ڈائس سے نیچے گھسیٹ لیا اور ایک بغلی دروازہ کھول کر اسے زینے میں دھکیل دیا۔ کسی بدمعاش نے اس کے چہرے پر ایک زخم بھی ڈال دیا۔ اس کے بعد مرکزے کے تقریباً تمام ممبر میٹنگ سے اٹھ‌کر چلے گئے۔ اس واقعے نے بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں...»

خط پڑھ‌کر تالیا ڈائس سے نیچے اتر آئی۔

گذشتہ دو مہینوں سے سیگل گبرنیا کی پارٹی کمیٹی کے پروپیگنڈا اور پرچار کے محکمے کا کام سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ مجلس صدارت میں توکاریف کے پاس بیٹھا ہوا نمائندوں کی تقریریں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ ابھی تک کانفرنس میں صرف نوجوانوں کی تقریریں ہوئی تھیں جو فی الحال کومسومول میں ہی تھے۔

«یہ لوگ پچھلے کچھ برسوں میں ذہنی طور پر کتنے پختہ ہو گئے ہیں» سیگل سوچ رہا تھا۔

«مخالفین کے چھکے چھوٹ گئے ہیں» اس نے توکاریف سے کہا۔ «اور اصلی حربے تو ابھی استعمال ہی نہیں کئے گئے ہیں۔ نوجوان ہی ٹراٹسکی کے چیلوں اور شاگردوں کو پسپا کئے دے رہے ہیں۔»

اتنے میں تفتہ کودکر ڈائس پر آیا۔ اس کے آتے ہی ہال میں ناپسندیدگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی، اور ایک ہلکا سا قہقہہ بھی پڑا۔ اپنے اس استقبال کے خلاف احتجاج کرنے کے کئے تفتہ نے مجلس صدارت کی طرف مڑکر دیکھا لیکن تب تک تمام لوگ خاموش ہو چکے تھے۔

«ابھی یہاں کسی نے مجھے موسم کی پیشین گوئی کا ماہر کہا تھا ۔ تو آپ اس طرح میرے سیاسی خیالات کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ کیوں ساتھیوں؟ محض اس لئے کہ آپ اکثریت میں ہیں!» وہ ایک سانس میں کہہ گیا ۔

اسکے ان الفاظ پر ایک زبردست قہقہہ لگا ۔ تفتہ نے بہت ناراضگی سے صدر سے احتجاج کیا ۔

«آپ لوگ ہنس سکتے ہیں لیکن میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ نوجوان واقعی مقیاس الہوا ہوتے ہیں ۔ یہ بات لینن نے بارہا کہی ہے ۔»

ایک لمحے میں ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی ۔

«کیا کہا ہے لینن نے؟» کچھ لوگوں نے مجمع میں سے پوچھا ۔

تفتہ کو جوش آ گیا ۔

«جس وقت اکتوبر انقلاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں اس وقت لینن نے ہدایت دی تھی کہ مزدور طبقے کے ثابت قدم نوجوانوں کو جمع کرکے اور انہیں ہتھیار دیکر ملاحوں کے ساتھ سب سے اہم علاقوں میں بھیجا جائے ۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو لینن کا وہ اقتباس پڑھ کر سناؤں؟ میرے پاس تمام اقتباسات لکھے ہوئے ہیں» یہ کہہ کر تفتہ اپنے تھیلے میں کچھ ڈھونڈنے لگا ۔

«جانے دو ۔ ہمیں معلوم ہے!»

«لیکن لینن نے اتحاد کے بارے میں کیا کہا تھا؟»

«اور پارٹی کے ڈسپلن کے بارے میں؟»

«اور لینن نے یہ کب کہا تھا کہ نوجوانوں کو پارٹی کے پرانے ممبروں کی مخالفت کرنی چاہئے؟»

تفتہ کے خیالات کا سلسلہ منتشر ہو گیا اور وہ بالکل ہی دوسرے موضوع کے بارے میں بولنے لگا ۔ اس نے کہا:

«لاگوتینا نے ابھی یورینیوا کا ایک خط پڑھ کر سنایا ہے ۔

کسی بحث کے دوران میں اگر کوئی تھوڑی بہت بدعنوانی ہو جائے تو اسکی ذمہ‌داری ہمارے اوپر تو عائد نہیں ہوتی۔»

سویتایف نے جو شمسکی کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا، غصے سے دانت پیس کر زیرلب کہا۔ «بیوقوف کہیں کا۔ آخر اس بات کا ذکر چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی...»

«ہاں» شمسکی نے چپکے سے تائید کرتے ہوئے کہا۔ «یہ احمق تو ہمیں بالکل تباہ کر دیگا۔»

تفتہ کی باریک اونچی آواز سننے والوں کے کانوں کو گراں گزر رہی تھی لیکن وہ بولے چلا جا رہا تھا:

«اگر آپ لوگوں نے اکثریت کا ایک جتھا منظم کر لیا ہے تو ہمیں بھی اقلیت کا جتھا منظم کرنے کا حق ہونا چاہئے۔»

ہال میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

ہر طرف سے تفتہ پر غصے سے بھری ہوئی باتوں کی بوچھار ہونے لگی:

«یہ کیا ہے؟ پھر وہی بالشویکوں اور منشویکوں کا جھگڑا شروع کر دیا؟»

«روسی کمیونسٹ پارٹی پارلیمان نہیں ہے!»

«یہ لوگ میاسنیکوف سے لیکر مارتوف تک ہر شخص کی خدمت کر رہے ہیں!»

تفتہ نے اپنے ہاتھ اس طرح اوپر اٹھائے گویا دریا میں غوطہ لگانے جا رہا ہو اور پھر مشتعل ہوکر بڑی تیزی سے آگ اگلنے لگا:

«یقیناً ہمیں اپنے گروپ بنانے کی آزادی ہونی چاہئے۔ ورنہ ہم لوگ، جن کا نظریہ بالکل مختلف ہے، ایسی منظم اور ڈسپلن کی پابند اکثریت کے خلاف اپنے خیالات کے لئے کیسے لڑ سکتے ہیں؟»

اس پر شور غل اور بڑھ گیا۔ اتنے میں پانکراتوف اٹھا اور اس نے زور سے کہا:

«بولنے دو اسے ۔ ذرا ہم بھی تو سنیں کہ اسے کیا کہنا ہے ۔ جو باتیں دوسرے لوگ مصلحتاً کہنا نہیں چاہینگے وہ سب یہ اگل دیگا ۔»

ہال میں خاموشی چھا گئی ۔ تفتہ نے محسوس کیا کہ وہ حد سے آگے بڑھ گیا تھا ۔ شاید اسے یہ بات ابھی نہیں کہنی چاہئے تھی ۔ اس کے تمام خیالات خلط ملط ہو گئے اور اس نے بڑی روانی سے بولتے ہوئے اپنی تقریر ختم کر دی:

«یہ تو ظاہر ہے کہ آپ لوگ چاہیں تو ہمیں نکال کر پارٹی سے باہر پھینک دیں ۔ اور اس قسم کی حرکت شروع بھی ہو گئی ہے ۔ کومسومول کی گبرنیا کمیٹی سے تو مجھے نکال ہی دیا گیا ہے ۔ لیکن کوئی پرواہ نہیں، جلد ہی معلوم ہو جائیگا کہ کون صحیح تھا اور کون غلط» اور اتنا کہہ‌کر وہ ڈائس سے کود کر ہال میں آ گیا ۔

سویتایف نے ایک پرچے پر کچھ لکھ‌کر دباوا کو دیا ۔

«متیائی اسکے بعد اب تم جاکر بولو ۔ حالانکہ اس سے صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی تو نہیں ہوگی کیونکہ ظاہر ہے کہ یہاں تو ہم لوگوں کا بہت برا حال ہو رہا ہے ۔ ہمیں تفتہ کا دماغ درست کرنا چاہئے ۔ وہ بالکل احمق ہے اور فضول باتیں بہت کرتا ہے ۔»

دوباوا نے بولنے کی اجازت مانگی اور اس کی درخواست فوراً قبول کر لی گئی ۔

جب وہ بولنے کے لئے ڈائس پر آیا تو ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی گویا کوئی اہم بات ہونے والی ہو ۔ ہر تقریر سے پہلے اسی قسم کی خاموشی ہو جاتی تھی لیکن دوباوا نے سمجھا کہ اس خاموشی کے پیچھے ان لوگوں کی اس سے عداوت پوشیدہ ہے ۔ جس جوش و خروش کے ساتھ وہ مختلف مرکزوں کی میٹنگوں میں بولتا

رھا تھا وہ اب باقی نہیں رہ گیا تھا ۔ دن بدن اس کا جوش ٹھنڈا پڑتا جا رھا تھا ۔ اور اس شکست فاش کے بعد اور اپنے سابق ساتھیوں کی سخت جھڑکی کھاکر تو جیسے آگ پر پانی ھی پڑ گیا ۔ اس بات سے اسکی خودنمائی کو بہت ٹھیس لگی تھی اور وہ محسوس کر رھا تھا کہ جیسے اسکے چاروں طرف دھواں بھرا ھو اور اسکا دم گھٹ رھا ھو ۔ اور چونکہ وہ بڑی ھٹ دھرمی سے اپنی غلطی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا اسلئے اس دھوئیں کی تلخی اور بھی بڑھ گئی تھی ۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بالکل دوٹوک بات کہےگا حالانکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس طرح وہ اکثریت کو اپنے اور بھی خلاف کر لیگا ۔ بولتے وقت اس کی آواز بالکل کھوکھلی تھی لیکن پھر بھی صاف سنائی دے رھی تھی ۔

«مہربانی کرکے آپ لوگ مجھے بیچ میں نہ ٹوکئےگا اور نہ سوالات کرکے مجھے دق کیجئےگا ۔ میں اپنے خیالات آپکے سامنے پورے طور پر واضح کرکے رکھہ دینا چاھتا ھوں حالانکہ میں اس بات کو اس وقت بھی جانتا ھوں کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ھوگا کیونکہ آپ لوگ اکثریت میں ھیں ۔»

آخرکار جب اس نے اپنی تقریر ختم کی تو ایسا معلوم ھوا کہ ھال میں بم پھٹ گیا ھو ۔ اس پر غضبناک چیخوں کا طوفان سا ٹوٹ پڑا اور اسے ایسا معلوم ھوا کہ جیسے اس کے منہہ پر کوئی کوڑے لگا رھا ھو ۔

«لعنت ھے ان لوگوں پر!»

«پارٹی میں پھوٹ ڈالنے والے مردہ باد!»

«بس بہت ھو چکا اب یہ لوگ بہت گالیاں دے چکے!»

لوگوں کی تضحیک آمیز ھنسی کے درمیان دوباوا اپنی جگہ پر جاکر بیٹھہ گیا ۔ لیکن اس ھنسی نے اسکا حوصلہ بالکل ھی پست کر دیا ۔ اگر وہ لوگ اس پر چیختے چلاتے اور اسے جی بھر

کر گالیاں دے لیتے تو اسے خوشی ہوتی لیکن وہ تو اس کا مذاق اس طرح اڑا رہے تھے گویا وہ کوئی گھٹیا قسم کا اداکار ہو جس کی آواز غلط سر نکالنے کی وجہ سے پھٹ گئی ہو۔
«اب شمسکی کی تقریر ہوگی» صدر نے اعلان کیا۔
شمسکی نے کھڑے ہوکر کہا:
«میں نہیں بولنا چاہتا۔»
اس پر ہال کے پیچھے سے پانکراتوف کی بھاری سی آواز گونجی:
«میں بولنا چاہتا ہوں!»
دوباوا اسکی آواز سے ہی سمجھ گیا کہ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس جہازی مزدور کو جب بھی یہ احساس ہوتا تھا کہ اسکی سخت توہین کی گئی ہے تو اسکی آواز ہمیشہ اسی طرح گونجنے لگتی تھی۔ دوباوا نے بڑی افسردگی سے اس لمبے سے کچھ جھکے ہوئے شخص کو تیزی سے ڈائس کی طرف بڑھتے دیکھا اور اس پر شدید بیچینی غالب آ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ پانکراتوف کیا کہنے والا تھا۔ کل سولومینکا میں اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ اسکی جو گفتگو ہوئی تھی وہ اسے یاد آنے لگی۔ اسے یاد آنے لگا کہ ان لوگوں نے اسے کتنی منت کے ساتھ سمجھایا تھا کہ وہ مخالفین کا ساتھ چھوڑ دے۔ سویتایف اور شمسکی بھی اسکے ساتھ تھے۔ ان لوگوں کی ملاقات توکاریف کے گھر پر ہوئی تھی۔ پانکراتوف، آکونیف، تالیا، والنتسیف، زیلینوو، استارووئیروف اور آرتیوخن وہاں پر موجود تھے۔ دوباوا نے اتحاد قائم کرنے کی اس کوشش کو بالکل ہی ٹھکرا دیا تھا۔ بحث کے بیچ ہی میں وہ سویتایف کے ساتھ اٹھ‌کر چلا گیا تھا جس سے یہ بات اور بھی پختہ ہو گئی تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا نہیں چاہتا۔ شمسکی وہاں اکیلا رہ گیا تھا، اور اب یہاں اس نے بولنے سے انکار کر دیا

تھا ۔ «ضعیف الارادہ دانشور! یقیناً ان لوگوں نے اس کو اپنی طرف ملا لیا ہوگا» دوباوا نے جھنجھلا کر بڑی تلخی کے ساتھہ سوچا ۔ اس سخت جدوجہد میں اسکے تمام دوست ایک ایک کرکے اس سے الگ ہوتے جا رہے تھے ۔ یونیورسٹی میں ژارکی سے اسکی دوستی اسی طرح ختم ہو گئی تھی ۔ ژارکی نے پارٹی بیورو کی میٹنگ میں «چھیالیس ممبروں» کے اعلان‌نامہ کی سخت مذمت کی تھی، اور بعد میں، جب انکے اختلافات بہت بڑھہ گئے تھے، تو انکی بول چال بھی بالکل ختم ہو گئی تھی ۔ اسکے بعد کئی بار ژارکی اسکے گھر آنا سے ملنے آیا تھا ۔ دوباوا اور آنا کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا ۔ وہ دونوں الگ الگ کمروں میں رہتے تھے اور دوباوا کا یہ خیال تھا کہ ژارکی کے باربار آنے سے آنا کے ساتھہ اسکے کشیدہ تعلقات اور بھی بدتر ہو گئے تھے جو یوں بھی اسکے خیالات سے متفق نہیں تھی ۔ اس نے بار بار اپنے آپ کو یقین دلایا کہ ژارکی سے اسے رقابت نہیں تھی لیکن ان حالات میں وہ ژارکی کے ساتھہ آنا کی دوستی پر بہت جھنجھلاتا تھا ۔ اس نے آنا سے اس بات کا ذکر بھی کیا تھا لیکن اسکے نتیجے کے طور پر جو ہنگامہ برپا ہوا اس سے ان کے تعلقات بہتر ہونے میں قطعی کوئی مدد نہیں ملی ۔ وہ اسے بغیر یہ بتائے ہوئے کہ کہاں جا رہا ہے کانفرنس میں شرکت کرنے چلا آیا تھا ۔

اسکے خیالات کی تیز پرواز پانکراتوف کی آواز سے بیچ ہی میں رک گئی ۔

«ساتھیوں!» مقرر نے ڈائس کے کنارے پر کھڑے ہوکر بہت گونجتی ہوئی آواز سے کہا ۔ «ساتھیوں! ہم لوگ نو دن تک مخالفین کی تقریریں سن چکے ہیں اور میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ ہمارے شانہ بشانہ لڑنے والے مجاہدوں کی طرح، انقلابیوں کی طرح، طبقاتی جدوجہد میں ہمارے رفیقوں کی طرح

نہیں بولے ۔ انکی تقریروں میں عداوت تھی، کینہ تھا، کٹھ حجتی تھی اور جھوٹی تہمتیں تھیں ۔ ہاں ساتھیوں، جھوٹی تہمتیں! ان لوگوں نے ہم بالشویکوں کو اس شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے گویا ہم لوگ پارٹی کے اندر ایک نادرشاہی نظام کے حامی ہیں، گویا ہم اپنے طبقے اور انقلاب کے مفاد کے ساتھ غداری کر رہے ہیں ۔ پارٹی کے بہترین، معتبرترین اور آزمودہ‌ترین لوگوں کو، قابل فخر پرانے بالشویکوں کو، ان لوگوں کو جنہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے روسی کمیونسٹ پارٹی کو بنایا ہے، جنہوں نے زار کے جیلوں میں مصیبتیں جھیلی ہیں، ان لوگوں کو جنہوں نے لینن کی رہنمائی میں دنیا بھر کے مینشویکوں کے اور ٹراٹسکی کے خلاف مسلسل بے لوچ جدوجہد کی ہے، ان لوگوں پر ہمارے ان مخالفین نے یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے کہ وہ پارٹی کے اندر انتہائی ضابطہ پرستی کا نظام قائم کئے ہوئے ہیں ۔ ہمارے دشمنوں کے علاوہ کیا کوئی اور شخص اس قسم کی بات کہہ سکتا تھا؟ کیا پارٹی اور اسکے اراکین کوئی الگ الگ دو چیزیں ہیں؟ پھر میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کس قسم کی باتیں کی جا رہی ہیں؟ ہم ایسے لوگوں کو کیا کہیں‌گے جو سرخ فوج کے سپاہیوں کو اپنے کمانڈروں اور کمیساروں کے خلاف اور فوجی ہیڈکوارٹر کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ بھی ایسے وقت جب کہ فوج کا وہ مخصوص دستہ دشمنوں سے گھرا ہوا ہو؟ ٹراٹسکی کے چیلوں کے قول کے مطابق تو جب تک میں کارخانے میں مستری ہوں تب تک میں 'بالکل ٹھیک، ہوں لیکن اگر کل میں پارٹی کمیٹی کا سکریٹری ہو جاؤں تو میں 'ضابطہ پرست حاکم، ہوں 'بیٹھے بیٹھے کرسی توڑتا ہوں،! ساتھیوں، میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کیا یہ عجیب نہیں معلوم ہوتا کہ مخالفین میں، جو ضابطہ پرستی کے خلاف اور جمہوریت کے لئے لڑنے کا دعوی کرتے ہیں، مثال کے طور پر تفتہ

جیسے لوگ شامل ہیں جسے ابھی حال ہی میں ضابطہ پرستی کے الزام پر اپنے کام سے علیحدہ کیا گیا تھا؟ یا سویتائیف کو ہی لیجئے جو اپنی 'جمہوریت پسندی' کے لئے تمام سولومینکا میں مشہور ہے۔ یا آفاناسیف جسے پودولسک ضلع میں خود پسندانہ اور جابرانہ طریقے سے کام کرنے کی وجہ سے گبرنیا کمیٹی تین بار اسکے عہدے سے الگ کر چکی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ پارٹی نے جتنے لوگوں کو سزا دی ہے وہ سب پارٹی کے خلاف لڑنے کے لئے متحد ہو گئے ہیں۔ جو پرانے بالشویک ہیں وہ ہمیں ٹراٹسکی کے 'بالشویک رویے' کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ نوجوانوں کو اس بات کا علم ہو کہ بالشویکوں کے خلاف ٹراٹسکی کی جدوجہد کی تاریخ کیا ہے، کس طرح وہ مسلسل ایک گروپ کو چھوڑکر دوسرے گروپ کا دامن پکڑتا رہا ہے۔ مخالفین کے خلاف اس جدوجہد سے ہماری صفیں اور مضبوط ہوئی ہیں اور اس جدوجہد نے ہمارے نوجوانوں کو نظری اعتبار سے بھی بہت طاقتور بنا دیا ہے۔ نچلے پتی بورژوا کے رجحانات کے خلاف لڑکر بالشویک پارٹی اور کومسومول تنظیم فولاد کی طرح مضبوط ہو گئی ہیں۔ مخالفین کے گروہ کے خوف و دہشت پھیلانے والے لوگ یہ پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ ہمارا معاشی اور سیاسی ڈھانچہ بالکل ڈھیر ہو جائیگا۔ مستقبل ہی بتائےگا کہ ان پیشین گوئیوں کی کیا حقیقت ہے۔ وہ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہم پرانے بالشویکوں کو، مثلاً توکاریف کو، پھر کارخانے میں کام کرنے کے لئے بھیج دیں اور انکی جگہ دوباوا جیسے کسی ابن‌الوقت کو رکھ دیں جو سمجھتا ہے کہ پارٹی کے خلاف اسکی جدوجہد کوئی بہت ہی بہادری کا کارنامہ ہے۔ نہیں ساتھیوں، ہم اس بات کو کبھی بھی منظور نہیں کر سکتے۔ پرانے بالشویکوں کی جگہ دوسرے لوگ رکھے جائینگے لیکن ان لوگوں میں سے نہیں جو ہر دشواری کے وقت پارٹی کی پالیسی پر

زبردست حملہ کرنے لگتے ھیں۔ ھم اپنی عظیم پارٹی کے اتحاد کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ پرانے کارکنوں اور نئے کارکنوں کے درمیان کبھی پھوٹ نہیں پڑیگی۔ لینن کے پرچم کے نیچے پتی بورژوا طبقے کے رجحانات کے خلاف لڑتے ھوئے ھم فتح کی منزل تک پہنچیں گے!»

فلک شگاف تالیوں کے شور کے درمیان پانکراتوف ڈائس سے نیچے اتر آیا۔

دوسرے دن تفتہ کے گھر پر دس آدمیوں کی ایک میٹنگ ھوئی۔

«میں اور شمسکی تو آج خارکوف کے لئے روانہ ھو رھے ھیں» دوباوا نے کہا۔ «اب یہاں ھمارے کرنے کو کچھہ رہ ھی نہیں گیا ھے۔ تم لوگ اپنا اتحاد قائم رکھنا۔ اب ھمیں صرف یہ کرنا ھے کہ انتظار کریں اور دیکھیں آگے کیا ھوتا ھے۔ یہ تو ظاھر ھی ھے کہ کل روس کانفرنس میں ھم لوگوں کی مذمت کی جائیگی لیکن میری رائے میں ابھی اتنی جلدی ھم لوگوں کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جائیگی۔ اکثریت نے ھمیں ایک اور موقع دینے کا فیصلہ کیا ھے۔ ھمارے لئے اب کھلے طور پر اپنی جدوجہد چلانے کا مطلب یہ ھوگا — خصوصاً اس کانفرنس کے بعد — کہ ھمیں ٹھوکر مارکر پارٹی سے نکال دیا جائیگا۔ اور یہ مصلحت کے خلاف ھے۔ یہ کہنا تو دشوار ھے کہ آئندہ چل کر کیا ھوگا۔ میرے خیال میں اب اور کچھہ تو کہنے کو رہ نہیں گیا ھے» دوباوا جانے کے لئے اٹھہ کھڑا ھوا۔

سوکھا ھؤا پتلے پتلے ھونٹوں والا استاروویروف بھی اٹھہ کھڑا ھوا۔

«متیائی۔ میں تمھاری بات سمجھا نہیں» اس نے کچھہ ھکلاکر اور «ر» کی آواز ذرا کھینچ کر ادا کرتے ھوئے کہا۔ «کیا تمھارا

مطلب یه ھے که کانفرنس کا فیصله ھم لوگوں پر عائد نہیں ھوتا؟»

«ضابطه کے لحاظ سے تو ھوتا ھے» سویتائیف بیچ ھی میں بول اٹھا – «ورنه پارٹی کارڈ چھن جائیگا – لیکن ھم لوگ اندازہ لگائیں گے که ھوا کا کیا رخ ھے – تب تک کے لئے ھم لوگ رخصت ھوتے ھیں –»

تغته بڑی بے قراری سے اپنی کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا رھا – شمسکی کا چہرا بہت اترا ھوا تھا – اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے – وہ کھڑکی کے پاس بہت اداس بیٹھا اپنے ناخن چبا رھا تھا – سویتائیف کے ٹوکنے پر وہ اپنے اس مایوس کن مشغلے کو چھوڑ کر میٹنگ کی طرف متوجه ھوا –

«میں اس قسم کے داؤں پیچ کے خلاف ھوں» اس نے یک بیک خفا ھو کر کہا – «ذاتی طور پر میں سمجھتا ھوں که ھم لوگوں کو کانفرنس کے فیصلے کا پابند رھنا چاھئے – ھم لوگ اپنے عقیدے کے لئے لڑے لیکن اب جو فیصله کر لیا گیا ھے اسے ھمیں تسلیم کر لینا چاھئے –»

استارووِیروف نے اسے پسندیدگی کے انداز میں دیکھا –

«یہی بات میں بھی کہنا چاھتا تھا» اس نے لڑکھڑاتی ھوئی زبان سے کہا –

دوباوا نے شمسکی پر اپنی نظریں گاڑ دیں اور حقارت کے ساتھه کہا:

«تم سے کچھه کرنے کو کہا ھی کب جا رھا ھے – ابھی تو موقع ھے تم گبرنیا کی کانفرنس میں اپنی غلطیوں پر پیشیمانی کا اظہار کر سکتے ھو –»

شمسکی اچھل کر کھڑا ھو گیا –

«دمیتری! مجھے تمہارا یه انداز گفتگو قطعی پسند نہیں ھے! اور میں صاف صاف بتا دوں که تم نے جو کچھه کہا ھے اس سے مجھے

سخت نفرت آ رہی ہے اور میں اپنے رویے پر نئے سرے سے غور کرنے پر مجبور ہوں۔»

دوباوا نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

«میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم یہ کروگے۔ جاؤ جلدی جاکر اپنے گناہوں کا کفارہ کر لو ورنہ پھر وقت نہیں رہیگا۔» یہ کہہ کر دوباوا نے تفتہ اور دوسرے لوگوں سے ہاتھہ ملایا اور رخصت ہو گیا۔ اسکے تھوڑی ہی دیر بعد شمسکی اور استارووپروف بھی چلے گئے۔

تاریخ انسانی میں سن انیس سو چوبیس کی آمد آمد، کڑاکے کے جاڑے کے ساتھہ ہوئی۔ ماہ جنوری نے برف سے ڈھکے ہوئے ملک پر اپنا برفانی شکنجہ جکڑ دیا اور مہینے کے دو ہفتے گزرنے کے بعد بپھرے ہوئے طوفانوں اور برفانی آندھیوں کا دور شروع ہو گیا۔

جنوب مغربی ریلوے لائن پوری طرح برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ انسان قدرت کی قہرمانیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ برف کھودنے والے ہلوں کے فولادی پھال برف کی تہوں کو چیرتے ہوئے ریل گاڑیوں کے لئے راستہ بنا رہے تھے۔ برف کے بوجھہ سے جھکے ہوئے تار برقی کے تار پالے اور برفانی طوفانوں کی زد میں آکر ٹوٹ گئے تھے اور بارہ لائنوں میں سے صرف تین کام کر رہی تھیں: ایک تو ہند یورپی لائن اور دو سرکاری لائنیں۔

شیپیتووکا اسٹیشن کے تار کے دفتر میں تار برقی کے تین آلوں کی مسلسل کھٹ کھٹ جاری تھی جسے صرف سدھے ہوئے کان ہی سمجھہ سکتے تھے۔

تار کے دفتر میں آپریٹر کا کام کرنے والی لڑکیاں ابھی نو عمر تھیں۔ ابھی تک انہوں نے کاغذ کی جتنی پٹیوں پر پیغام کھٹکھٹائے تھے انکی کل لمبائی بارہ تیرہ میل سے زیادہ نہ ہوگی لیکن ان

کے برابر بیٹھا ہؤا بوڑھا تار بابو سوا سو میل سے زیادہ لمبی کاغذ کی پٹیوں پر پیغامات کھٹکھٹا چکا ہوگا۔ اپنے ساتھ کام کرنے والی ان نوجوان لڑکیوں کی طرح اسے پیغام کی عبارت سمجھنے کے لئے کاغذ کی پٹی کو پڑھنا نہیں پڑتا تھا اور نہ ہی اسے مشکل الفاظ یا فقروں کیلئے اپنی پیشانی پر بل ڈال کر غور و فکر کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ بلکہ وہ تو آلے کی کھٹ کھٹ کے ساتھ ہی الفاظ لکھتا جاتا تھا۔ اس نے اپنے مانوس کانوں سے آلے پر یہ الفاظ سنے: «عام اطلاع کے لئے۔ عام اطلاع کے لئے۔ عام اطلاع کے لئے!»

«برف کی صفائی سے متعلق کوئی اور اعلان ہوگا» بوڑھے تار بابو نے یہ الفاظ لکھتے ہوئے اپنے دل میں سوچا۔ باہر برف کا طوفان زور شور سے جاری تھا جس کی وجہ سے سخت برف آ کر کھڑکی سے ٹکرا رہی تھی۔ تار بابو نے سوچا شاید کوئی کھڑکی پر دستک دے رہا ہے۔ اسکی آنکھیں اسی آواز کی سمت میں گھوم گئیں اور ایک لمحے کے لئے وہ کھڑکی کے شیشوں پر برف سے بنے ہوئے نہائت باریک اور پرپیچ بیل بوٹوں کو دیکھتا رہ گیا۔ پتیوں اور ڈنٹھلوں کے اس نہایت خوبصورت ڈزائن کا مقابلہ اچھے سے اچھے نقاش کی کاریگری بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے خیالات بھٹکنے لگے اور ایک لمحے کے لئے اس نے تار برقی کے آلے کی کھٹ کھٹ سننا بند کر دیا۔ لیکن فوراً ہی اس نے نظر جھکائی اور ان الفاظ کو پڑھنے کے لئے، جنہیں اس نے بیچ میں ہی چھوڑ دیا تھا، کاغذ کی پٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس عرصے میں تار برقی کے آلے نے یہ الفاظ کھٹکھٹائے تھے:

«کل ۲۱ جنوری کی شام کو چھ بج کر پچاس منٹ پر...»

جلدی سے یہ الفاظ لکھ‌کر تار بابو نے کاغذ کی پٹی رکھ دی اور اپنی ہتھیلی پر سر ٹکا کر وہ پھر آلے کی کھٹ کھٹ سننے لگا:

«گور کی گاؤں میں انتقال ہو گیا...» دھیرے دھیرے اس نے یہ الفاظ بھی کاغذ پر لکھ دیئے۔ اپنی اس طویل عمر میں اس نے نہ جانے کتنے پیغامات لکھے تھے — مسرت کے پیغام بھی اور المناک خبریں بھی۔ نہ جانے کتنی بار دوسروں کے غم اور خوشی کی اطلاع سب سے پہلے اسی کو ملی تھی! نہ جانے کتنے عرصے سے اس نے ان مختصر اور جامع فقروں کے معنی پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ صرف ان کی آواز سنتا تھا اور مشین کی طرح انہیں کاغذ پر درج کر دیتا تھا۔

پھر کسی کی موت واقع ہو گئی تھی اور کسی کو اس غمناک واقعے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ پیغام کے شروع کے الفاظ «عام اطلاع کے لئے۔ عام اطلاع کے لئے۔ عام اطلاع کے لئے!» تار بابو کے ذہن سے اتر گئے تھے۔ تار برقی کے آلے نے پھر یہ حروف کھٹکھٹائے «و-ل-ا-د-ی-م-ی-ر ا-ل-ی-چ» اور بوڑھے تار بابو نے آلے کی کھٹ کھٹ کو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ وہ بالکل پرسکون انداز میں بیٹھا رہا۔ وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ ولادیمیر الیچ نام کا کوئی شخص کہیں مر گیا تھا۔ کسی کے پاس تار کے ذریعے یہ المناک خبر پہنچے گی اور کسی کے سینے سے کرب اور غم کی ایک چیخ نکل جائیگی۔ لیکن اسے اس سے کیا لینا وہ تو اس واقعہ کا محض اتفاقی گواہ تھا۔ تار برقی کے آلے نے پھر ایک مختصر سی کھٹ کی آواز کی، پھر ایک نسبتاً لمبی کھٹ کی آواز، پھر چھوٹی بڑی کھٹ کھٹ کی کئی آوازیں اور ان مانوس آوازوں کی تشریح کرکے تار بابو نے لفظ کا پہلا حرف پکڑا اور اسے تار کے فارم پر لکھ دیا۔ یہ حرف تھا «ل»۔ پھر دوسرا حرف آیا «ی»۔ اس کے بعد اس نے نہایت صفائی کے ساتھ لکھا «ن» اور پھر بغیر کچھ محسوس کئے ہوئے اس نے جلدی سے آخری حرف بھی لکھ دیا «ن»۔

اسکے بعد آلے نے لفظ «کا» کی آواز پیدا کی اور جملہ ختم ہو گیا ۔ ایک لمحے کے کئے تار بابو کی نظر اپنے لکھے ہوئے نام پر ٹھہر کر رہ گئی «لینن» ۔

آلے کی کھٹ کھٹ جاری تھی لیکن اب وہ مانوس نام تار بابو کے شعور پر حاوی ہو چکا تھا ۔ اس نے ایک بار پھر پیغام کے آخری الفاظ پر نظر ڈالی ۔ «لینن کا» کیا؟ لینن؟ اس تار کے پیغام کی پوری عبارت اس کے تخیل کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی ۔ وہ تار کے فارم کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور اسکی بتیس برس کی ملازمت کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنی لکھی ہوئی عبارت پر خود ھی اعتبار نہ آیا ۔

اس نے بڑی جلدی جلدی تین بار ان سطروں پر نظر دوڑائی لیکن الفاظ بدلنے سے قطعی انکار کر رہے تھے: «انتقال ھو گیا لینن کا ۔» بوڑھا اچھل کر کھڑا ھو گیا اور اس نے جھپٹ کر کاغذ کی لہرائی ہوئی پٹی اٹھا لی اور اسے اس طرح دیکھنے لگا گویا اپنی نظروں سے اس میں سوراخ کر دیگا ۔ اس دو گز لمبی کاغذ کی پٹی نے اس بات کی تصدیق کردی جسے ماننے سے وہ اب تک انکار کر رہا تھا! اس نے اپنا مردنی چھایا ھوا چہرہ دفتر کے دوسرے کارکنوں کی طرف گھمایا اور ان لوگوں نے اس کی دردناک چیخ سنی: «لینن کا انتقال ھو گیا!»

اس المناک موت کی خبر تار گھر کے کھلے ہوئے دروازوں سے نکلی اور آندھی کی طرح سارے اسٹیشن میں پھیل گئی، اور برفانی طوفان کے ساتھہ ریل کی پٹڑیوں اور پٹڑیوں کی قینچیوں پر چابک سی لگاتی ہوئی ھوا کے سرد جھونکوں کے ساتھہ ریلوے کے کارخانے کے آھنی پھاٹک میں داخل ہوئی ۔

فوری مرمت کرنے والے مزدوروں کی ایک ٹولی پہلے ھی ؛پٹ، پر کھڑے ہوئے ایک انجن کی صفائی وغیرہ میں مصروف

تھی - بوڑھا انجن ڈرائیور پولنتوفسکی خود اپنے انجن کے نیچے گھسا ہوا مستریوں کو اسکی خرابیاں بتا رہا تھا - زاخار بروژاک اور آرتیم انجن کی بھٹی کی ٹیڑھی سلاخوں کو سیدھا کرنے میں مصروف تھے - زاخار سلاخ کو نہائی پر رکھے ہوئے تھا آرتیم ہتھوڑا چلا رہا تھا -

زاخار کافی بوڑھا ہو گیا تھا - گذشتہ چند سالوں میں اسکے ماتھے پر ایک گہری سی شکن پڑ گئی تھی اور اسکی کنپٹیوں پر بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے - اسکی کمر کچھہ جھک گئی تھی اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں فرط غم سے دھندلا گئی تھیں -

ایک لمحے کے لئے دروازے پر ایک شخص کے جسم کا خاکہ سا نظر آیا اور پھر شام کے دھندلکے نے اسے نگل لیا - لوہے کی سلاخ پر ہتھوڑے کی ضربوں کی آواز میں اس کی پہلی آواز تو سنائی ہی نہیں دی - لیکن جب وہ شخص انجن کی مرمت کرتے ہوئے لوگوں کے پاس پہنچا تو آرتیم اپنا ہتھوڑا ہوا میں اٹھائے ہوئے بیچ میں ہی رک گیا -

«ساتھیوں! لینن کا انتقال ہو گیا!»

ہتھوڑا آہستہ آہستہ آرتیم کے کندھے سے نیچے سرک آیا اور اس نے بہت خاموشی کے ساتھہ اسے سمینٹ کے پکے فرش پر رکھہ دیا -

«کیا ہؤا؟ کیا کہا تم نے؟» آرتیم نے یہ خوفناک خبر لانے والے اس شخص کی چمڑے کی جیکٹ کو زور سے پکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑنے لگا -

وہ شخص سر سے پاؤں تک برف میں اٹا ہوا تھا اور اسکا دم پھول رہا تھا - اس نے بہت ہی دھیمی اکھڑی ہوئی آواز میں کہا:

«ہاں ساتھیوں، لینن کا انتقال ہو گیا ہے -»

اور چونکہ وہ شخص چیخ کر نہیں بول رہا تھا اسلئے آرتیم کو یقین آ گیا کہ یہ بھیانک خبر ضرور سچ ہوگی - اس نے اب

جاکر اس نے خبر لانے والے اس شخص کو پہچانا ــ وہ مقامی پارٹی تنظیم کا سکریٹری تھا ــ

لوگ "پٹ" میں سے باہر نکل آئے اور خاموشی کے ساتھ انہوں نے اس شخص کی موت کی خبر سنی جس کا نام تمام دنیا میں گونج رہا تھا ــ

پھاٹک کے باہر کہیں ایک انجن کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور ان آدمیوں کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی ــ یہ دردناک چیخ دور اسٹیشن کے سرے پر ایک دوسرے انجن نے دھرائی اور پھر ایک تیسرے نے ــ ان کی آواز میں آواز ملا کر بجلی گھر کا بھونپو بھی اپنی تیز اور کرخت آواز میں چیخ اٹھا جس طرح تیزرو بم کے گولے کی آواز ھوتی ھے ــ اور پھر یہ تمام آوازیں کیئف جانے والی سواری گاڑی کے خوبصورت «ایس» انجن کی بھاری گونجدار آواز میں دب گئیں ــ

وھاں پر کھڑے ھوئے چیکا کے آدمی کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ھوئی کہ شپیتووکا ــ وارسا اکسپریس کے پولستانی انجن ڈرائیور کو جب یہ معلوم ھوا کہ یہ سیٹیاں کیوں بج رھی ھیں تو اس نے ایک لمحے کے لئے انہیں سنا اور پھر دھیرے سے اپنا ھاتھ اٹھایا اور سیٹی بجانے والی ڈوری کھینچ دی ــ وہ جانتا تھا کہ وہ آخری بار اس ڈوری کو ھاتھ لگا رھا ھے ــ وہ جانتا تھا کہ اب کبھی اسے یہ انجن چلانے کو نہیں ملیگا لیکن اس کا ھاتھ ڈوری پر سے نہ ھٹا اور اس کے انجن کی چیخ سن کر نرم کوچوں پر لیٹے ھوئے پولستانی سفارت خانے کے افسر اور دیگر سفارتی نمائندے چونک کر اٹھ بیٹھے ــ

لوگ ریلوے کے یارڈ میں جمع ھونے لگے ــ وہ ھر پھاٹک سے جوق در جوق اندر داخل ھو رھے تھے اور جب اس وسیع عمارت میں کہیں تل رکھنے کو بھی جگہ نہ رھی تو اداس خاموشی کے

درمیان تعزیتی جلسہ شروع ہوا ۔ پارٹی کی شپیتووکا ایریا کمیٹی کے سکریٹری شرابرین نے جو ایک پرانے بالشویک تھے مجمع کے سامنے تقریر کی :

«ساتھیو! دنیا کے مزدوروں کے رہنما لینن اب ہمارے درمیان نہیں رہے ۔ پارٹی کو اتنا زبردست نقصان پہنچا ہے کہ اسکی کسی قسم کی تلافی ممکن نہیں ہے کیونکہ جس شخص نے بالشویک پارٹی کو بنایا اور اسے اپنے دشمنوں کے خلاف ڈٹ کر لڑنا سکھایا وہ اب نہیں رہا... ہماری پارٹی اور ہمارے طبقے کے رہنما کی وفات مزدور طبقے کے بہترین فرزندوں کے نام ہماری صفوں میں شامل ہونے کی ایک دعوت ہے...»

اسکے بعد ماتمی راگ کی دھن شروع ہوئی اور وہاں پر جمع ہزاروں لوگوں نے اپنی ٹوپیاں اتار لیں اور آرتیم کو، جو پچھلے پندرہ برس سے نہیں رویا تھا، ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی چیز دفعتاً اسکے حلق میں آکر اٹک گئی ہو اور اسکے مضبوط شانے اسکی سسکیوں سے ہلنے لگے ۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس انسانی اژدھام کے دباؤ سے ریلوے مزدوروں کے کلب کی عمارتیں تک کراہ رہی ہیں ۔ باہر کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی ۔ ہال کے پھاٹک پر لگے ہوئے دو لمبے لمبے فر کے درخت برف سے لدے ہوئے تھے لیکن ہال کے اندر انگیٹھیوں کی گرمی اور پارٹی تنظیم کے منظم کردہ تعزیتی جلسے میں شرکت کرنے والے چھہ سو آدمیوں کے سانس کی وجہ سے کافی گھٹن تھی ۔

عام طور پر بات چیت کی جو چہل پہل ہوتی ہے، وہ اس وقت بالکل مفقود تھی ۔ شدت غم سے لوگوں کی آوازیں گھٹ کر رہ گئی تھیں اور وہ سرگوشیوں میں بولتے تھے اور ان سینکڑوں لوگوں کی آنکھوں میں غم اور فکر کی جھلک تھی ۔ ان لوگوں کی اس وقت

یہی کیفیت تھی جیسے طوفان میں کسی جہاز کا کپتان نہ رہ جانے سے اس جہاز پر کام کرنے والوں کی ہوتی ہے۔

نہایت خاموشی کے ساتھ بیورو کے ممبر ڈائس پر اپنی اپنی جگہوں پر آکر بیٹھ گئے۔ گٹھے ہوئے جسم والے سروتینکو نے بڑے احتیاط کے ساتھ گھنٹی اٹھائی اور اسے ڈھیرے سے بجاکر پھر میز پر رکھ دیا۔ اتنا ہی کافی تھا۔ ہال میں ایک غم سے بھری ہوئی خاموشی چھا گئی۔

اس جلسے کی خاص تقریر ختم ہو جانے کے بعد پارٹی تنظیم کا سکریٹری سروتینکو بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ اور حالانکہ جو اعلان اس نے وہاں پر کیا وہ ایک تعزیتی میٹنگ کے لئے کچھ غیر معمولی تو ضرور تھا لیکن اس پر کسی کو تعجب نہیں ہوا۔

اس نے کہا۔ «کئی مزدوروں نے درخواست کی ہے کہ اس میٹنگ میں پارٹی کی ممبری کے لئے انکی عرضی پر غور کیا جائے۔ اس عرضی پر سینتیس ساتھیوں کے دستخط ہیں» پھر اس نے عرضی پڑھ کر سنائی:

« بالشویک پارٹی کی ریلوے تنظیم کے نام، شپیتووکا اسٹیشن، جنوب مغربی ریلوے۔

ہمارے لیڈر کی وفات ہم لوگوں کے لئے بالشویک پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت ہے اور ہم درخواست کرتے ہیں کہ یہ میٹنگ یہ فیصلہ کرے کہ ہم لینن کی پارٹی میں شریک ہونے کے قابل ہیں کہ نہیں۔»

اس مختصر سے بیان کے نیچے دستخطوں کے دو لمبے لمبے خانے تھے۔

سروتینکو نے تمام نام زور سے پڑھ کر سنائے اور ہر نام کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے رک جاتا تھا تاکہ میٹنگ میں شرکت کرنے والے لوگ ان ناموں کو یاد کر سکیں ۔

«استانیسلاو زگمنڈووچ پولینتوفسکی — انجن ڈرائیور، چھتیس سال کی ملازمت ۔»

سارے ہال میں زیرلب تائید کی ایک لہر دوڑ گئی ۔

«آرتیم آندریوچ کورچاگن — میکینک، سترہ سال کی ملازمت ۔»

«زاخار فیلپووچ بروزاک ۔ انجن ڈرائیور، بائیس سال کی ملازمت ۔ »

چبوترے پر کھڑا ہوا وہ شخص جیسے جیسے کھردرے ہاتھوں والے ریلوے مزدوروں کی برادری کے پرانے آزمودہ کار لوگوں کا نام پکارتا جاتا تھا، ویسے ویسے ہال میں شور بڑھتا جاتا تھا ۔

جس وقت پولینتوفسکی مجمع کے سامنے آکر کھڑا ہوا ہال میں پھر مکمل خاموشی چھا گئی ۔ اس کا نام فہرست میں سب سے پہلے تھا ۔

اپنی زندگی کے حالات بیان کرتے وقت وہ بوڑھا اپنے هیجان کو نہ چھپا سکا ۔

«... ساتھیو میں آپکو کیا بتا سکتا ہوں؟ آپ لوگ تو سبھی جانتے ہیں کہ پرانے زمانے میں مزدوروں کی زندگی کیسی تھی ۔ تمام عمر میں نے زر خرید غلاموں کی طرح کام کیا لیکن پھر بھی بڑھاپے میں کوڑی کوڑی کو محتاج رہا ۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جس وقت انقلاب ہوا میں یہی سوچتا رہا کہ میں بوڑھا ہوں اور مجھ پر اپنے کنبے کی پریشانیوں کا بوجھ ہے ۔ اسی لئے میں پارٹی میں داخل نہیں ہوا ۔ حالانکہ میں نے کبھی دشمن کا ساتھ نہیں دیا ہے لیکن جدوجہد میں بھی میں نے شاذ و نادر ہی حصہ لیا ہے ۔ سن انیس سو پانچ میں وارسا کی کار ورکشاپ کی ہڑتال کمیٹی کا ممبر تھا اور میں اس وقت بھی بالشویکوں کی

طرف تھا۔ اس وقت میں نوجوان تھا اور لڑنے کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ لیکن اب گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرنے سے کیا فائدہ! لینن کی موت سے میرے دل پر سخت چوٹ لگی ہے۔ ہمارا دوست اور ہمارے دکھہ درد کو سمجھنے والا اب ہم سے چھن گیا ہے اور یہ آخری بار ہے کہ میں اپنے بوڑھے ہونے کی بات زبان پر لایا ہوں۔ میں اپنے جذبات کا پوری طرح اظہار نہیں کر پا رہا ہوں کیونکہ میں تقریر کرنے کا کبھی عادی نہیں رہا۔ لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ بالشویکوں کا راستہ ہی میرا راستہ ہے۔ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔»

انجن ڈرائیور نے اپنا سفید بالوں والا سر جھٹکا اور اسکے سفید ابرؤوں کے نیچے سے اسکی آنکھیں عزم اور استقلال کے ساتھہ مجمع کو اس طرح دیکھنے لگیں گویا انکے آخری فیصلے کی منتظر ہوں۔

اس چھوٹے سے سفید بالوں والے بوڑھے کی عرضی کی کسی نے بھی مخالفت نہیں کی اور جب ووٹ لئے گئے، جس میں پارٹی کے باہر کے لوگوں کو بھی شریک کیا گیا تھا، تو ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا جس نے اسکی عرضی کے حق میں ووٹ نہ دیا ہو۔

پولینتوفسکی ڈائس سے اترا تو اس وقت وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا۔

ہر شخص کو اس احساس تھا کہ کوئی اہم تاریخی بات ہو رہی ہے۔ اس کے بعد جہاں پر وہ ڈرائیور کھڑا تھا وہیں آرتیم کا لحیم شحیم جسم نظر آیا۔ اس مستری کی سمجھہ میں نہیں آ رہا تھا کہ تقریر کرتے وقت وہ اپنے ہاتھوں کا کیا کرے اسلئے وہ گھبراہٹ میں اپنی بال‌دار سمور کی ٹوپی کو مڑوڑنے لگا۔ اس کی بھیڑ کی کھال والی جیکٹ کے، جو کناروں پر پھٹ چلی تھی، تمام بٹن کھلے ہوئے تھے لیکن اسکی بھورے رنگ کی اونچے کالر والی فوجی ٹیونک کے گریبان پر پیتل کے دو بٹن چمک رہے تھے جس کی وجہ سے اس کا حلیہ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا چھٹی کے دن

وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر نکلا ہو۔ آرتیم ہال کی طرف مخاطب ہوا اور اس نے مجمع میں ایک عورت کی جانی پہچانی صورت کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ سنگ تراش کی بیٹی گالینا تھی جو اپنے درزی کی دوکان کے ساتھیوں کے ساتھہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک عفو پرور مسکراہٹ کے ساتھہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھہ رہی تھی، اور اس کی مسکراہٹ میں آرتیم نے پسندیدگی کا جذبہ دیکھا اور ایک ایسا جذبہ جسے وہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

«آرتیم ان لوگوں کو اپنے بارے میں بتاؤ!» اس نے سروتینکو کو کہتے سنا۔

لیکن آرتیم کو اپنی داستان شروع کرنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ اتنے بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے تقریر کرنے کا عادی نہیں تھا اور دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ زندگی نے تجربات کے جس ذخیرے سے اسے مالامال کر رکھا تھا اس کو الفاظ کا جامہ پہنانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ الفاظ تلاش کرنے کی بری طرح کوشش کر رہا تھا اور گھبراہٹ کی وجہ سے اس کے لئے بولنا اور بھی دشوار ہو گیا تھا اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا نہیں محسوس کیا تھا۔ اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ ایک عظیم تبدیلی کی دہلیز پر کھڑا ہے، وہ ایک ایسا قدم اٹھانے والا ہے جو اسکی کٹھن اور کج رو زندگی میں حرارت اور معنویت پیدا کر دیگا۔

«ہم چار بھائی تھے» آرتیم نے بولنا شروع کیا۔

ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ چھہ سو لوگ بڑے اشتیاق سے اس لمبے قد والے مزدور کی تقریر سن رہے تھے جس کی ناک چونچیلی تھی اور جس کی آنکھیں سیاہ ابروؤں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں۔

«میری ماں امیروں کے یہاں کھانا پکانے کا کام کرتی تھی۔ مجھے اپنے باپ بہت ہی کم یاد ہیں۔ انکی اور ماں کی کبھی نہیں

بنتی تھی — وہ شراب بہت پیتے تھے — اس لئے ماں کو بچوں کی دیکھہ بھال کرنا پڑتی تھی — اتنے لوگوں کا پیٹ پالنا اس کے، اکیلی کے لئے بہت دشوار تھا — وہ صبح سے رات تک اپنی جان کھپاتی تھی تب جا کر اسے اپنے کھانے کے علاوہ مہینے میں چار روبل ملتے تھے — خوش قسمتی سے میں نے دو سال تک اسکول میں تعلیم بھی پائی — وہاں میں نے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھا لیکن جب میں نو برس کا ہوا تو میری ماں نے مجبور ہوکر مجھے مشینوں کی مرمت کرنے والے ایک مستری کے یہاں اپرینٹس رکھا دیا — اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ ھی نہیں تھا — وہاں میں نے تین سال تک کام کیا اور مجھے کھانے کے علاوہ وہاں کچھہ بھی نہیں ملتا تھا... اس دوکان کا مالک فارسٹر نام کا ایک جرمن تھا — شروع میں تو وہ مجھے رکھنے پر تیار نہیں ہوا کیونکہ میں بہت چھوٹا تھا لیکن میں بہت ھٹا کٹا لڑکا تھا اسلئے ماں نے میری عمر دو تین برس بڑھاکر بتا دی — میں نے تین برس تک اس جرمن کے یہاں کام کیا لیکن کچھہ کام سیکھنے کے بجائے مجھے گھر کا اوپر کا کام کرنا پڑتا تھا اور شراب لانے کے لئے بھاگ بھاگ کر بازار جانا پڑتا تھا — میرا مالک بے انتہا شراب پیتا تھا... وہ کوئلہ اور لوھا لانے کے لئے بھی مجھے ھی بھیجتا تھا... اس کی بیوی میرے ساتھہ بالکل غلاموں کا سا سلوک کرتی تھی — مجھے آلو چھیلنا پڑتے تھے اور برتن مانجھنا پڑتے تھے — مجھے ہر وقت لاتوں اور گھونسوں سے پیٹا جاتا تھا — بیش‌تر موقعوں پر تو بلاوجہ ھی، محض عادتاً — اگر مالکن کسی بات پر مجھہ سے خفا ہو جاتی تھی تو تڑسے ایک زور کا چانٹا رسید کر دیتی تھی — اور اپنے شوھر کے شراب پینے کی وجہ سے اس کا مزاج تو ھر وقت ھی گرم رھتا تھا — میں گھر سے بھاگ کر سڑک پر آ جاتا تھا لیکن جاتا تو جاتا کہاں — کون تھا جس سے جاکر شکایت کرتا؟ میری ماں وھاں سے

چالیس میل کے فاصلے پر رہتی تھی اور اگر اس کے پاس جاتا بھی تو وہ مجھے گھر پر نہ رکھہ سکتی... دوکان میں حالت اس سے کچھہ بہتر نہ تھی۔ مالک کا بھائی دوکان پر بیٹھتا تھا۔ بہت ہی سور آدمی تھا۔ مجھے پریشان کرنے میں اسے کچھہ خاص مزا آتا تھا۔ وہ مجھہ سے کہتا «اے چھوکرے۔ ذرا وہاں سے وہ واشر تو اٹھا دے» اور یہ کہہ کر بھٹی کے قریب والے کونے کی طرف اشارہ کر دیتا۔ میں لپک کر واشر اٹھاتا اور اسے چھوتے ہی چیخ پڑتا۔ وہ واشر بھٹی میں تپا ہوا ہوتا تھا اور حالانکہ وہاں کونے میں پڑا ہوا وہ بالکل سیاہ اور سرد نظر آتا تھا لیکن چھوتے ہی ہڈی تک گوشت جل جاتا تھا۔ میں شدید تکلیف کی وجہ سے چیختا چلاتا رہتا اور وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ میرے لئے یہ اذیت اور زیادہ برداشت کرنا ناممکن ہو گیا اور میں اپنی ماں کے پاس گھر بھاگ گیا۔ لیکن اس کی سمجھہ میں نہ آیا کہ مجھے گھر پر رکھہ کر کیا کرے اسلئے وہ مجھے پھر اسی جرمن کے پاس چھوڑ آئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ راستے بھر روتی رہی تھی۔ تیسرے سال انہوں نے مجھے تھوڑا بہت کام سکھانا شروع کیا لیکن مارپیٹ حسب دستور چلتی رہی۔ میں پھر وہاں سے بھاگ آیا اور اس بار استارو کانستانٹی‌نوف جا پہنچا۔ وہاں مجھے ایک ساسیج بنانے کے کارخانے میں کام مل گیا۔ وہاں میں نے پیٹیاں دھونے میں اپنا ڈیڑھہ سال کا وقت ضائع کیا۔ پھر اس کارخانے کا مالک جوئے میں اپنے کارخانے کو کھو بیٹھا اور ہم لوگوں کی چار مہینے کی تنخواہ مارکر بھاگ گیا۔ میں نے اس دوزخ سے نکل کر ژمیرنکا کی گاڑی پکڑی اور کام کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ خوش قسمتی سے وہاں میری ملاقات ایک ریلوے مزدور سے ہو گئی جسے میرے حال پر ترس آ گیا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں تھوڑا بہت مشینوں کی مرمت کا کام جانتا ہوں تو وہ مجھے

اپنے بڑے افسر کے پاس لے گیا اور اس سے یہ کہہ کر کہ میں اس کا بھتیجا ہوں اس نے مجھے کوئی کام دلوانے کی درخواست کی۔ میرا ڈیل ڈول دیکھہ کر ان لوگوں نے اندازہ لگایا کہ میں کم سے کم سترہ برس کا ہونگا اور انہوں نے مجھے ایک مستری کی مدد کرنے کے کام پر لگا دیا۔ جہاں تک میرے موجودہ کام کا تعلق ہے میں یہاں آٹھہ برس سے زیادہ سے کام کر رہا ہوں۔ اپنے گذشتہ حالات کے بارے میں میں آپ کو اس سے زیادہ اور کیا بتا سکتا ہوں۔ اور میری موجودہ زندگی کے بارے میں آپ سب لوگ جانتے ہی ہیں۔»

آرتیم نے ٹوپی سے اپنا ماتھا پونچھا اور ایک گہری آہ بھری۔ اس نے سب سے اہم بات تو ابھی تک کہی نہیں تھی۔ اور اس بات کو کہنا سب سے زیادہ دشوار تھا لیکن قبل اس کے کہ کوئی سوال کر بیٹھے اسے وہ بات کہہ ڈالنی چاہئے۔ اپنی گھنی بھویں سکوڑ کر اس نے اپنی داستان جاری رکھی:

«آپ لوگ پوچھیں گے کہ جب انقلاب کے شعلے پہلے پہل بھڑکے اس وقت میں بالشویکوں کی صف میں کیوں نہیں شامل ہوا؟ اور آپ لوگوں کو یہ سوال مجھہ سے پوچھنے کا حق بھی ہے۔ میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں؟ میں ابھی کوئی ایسا بوڑھا بھی نہیں ہو گیا ہوں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ آج تک میں اس منزل تک پہنچنے کا راستہ نہ پا سکا؟ میں آپ کو اس سوال کا صاف صاف جواب دوں گا کیونکہ میں کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ ہم لوگوں نے وہ راہ نہ پکڑی حالانکہ سن انیس سو اٹھارہ ہی میں جب ہم لوگ جرمنوں سے ٹکر لے رہے تھے ہمیں وہ راستہ اختیار کر لینا چاہئے تھا۔ ژوخرائی ملاح نے کئی بار ہم لوگوں سے کہا بھی لیکن ۱۹۲۰ء تک میرے رائفل کو ہاتھہ لگانے کی نوبت نہ آئی۔ جب وہ طوفان ختم ہو گیا اور ہم لوگوں نے سفید فوجوں کو

بحر اسود میں دھکیل دیا تو ہم لوگ گھر لوٹ آئے۔ اس کے بعد شادی اور بال بچوں کے چکر میں پھنس گئے... میں گھر گرھستی میں ایسا الجھ گیا کہ اور کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ لیکن اب جبکہ کامریڈ لینن ہم سے جدا ہو گئے ہیں اور پارٹی نے ہم لوگوں سے خطاب کیا ہے تو میں نے بھی اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ میری زندگی میں کس چیز کی کمی ہے۔ صرف اپنے اقتدار کی حفاظت کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ کامریڈ لینن کی عدم موجودگی میں ہم لوگوں کو ایک بہت بڑے کنبے کی طرح متحد ہوکر رہنا ہے تاکہ سوویت اقتدار فولاد کے پہاڑ کی طرح مضبوط اور ناقابل شکست بن سکے۔ ہم سب کو بالشویک بننا چاھئے آخر یہ ہماری ہی پارٹی ہے نا؟»

ان الفاظ میں اس مستری نے سیدھے سادے لیکن پرخلوص انداز میں اپنی زندگی کے حالات بیان کئے۔ اور جب اس نے اپنی تقریر ختم کی تو حالانکہ وہ اپنے الفاظ کی روانی کی وجہ سے، جس کا وہ عادی نہیں تھا، کچھ شرمندہ ضرور تھا لیکن وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ پھر وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور سوالات کا انتظار کرنے لگا۔

خاموشی کو توڑتے ہوئے سروتینکو نے کہا «کسی کو کوئی سوال کرنا ہے؟»

مجمع پر ایک حرکت کی لہر سی دوڑ گئی لیکن صدر کے اس سوال کے جواب میں شروع میں تو کسی نے کچھ بھی نہ کہا۔ پھر بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والے ایک مزدور نے جو ابھی سیدھا انجن پر سے چلا آ رہا تھا اور بالکل الٹے توے کی طرح سیاہ نظر آ رہا تھا فیصلہ‌کن انداز میں کہا:

«پوچھنے کو ہے ہی کیا؟ کیا ہم اسے جانتے نہیں ہیں؟ اسے منظوری دے دو اور قصہ ختم کرو!»

گلیاکا لوہار نے بھی، جس کا چہرہ گرمی اور جوش کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا، اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں چلا کر کہا:

«یہ کامریڈ بہت ہی معقول قسم کا آدمی ہے۔ یہ کبھی اپنی راہ سے گمراہ نہیں ہوگا۔ اس پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ سروتینکو ووٹ لے لو!»

اتنے میں ہال کے بالکل پیچھے سے جہاں کومسومول کے نوجوان بیٹھے ہوئے تھے کسی نے جس کا چہرہ نیم تاریکی میں صاف نظر نہیں آ رہا تھا کھڑے ہو کر پوچھا:

«اچھا کامریڈ کورچاگن یہ بتائیں کہ وہ جاکر کاشت‌کاری میں کیوں پھنس گئے ہیں؟ وہ اپنی مزدور ذہنیت اور اپنی کسان کی حیثیت دونوں کو کیسے ایک ساتھہ قائم رکھہ سکتے ہیں؟»

ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو یہ سوال بہت ناگوار گزرا اور کسی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا:

«آخر سیدھے سادے الفاظ میں کیوں نہیں بات کہتے کہ سب کی سمجھہ میں آ سکے۔ قابلیت جھاڑنے کے لئے کوئی اور موقع نہیں ملتا...»

لیکن آرتیم نے سوال کا جواب بھی دینا شروع کر دیا تھا:

«ساتھیوں، رہنے دیجئے۔ یہ لڑکا ٹھیک ہی کہتا ہے کہ میں کاشت‌کاری کے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ یہ بات تو سچ ہے لیکن میں نے اپنے مزدور ضمیر کے ساتھہ غداری نہیں کی ہے۔ خیر کچھہ بھی ہو لیکن آج سے وہ سلسلہ بالکل ختم ہو جائیگا۔ میں اپنے بال بچوں کو یہاں یارڈ سے قریب لاکر رکھوں‌گا۔ یہاں کا ماحول بہتر ہے۔ وہ کمبخت کاشت‌کاری تو بہت عرصے سے میرے گلے میں پھندے کی طرح پڑی ہوئی ہے۔»

آرتیم نے جب اپنے حق میں ہاتھوں کا ایک ہجوم اوپر اٹھا ہوا دیکھا تو اس کا دل ایک بار پھر کانپ اٹھا اور فخر سے سر

اونچا کئے ہوئے وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسکے قدم بہت ہلکے پڑ رہے ہیں گویا اس کے سر سے کوئی بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اپنے پیچھے اس نے سروتینکو کو اعلان کرتے ہوئے سنا «سب حق میں ہیں۔»

تیسرا نمبر زاخار بروژاک کا تھا۔ وہ آکر مجلس صدارت کی میز کے پاس کھڑا ہو گیا۔ پہلے وہ انجن ڈرائیور پولینتوفسکی کی مدد کرتا تھا لیکن ادھر کچھ دنوں سے یہ خاموش طبیعت بوڑھا آدمی خود انجن چلانے لگا تھا۔ جب وہ اپنی محنت و مشقت کی زندگی کی داستان ختم کر چکا اور موجودہ زمانے کے حالات بیان کرنے لگا تو اس کی آواز ڈوب گئی اور وہ دھیمی آواز میں بولنے لگا لیکن پھر بھی وہ اتنی اونچی تھی کہ سب لوگ سن سکتے تھے:

«یہ میرا فرض ہے کہ جو کام میرے بچوں نے شروع کیا تھا اسے میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو کبھی اس بات کو پسند نہ کرتے کہ میں اپنا غم لیکر ایک کونے میں منھہ چھپائے پڑا رہوں۔ انہوں نے اپنی جانیں اس لئے قربان نہیں کی تھیں۔ انکی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پر کرنے کی میں نے کوئی کوشش نہیں کی ہے، لیکن اب ہمارے رہنما کی موت نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ میری گذشتہ زندگی ایسی کیوں رہی۔ آج سے ہماری نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔»

دل میں غمگین یادیں تازہ ہو جانے کی وجہ سے زاخار کا چہرہ اداس ہو گیا اور وہ بہت گمبھیر نظر آنے لگا۔ لیکن جب اسے پارٹی میں داخل ہونے کی منظوری دینے کے لئے ہاتھوں کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس کا سفید ہوتے ہوئے بالوں والا سر اب جھکا ہوا نہیں تھا۔

پارٹی میں بھرتی ہونے کی عرضی دینے والوں کے معاملے پر بہت رات گئے تک غور کیا جاتا رہا ۔ جو بہترین لوگ تھے صرف انہیں کو بھرتی کیا گیا — جنہیں سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے اور جنکے ماضی پر کسی قسم کا داغ نہیں تھا ۔

لینن کی موت نے لاکھوں مزدوروں کو بالشویک بنا دیا ۔ وہ رھنما اب ان کے درمیان سے اٹھہ گیا تھا لیکن پارٹی کی صفوں میں کوئی انتشار پیدا نہیں ھوا ۔ جس پیڑ کی جڑیں مضبوطی سے زمین میں جمی ھوئی ھوں وہ پھنگی کے کٹ جانے سے سوکھہ نہیں جاتا ۔

چھٹا باب

ھوٹل کے ناچ گانے کے کمرے کے دروازے پر دو آدمی کھڑے تھے ۔ ان میں لمبا والا شخص بغیر کمانی کا چشمہ لگائے ھوئے تھا اور اسکے بازو پر ایک سرخ بلا لگا تھا جس پر لکھا تھا «کمانڈنٹ» ۔

«کیا یوکرینی ڈیلیگیشن کی میٹنگ یہیں ھو رھی ھے؟» ریتا نے پوچھا ۔

«ھاں» اس لمبے شخص نے خالصتاً رسمی انداز میں جواب دیا ۔ «آپ کس کام سے آئی ھیں، کامریڈ؟»

اس لمبے شخص نے راستہ روک کر ریتا کو سر سے پاؤں تک دیکھا ۔

«آپ کے پاس کیا ڈیلیگیٹ کا کارڈ ھے؟»

ریتا نے اپنا کارڈ نکال کر دکھایا جس پر ابھرے ھوئے سنہرے حروف میں لکھا تھا «ممبر مرکزی کمیٹی» اور کارڈ دیکھتے ھی اس شخص کے لہجے میں فوراً نرمی اور خوش اخلاقی آ گئی ۔

«جائیے کامریڈ ۔ ادھر بائیں طرف کچھہ کرسیاں خالی ھیں ۔»

ریتا کرسیوں کی قطاروں کے درمیان والے راستے سے ہوکر ایک خالی کرسی پر جاکر بیٹھ گئی۔

ظاہر تھا کہ میٹنگ ختم ہونے کے قریب تھی کیونکہ صدر میٹنگ کی کارروائی کا خلاصہ بیان کر رہے تھے۔ انکی آواز ریتا کو کچھ جانی پہچانی معلوم ہوئی۔

«کل روس کانگریس کی کونسل کا چناؤ اب مکمل ہو گیا ہے۔ کانگریس کی کارروائی دو گھنٹے بعد شروع ہونے والی ہے۔ اس عرصے میں میں آپ کے سامنے ڈیلیگیٹوں کی فہرست ایک بار پھر پڑھ کر سنا دینا چاہتا ہوں۔»

یہ آکم کی آواز تھی۔ ریتا بڑے غور سے اسے جلدی جلدی فہرست پڑھتے ہوئے سن رہی تھی۔ جس ڈیلیگیٹ کا نام پکارا جاتا تھا وہ اپنا ہاتھ اٹھاکر اپنا سفید یا سرخ رنگ کا پاس دکھاتا تھا۔

یک بیک ریتا کو ایک جانا پہچانا نام سنائی دیا — پانکراتوف۔

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک ہاتھ اوپر اٹھ گیا لیکن درمیان کی قطاروں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی وجہ سے وہ اس جہازی مزدور کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔ ناموں کا سلسلہ جاری رہا اور ریتا کو پھر ایک نام سنائی دیا جس سے وہ مانوس تھی — آکونیف اور اسکے فوراً ہی بعد ایک اور — ژارکی۔

تمام ڈیلیگیٹوں پر نظر دوڑاتے وقت اسکی نظریں ژارکی پر پڑیں۔ وہ تھوڑی ہی دور پر بیٹھا تھا اور اسکا چہرہ ریتا کی طرف آدھا مڑا ہوا تھا۔ ہاں۔ وہ وانیا ہی تھا۔ وہ اس کی صورت تقریباً بھول ہی گئی تھی۔ اسے دیکھے ہوئے کئی برس بھی تو بیت گئے تھے۔

نام حسب دستور پکارے جاتے رہے۔ پھر آکم نے ایک نام پکارا جسے سن کر ریتا چونک پڑی:

«کورچاگن!»

اگلی قطاروں میں بہت دور پر ایک ہاتھہ اٹھا اور فوراً نیچے گر گیا اور تعجب کی بات تو یہ تھی کہ ریتا کے دل میں اس شخص کا چہرہ دیکھنے کی ایک پردرد خواہش پیدا ہوئی جس کا نام وہی تھا جو اس کے بچھڑے ہوئے ساتھی کا تھا ـ وہ اس مقام کی طرف سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکی جہاں وہ ہاتھہ اٹھا تھا لیکن اس کے آگے کی قطاروں میں تمام لوگوں کے سر یکساں نظر آ رہے تھے ـ ریتا اٹھی اور بیچ کے راستے سے اگلی قطاروں کی طرف چل دی ـ اسی وقت آکم نے فہرست پڑھنا ختم کیا ـ کافی شور و غل کے ساتھہ کرسیاں پیچھے کھسکائی جانے لگیں اور ہال آوازوں کی گونج اور نوجوانوں کے قہقہوں سے بھر گیا ـ اس شور و غل میں اپنی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچانے کے لئے آکم نے چیخ کر کہا:

«بالشوئی تھیٹر... سات بجے ـ دیکھئے کوئی دیر سے نہ پہنچے!»

ہال سے باہر نکلنے کا ایک ہی دروازہ تھا ـ تمام ڈیلیگیٹ اسی پر بھیڑ لگاکر کھڑے ہو گئے ـ ریتا نے دیکھا کہ اس ھجوم میں تو وہ اپنے کسی بھی پرانے ساتھی کو نہیں ڈھونڈ پائیگی ـ قبل اس کے کہ وہ چلا جائے اسے آکم کو پکڑنا چاہئے ـ وہ دوسروں کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کر سکیگا ـ اسی وقت ڈیلیگیٹوں کا ایک گروہ کرسیوں کی قطاروں کے درمیان والے راستے میں اس کے قریب سے گزرتا ہوا باہر نکلنے کے دروازے کی طرف چل دیا ـ اس نے کسی کو کہتے سنا:

«چلو یار کورچاگن ہم لوگ بھی نکل چلیں!»

اور پھر ایک آواز نے، جو اتنی مانوس، اتنی ناقابل فراموش تھی، جواب دیا:

«اچھی بات ہے ـ آؤ چلیں!»

ریتا نے جلدی سے مڑکر دیکھا ـ اس کے سامنے ایک لمبا سا

سانولے رنگ کا نوجوان خاکی ٹیونک پر پتلی سی کاکیشائی پیٹی لگائے، نیلے رنگ کی گھوڑ سواروں والی برجس پہنے کھڑا تھا۔

ریتا اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گرد اس کی باہوں کا لمس محسوس کیا اور اسکی کانپتی ہوئی آواز کو نرم لہجے میں کہتے سنا: «ریتا!» اور وہ پہچان گئی کہ وہ پاویل کورچاگن ہی تھا۔

«تو تم زندہ ہو؟»

اسکے ان الفاظ نے پاویل کو سب کچھ سمجھا دیا۔ تو اس کو سچ مچ اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کی موت کی خبر غلط تھی۔

ہال بہت دیر ہوئی خالی ہو چکا تھا، اور شہر کی شہرگ تویرسکایا اسٹریٹ کی چہل پہل کا شورغل کھڑکی کے راستے ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ گھڑی نے چھ بجائے لیکن ان دونوں کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کی ملاقات ابھی ایک لمحہ پہلے ہی ہوئی ہو۔ لیکن گھڑی انہیں مسلسل بالشوئی تھیٹر کی یاد دلا رہی تھی۔ چوڑے زینے سے نیچے اتر کے دروازے کی طرف جاتے وقت اس نے ایک بار پھر پاویل کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ اب اتنا لمبا ہوگیا تھا کہ ریتا اس کے کندھے کے برابر آتی تھی، اور اس میں پختگی اور سنجیدگی بھی زیادہ آ گئی تھی، لیکن باقی ہر اعتبار سے وہ وہی پرانا پاویل تھا جسے وہ ایک زمانے میں جانتی تھی۔

«میں نے تم سے ابھی تک یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کہاں کام کر رہے ہو» اس نے کہا۔

«میں کومسومول کی حلقہ کمیٹی کا سکریٹری ہوں جسے دوباوا ،محض قلم گھسنے والا، کہےگا» پاویل نے مسکرا کر جواب دیا۔

«تم اس سے ملے؟»

«هاں میں ملا تھا اور وہ ملاقات میرے لئے ایک تلخ یادگار ہے۔»

وہ دونوں سڑک پر نکل آئے۔ موٹریں هارن بجاتی ہوئی انکے قریب سے گزر رہی تھیں اور سڑک کی پٹڑیوں پر شور مچاتے اور دھکم دھکا کرتے ہوئے لوگوں کے ہجوم لگے ہوئے تھے۔ تھیٹر کے راستے میں ان دونوں نے ایک دوسرے سے تقریباً ایک لفظ بھی نہ کہا۔ دونوں ایک ہی بات کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جس وقت وہ تھیٹر پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ لوگوں کا ایک طوفانی لہریں لیتا ہؤا سمندر ہال کو گھیرے کھڑا ہے اور دروازوں پر پہرہ دینے والے سرخ فوج کے سپاہیوں کی صفوں کو توڑکر کسی طرح اندر گھس جانے کی کوشش میں تھیٹر کی پتھر کی ٹھوس دیواروں سے ٹکرلے رہا ہے۔ لیکن سنتری صرف ڈیلیگیٹوں کو ہی اندر داخل ہونے دیتے تھے جو بڑی شان کے ساتھہ اپنی سندیں دکھاتے ہوئے سپاہیوں کی صف کو پار کرکے ہال میں چلے جاتے تھے۔

یہ کومسومول کے نوجوانوں کا مجمع تھا جو کانگریس کے افتتاحیہ جلسے کا ٹکٹ حاصل نہیں کر سکے تھے لیکن جو ہر قیمت پر کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہونے پر تلے ہوئے تھے۔ انہیں نوجوانوں کا سمندر ہال کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نسبتاً پھرتیلی قسم کے کچھہ نوجوان ڈیلیگیٹوں کی ٹولیوں کے بیچ میں گھس کر سرخ رنگ کے کاغذ کا کوئی ٹکڑا دکھاکر کبھی کبھی ہال کے دروازے تک پہنچ جانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔

کچھہ تو ہال کے اندر تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو جاتے تھے لیکن وہاں وہ ڈیوٹی پر تعینات مرکزی کمیٹی کے آدمی کو یا کمانڈنٹ کو دھوکا نہیں دے پاتے تھے جو مہمانوں اور ڈیلیگیٹوں

کو انکی مقررہ جگہوں پر لے جاکر بٹھا رہے تھے۔ اور پھر جب وہ بےآبرو ہوکر وہاں سے نکال دئے جاتے تو «بغیر ٹکٹ والوں» کی برادری کے باقی لوگوں کو بیحد خوشی ہوتی تھی۔

جتنے لوگ ہال میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے انکا ایک چھوٹا سا حصہ بھی ہال میں نہیں سما سکتا تھا۔

ریتا اور پاویل بڑی مشکل سے دھکا دیتے ہوئے کسی طرح ہال کے دروازے تک پہنچے۔ ڈیلیگیٹ جوق در جوق چلے ہی آ رہے تھے۔ کچھہ ٹراموں پر اور کچھہ موٹروں پر۔ دروازے پر انکی بہت بڑی بھیڑ لگ گئی تھی اور سرخ فوج کے سپاہی جو خود کومسومول تنظیم کے ممبر تھے، ان کے اور دیوار کے درمیان پسے جا رہے تھے۔ اسی وقت دروازے کے قریب کھڑے ہوئے هجوم میں سے کسی نے زور سے چلاکر کہا:

«باؤمان ضلع والوں، لگا ڈالو کس کے زور!»

«ہاں جوانوں۔ ذرا اور زور لگا کے۔ ہم جیت رہے ہیں!»

«ہرا!»

دروازے میں پاویل اور ریتا کے ساتھہ کومسومول کا بلا لگائے ہوئے ایک چمکدار آنکھوں والا نوجوان بھی داخل ہؤا اور کمانڈنٹ کی نظر بچا کر وہ سیدھا زینے کے نیچے کی نشستوں کی طرف چل دیا۔ ایک لمحے بعد ہی وہ مجمع میں نہ جانے کہاں کھو گیا۔

«آؤ یہاں بیٹھیں» ریتا نے سامنے کی نشستوں کے پیچھے ایک کونے کی دو خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جب وہ دونوں بیٹھہ گئے تو ریتا نے کہا۔ «میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ اس کا تعلق گزرے ہوئے زمانے سے ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تم جواب دینے سے انکار نہ کروگے۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت تم نے میرے ساتھہ پڑھنا کیوں بندکر دیا تھا اور دوستی کیوں ختم کر دی تھی؟»

حالانکہ جس وقت سے ان کی ملاقات ہوئی تھی اسی وقت سے پاویل اس سوال کا انتظار کر رہا تھا لیکن سوال سن کر وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور پاویل سمجھ گیا کہ ریتا جانتی ہے۔

«ریتا، میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا جواب تم خود جانتی ہو۔ وہ تین سال پہلے کی بات ہے اور اب میں پاؤکا کی اس حرکت کی مذمت ہی کر سکتا ہوں۔ دراصل کورچاگن نے اپنی زندگی میں بہت سی فاش غلطیاں کی ہیں، چھوٹی بھی اور بڑی بھی، وہ انہیں میں سے ایک تھی۔»

ریتا مسکرا دی۔

«تمہید تو اچھی باندھی ہے۔ مگر جواب بھی تو سنوں!»

«قصور صرف میرا نہیں تھا» پاویل نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ «اس میں «دی گیڈفلائی» کا بھی قصور تھا۔ اس کی انقلابی رومان پسندی کا۔ اس زمانے میں ایسی کتابیں مجھے بہت متاثر کرتی تھیں جن میں ہمارے نصب‌العین کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے والے ثابت قدم، باہمت انقلابیوں کے بڑے دل‌نشین تذکرے ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے مجھ پر بڑا گہرا نقش ڈالا تھا اور میری دلی خواہش یہی تھی کہ میں بھی ان جیسا بن سکوں۔ تمہارے لئے اپنے جذبات میں بھی میں نے «دی گیڈفلائی» کو اثر انداز ہونے کا موقع دیا۔ اب مجھے وہ تمام واقعہ ایک حماقت معلوم ہوتا ہے اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے اس بات کا کتنا ملال ہے۔»

«تو کیا تم نے «دی گیڈفلائی» کے بارے میں اپنی رائے بدل دی ہے؟»

«نہیں ریتا بنیادی طور پر میری رائے اب بھی وہی ہے۔ میں نے صرف قوت ارادی کا امتحان لینے کے تکلیف دہ طریق عمل

کی غیرضروری خودآزاری کو ترک کر دیا ہے۔ «دی گیڈفلائی» میں جو چیز سب سے اہم ہے یعنی اس کی ہمت، اس کی غیر معمولی قوت برداشت اس کا میں اب تک قائل ہوں۔ میں ابھی تک اس شخص کا قائل ہوں جو اپنی تکلیف کا ہر ایک کے سامنے ڈھنڈورا پیٹے بغیر اسے خاموشی سے برداشت کر سکے۔ میں ایسے انقلابی کا قائل ہوں جو اپنی ذاتی زندگی کو پورے سماج کی زندگی کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہ دیتا ہو۔»

«پاویل، بڑا افسوس ہے کہ تم نے یہ سب کچھ تین سال پہلے نہیں کہا» ریتا نے اس طرح مسکراکر کہا جس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے خیالات کہیں بہت دور بھٹک رہے ہیں۔

«ریتا تمہارا مطلب ہے کہ تمہیں اس بات کا افسوس ہے کہ میں تمہارے لئے ایک ساتھی سے زیادہ کچھ نہ بن سکا؟»

«نہیں پاویل، تم میرے لئے اس سے بھی زیادہ کچھ بن سکتے تھے۔»

«لیکن اس کا تو یقیناً اب بھی تدارک ہو سکتا ہے۔»

«نہیں کامریڈ گیڈفلائی۔ اب اس کے لئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے اب ایک چھوٹی سی بچی ہے» ریتا نے مسکراتے ہوئے اسے سمجھایا۔ «مجھے اس کے باپ سے بہت لگاؤ ہے۔ مجموعی طور پر ہم تینوں بہت اچھے دوست ہیں اور کم سے کم ابھی تک یہی صورت ہے کہ ہم تینوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔»

اس کی انگلیوں نے پاویل کے ہاتھ کو چھوا۔ یہ حرکت اس نے پاویل کے لئے فکرمندی کے جذبے کے تحت کی تھی لیکن اس نے فوراً ہی محسوس کیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں۔ اس میں ان پچھلے تین سالوں میں کافی پختگی آ گئی تھی، اور صرف جسمانی طور پر ہی نہیں۔ وہ اس کی آنکھوں سے ہی

بتا سکتی تھی کہ اسے ریتا کے اس انکشاف سے بہت تکلیف ہوئی تھی لیکن اس نے صرف اتنا کہا:

«ابھی میں نے جو کچھ کھویا ہے اسکے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ ہے جو میرے پاس اب بھی بچ گیا ہے» اور ریتا جانتی تھی کہ یہ محض کھوکھلی لفاظی نہیں تھی یہ سیدھی سادی حقیقت تھی۔

اب وقت قریب آ گیا تھا کہ وہ اسٹیج کے قریب اپنی جگہوں پر جاکر بیٹھ جائیں۔ وہ اٹھے اور اس قطار کی طرف چل دئے جہاں یوکرینی ڈیلیگیٹ بیٹھے تھے۔ بینڈ بجنا شروع ہؤا۔ ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لگی ہوئی سرخ جھنڈیوں پر جلی حروف میں لکھا ہؤا تھا: «مستقبل ہمارا ہے!» اس عظیم الشان تھیٹر میں ہزاروں لوگوں کا مجمع تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں لوگ بیٹھ سکتے ہوں اور بیٹھے نہ ہوں۔ یہ ہزاروں لوگ مل‌کر ایک ایسی طاقتور تنظیم بن گئے تھے جس میں بے پناہ جوش اور توانائی تھی۔ ملک کی عظیم صنعتی برادری کی نئی پود کے بہترین فرزند وہاں جمع ہوئے تھے۔ بھاری پردے پر جلی حروف میں لکھے ہوئے الفاظ کی چمک ان ہزاروں آنکھوں میں بھی نظر آ رہی تھی۔ «مستقبل ہمارا ہے!» اور وہ انسانی سمندر ابھی تک اندر امڈا چلا آ رہا تھا۔ چند لمحے بعد مخمل کا بھاری پردہ ہٹےگا اور روسی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا سکریٹری اس اہم موقعے پر ایک لمحے کے لئے اپنا ضبط کھوکر کچھ گھبراہٹ کے ساتھ اعلان کرےگا:

«میں روسی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی چھٹی کانگریس کا افتتاح کرتا ہوں۔»

اس سے پہلے کبھی پاویل کورچاگن کو انقلاب کی عظمت اور طاقت کا احساس اتنی شدت اور گہرائی کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ اور اس خیال سے اس کے جسم میں فخر اور خوشی کی ایک

ناقابل اظہار لہر دوڑ گئی کہ زندگی اسے — اس مجاهد اور معمار کو — بالشویکوں کی نئی پود کے اس فاتحانہ اجتماع میں لے آئی تھی۔

صبح سے لیکر رات تک کا تمام وقت کانگریس کی سرگرمیوں میں گزر جاتا تھا۔ اسلئے صرف کانگریس کے خاتمے کے قریب ھی پاویل کی ریتا سے دوبارہ ملاقات ھو سکی۔ وہ یوکرینی ڈیلیگیٹوں کے ایک گروہ کے ساتھہ تھی۔

«میں کل کانگریس ختم ھوتے ھی چلی جاؤنگی» اس نے پاویل سے کہا۔ «معلوم نہیں مجھے اب تم سے بات کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے اس لئے میں نے اپنی ڈائری کی دو پرانی نوٹ بکیں تمہارے لئے تیار کردی ھیں اور انکے ساتھہ ھی ایک چھوٹا سا پرچہ بھی لکھہکر رکھہ دیا ھے۔ انہیں پڑھہکر ڈاک سے میرے پاس واپس بھیج دینا۔ میں تمہیں جو کچھہ نہیں بتا سکی ھوں وہ سب اس ڈائری سے معلوم ھو جائیگا۔»

پاویل نے اس کا ھاتھہ دبایا اور بڑی دیر تک اسے نظر جمائے دیکھتا رہا گویا اس کے خط و خال ذھن نشین کر رہا ھو۔

وعدے کے مطابق وہ دونوں دوسرے دن بڑے پھاٹک پر ملے اور ریتا نے اسے ایک پیکٹ اور ایک بند لفافہ دیا۔ وہ وھاں تنہا نہیں تھے اس لئے وہ جی کھولکر ایک دوسرے سے رخصت نہ ھو سکے لیکن پاویل نے اس کی نمناک آنکھوں میں محبت کا ایک شدید جذبہ دیکھا جس میں غم کی آمیزش بھی تھی۔

دوسرے دن ریل گاڑیاں انہیں مختلف سمتوں میں لےکر چلی گئیں۔ جس گاڑی سے پاویل سفر کر رہا تھا اسکے کئی ڈبوں میں یوکرینی ڈیلیگیٹ بیٹھے ھوئے تھے۔ وہ کیئف کے کچھہ ڈیلیگیٹوں کے ساتھہ ایک ڈبے میں بیٹھا تھا۔ شام کے وقت جب باقی تمام مسافر سونے کے لئے لیٹ گئے اور پاس والی سیٹ پر آکونیف مزے سے خراٹے بھرنے لگا تو پاویل نے لیمپ قریب کھسکاکر خط کھولا۔

«پاویل میرے محبوب!

میں تم سے یہ تمام باتیں اس وقت بھی کہہ سکتی تھی جب ہم ساتھہ تھے، لیکن یہی بہتر ہے کہ میں خط کے ذریعہ تم سے یہ باتیں کہوں۔ میں صرف ایک بات چاہتی ہوں کہ کانگریس سے قبل ہم دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ تمہارے دل کا زخم بن کر نہ رہ جائے۔ میں جانتی ہوں کہ تم مضبوط آدمی ہو اور مجھے پکا یقین ہے کہ اس وقت تم نے جو کچھہ کہا تھا وہ سچے دل سے کہا تھا۔ زندگی کی طرف میرا رویہ سخت اصولوں میں جکڑا ہؤا نہیں ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ انسان اپنے ذاتی تعلقات میں کبھی کبھی مقررہ ڈگر سے ہٹ بھی سکتا ہے۔ لیکن بہت ھی شاذ و نادر موقعوں پر اور بشرطیکہ ان تعلقات کی بنیاد سچے اور گہرے لگاؤ پر ہو۔ میں تمہارے لئے ایک بار کو مقررہ ڈگر سے ہٹ سکتی تھی لیکن میں نے جوانی کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے جذبے کو رد کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں ہم دونوں میں سے کسی کو بھی سچی خوشی حاصل نہ ہوتی۔ پھر بھی تمہیں اپنے ساتھہ اتنا ظلم نہ کرنا چاہئے، پاویل۔ ہماری زندگی میں صرف جد و جہد ھی نہیں ہے اس میں خوشی کی بھی گنجائش ہے۔ وہ خوشی جو سچی محبت سے حاصل ہوتی ہے۔

جہاں تک باقی تمام باتوں کا سوال ہے، تمہاری زندگی کے بنیادی مقصد کا سوال ہے، میں تمہاری طرف سے بالکل مطمئن ہوں۔ میں دلی خلوص کے ساتھہ تم سے رخصت ہوتی ہوں۔

تمہاری ریتا۔»

پاویل نے خیالات میں گم ہوکر خط پھاڑ ڈالا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھڑکی کے باہر نکالا اور اسے محسوس ہوا کہ ہوا کے جھونکوں نے کاغذ کے پرزوں کو اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

صبح تک اس نے ریتا کی ڈائری کی دونوں جلدیں پڑھ ڈالیں اور ڈاک میں ڈالنے کے لئے ان کا ایک پیکٹ بنا دیا۔ خارکوف میں وہ آکونیف اور پانکراتوف اور چند دوسرے ڈیلیگیٹوں کے ساتھ گاڑی سے اتر گیا۔ آکونیف تالیا کو لینے کیئف جا رہا تھا۔ وہ وہاں آنا کے ساتھ کچھ دن رہنے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ پانکراتوف کو بھی، جو یوکرینی کومسومول کی مرکزی کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا تھا، کیئف میں کچھ کام تھا۔ پاویل نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ جاکر کیئف میں ژارکی اور آنا سے مل آئے۔

کیئف اسٹیشن کے ڈاکخانے سے جب وہ ریتا کو پارسل بھیج کر نکلا تو باقی لوگ جا چکے تھے۔ اس لئے وہ اکیلا ہی چل پڑا۔ ٹرام اس مکان کے بالکل سامنے جاکر رکی جہاں آنا اور دوباوا رہتے تھے۔ پاویل سیڑھیاں چڑھ کے دوسری منزل پر پہنچا اور بائیں طرف والے دروازے پر دستک دی۔ وہ آنا کا کمرہ تھا۔ لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ اتنی جلدی وہ کام پر تو جا نہیں سکتی۔ «وہ سو رہی ہوگی» اس نے سوچا۔ برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور نیند میں آنکھیں ملتا ہوا دوباوا باہر نکلا۔ اس کا چہرہ راکھ کی طرح پھیکا پڑ گیا تھا اور اسکی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ اس کے منہہ سے پیاز کی بو آ رہی تھی اور پاویل کی تیز ناک میں شراب کا بھبکا بھی آیا۔ ادھ کھلے دروازے سے اس نے بستر پر لیٹی ہوئی کسی عورت کی بھری ہوئی پنڈلیوں اور شانوں کی ایک جھلک دیکھی۔

دوباوا نے اس کی نظر کا رخ دیکھ‌کر پیر کی ٹھوکر سے دروازہ بند کر دیا۔

«کامریڈ بورھارٹ سے ملنے آئے ھونگے ۔ کیوں؟» اس نے پاویل سے نظریں نہ ملاتے ھوئے بیٹھی ھوئی آواز میں پوچھا ۔ «وہ اب یہاں نہیں رھتی ۔ تمہیں نہیں معلوم تھا؟»

کورچاگن کے چہرے پر سختی تھی ۔ اس نے تیز متلاشی نگاھوں سے دوباوا کو دیکھا ۔

«نہیں مجھے معلوم نہیں تھا ۔ کہاں گئی ھے؟»

دوباوا یک بیک آپے سے باھر ھو گیا ۔

«مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں!» اس نے چلاکر کہا ۔ پھر اس نے ڈکار لیکر دبے ھوئے طنز اور کینے کے ساتھہ کہا: «اسے تسلی دینے آئے تھے نا؟ جگہ بھرنے کے لئے بڑے وقت سے آئے ھو ۔ تمہارے لئے موقع بہت اچھا ھے ۔ فکر نہ کرو ۔ وہ تمہیں رد نہیں کریگی ۔ اس نے مجھہ سے کئی بار کہا بھی تھا کہ وہ تمہیں بہت پسند کرتی ھے... الفاظ تو مجھے یاد نہیں یہ بیوقوف عورتیں نہ جانے کس طرح اس خیال کو ادا کرتی ھیں ۔ جاؤ جلدی جاؤ ۔ یہی بہترین موقع ھے ۔ ابھی لوھا گرم ھے ایک ھی چوٹ میں ھموار ھو جائیگا ۔ بڑی اچھی جوڑی رھیگی ۔ اور یہ اصلی معنی میں بہترین روحانی اور جسمانی اتصال رھےگا ۔»

پاویل کا خون کھول اٹھا ۔ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو رکھہ کر اس نے دھیمی آواز میں کہا:

«متییائی ۔ تم اپنا کیا حال کر رھے ھو! مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنا گر جاؤگے ۔ پہلے تو تم اتنے برے نہیں تھے ۔ تم آخر اپنے آپ کو تباہ کیوں کر رھے ھو؟»

دوباوا دیوار کا سہارا لگاکر کھڑا ھو گیا ۔ سیمنٹ کا فرش اسکے ننگے پاؤں کو سرد معلوم ھو رھا تھا کیونکہ وہ بری طرح کانپ رھا تھا ۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور سوجی ھوئی آنکھوں اور پھولے پھولے گالوں والی ایک عورت نے جھانک کر دیکھا ۔

«جان من اندر آجاؤ۔ آخر وهاں باهر کهڑے کهڑے کیا کر رهے هو؟»

قبل اسکے که وه اور کچهه کہتی دوباوا نے دروازه بندکر دیا اور اس کا سہارا لگاکر کهڑا هو گیا۔

«کیا ابتدا کی هے تم نے اپنی نئی زندگی کی» «پاویل نے اپنی رائے ظاهر کی۔ «ذرا سوچو تو که تم کس قسم کی صحبت میں پڑ گئے هو۔ آخر اس کا کیا انجام هوگا؟»

لیکن دوباوا اور کچهه سننے کو تیار نہیں تها۔

«اچها تو آپ مجهے یه مشوره دینگے که میں کس عورت کے ساتهه سوؤں اور کس کے ساتهه نه سوؤں؟» اس نے چلاکر کہا۔ «میں تمہاری نصیحت بہت سن چکا۔ اب چپ چاپ الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ! جاکر سب سے کہه دو که دوباوا شراب پیتا هے اور فاحشه عورتوں کے ساتهه سوتا هے۔»

پاویل اس کے اور قریب چلا گیا اور دبے هوئے جذبات سے پر لہجے میں بولا:

«متیائی اس عورت کو یہاں سے چلتا کرو۔ میں تم سے کچهه باتیں کرنا چاهتا هوں۔ آخری بار...»

دوباوا کے چہرے پر سیاهی چها گئی۔ وه فوراً پیچهے گهوما اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے میں واپس چلا گیا۔

«سؤر کہیں کا!» پاویل نے زیرلب کہا اور دهیرے دهیرے سیڑهیوں پر سے نیچے اتر گیا۔

دو سال گزر گئے۔ ایک ایک کرکے دن اور مہینے بےرحم وقت کی نذر هوتے گئے لیکن زندگی کے تیز رو کارواں نے اپنی رنگینیوں سے اس غیردلچسپ یکسانیت میں ایسا ایک انوکهاپن پیدا کر دیا که کوئی دو دن ایک سے نہیں هوتے تهے۔ سوله کروڑ عوام

کی عظیم قوم، وہ قوم جس نے دنیا میں سب سے پہلے اپنے وسیع ملک اور اسکی بےاندازہ دولت کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھہ میں لے لیا تھا، اپنی جنگ کے ہاتھوں بربادشدہ معیشت کی بحالی کے نہایت دشوار کام میں جٹی ہوئی تھی۔ ملک دن بدن مضبوط ہوتا گیا۔ اسکی رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا اور بند کارخانوں کا مایوس‌کن منظر جنکی چمنیوں نے دھواں اگلنا بند کر دیا تھا، اب ہمیشہ کے لئے مٹ گیا تھا۔

پاویل کے وہ دو سال مسلسل کام کی سرگرمیوں میں دیکھتے دیکھتے گزر گئے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو زندگی عیش و آرام میں گزار دیتے ہیں، جو صبح کے وقت نہایت اطمینان سے جمائی لیتے ہوئے اٹھتے ہیں اور رات کو دس بجتے ہی سو جاتے ہیں۔ اسکی زندگی ایک تندرو دھارے کی طرح تھی۔ وہ نہ خود ایک لمحہ برباد کرتا تھا اور نہ کسی اور کو برباد کرنے دیتا تھا۔

وہ سونے میں کم سے کم وقت صرف کرتا تھا۔ اکثر اسکی کھڑکی میں بہت رات گئے تک روشنی نظر آتی تھی اور اندر ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے کچھہ لوگ پڑھائی میں مصروف ہوتے تھے۔ گذشتہ دو برس میں انہوں نے «سرمایہ» کی تیسری جلد کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور سرمایہ‌دار نظام کی لوٹ کھسوٹ کی تمام باریک پیچیدگیاں ان کی سمجھہ میں آ گئی تھیں۔

رازوالیخین بھی اب اسی حلقے میں آ گیا تھا جہاں کورچاگن کام کرتا تھا۔ گبرنیا کمیٹی نے اسے اس سفارش کے ساتھہ بھیجا تھا کہ اسے کومسومول کی کسی ضلع تنظیم کا سکریٹری مقرر کر دیا جائے۔ جب رازوالیخین وہاں پہنچا اس وقت پاویل کہیں گیا ہؤا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں بیورو نے اس نووارد کو ایک ضلع میں تعینات کر دیا۔ واپس آنے پر جب پاویل کو معلوم ہؤا تو اس نے کچھہ بھی نہ کہا۔

ایک ماہ بعد پاویل ایک دن اچانک رازوالیخین کے ضلع میں پہنچ گیا۔ وہاں اسے اس کے خلاف کوئی زیادہ ثبوت تو نہیں ملے لیکن جتنے بھی ملے وہ اسکی قلعی کھولنے کے لئے کافی تھے۔ نیا سکریٹری شراب پیتا تھا۔ اس نے اپنے گرد چاپلوسوں کا ایک گروہ جمع کر رکھا تھا اور وہ ایماندار اور پرخلوص ممبروں کو اپنی پہل قدمی کا ثبوت دینے کا موقع ھی نہیں دیتا تھا۔ پاویل نے یہ تمام ثبوت بیورو کے سامنے پیش کئے اور جب میٹنگ نے یہ رائے ظاہر کی کہ رازوالیخین کو سختی سے ڈانٹ دیا جائے تو پاویل نے کھڑے ہوکر ایک ایسی تجویز پیش کی جس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

«میری تجویز ھے کہ اسے تنظیم سے نکال دیا جائے اور یہ فیصلہ آخری اور قطعی ہو۔»

اس تجویز پر باقی لوگ حیران رہ گئے۔ ان حالات میں یہ سزا بہت ھی سخت معلوم ھوتی تھی۔ لیکن پاویل اپنی بات پر اڑا رہا۔

«اس بدمعاش کو نکال ھی دینا چاھئے۔ اسے اس بات کا پورا موقع تھا کہ وہ شریف اور معقول انسان بن سکے لیکن وہ کومسومول میں رہ‌کر بھی بیرونی آدمی بنا رہا ھے» اور پاویل نے بیورو کے سامنے بریزدوف والا واقعہ بیان کیا۔

«میں احتجاج کرتا ھوں» رازوالیخین نے چلاکر کہا۔ «کورچاگن مجھہ سے اپنا ذاتی جھگڑا چکانے کی کوشش کر رہا ھے۔ اس نے جو کچھہ بھی کہا ھے وہ سراسر جھوٹ ھے۔ میں کہتا ھوں کہ وہ اپنی بات کے ثبوت میں واقعات اور دستاویزات پیش کرے۔ فرض کر لیجئے کہ میں آپ کے پاس یہ شکایت لیکر آؤں کہ کورچاگن چوری سے مال کی درآمد برآمد میں حصہ لیتا ھے تو کیا آپ محض میرے کہنے پر اسے نکال دینگے؟ اسے تحریری ثبوت پیش کرنے ھونگے۔»

«گھبراؤ نہیں، میں تمام ضروری ثبوت پیش کرونگا» کورچاگن نے جواب دیا۔

رازوالیخین کمرے سے اٹھ‌کر چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کے اندر پاویل نے بیورو کو یہ تجویز منظور کرنے پر راضی کر لیا کہ رازوالیخین کو بیرونی اور مکروہ عنصر قرار دیکر کومسومول سے نکال دیا جائے۔

گرمیاں آئیں اور انکے ساتھ ھی چھٹیوں کے دن بھی۔ ایک ایک کرکے پاویل کے سب ساتھی چھٹیاں منانے چلے گئے۔ سال بھر کی سخت محنت کے بعد انہیں اس چھٹی کا پورا حق پہنچتا تھا۔ جن لوگوں کی صحت خراب تھی وہ سمندر کے کنارے چھٹیاں گزارنے چل دئے اور پاویل نے انکے لئے سینی‌ٹوریم میں رھنے کی جگہ حاصل کرنے اور انہیں مالی امداد دلوانے کے سلسلے میں بڑی کوشش کی۔ جاتے وقت انکے چہرے زرد اور مرجھائے ھوئے تھے لیکن چھٹیوں کے تصور سے انکے دل خوشی سے بھرپور تھے۔ ان سب کے کام کا بوجھ پاویل کے کندھوں پر آ پڑا اور اس نے شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر لائے بغیر یہ بوجھ بھی سنبھال لیا۔ کچھ دن بعد وہ لوگ دھوپ میں سنولائے ھوئے اور تر و تازہ ھوکر لوٹ آئے اور انکی جگہ دوسرے لوگ چھٹی پر چلے گئے۔ گرمیوں بھر یہی سلسلہ جاری رھا اور دفتر سے ھمیشہ کچھ نہ کچھ لوگ چھٹیوں پر غائب رھے۔ لیکن زندگی کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی اور پاویل کے لئے ایک دن کا بھی ناغہ کرنا ناممکن ھو گیا۔

گرمیاں گزر گئیں۔ پاویل خزاں اور سردیوں کی آمد سے گھبرا رھا تھا کیونکہ ان موسموں میں اسے بالعموم کافی جسمانی تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔

اس سال گرمیوں کے آنے کا اسے خاص طور پر بہت شدید انتظار تھا کیونکہ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی طاقت ھر

سال کم ہوتی جا رہی ہے حالانکہ اس بات کو خود اپنے سے تسلیم کرتے ہوئے بھی اسے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اسکے سامنے صرف دو ہی راستے تھے: یا تو وہ اس بات کو مان لے کہ اسکے کام کے لئے جس سخت محنت کی ضرورت ہے وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا اور اپنے آپ کو بیمار قرار دے دے۔ یا پھر جب تک اس کا جسم ساتھہ دے وہ اپنے کام پر ڈٹا رہے۔ اس نے یہی راستہ اختیار کیا۔

ایک دن پارٹی کی حلقہ کمیٹی کے بیورو کی میٹنگ میں ڈاکٹر بارتیلک آکر کورچاگن کے پاس بیٹھہ گیا۔ وہ پارٹی کا بہت پرانا خفیہ کارکن تھا اور اب اس حلقے کے محکمۂ صحت و صفائی کی ذمہ‌داری اسی پر تھی۔ اس نے پاویل سے کہا:

«کورچاگن تم کچھہ بیمار معلوم ہوتے ہو۔ تمہاری صحت کیسی ہے؟ کیا ڈاکٹری کمیشن نے تمہارا معائنہ کیا تھا؟ نہیں کیا؟ میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔ لیکن دوست تمہاری صورت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری پوری دیکھہ بھال کرنے کی ضرورت ہے۔ جمعرات کو شام کے وقت آ جانا ہم لوگ تمہارا معائنہ کر لینگے۔»

پاویل نہیں گیا۔ اسے کام سے فرصت ہی نہیں ملی۔ لیکن بارتیلک اسے بھولا نہیں تھا۔ کچھہ عرصے بعد وہ خود اسے لینے آیا اور اسے اس ڈاکٹری کمیشن کے پاس لے گیا جس میں وہ اعصابی بیماریوں کے ماہر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ڈاکٹری کمیشن نے اس کے بارے میں سفارش کی کہ «اسے فوراً چھٹی دیکر طویل علاج کے لئے کریمیا بھیج دیا جائے اور اس کے بعد بھی اس کا علاج جاری رکھا جائے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو اسکے نتائج بہت سنگین ہونگے۔»

لاطینی زبان میں متعدد بیماریوں کی جو فہرست اس سفارش سے پہلے لکھی ہوئی تھی اس سے پاویل صرف یہ سمجھہ پایا کہ

خاص خرابی اس کے پاؤں میں نہیں بلکہ اسکے نظام اعصابی کے مرکز میں ہے جو بہت بری طرح خراب ہو چکا تھا۔

بارتیلک نے کمیشن کا یہ فیصلہ بیورو کے سامنے پیش کیا اور اس کی اس تجویز کی کسی نے مخالفت نہیں کی کہ کورچاگن کو فوراً چھٹی دے دی جائے۔ لیکن خود کورچاگن نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اسکی چھٹی محکمۂ تنظیم کے صدر اسبیتنیف کے واپس آنے تک کے لئے ملتوی کر دی جائے۔ وہ کمیٹی کو بغیر کسی رهنما کے چھوڑکر جانا نہیں چاهتا تھا۔ بیورو نے اسکی بات مان لی حالانکہ بارتیلک اس التوا کے خلاف تھا۔

اور اس طرح اب تین هفتے بعد پاویل چھٹی پر جانے والا تھا، جو کہ اس کی زندگی کی پہلی چھٹی تھی۔ یوپاٹوریا کے ایک سینیٹوریم میں اسکے رهنے کا انتظام بھی کرا دیا گیا تھا اور اس سلسلے کا کاغذ اسکی میز کی دراز میں پڑا هؤا تھا۔

اس دوران میں اس نے کام کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اس نے حلقے کی کومسومول تنظیم کی ایک مکمل میٹنگ کی اور اپنی جان لڑاکر اس بات کی کوشش کی کہ تنظیم کی تمام خامیاں دور هو جائیں تاکہ وہ اطمینان کے ساتھہ چھٹی پر جا سکے۔

اور جس دن وہ اپنی زندگی میں پہلی بار سمندر دیکھنے جانے والا تھا اس سے ایک دن قبل ایک نہایت نفرت انگیز اور بعید از قیاس واقعہ پیش آیا۔

اس دن پاویل اپنا کام ختم کرکے پارٹی کے پروپیگنڈا اور پرچار کے محکمہ میں ایک میٹنگ میں گیا تھا۔ جس وقت وہ وهاں پہنچا اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا اسلئے وہ کتابوں کی الماری کے پیچھے والی کھلی کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھہ‌کر دوسروں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی هی دیر بعد کئی لوگ اندر داخل هوئے۔ الماری کے پیچھے سے وہ انکی صورت تو نہیں دیکھہ

پایا لیکن اس نے ایک شخص کی آواز پہچان لی۔ وہ فایلو کی آواز تھی جو ایک لمبا سا خوبصورت نوجوان تھا اور اس میں فوجیوں کی سی چستی تھی۔ وہ حلقے کے محکمۂ معاشیات کا ذمہ‌دار تھا۔ وہ شراب پینے اور لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے کے معاملے میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔

فایلو ایک زمانے میں چھاپہ مار رہ چکا تھا اور وہ مذاق ہی مذاق میں یہ شیخی مارنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا کہ اس نے ماخنو کے گروہ کے درجنوں لٹیروں کو کس طرح تلوار کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پاویل اس شخص کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک دن کومسومول کی ایک لڑکی پاویل کے پاس روتی ہوئی آئی تھی اور اسے بتایا تھا کہ فایلو نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ہفتے بھر تک ساتھ رہنے کے بعد اسے چھوڑ دیا تھا اور اب ملاقات ہونے پر اسکے سلام کا جواب بھی نہیں دیتا تھا۔ جب یہ معاملہ کنٹرول کمیشن کے سامنے پیش ہؤا تو فایلو داؤں پیچ کر کے صاف بچ گیا کیونکہ وہ لڑکی کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکی۔ لیکن پاویل کو اس لڑکی کی بات کا پورا یقین تھا۔ وہ اب وہاں بیٹھا چپ چاپ انکی باتیں سن رہا تھا اور وہ لوگ بھی اسکی موجودگی سے بےخبر بےدھڑک باتیں کر رہے تھے۔

«کہو فایلو کیا ٹھاٹ ہیں؟ ادھر کوئی نیا معاملہ ہوا؟»

یہ فایلو کے جگری دوست گریبوف کی آواز تھی۔ نہ معلوم کیوں گریبوف کو پروپیگنڈے کا ماہر سمجھا جاتا تھا حالانکہ وہ بالکل جاہل، تنگ نظر اور بیوقوف تھا۔ پھر بھی اسے اس بات پر بڑا فخر تھا کہ اسے پروپیگنڈے کے محکمہ کا کارکن سمجھا جاتا تھا اور وہ ہر شخص کے سامنے اس بات کا ذکر کرنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔

«ارے یار۔ مجھے مبارکباد دو۔ کل میں نے ایک نیا معرکہ سر کیا۔ کوروتائیوا کو۔ تم کہتے تھے کہ میری تمام کوششیں بیکار

جائیں گی۔ لیکن دوست تم ابھی جانتے ہی کیا ہو۔ اگر میں کسی عورت کو تاک لوں تو یقین جانو وہ زیادہ دن تک مجھ سے بچ کر نہیں رہ سکتی» فایلو نے شیخی مارتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک فحش سا فقرہ بھی جوڑ دیا۔

پاویل نے محسوس کیا کہ وہ سر سے پاؤں تک بری طرح کانپ رہا ہے۔ اس پر ایک اعصابی کپکپی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب بھی وہ کسی بات پر بہت مشتعل ہو جاتا تھا تو اس کی یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ کوروتائیوا کے ذمہ عورتوں کا محکمہ تھا اور وہ اس حلقہ کمیٹی میں اسی زمانے میں کام کرنے آئی تھی جب پاویل آیا تھا۔ پاویل جانتا تھا کہ وہ بہت خوش مزاج تھی اور پارٹی کی نہایت پر خلوص کارکن تھی۔ جو عورتیں اس کے پاس امداد اور مشورے کے لئے آتی تھیں ان کے ساتھ وہ بہت نرمی اور توجہ سے پیش آتی تھی۔ اور کمیٹی میں کام کرنے والے باقی تمام ساتھی اسکی عزت کرتے تھے۔ پاویل جانتا تھا کہ وہ غیر شادی‌شدہ ہے اور اسے کوئی شبہہ نہیں تھا کہ فایلو اسی کے بارے میں بات‌کر رہا تھا۔

«بس رہنے بھی دو فایلو۔ تم یوں ہی اڑا رہے ہو! وہ ایسی ہئی نہیں۔»

«میں اڑا رہا ہوں؟ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ میں نے اس سے بھی زیادہ سنگلاخ زمینیں ہموار کی ہیں۔ آدمی کو بس صحیح گر معلوم ہونا چاہئے۔ ہر لڑکی کو راضی کرنے کا ایک ہی طریقہ نہیں ہوتا۔ کچھ تو فوراً راضی ہو جاتی ہیں لیکن ان لڑکیوں میں کچھ مزا نہیں آتا۔ لیکن کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ مہینہ بھر محنت کرنے کے بعد کہیں پٹھے پر ہاتھ رکھنے دیتی ہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ انکی نفسیات سمجھی جائے، طریقہ صحیح استعمال کیا جائے اسی پر ہر چیز کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ارے یار یہ

بھی ایک پورا علم ہے لیکن میں تو ان معاملات میں استاد ہوں۔ ہو! ہو! ہو...!»

فایلو اپنی اس کامیابی پر اتنا خوش تھا کہ اس کے منہہ سے تھوک جھڑ رہا تھا۔ اس کے سامعین اسے اکسا رہے تھے، وہ اور زیادہ دلچسپ اور چٹپٹی تفصیلات سننے کے مشتاق تھے۔

کورچاگن اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل اندر سے اسکے سینے پر ہتھوڑا چلا رہا ہے۔

«میں جانتا تھا کہ کوروتائیوا معمولی حربوں سے قابو میں آنے والی نہیں ہے لیکن میں بھی ہمت ہارنے والا نہیں تھا خصوصاً جب میں گریبوف سے ایک درجن پورٹ کی بوتلوں کی شرط لگا چکا تھا کہ میں اسے پھانس کر دکھا دونگا۔ اسلئے میں نے جسے کہنا چاہئے دھوکا دھڑی سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ میں اس سے ملنے کے لئے یوں ہی دو ایک بار اس کے گھر چلا گیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ مجھہ سے کچھہ خاص متاثر نہیں ہوئی۔ اسکے علاوہ میرے بارے میں نہ جانے کتنی الٹی سیدھی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی بھنک اس کے کان میں بھی ضرور پڑی ہوگی... خیر قصہ مختصر یہ ہے کہ سیدھا حملہ تو کارگر ثابت نہیں ہؤا اسلئے میں نے بغلی چوٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہو! ہو! کہو کیسی کہی۔ ہاں تو میں نے اسے اپنی غمناک داستان سنائی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں جنگ کے مورچے پر لڑا تھا، کس طرح میں نے تمام دنیا کی خاک چھانی تھی اور نہ جانے کتنی مصیبتیں جھیلی تھیں لیکن مجھے اپنی عمر میں کبھی بھی صحیح قسم کی عورت نہیں ملی تھی اور اسی لئے میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ کوئی مجھہ سے محبت کرنے والا بھی نہیں تھا... اور اسی قسم کی نہ جانے کتنی بکواس میں نے اس سے کی۔ میں اس کی کمزوریوں

کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ سمجھے نا؟ یہ ماننا پڑیگا کہ اس نے مجھے ناکوں چنے چبوا دیئے۔ ایک بار تو میں سوچا جہنم میں ڈالو اسے اور میں تو اس معاملے سے بالکل دست بردار ہو جانے والا تھا لیکن تب تک یہ میری عزت کا سوال بن چکا تھا اور میں اصولاً اس معاملے کو بیچ میں نہیں چھوڑ سکا۔ آخرکار میں نے اسے ہموار کر ہی لیا۔ اور کیا سمجھتے ہو؟ وہ کنواری تھی کنواری۔ ہا۔ ہا! کیا مال تھا!»

اور فایلو اپنا گھناؤنا قصہ سناتا رہا۔

پاویل غصے سے کھول رہا تھا۔ وہ لپک کر فایلو کے قریب پہنچ گیا۔

«بدمعاش!» اس نے گرج کر کہا۔

«اچھا میں بدمعاش ہوں، کیوں؟ اور تم بہت شریف ہو کہ اس طرح چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنتے ہو؟»

پاویل نے یقیناً اس کے علاوہ بھی کچھہ کہا کیونکہ فایلو نے، جو کچھہ کچھہ نشے میں بھی تھا، بڑھہ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

«مجھے بدنام کرتا ہے، کیوں؟» وہ زور سے چلایا اور پاویل کے ایک گھونسا رسید کر دیا۔

پاویل نے شاہ بلوط کی لکڑی کا بنا ہوا ایک اسٹول اٹھاکر اس کے سر پر اتنے زور سے مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ فایلو کی خوش قسمتی سے پاویل کے پاس اس کا پستول نہیں تھا ورنہ اب تک وہاں فایلو کی لاش نظر آتی۔

لیکن اب تو وہ حماقت نہ جانے کیسے اس سے سرزد ہو ہی گئی تھی۔ اور جس دن پاویل کریمیا کے لئے روانہ ہونے والا تھا اس دن اسے پارٹی کی عدالت میں پیش ہونا پڑا۔

شہر کے تھیٹر میں پارٹی تنظیم کے تمام لوگ موجود تھے۔ اس معاملے نے کافی ھلچل مچا دی تھی اور مقدمے کی شنوائی نے

کمیونسٹ اخلاقیات، چال چلن اور ذاتی تعلقات پر ایک سنجیدہ بحث کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ اس معاملے نے اس سے متعلق عام مسائل پر بحث مباحثہ کا میدان گرم کر دیا اور وہ واقعہ بذات خود پس منظر میں چلا گیا ۔ فایلو کا رویہ نہایت گستاخانہ تھا ۔ تمام وقت اس کے چہرے پر تمسخر آمیز مسکراہٹ رہی اور اس نے دھمکی دی کہ وہ اس معاملے کو عوامی عدالت میں لے جائیگا اور یہ کہ کورچاگن کو اس کا سر پھوڑنے کے جرم میں قید بامشقت ہو جائیگی ۔ اس نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے صاف انکار کر دیا ۔

«تم لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی خبریں پھیلاکر مجھے بدنام کرنا چاھتے ھو؟ میں یہ کبھی نہیں ھونے دونگا ۔ آپ لوگوں کا جو جی چاھے میرے خلاف الزام لگا سکتے ھیں لیکن یہ حقیقت ھے کہ یہاں کی عورتیں مجھہ سے اسلئے خار کھائے بیٹھی ھیں کہ میں انکی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا ۔ اور یہ سب مقدمہ جو تم لوگوں نے کھڑاکر رکھا ھے اس میں ذرا بھی دم نہیں ھے ۔ اگر ١٩١٨ء کا زمانہ ھوتا تو میں اس پاگل کورچاگن سے خود نبٹ لیتا ۔ آپ لوگ خوشی سے میرے بغیر اپنا مقدمہ جاری رکھہ سکتے ھیں ۔»

اور اتنا کہہ‌کر وہ ھال سے باھر چلا گیا ۔

اس کے بعد صدر نے پاویل سے پورا واقعہ بیان کرنے کو کہا ۔ پاویل نے خاصے پرسکون لہجے میں بولنا شروع کیا حالانکہ اسے اپنے اوپر قابو رکھنے میں کافی دشواری پیش آ رھی تھی ۔

«یہ واقعہ اسلئے پیش آیا کہ میں اپنے اوپر قابو نہ رکھہ سکا ۔ ایک زمانہ تھا کہ اپنے دماغ کے مقابلے میں میں اپنے ھاتھوں کا زیادہ استعمال کیا کرتا تھا لیکن بہت عرصہ ھوا وہ زمانہ بیت گیا ۔ اس بار جو کچھہ ھوا وہ محض ایک اتفاق تھا ۔ قبل اس کے کہ مجھے اس بات کا احساس ھوتا کہ میں کیا کر رھا ھوں میں فایلو پر حملہ

کر کے اسے زمین پر گرا چکا تھا۔ گذشتہ کچھ برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے "چھاپہ ماری" کا حربہ استعمال کیا ہو۔ اور میں اپنی اس حرکت کی سخت مذمت کرتا ہوں حالانکہ میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ فایلو اسی کا مستحق تھا۔ فایلو کی قسم کے لوگوں کو میں قابل نفرت عنصر سمجھتا ہوں۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے، میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ آدمی ایک انقلابی، ایک کمیونسٹ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اتنا ذلیل درندہ اور بدمعاش بھی ہو سکتا ہے۔ اس تمام واقعے سے ایک ہی فائدہ ہوا ہے کہ اس نے ذاتی زندگی میں ہمارے کچھ کمیونسٹوں کے طرز عمل کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔"

پارٹی ممبروں کی بہت بڑی اکثریت نے فایلو کو پارٹی سے نکال دینے کے حق میں ووٹ دیا۔ گریبوف کو جھوٹی گواہی دینے کے لئے بہت سختی سے ڈانٹا گیا اور تنبیہہ کی گئی کہ اگر آئندہ اس نے اس قسم کی حرکت کی تو اسے نکال دیا جائیگا۔ فایلو کی گفتگو میں دوسرے جو لوگ شریک تھے انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور انہیں سرزنش کر کے چھوڑ دیا گیا۔

اس کے بعد بارتیلک نے پاویل کی اعصابی کیفیت کے بارے میں حاضرین کو بتایا اور جب پارٹی کی طرف سے اس معاملے کی تحقیق کرنے کے لئے مقرر کئے ہوئے کامریڈ نے یہ تجویز پیش کی کہ کورچاگن کو بھی تنبیہہ کر دی جائے تو پورے مجمع نے سخت احتجاج کیا۔ تحقیق کرنے والے ساتھی نے اپنی تجویز واپس لے لی اور پاویل کو بری کر دیا گیا۔

پاویل چند دن بعد خارکوف کے لئے روانہ ہوا۔ پارٹی کی حلقہ کمیٹی نے آخر کار اسکی یہ بہت پرانی درخواست منظور کر لی تھی کہ اسکے موجودہ کام سے چھٹی دیکر اسے یوکرینی کومسومول کی مرکزی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ اسے ایک بہت عمدہ سند

بھی دی گئی تھی۔ مرکزی کمیٹی کے سکریٹریوں میں آکم بھی ایک تھا۔ خارکوف پہنچتے ہی پاویل اس سے ملنے گیا اور اسے سارا قصہ سنایا۔

آکم نے پاویل کی سند دیکھی۔ سند میں اسے «پارٹی کا بےانتہا وفادار اور جان نثار» بتایا گیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا: «عام طور پر نہایت ٹھنڈے مزاج کا پارٹی کا کارکن ہے لیکن کبھی کبھی ضبط کھو بیٹھتا ہے۔ یہ اس کے اعصاب کی سنگین حالت کی وجہ سے ہے۔»

«پاویل، اچھا خاصہ سرٹیفکٹ تم نے اس ایک بات سے تباہ کر دیا» آکم نے کہا۔ «لیکن دوست کوئی فکر نہ کرو۔ مضبوط سے مضبوط آدمی کے ساتھ اس قسم کا حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ جنوب میں جاکر اپنی صحت ٹھیک کر لو جب واپس آؤگے تب تمہارے کام کے بارے میں طے کرینگے۔»

اور رخصت ہوتے وقت آکم نے اس سے بہت زور سے ہاتھ ملایا۔

مرکزی کمیٹی کا کمیونارڈ سینی ٹوریم۔ گلاب کی جھاڑیوں اور خوشگوار فواروں والے باغوں کے درمیان انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی سفید عمارتیں اور سفید رنگ کی گرمی کی پوشاکیں اور نہانے کے لباس پہنے ہوئے چھٹیاں منانے والوں کے غول... ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر نے اس کا نام رجسٹر میں درج کر لیا اور وہ کونے والی عمارت کے ایک کشادہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بستر پر سفید شفاف چادر، ہر طرف بےداغ صفائی اور سکون۔ پاکیزہ اور مکمل سکون۔

نہاکر اپنی تھکن مٹانے کے بعد کپڑے بدل کر پاویل جلدی سے سمندر کے کنارے چلا گیا۔

اسکی نظروں کے سامنے افق تک پرسکون اور شاندار سمندر جمکتے ہوئے سیاہی مائل نیلگوں سنگ مرمر کی لامحدود وسعت کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ دور، بہت دور، جہاں سمندر آسمان سے ملتا تھا ایک نیلا سا کہر چھایا ہوا تھا اور پگھلی ہوئی دھات کے سورج کا شفقتی عکس اس کی سطح پر پڑ رہا تھا۔ صبح کے کہر کے پردے کے پیچھے ایک عظیم سلسلۂ کوہ کے مبہم سے نقوش نظر آرہے تھے۔ پاویل نے سمندر کی زندگی بخش تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لئے اور اس نیلگوں وسعت کے لامحدود سکون و رعنائی سے اپنی آنکھیں سیراب کرتا رہا۔

ایک موج ساحل کی سنہری ریت کو چاٹتی ہوئی نہایت مست خرامی سے آکر اسکے قدموں کو چوم گئی۔

ساتواں باب

مرکزی پولی کلینک کا باغ مرکزی کمیٹی کے سینی ٹوریم کے احاطے سے ملا ہوا تھا اور سینی ٹوریم میں رھنے والے مریض سمندر کے ساحل سے گھر لوٹتے وقت چکر سے بچنے کے لئے اس باغ میں سے ہوکر ھی جاتے تھے۔ پاویل کو ایک دور تک پھیلے ہوئے چنار کے درخت کی چھاؤں میں آرام کرنا بہت پسند تھا۔ یہ درخت چونے کے پتھر کی ایک اونچی دیوار کے پاس اگا ھوا تھا۔ اس پرسکون کونے میں بیٹھ کر وہ باغ کے راستوں پر سیر کرنے والوں کی تیز رفتاری دیکھ سکتا تھا اور شام کے وقت بینڈ بھی سن سکتا تھا اور وہ اس بڑی صحت گاہ کے رھنے والوں کی بھیڑ بھاڑ سے بھی بچ جاتا تھا جو تفریح کرنے کے لئے جوق درجوق ساحل پر نکل آتے تھے۔

آج بھی وہ اپنی اسی پسندیدہ جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ابھی سمندر میں نہاکر آیا تھا اور وہاں کی خواب آور دھوپ میں اسکی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے آرام کرسی پر پاؤں پھیلاکر لیٹ گیا اور اونگھنے لگا۔ اس کا تولیہ اور فرمانوف کا ناول «بغاوت» جو وہ پڑھ رہا تھا قریب ہی کرسی پر رکھے ہوئے تھے۔ سینی‌ٹوریم میں پہلے چند دنوں میں اسکے اعصاب کو کوئی آرام نہیں ملا تھا اور اسکے سر کا درد اب بھی بدستور جاری تھا۔ اسکی بیماری نے تمام ڈاکٹروں کو چکر میں ڈال رکھا تھا اور وہ لوگ ابھی تک بیماری کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاویل ہر وقت کے ان ڈاکٹری معائنوں سے تنگ آ گیا تھا۔ ان سے اس کا دم الجھتا تھا اور وہ اپنے وارڈ کی لیڈی ڈاکٹر سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرتا تھا۔ وہ ڈاکٹر بہت خوش مزاج عورت تھی اور پارٹی کی ممبر بھی تھی۔ اس کا نام کچھہ عجیب سا تھا — یروسالمچک۔ اپنے اس نخریلے مریض کو تلاش کرنے اور اسے کسی ماہر ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لئے راضی کرنے میں اس کا بہت وقت صرف ہوتا تھا۔

«میں تو اس پوری صورت حال سے تنگ آ گیا ہوں» پاویل اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ «دن میں پانچ بار مجھے وہی قصہ دہرانا پڑتا ہے اور دنیا بھر کے احمقانہ سوالات کا جواب دینا پڑتا ہے: کیا تمہاری دادی پاگل تھیں؟ کیا تمہارے پر دادا کو گٹھیا کی شکایت تھی؟ بھلا مجھے کیا معلوم انہیں کیا شکایت تھی؟ میں نے اپنی عمر میں کبھی ان کی شکل بھی نہیں دیکھی! ہر ڈاکٹر مجھہ سے یہ قبولوانے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے سوزاک یا اس سے بھی کوئی بری بیماری ہوئی تھی اور ایسے سوال اتنی دیر تک چلتے رہتے ہیں کہ میرا جی چاہنے لگتا ہے کہ انکا گنجا سر پھوڑ دوں۔ مجھے آرام کرنے کا موقع دو۔ مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں

ہے۔ اگر چھ ہفتے تک جب تک میں یہاں ہوں اسی طرح میرے مرض کی تشخیص کی جاتی رہی تو میں پورے سماج کے لئے ایک خطرہ بن جاونگا۔»

یروسالمچک اسکے ساتھ تھوڑی دیر ہنسی مذاق کرتی لیکن چند منٹ بعد ہی وہ نرمی سے اسکا ہاتھ پکڑکر اسے سرجن کے پاس لے جاتی اور راستے بھر باتیں کرکے اس کا دماغ چاٹ جاتی۔

لیکن آج کوئی ڈاکٹری معائنہ ہونے والا نہیں تھا اور کھانے میں بھی ابھی گھنٹے بھر کی دیر تھی۔ اتنے میں اس نے اپنی نیند میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس نے سوچا «وہ لوگ مجھے سویا ہوا سمجھ‌کر چلے جائینگے» کاش یہ ممکن ہوتا! اس نے اپنے پاس والی کرسی کو چرمراتے سنا۔ کوئی آکر اس پر بیٹھ گیا تھا۔ عطر کی ہلکی سی خوشبو سے وہ سمجھ گیا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلی چیز جو اسے نظر آئی وہ تھا ایک سفید شفاف لباس اور نرم چمڑے کی سلیپروں میں کسی کے دھوپ میں سنولائے ہوئے پاؤں۔ پھر اس نے لڑکوں جیسے کٹے ہوئے بال، دو بڑی بڑی آنکھیں اور چوہے کے دانتوں جیسے تیز چمکدار دانتوں کی ایک قطار دیکھی۔ وہ اسکی طرف دیکھ‌کر نہایت شرمیلے انداز میں مسکرا دی۔

«میرے آنے سے آپ کے آرام میں خلل تو نہیں پڑا؟»

پاویل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ اس کی بہت بڑی بدتمیزی تھی لیکن اسے امید تھی کہ وہ چلی جائیگی۔

«یہ آپ کی کتاب ہے؟» وہ «بغاوت» کے ورق الٹ رہی تھی۔

«ہے تو۔»

ایک لمحے تک خاموشی رہی۔

«آپ «کمیونارڈ» سینی‌ٹوریم میں رہتے ہیں نا؟»

پاویل بہت بےصبری سے پہلو بدلنے لگا۔ آخر وہ اسے سکون

سے وھاں پڑا کیوں نہیں رھنے دیتی؟ اچھا آرام کرنے کو ملا۔ اب وہ اسکی بیماری کے بارے میں پوچھے گی۔ اسے وھاں سے چلا ھی جانا ھوگا۔

«نہیں» اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

«مجھے تو یقین تھا کہ میں نے آپ کو وھاں دیکھا ھے۔»

پاویل اٹھنے ھی کو تھا کہ اتنے میں کسی عورت کی گھری خوشگوار آواز نے اسکے پیچھے سے کہا:

«کیوں ڈورا کیوں یہاں کیا کر رھی ھو؟»

ایک بھرے ھوئے جسم‌والی، سورج کی دھوپ میں سنولائی ھوئی، سنہرے بالوں والی لڑکی ساحل کا لباس پہنے ھوئے کرسی کی کگر پر آکر بیٹھہ گئی۔ اس نے جلدی سے کورچاگن پر ایک نظر ڈالی۔

«کامریڈ میں نے آپکو پہلے کہیں دیکھا ھے۔ آپ خارکوف سے آئے ھیں نا؟»

«ھاں۔»

«آپ کہاں کام کرتے ھیں؟»

پاویل نے گفتگو کے اس سلسلے کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس نے جواب دیا «میں کوڑا صاف کروانے کے محکمہ میں کام کرتا ھوں آپ کو کچھہ کرنا ھے؟» اس کے اس مذاق پر اتنے زور کی ھنسی پڑی کہ اس سے پاویل تقریباً اچھل پڑا۔

«کامریڈ آپ خوش اخلاق نہیں معلوم ھوتے۔ بات کیا ھے؟»

انکی دوستی کی ابتدا اس طرح ھوئی۔ معلوم یہ ھوا کہ ڈورا رودکینا پارٹی کی خارکوف شہر کمیٹی کے بیورو کی ممبر تھی۔ بعد میں جب وہ دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ھو گئے تو وہ اکثر اس دلچسپ واقعہ کی یاد دلاکر اسے چڑایا کرتی تھی جس سے انکی جان پہچان کی ابتدا ھوئی تھی۔

ایک دن شام کو تھلا سا سینی‌ٹوریم کے کھلے میدان میں ناچ گانے کے پروگرام کے دوران میں پاویل کی ملاقات اپنے پرانے دوست ژارکی سے ہو گئی۔ اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کی ملاقات کا باعث ایک 'فاکس ٹراٹ' ناچ تھا۔

پہلے تو ایک گداز جسم اور باریک آواز والی عورت نے انتہائی جذباتی لہجے میں «برھا کی رات...» قسم کا ایک گانا سنایا اور پھر ایک جوڑا کودکر اسٹیج پر آیا۔ مرد سر پر سرخ رنگ کی اونچی سی ٹوپی اور کمر پر سلمہ ستارے کے کام کی چند چمکدار پٹیاں اور گلے میں ایک 'بوٹائی' کے ساتھ سفید شفاف قمیص کا اگلا حصہ لگائے ہوئے تھا۔ اسکے جسم پر اسکے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ غالباً وہ وحشی آدمی کا بھیس بنائے ہوئے تھا لیکن یہ کوشش بہت ھی ناکامیاب قسم کی تھی۔ اسکے ساتھ والی گڑیا کی صورت والی عورت بےشمار کپڑوں میں ملبوس تھی۔ سینی‌ٹوریم کے مریضوں کے پلنگوں اور آرام کرسیوں کے پیچھے کھڑے ہوئے موٹی موٹی گردنوں والے نیپ‌مین جھوم جھوم‌کر داد دے رہے تھے اور وہ جوڑا اسٹیج پر 'فاکس‌ٹراٹ' ناچ کی پیچیدہ ادا کاریاں دکھا رہا تھا۔ اس سے زیادہ بیہودہ منظر تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ احمقانہ ٹوپی لگائے ہوئے وہ موٹا سا آدمی اپنی رفیقہ کو کس‌کر سینے سے چمٹائے ہوئے تھا اور وہ دونوں اسٹیج پر نہایت فحش انداز میں تھرک رہے تھے۔ پاویل نے اپنے پیچھے کسی موٹے تازے 'بھینسے' کے سانس کی خرخراھٹ سنی۔ وہ وھاں سے چلنے کے لئے اٹھا ھی تھا کہ اگلی قطار میں کسی نے کھڑے ھوکر چیخ‌کر کہا:

«بند کرو یہ بیہودہ فحش ناچ! لعنت ھے اس پر!»

یہ ژارکی کی آواز تھی۔

پیانو بجانےوالا دفعتاً رک گیا اور وائلن نے بھی ایک چیخ مارکر دم توڑ دیا۔ اسٹیج پر اس جوڑے نے تھرکنا بندکر دیا۔

پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں نے جل کر بری طرح شور مچانا شروع کیا:

«کیسا بدتمیز آدمی ہے کہ ناچ کے بیچ میں ٹوکتا ہے!»

«تمام یورپ اس ناچ کا دیوانہ ہے!»

«بیہودگی کی انتہا ہے!»

لیکن سریوژا ژبانوف نے جو چیریپوویتس ضلع کی کومسومول تنظیم کا سکریٹری تھا اور آج کل کمیونارڈ سینی ٹوریم میں صحت یابی کے لئے آیا ہوا تھا، اپنے منھہ میں چار انگلیاں رکھہ کر ایک زور کی سیٹی بجائی۔ کئی اور لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا اور وہ جوڑا اسٹیج سے ایسا غایب ہؤا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اس تماشے کے منتظم نے، جو اپنے غلامانہ اور خوشامدانہ انداز سے بالکل پرانے زمانے کا پیش خدمت معلوم ہوتا تھا، اعلان کیا کہ ناچ منڈلی جا رہی ہے۔

«چلو اچھا ہے۔ خس کم جہاں پاک!» ایک لڑکے نے، جو نہانے کے بعد ابھی تک گاؤن پہنے تھا، چلاکر کہا اور اس پر ایک عام قہقہہ پڑ گیا۔

پاویل اگلی قطاروں کی طرف گیا اور وہاں ژارکی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ دونوں دوست پاویل کے کمرے میں بڑی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ژارکی نے پاویل کو بتایا کہ وہ پارٹی کی ایک حلقہ کمیٹی کے پروپیگنڈا اور پرچار کے محکمہ میں کام کر رہا تھا۔

«تمہیں یہ تو نہیں معلوم ہوگا کہ میری شادی ہو گئی ہے؟» ژارکی نے کہا۔ «جلد ہی میں ایک بیٹے یا بیٹی کا باپ بننے والا ہوں۔»

«تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ کب؟» پاویل نے تعجب سے کہا۔ «کون ہے تمہاری بیوی؟»

ژارکی نے اپنی جیب سے ایک فوٹو نکال کر پاویل کو دکھائی۔
«پہچانتے ہو؟»

وہ ژارکی اور آنا بورھارٹ کی تصویر تھی۔

«اور دوباوا کا کیا ہوا؟» پاویل نے اور بھی تعجب سے پوچھا۔

«وہ ماسکو میں ہے۔ پارٹی سے نکال دیئے جانے کے بعد اس نے کمیونسٹ یونیورسٹی بھی چھوڑ دی۔ وہ اب بامان ٹیکنکل انسٹی‌ٹیوٹ میں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اسے پھر پارٹی میں لے لیا گیا۔ اگر ایسا ہے تو بہت ہی بری بات ہے۔ وہ تو بالکل ہی ذلیل اور پست ہو گیا ہے۔ اور بھلا جانتے ہو پانکراتوف کیا کر رہا ہے؟ وہ ایک جہاز یارڈ میں اسسٹنٹ ڈائیرکٹر ہے۔ باقی لوگوں کے بارے میں مجھے زیادہ کچھہ معلوم نہیں۔ ادھر کچھہ دنوں سے ہم لوگ آپس میں کوئی خط وکتابت قائم نہیں رکھہ سکے ہیں۔ ہم لوگ ملک کے مختلف حصوں میں کام کر رہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ملاقات ہو جانے پر پچھلے دنوں کی یاد کرنے میں کتنا مزا آتا ہے!»

اتنے میں ڈورا کئی لوگوں کو ساتھہ لئے ہوئے وہاں آئی۔ اس نے ژارکی کی جیکٹ پر لگے ہوئے تمغے کو ایک نظر دیکھا اور پاویل سے پوچھا:

«تمہارے یہ دوست کیا پارٹی کے ممبر ہیں؟ کہاں کام کرتے ہیں؟»

پاویل نے کچھہ متعجب ہوکر مختصر الفاظ میں ژارکی کے بارے میں ڈورا کو بتایا۔

«اچھی بات ہے» اس نے کہا۔ «تو وہ یہاں رہ سکتا ہے۔ یہ ساتھی ابھی ماسکو سے آئے ہیں۔ یہ ہمیں پارٹی کی تازہ‌ترین خبریں بتائیں‌گے۔ ہم لوگوں نے سوچا تمہارے کمرے میں چل کر پارٹی ممبروں کی ایک چھوٹی سی میٹنگ کرینگے۔» اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

پاویل اور ژارکی کے علاوہ نئے آنےوالوں میں تمام لوگ پرانے بالشویک تھے۔ ماسکو کے کنٹرول کمیشن کے ایک ممبر بارتاشیف نے انہیں ٹراٹسکی، زینوویف اور کامینیف کی رہنمائی میں پارٹی کی نئی مخالفت کے بارے میں بتایا۔

«اس نازک گھڑی میں ہمیں اپنے اپنے کام کی جگہ پر ہونا چاھئے» بارتاشیف نے آخر میں کہا۔ «میں تو کل ھی جا رہا ہوں۔»

پاویل کے کمرے میں ہونےوالی اس میٹنگ کے تین دن بعد سارا سینیٹوریم خالی ہو گیا۔ کچھ دن بعد پاویل بھی اپنی چھٹی ختم ہونے سے پہلے ھی چلا گیا۔ کومسومول کی مرکزی کمیٹی نے بھی اسے نہیں روکا۔ اسے ایک صنعتی علاقے میں کومسومول کا سکریٹری بنا دیا گیا، اور ہفتے بھر کے اندر ھی وہ شہر کی مقامی تنظیم کی میٹنگوں میں تقریریں کرنے لگا۔

خزاں کے موسم کے خاتمے کے قریب ایک دن پاویل کی موٹر، جس میں وہ پارٹی کے دو اور کارکنوں کے ساتھ دوردراز دیہاتی علاقوں کا دورہ کر رہا تھا، ایک کھائی میں جا گری اور الٹ گئی۔

موٹر میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ زخمی ہوئے۔ پاویل کا داھنا گھٹنا بری طرح کچل گیا۔ چند دن بعد اسے خارکوف کے سرجکل انسٹی ٹیوٹ میں لے جایا گیا۔ زخمی عضو کا معائنہ کرنے اور ایکس رے لینے کے بعد ڈاکٹروں نے فوراً آپریشن کرنے کا مشورہ دیا۔

پاویل راضی ہو گیا۔

«تو کل سویرے» ڈاکٹروں کے کمیشن کے صدر ایک موٹے پروفیسر نے کہا۔ وہ اٹھا اور باقی ڈاکٹر بھی اسکے پیچھے قطار باندھ کر چلے گئے۔

ایک صاف ستھرا چھوٹا سا ہسپتال کا وارڈ اور اس میں صرف ایک پلنگ۔ ہر چیز آئینہ کی طرح صاف چمکتی ہوئی اور ہسپتال کی وہ مخصوص بو جسے پاویل اب بھول بھی چکا تھا۔ اس نے چاروں

طرف نظر ڈالی ۔ پلنگ کے قریب ایک چھوٹی سی میز، جس پر دودھ جیسا سفید میز پوش بچھا ہوا تھا، اور ایک سفید پالش کیا ہؤا اسٹول تھا ۔ اسکے علاوہ کمرے میں اور کچھ بھی نہیں تھا ۔

نرس اس کا کھانا لیکر آئی ۔ پاویل نے کھانا واپس کر دیا ۔ پلنگ پر ٹانگیں پھیلائے وہ تکیوں کے سہارے بیٹھا خط لکھ رہا تھا ۔ اس کے گھٹنے کا درد اسکے خیالات کی رو میں خلل انداز ہو رہا تھا اور اسی درد کی وجہ سے اسکی بھوک بھی ماری گئی تھی ۔

جب وہ چوتھا خط لکھکر ختم کر چکا تو دروازہ بہت آہستہ سے کھلا اور ایک نوجوان عورت سفید فراک اور ٹوپی پہنے ہوئے اس کے پلنگ کے قریب آئی ۔

شام کے دھندلکے میں پاویل نے اس کی پتلی پتلی بھوؤں اور بڑی بڑی آنکھوں کی ایک جھلک سی دیکھی ۔ اسکی آنکھیں غالباً سیاہ تھیں ۔ اس کے ایک ہاتھ میں چمڑے کا ایک تھیلا تھا اور دوسرے میں کاغذ اور پنسل ۔

«میں تمہارے وارڈ کی ڈاکٹر ہوں» اس نے کہا ۔ «میں تم سے بہت سے سوال پوچھنے آئی ہوں اور تمہیں اپنے بارے میں مجھے سب کچھ بتانا ہوگا، چاہے یہ بات تمہیں پسند ہو یا نہ ہو ۔»

یہ کہکر وہ نہایت خوشگوار انداز میں مسکرائی اور اسکی اس مسکراہٹ کی وجہ سے «سوال جواب» کی خشک اور غیر دلچسپ نوعیت بالکل ہی تبدیل ہو گئی ۔ پاویل تقریباً گھنٹے بھر تک صرف اپنے ہی بارے میں نہیں بلکہ کئی پشتوں پہلے کے اپنے آبا و اجداد کے بارے میں بھی بتاتا رہا ۔

... آپریشن تھیٹر ۔ اپنی ناک اور منہہ پر جالی کی نقابیں لگائے ہوئے لوگ ۔ نکل کے چمکتے ہوئے اوزار ۔ ایک لمبی سی تنگ میز اور اسکے نیچے ایک بڑی سی چلمچی ۔

پروفیسر ابھی اپنے ھاتھہ ھی دھو رھا تھا کہ پاویل آپریشن کی میز پر لیٹ گیا۔ اسکے پیچھے آپریشن کی سرگرم تیاریاں جاری تھیں۔ اس نے سر گھماکر دیکھا۔ نرس قینچیاں اور چاقو سلیقے سے رکھہ رھی تھی۔

«کامریڈ کورچاگن، ادھر نہ دیکھو» اسکے وارڈ کی ڈاکٹر باژانووا نے اسکے پیر کی پٹی کھولتے ھوئے کہا۔ «اعصاب پر اسکا برا اثر پڑتا ھے۔»

«کس کے اعصاب پر ڈاکٹر؟» پاویل نے شرارت بھری مسکراھٹ کے ساتھہ پوچھا۔

چند منٹ بعد اسکے چہرے پر ایک بھاری سی نقاب رکھہ دی گئی اور اس نے پروفیسر کو کہتے سنا:

«اب تمھیں بےھوشی کی دوا دی جائیگی۔ ناک سے گہرے سانس لو اور گنتی گننا شروع کرو۔»

«اچھی بات ھے» نقاب کے نیچے سے ایک دبی ھوئی پرسکون آواز نے کہا۔ «اگر میں اس عرصے میں کوئی بہت بھدی بات کہوں تو اس کے لئے میں پہلے ھی سے معافی چاھتا ھوں۔»

پروفیسر بےساختہ مسکرا دیا۔

ایتھر کے پہلے چند قطرے۔ کتنی گھناؤنی ھوتی ھے اسکی دم گھونٹ دینےوالی بو۔

پاویل نے ایک گہرا سانس لیا اور صاف لہجے میں بولنے کی کوشش کرتے ھوئے اس نے گنتی گننا شروع کیا۔ اس کی زندگی کے المیے کے پہلے ایکٹ کا پردہ اٹھنے ھی والا تھا۔

آرتیم نے لفافہ کھولا اور کانپتے ھوئے دل سے خط پڑھنے لگا۔ پہلی چند سطریں تو وہ اس طرح گھورکر پڑھتا رھا گویا کاغذ میں سوراخ کر دیگا۔ پھر باقی خط وہ بڑی تیزی سے پڑھہ گیا:

«آرتیم! ہم دونوں ایک دوسرے کو شاید ہی کبھی خط لکھتے ہوں۔ سال میں ایک یا حد سے دو بار! لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم کتنے خط لکھتے ہیں؟ تم نے لکھا ہے کہ تم اپنے بال بچوں کے ساتھ شپیتووکا سے کازاتین کے ریلوے یارڈ کے علاقے میں آکر رہنے لگے ہو کیونکہ تم اپنی کاشتکاری میں جمی ہوئی جڑیں اکھاڑ دینا چاہتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ ستیوشا اور اسکے رشتہ داروں کی پچھڑی ہوئی اور چھوٹے موٹے جائداد والوں کی ذہنیت ہی ان جڑوں کا پس‌منظر ہے۔ ستیوشا کی قسم کے لوگوں کو بدلنا بہت دشوار ہوتا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم بھی اس میں کامیاب نہیں ہوگے۔ تم نے لکھا ہے کہ ‹اس بڑھاپے میں› پڑھنا تمہارے لئے بہت دشوار ہے لیکن تمہارے خط سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کافی ترقی کر لی ہے۔ کارخانے کو چھوڑکر شہر کی سوویت کے صدر کا عہدہ سنبھالنے سے پرضد انکار کرنا تمہاری بہت بڑی غلطی ہے۔ تم اقتدار کے لئے لڑے تھے کہ نہیں؟ پھر اسکی ذمہ‌داری لینے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ کل ہی شہر کی سوویت کی ذمہ‌داری سنبھال لو اور کام میں جٹ جاؤ!

اب میں اپنے بارے میں بھی کچھ بتا دوں۔ میری صحت میں کوئی بنیادی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ میں اب ہسپتالوں کے چکر بہت لگانے لگا ہوں۔ دو بار مجھے چاک بھی کیا جا چکا ہے۔ میرا کافی خون اور طاقت ضائع ہو چکی ہے لیکن یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ آخر یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔

مجھے میرے کام سے ہٹا لیا گیا ہے اور میں نے اب ایک نیا پیشہ اختیار کر لیا ہے ـــ ‹مریض› کا پیشہ۔ میں بہت تکلیف برداشت کر رہا ہوں اور اس سب کا ماحصل یہ ہے کہ میرے داہنے گھٹنے کی حرکت بالکل بند ہو گئی ہے اور میرے جسم

کے مختلف حصوں پر زخموں کے متعدد نشان ہیں۔ اور ڈاکٹروں کی تازہ ترین دریافت یہ ہے کہ سات سال پہلے میری ریڑھہ کی ہڈی میں جو چوٹ لگی تھی اسکی وجہ سے اب مجھے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر میں پھر اپنے ساتھیوں کی صفوں میں واپس جانے کے لائق ہو جاؤں تو میں سب کچھہ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

زندگی میں مجھے اور کسی چیز سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ جد و جہد کے میدان سے دور رہ‌کر ہوتی ہے۔ میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ میں ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھیوں کی صفوں سے الگ ہو جاؤنگا۔ اسی لئے وہ لوگ جو کچھہ کرنا چاہتے ہیں میں انہیں کرنے دیتا ہوں۔ لیکن میری حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی ہے اور ناامیدی کے بادل ہر لمحہ زیادہ تاریک اور زیادہ گھنے ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے آپریشن کے بعد جوں ہی میں چلنے پھرنے کے لائق ہوا میں اپنے کام پر واپس چلا گیا تھا لیکن تھوڑے ہی دن بعد وہ مجھے پھر واپس لے آئے۔ اب مجھے یوپاٹوریا کے ایک سینی‌ٹوریم بھیجا جا رہا ہے۔ میں کل چلا جاؤنگا۔ لیکن تم غم نہ کرنا۔ میں آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ میں بہت سخت جان ہوں۔ بھیا مجھے اور تمہیں ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ اپنے پر ضرورت سے زیادہ کام کا بوجھہ نہ ڈالو کیونکہ ساتھیوں کا علاج کرانے میں پارٹی کا بہت پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ کام کے دوران میں ہم جو تجربہ حاصل کرتے ہیں اور مطالعہ سے ہم جو علم حاصل کرتے ہیں وہ اتنا بیش قیمت ہوتا ہے کہ اسے ہسپتالوں میں ضائع کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ اچھا سلام۔ محبت اور پیار کے ساتھہ۔

پاویل۔»

جس وقت آرتیم اپنی گھنی بھویں سکیڑے اپنے بھائی کا خط پڑھ رہا تھا اسی وقت پاویل ہسپتال میں ڈاکٹر باژانووا سے رخصت ہو رہا تھا۔

«تو کل تم کریمیا چلے جاؤ گے؟» اس نے پاویل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ «باقی دن آج کیا کرنے کا ارادہ ہے؟»

«کامریڈ رودکینا ابھی یہاں آتی ہوں گی» پاویل نے جواب دیا۔ «وہ مجھے اپنے خاندان سے ملانے کے لئے اپنے گھر لے جائیں گی۔ میں رات وہیں رہوں گا اور کل وہ مجھے اسٹیشن چھوڑ آئیں گی۔»

باژانووا ڈورا کو جانتی تھی کیونکہ وہ پاویل سے ملنے اکثر ہسپتال آتی تھی۔

«لیکن کامریڈ کورچاگن کیا تم اپنا وعدہ بھول گئے؟ تم نے کہا تھا کہ جانے سے پہلے تم میرے پاپا سے اپنا معائنہ کرا لوگے۔ میں نے انہیں بڑی تفصیل کے ساتھ تمہاری بیماری کا حال بتا دیا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ ایک بار تمہیں دیکھ لیں۔ شاید آج شام کو تم تھوڑا سا وقت نکال سکو گے؟»

پاویل فوراً راضی ہو گیا۔

اسی دن شام کو باژانووا پاویل کو اپنے باپ کے بڑے سے مطب میں لے گئی۔

اس مشہور ڈاکٹر نے پاویل کا بڑے غور سے معائنہ کیا۔ اس کی بیٹی ہسپتال سے ایکس رے کی تمام تصویریں اور ڈاکٹری معائنے کی رپورٹیں لے آئی تھی۔ جب اسکے باپ نے لاطینی زبان میں اس سے کوئی لمبی سی بات کہی تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور یہ بات پاویل سے چھپی نہ رہ سکی۔ پروفیسر پاویل پر جھکا ہؤا اسکا معائنہ کر رہا تھا۔ پاویل اسکے بڑے سے گنجے سر کو گھورتا رہا اور اسکی تیز آنکھوں میں کچھ کھوجتا رہا۔ لیکن باژانوف کے چہرے کے انداز سے کچھ بھی پتہ لگانا ناممکن تھا۔

جب پاویل کپڑے پہن چکا تو پروفیسر نہایت تپاک سے اس سے رخصت ہؤا کیونکہ اسے فوراً کسی کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو ضروری ہدایات دے گیا کہ وہ پاویل کو معائنہ کے نتیجے کی اطلاع دے دے۔

پاویل باژانووا کے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھہ سجے ہوئے کمرے میں کوچ پر لیٹا ہوا اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن باژانووا کی سمجھہ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات شروع کس طرح کرے۔ اسکے باپ نے اسے جو کچھہ بتایا تھا اسے وہ دوہرا نہیں سکتی تھی۔ اس کے باپ نے کہا تھا کہ علم طب کی اب تک کی معلومات اسکے جسم کے تباہ‌کن ورم کو روکنے سے قاصر ہیں۔ پروفیسر آپریشن کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا «اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ نوجوان اپنے اعضا کی حرکت بالکل کھودے اور ہم لوگ اس سانحے کو روکنے کے لئے کچھہ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم بالکل لاچار ہیں۔»

بحیثیت ایک ڈاکٹر کے اور بحیثیت دوست کے بھی وہ اسے پوری حقیقت بتانا نہیں چاہتی تھی اسلئے اس نے بہت سوچ سوچ کر الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے اسے حقیقت کے صرف ایک جزو سے واقف کرایا۔

«کامریڈ کورچاگن مجھے یقین ہے کہ یوپاٹوریا کی مٹی تمہاری صحت کو درست کر دیگی اور خزاں کے آغاز تک تم پھر اپنے کام پر واپس جا سکوگے۔»

لیکن وہ بھول گئی تھی کہ پاویل کی تیز نگاہیں اسے تمام وقت دیکھتی رہی تھیں۔

«جو کچھہ تم نے کہا ہے یا کہنا چاہئے کہ جو کچھہ تم نے نہیں کہا ہے اس سے میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ ہمیشہ مجھہ

سے پوری طرح کھل کر سب باتیں صاف صاف بتا دیا کرو۔ تمہیں مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سن کر نہ تو غش کھا جاؤنگا اور نہ خودکشی کرنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ میرا کیا انجام ہونےوالا ہے۔»

پاویل کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اس نے تسلی دینے کی کوئی بات کہہ دی لیکن اسکے سوال کا سیدھا سیدھا جواب نہ دیا۔ اس لئے اس دن پاویل کو اپنے مستقبل کے بارے میں حقیقت کا علم نہ ہو سکا۔

«کامریڈ کورچاگن، میری دوستی کو بھلا نہ دینا» لیڈی ڈاکٹر نے رخصت ہوتے وقت بڑی نرمی سے کہا۔ «کون جانے زندگی ہمیں کن کن راہوں سے لے جائے۔ اگر تمہیں کبھی بھی میری مدد یا صلاح مشورے کی ضرورت ہو تو خط ضرور لکھنا۔ تمہاری مدد کرنے کے لئے مجھ سے جو بھی ممکن ہوگا ضرور کرونگی۔»

کھڑکی میں سے وہ اس کے چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس لمبے جسم کو دیکھتی رہی۔ وہ اپنی چھڑی پر زور دیکر بڑی دقت سے دروازے سے باہر کھڑی ہوئی گاڑی تک گیا۔

پھر وہی یوپاٹوریا۔ وہی جنوبی علاقے کا گرم سورج۔ کشیدہ کاری کی گول ٹوپیاں اپنی چندیا پر منڈھے ہوئے شور مچاتے ہوئے لوگ جو دھوپ میں سنولا گئے تھے۔ موٹر نے دس منٹ میں نئے آنے والوں کو بھورے رنگ کی ایک پکی دو منزلہ عمارت کے سامنے پہنچا دیا۔ یہ میناک سینیٹوریم تھا۔

جو ڈاکٹر اس وقت ڈیوٹی پر تھا، جب اس کو معلوم ہوا کہ پاویل کے وہاں ٹھہرنے کا انتظام یوکرینی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے کیا ہے تو وہ اسے فوراً ۱۱ نمبر کمرے میں لے گیا۔

«میں تمہیں کامریڈ ایبنر کے کمرے میں رکھوں گا ـ وہ ایک جرمن کامریڈ ہیں اور چاہتے ہیں کہ انکے کمرے میں کسی روسی کو رکھا جائے» اس نے ایک دروازے پر دستک دیتے ہوئے پاویل کو بتایا ـ اندر سے کسی نے جرمن لہجے میں بھاری آواز سے کہا:

«اندر آ جاؤ ـ»

پاویل نے اپنا سفری تھیلا نیچے رکھہ دیا اور پھر اس سنہرے بالوں اور نیلے رنگ کی چمک دار، شگفتہ آنکھوں والے شخص کی طرف مخاطب ہوا جو بستر پر لیٹا ہوا تھا ـ جرمن نے نہایت پرتپاک مسکراہٹ سے اسکا استقبال کیا ـ

«گٹین مارگین جینوسے ـ میرا مطلب ہے گڈ ڈے» اس نے اپنی بات درست کرتے ہوئے کہا اور لمبی لمبی انگلیوں والا پیلا ہاتھہ پاویل کی طرف بڑھا دیا ـ

چند ہی لمحوں بعد پاویل اسکے پلنگ کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور وہ دونوں بڑی سرگرمی کے ساتھہ اس «بین الاقوامی زبان» میں گفتگو کر رہے تھے جس میں الفاظ کی بہت کم اہمیت ہوتی ہے اور تخیل، ہاتھہ کے اشاروں، مختلف قسم کی آوازوں اور بغیر ضبط تحریر میں آئی ہوئی عالمی زبان کے دوسرے تمام حربوں سے خیالات کے اظہار کی تمام خامیاں پوری کر لی جاتی ہیں ـ

پاویل کو معلوم ہؤا کہ ایبنر ایک جرمن مزدور تھا جس کے کولہے پر ۱۹۲۳ء کی ہیمبرگ کی بغاوت کے دوران میں زخم آ گیا تھا ـ وہی پرانا زخم اب پھر ہرا ہو گیا تھا اور وہ بستر سے لگ گیا تھا ـ لیکن وہ اپنی تمام تکلیف ہنستے ہنستے ہنسی خوشی برداشت کرتا تھا اور اسی لئے پاویل کے دل میں فوراً اسکے لئے عزت پیدا ہو گئی ـ

پاویل کو اس سے بہتر ساتھی کی تمنا نہیں ہو سکتی تھی ـ یہ شخص ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صبح سے شام تک اپنی

تکلیفوں کا رونا روتے رہتے ہیں اور قسمت کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ اسکے برخلاف، اسکے ساتھ رہ کر تو آدمی اپنی تکلیفیں بھی بھول جاتا تھا۔

«بس مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ میں جرمن زبان نہیں جانتا» پاویل نے بڑی حسرت سے سوچا۔

سینی‌ٹوریم کے احاطے کے ایک کونے میں کئی جھولنے والی کرسیاں، ایک بانس کی میز اور دو آرام کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سینی‌ٹوریم کے وہ پانچ مریض جنہیں باقی تمام لوگ «کمیونسٹ انٹرنیشنل کی مجلس عاملہ» کہنے لگے تھے، ڈاکٹری دیکھ بھال اور دوادارو کے بعد یہیں اپنا وقت گزارا کرتے تھے۔

ایبنر ایک آرام کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھا رہتا تھا اور پاویل دوسری پر کیونکہ اسے بھی چلنے پھرنے کو منع کر دیا گیا تھا۔ اس گروہ کے باقی تین افراد تھے: ویمان نام کا ایک ایستونیائی جو جمہوریہ کے کسی محکمۂ تجارت میں کام کرتا تھا، مارتا لاؤرین نام کی بھوری آنکھوں‌والی ایک نوجوان لتھوانیائی عورت جو دیکھنے میں اٹھارہ برس کی لڑکی معلوم ہوتی تھی اور لیدینیف نام کا ایک لمبا، تنومند سائبیریا کا باشندہ جسکے بال کنپٹیوں پر سفید ہونے لگے تھے۔ اس چھوٹے سے گروہ میں پانچ مختلف قوموں کے لوگ تھے۔ جرمن، ایستونیائی، لتھوانیائی، روسی اور یوکرینی۔ مارتا اور ویمان جرمن بول لیتے تھے اسلئے ایبنر ان سے ترجمان کا کام لیتا۔ پاویل اور ایبنر دوست تھے کیونکہ دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ اور مارتا، ایبنر اور ویمان اسلئے دوست تھے کہ وہ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ لیدینیف اور پاویل کی دوستی شطرنج کی وجہ سے تھی۔

لیدینیف کے آنے سے پہلے کورچاگن اس سینی‌ٹوریم کا شطرنج کا «چیمپین» تھا۔ اس نے بڑی سخت جدوجہد کے بعد ویمان سے یہ رتبہ چھینا تھا۔ وہ ٹھس سا ایستونیائی اپنی شکست پر کافی عرصے تک کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہا اور اس نے بہت دنوں تک کورچاگن کو اپنی اس خواری کے لئے معاف نہیں کیا۔ لیکن ایک دن ایک لمبا سا آدمی جو اپنی پچاس سال کی عمر کے لحاظ سے بہت نوجوان دکھائی دیتا تھا اس سینی‌ٹوریم میں آیا اور اس نے کورچاگن کو شطرنج کھیلنے کی دعوت دی۔ پاویل خطرے سے قطعی بے خبر تھا۔ اس نے بڑے سکون سے فرزین کے گھروالا پیادہ چل دیا۔ اسکے جواب میں لیدینیف نے اپنے بیچ والے مہرے چلے۔ «چیمپین» ہونے کے ناتے پاویل کو ہر نئے آنے والے کے ساتھہ شطرنج کھیلنا پڑتی تھی اور بازی کے گرد ہمیشہ کھیل میں دلچسپی رکھنےوالوں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا تھا۔ نویں چال کے بعد ھی پاویل سمجھہ گیا کہ اسکا حریف اپنے مہرے آگے بڑھاکر اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا ھے۔ پاویل سمجھہ گیا کہ سخت کھلاڑی سے مقابلہ پڑا ھے اور وہ دل ھی دل میں افسوس کرنے لگا کہ شروع میں اس نے کھیل میں اتنی لاپرواھی سے کام کیوں لیا تھا۔

تین گھنٹے کے زبردست مقابلے کے بعد پاویل نے ھتھیار ڈال دئے۔ اس عرصے میں اس نے اپنی تمام مہارت اور سوجھہ بوجھہ سے کام لیا تھا۔ وہ بہت پہلے ھی سمجھہ گیا کہ اسکی ھار یقینی ھے۔ کھیل دیکھنے والوں کو اس وقت تک اسکا کوئی گمان بھی نہیں تھا۔ اس نے نظریں اٹھاکر اپنے رقیب کو دیکھا۔ لیدینیف اسے بڑی شفیق نظروں سے دیکھہ رھا تھا۔ اس کے انداز سے ظاھر تھا کہ وہ بھی جان گیا تھا کہ کھیل کا کیا انجام ھونے والا ھے۔ وہ ایستونیائی کھیل کو بڑے غور سے دیکھہ رھا تھا اور اس نے

اپنی اس خواهش کو چهپانے کی کوئی کوشش نہیں کی کہ کورچاگن هار جائے۔ اسے ابهی تک اس بات کا کوئی اندازہ نہیں هو سکا تها کہ بازی نے کیا رنگ اختیار کر لیا تها۔

«میں آخری مہرے تک لڑنے کا قائل هوں» پاویل نے کہا اور لیدینیف نے بهی سر هلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

پانچ دنوں میں پاویل لیدینیف کے ساتهه دس بازیاں کهیلا۔ سات میں اسے شکست هوئی، دو وہ جیتا اور ایک میں دونوں برابر رهے۔

ویمان بہت خوش تها۔

«شکریہ کامریڈ لیدینیف، آپ کا بہت شکریہ! کیا شکست دی هے آپ نے اسے! وہ اسی کا مستحق تها! اس نے هم تمام پرانے کهلاڑیوں کو نیچا دکها دیا تها اور اب ایک بوڑهے کهلاڑی کے هاتهوں هی اسے شکست کهانا پڑی۔ ها۔ ها!»

«هارنے میں کیسا مزا آتا هے، کیوں؟» اس نے اس فاتح کو چهیڑتے هوئے کہا جو اس بار شکست کها چکا تها۔

پاویل کا «چیمپین» کا لقب تو چهن گیا لیکن لیدینیف کی ذات میں اسے ایک ایسا دوست مل گیا جو بعد میں چل کر بہت کام کا ثابت هوا۔ وہ اب اس بات کو سمجهنے لگا کہ شطرنج میں اس کی شکست لازمی تهی کیونکہ شطرنج کے پینتروں کے بارے میں اسکا علم محض سطحی تها اور اس نے ایک ایسے ماهر کهلاڑی کے هاتهوں شکست کهائی تهی جو کهیل کی تمام باریکیوں سے واقف تها۔

پاویل اور لیدینیف نے اپنی دوستی کے دوران میں یہ دریافت کیا کہ ایک تاریخ ان دونوں کے لئے بڑی اهمیت رکهتی تهی۔ جس سال پاویل پیدا هوا تها اسی سال لیدینیف پارٹی میں داخل هؤا تها۔ وہ دونوں بالشویکوں کی پرانی اور نئی پود کی پوری طرح نمائندگی

کرتے تھے ۔ ایک کی پشت پر ایک طویل سرگرم سیاسی زندگی، روپوشی کی حالت میں کئی برس تک کام کرنے، زار کی جیلوں میں قید کی سزائیں کاٹنے اور پھر اس کے بعد اہم سرکاری کام انجام دینے کا تجربہ تھا اور دوسرے کے پیچھے تھی اس کی شعلہ صفت جوانی اور حالانکہ جد و جہد کا اسے ابھی صرف آٹھہ سال کا تجربہ تھا لیکن وہ ایسے آٹھہ سال تھے جن میں کئی زندگیاں سما سکتی تھیں ۔ اور وہ دونوں — وہ بوڑھا بھی اور وہ نوجوان بھی — زندگی کے رسیا اور آرزومند تھے اور دونوں ھی کی صحت خراب تھی ۔

شام کے وقت ایبنر اور کورچاگن کا کمرہ ایک کلب بن جاتا تھا ۔ تمام سیاسی خبریں یہیں سے معلوم ھوتی تھیں ۔ کمرے میں گفتگو اور قہقہوں کی چہل پہل رھتی تھی ۔ ویمان عام طور پر گفتگو کے دوران میں کوئی نہ کوئی فحش قصہ چھیڑ دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن ھمیشہ اسے دو طرفہ حملے کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا — ایک مارتا کی طرف سے اور ایک کورچاگن کی طرف سے ۔ یوں تو مارتا کوئی سخت چبھتی ھوئی بات کہہ‌کر اسکا منہہ بندکر دیتی تھی لیکن جب اسے کامیابی نہیں ھوتی تھی تو کورچاگن کو دخل دینا پڑتا تھا ۔

«ویمان تم جانتے ھو کہ تمہارا یہ خاص قسم کا «مذاق» ھم میں سے کسی کو پسند نہیں ھے» مارتا اس سے کہتی ۔

«میری تو سمجھہ ھی میں نہیں آتا کہ آخر تم اتنی نیچی سطح پر گرکر کیسے بات کر سکتے ھو» کورچاگن بھڑکتے ھوئے غصے کے ساتھہ کہنا شروع کرتا ۔

ویمان اپنا موٹا سا نچلا ھونٹ باھر کو نکال‌کر مجمع پر ایک نظر ڈالتا اور اسکی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں تضحیک کی چمک پیدا ھو جاتی ۔

«ہمیں سیاسی تعلیم کے محکمہ کے تحت اخلاقیات کا ایک نیا محکمہ کھولنا پڑیگا اور اسکے چیف انسپکٹر کی جگہ کے لئے ہم کورچاگن کا نام تجویز کرینگے۔ مارتا اعتراض کرتی ہے تو وہ تو سمجھہ میں آنے کی بات ہے، عورتوں کا تو پیشہ ہی اعتراض کرنا ہے۔ لیکن آخر کورچاگن کیوں معصوم بننے کی کوشش کرتا ہے گویا کومسومول کا ننھا سا بچہ جنگل بیابان میں آکر پھنس گیا ہو... اور مجھے اس سے بھی بری تو یہ بات لگتی ہے کہ کل کا چھوکرا مجھے نصیحت کرنے چلا ہے۔»

کمیونسٹ اخلاقیات کے بارے میں ایک گرماگرم بحث کے بعد گندے مذاقوں کے سوال پر اصولی نقطۂ نظر سے غور کیا گیا۔ مارتا نے مختلف لوگوں کے خیالات ایبنر کو جرمن میں سمجھائے۔

ایبنر نے کہا «گندے مذاق کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں پاویل سے متفق ہوں۔»

ویمان کو ہار ماننا پڑی۔ اس نے اس معاملے کو ہنسی میں ٹال دینے کی حتی‌الامکان کوشش کی لیکن اسکے بعد سے کبھی گندے قصے نہیں سنائے۔

پاویل سمجھتا تھا کہ مارتا کومسومول کی ممبر ہوگی کیونکہ وہ اسے انیس برس سے زیادہ کی نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ۱۹۱۷ء سے پارٹی میں تھی، اس کی عمر اکتیس برس تھی اور وہ لاطویہ کی کمیونسٹ پارٹی کی ایک سرگرم کارکن تھی۔ ۱۹۱۸ء میں سفید فوجوں نے اسے موت کی سزا دی تھی لیکن بعد میں قیدیوں کے عوض کچھہ اور ساتھیوں کے ساتھہ اسے سوویت حکومت کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ اس وقت «پراودا» کے دفتر میں محکمۂ ادارت میں کام کر رہی تھی اور اس کے ساتھہ ہی یونیورسٹی میں پڑھہ رہی تھی۔ قبل اسکے کہ پاویل کو اس بات کا احساس ہوتا انکے درمیان گہری دوستی ہو گئی تھی

اور وہ چھوٹی سی لاطویائی عورت، جو اکثر ایبنر سے ملنے چلی آیا کرتی تھی، ان «پانچوں کی منڈلی» میں شامل ہو گئی۔

ایگلت نام کا ایک روپوش لاطویائی کارکن اسے اکثر اس بات پر چھیڑا کرتا تھا۔ «اور ماسکو میں وہ بیچارہ اوزول تمہارے غم میں گھلا جا رہا ہوگا؟ مارتا تمہیں اسکا ذرا بھی خیال نہیں ہے؟»

ایک دن صبح اٹھنے کی گھنٹی بجنے سے کچھہ قبل ھی سینی‌ٹوریم میں ایک مرغ کی زوردار بانگ گونج گئی۔ وھاں کے تمام ملازمین اس جہاں‌گرد پرند کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ انہیں اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ ایبنر جو مرغ کی بولی کی بہت اچھی نقل اتار لیتا تھا، انہیں بیوقوف بنا رہا تھا۔ کئی دن تک روز صبح یہی واقعہ پیش آتا رہا اور ایبنر دل ھی دل میں بیحد خوش ھوتا رہا۔

سینی‌ٹوریم میں ایک مہینہ رہنے کے بعد پاویل کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے بستر سے اٹھنے کو منع کردیا۔ ایبنر کو بڑی فکر لگ گئی۔ وہ اس باھمت نوجوان بالشویک کو بہت پسند کرنے لگا تھا جس میں زندگی اور کام کرنے کا حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ھوا تھا۔ لیکن افسوس کہ اتنی کمسنی میں ھی اسکی صحت بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ اور جب مارتا نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر کورچاگن کا مستقبل کتنا المناک بتاتے ھیں تو ایبنر کو شدید تکلیف ھوئی۔

پاویل اس کے بعد سینی‌ٹوریم میں جتنے دن رہا بستر ھی سے لگا رہا۔ اپنے آس پاس کے لوگوں پر اس نے اپنی تکلیف ظاھر نہیں ھونے دی لیکن مارتا اسکے چہرے کی خوفناک زردی دیکھہ‌کر سمجھہ گئی کہ اسے یقیناً شدید تکلیف ھو رھی ھوگی۔ پاویل کی روانگی کی تاریخ سے ایک ھفتہ پہلے اسے پارٹی کی یوکرینی مرکزی

کمیٹی کا ایک خط ملا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ سینی ٹوریم کے ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق اسکی چھٹی دو مہینے کے لئے بڑھا دی گئی تھی کیونکہ ڈاکٹروں نے اسے کام کے قطعی ناقابل قرار دے دیا تھا۔ اسکے خرچ کے پیسے بھی اسی خط کے ساتھ وصول ہوئے۔

پاویل نے یہ پہلا صدمہ اسی طرح برداشت کیا جس طرح اب سے کئی برس پہلے وہ مکےبازی کی مشق کے دوران میں ژوخرائی کے گھونسے برداشت کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ گھونسہ کھاکر زمین پر گر پڑتا تھا لیکن فوراً ہی پھر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

اسکی ماں کا بھی ایک خط آیا تھا جس میں اس نے پاویل سے کہا تھا کہ وہ اسکی ایک بہت پرانی سہیلی البینا کیوتسام سے جاکر مل لے جو یوپاٹوریا سے تھوڑے ہی فاصلے پر کسی چھوٹے سے بندرگاہ میں رہتی تھی۔ پاویل کی ماں اپنی سہیلی سے پندرہ برس سے نہیں ملی تھی اور اس نے پاویل کو بڑی منت کے ساتھ لکھا تھا کہ کریمیا میں اپنے قیام کے دوران میں اس سے جاکر ضرور مل لے۔ یہ خط آگے چل کر پاویل کی زندگی میں بہت اہم ثابت ہوا۔

ہفتے بھر بعد اسکے سینی ٹوریم کے دوستوں نے بڑے تپاک سے اسے رخصت کرکے جہاز پر سوار کرا دیا۔ ایبنر نے بھائی کی طرح اسے گلے لگاکر پیار کیا۔ مارتا اس وقت کہیں گئی ہوئی تھی۔ اسلئے وہ اس سے الوداع کہے بغیر ہی چلا گیا۔

دوسرے دن صبح پاویل نے بندرگاہ پر ایک گھوڑا گاڑی پکڑی جو اسے ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچا گئی جس کے سامنے ایک باغیچہ بھی تھا۔

کیوتسام کنبے میں پانچ افراد تھے۔ بچوں کی ماں البینا جو بھرے ہوئے جسم کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی، اسکی سیاہ آنکھوں میں غم بھرا ہوا تھا اور اسکے سن رسیدہ چہرے پر اب بھی حسن کے کچھ آثار باقی تھے۔ اس کے علاوہ اسکی دونوں بیٹیاں لولا اور تایا بھی اسی کے ساتھ رہتی تھیں۔ لولا کا ایک چھوٹا سا بیٹا بھی تھا۔ اور پانچواں شخص تھا بزرگ خاندان بوڑھا کیوتسام جو ایک موٹا تازہ، بدمزاج، بوڑھا سا آدمی تھا اور دیکھنے میں بالکل جنگلی سور معلوم ہوتا تھا۔

بوڑھا کیوتسام ایک کوآپریٹو اسٹور میں کام کرتا تھا۔ چھوٹی بیٹی تایا وقتاً فوقتاً چھوٹے موٹے پھٹکل کام کرتی رہتی تھی۔ لولا جو کسی زمانے میں ٹائپسٹ تھی حال ھی میں اپنے شوھر کو طلاق دیکر یہاں آ گئی تھی کیونکہ وہ بلا کا شرابی تھا اور اسے مارتا پیٹتا بہت تھا۔ وہ اب گھر ھی پر رہتی تھی اور اپنے چھوٹے سے بیٹے کی پرورش کے علاوہ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ھاتھہ بٹاتی تھی۔

ان دو بیٹیوں کے علاوہ انکا ایک بیٹا بھی تھا — جارج۔ پاویل کے وھاں پہنچنے کے زمانے میں وہ لینن گراڈ میں تھا۔

سارے کنبے نے پاویل کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ صرف وہ بوڑھا اس نووارد کو شبہہ اور عداوت کی نظر سے دیکھتا رھا۔

پاویل نے بڑے صبر کے ساتھہ البینا کو گھر کا تمام حال چال بتایا اور ساتھہ ھی اسے بھی کیوتسام گھرانے کی زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔

لولا کی عمر بائیس برس کی تھی۔ وہ بہت ھی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال، چوڑا سا کھلا ہوا چہرہ۔ اس نے فوراً پاویل کو رازدار بنا لیا اور اسے اپنے گھر کی تمام اندرونی

انہیں بہت ذلیل اور خوار سمجھتا تھا۔ ماں اپنے شوہر سے جو بھی رقم اینٹھہ پاتی وہ، اور اسکے علاوہ تایا کی ساری کمائی وہ اپنے بیٹے کو بھیج دیتی تھی۔ اور ادھر جارج انٹرنس کے امتحان میں فیل ہو گیا تھا اور وہ اپنے چچا کے یہاں رہ‌کر لینن‌گراڈ کے مزے لوٹ رہا تھا اور بذریعہ تار اپنی ماں کے پاس پیسوں کا تقاضہ بھیج‌کر وہ اسے دہشت زدہ کر دیتا تھا۔

جس دن پاویل وہاں پہنچا تھا اس دن شام تک تایا سے اسکی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ جب شام کو وہ آئی تو ماں جلدی جلدی بھاگی ہوئی اس سے ملنے گیلری ہی میں جا پہنچی اور پاویل نے سنا کہ وہ چپکے چپکے اسے اسکے آنے کی اطلاع دے رہی ہے۔ اس لڑکی نے بہت شرماتے ہوئے اس اجنبی نوجوان سے ہاتھہ ملایا اور اسکے چھوٹے چھوٹے کانوں کی لویں تک سرخ ہو گئیں اور ہاتھہ ملانے کے بعد بھی پاویل اسکا مضبوط گھٹے‌دار ہاتھہ چند لمحوں تک اپنے ہاتھوں میں تھامے رہا۔

تایا کا انیسواں سال چل رہا تھا۔ وہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن بڑی بڑی بھوری آنکھوں، ترچھی چینیوں جیسی بھوؤں، خوبصورت ناک اور بھرے ہوئے پھول جیسے ہونٹوں کی وجہ سے اس میں کشش بڑی تھی۔ اسکی سخت نوخیز چھاتیاں اسکے دھاری‌دار بلاؤز کے نیچے ابھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

دونوں بہنیں دو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں رہتی تھیں۔ تایا کے کمرے میں ایک تنگ سا لوہے کا پلنگ، ایک درازوں والی الماری، جس پر مختلف چھوٹی موٹی چیزیں رکھی ہوئی تھیں، ایک چھوٹا سا آئینہ اور دیوار پر درجنوں فوٹو اور تصویری پوسٹ‌کارڈ تھے۔ کھڑکی پر دو گلدان رکھے ہوئے تھے جن میں سرخ جیرینیم اور ہلکے پیلے اور گلابی ایسٹر کے پھول لگے ہوئے تھے۔ کھڑکی

باتیں بھی بتا دیں ۔ اس نے پاویل کو بتایا کہ وہ بوڑھا پورے کنبے کے ساتھہ انتہائی جابرانہ انداز میں پیش آتا ہے اور اگر کسی نے ذرا بھی آزادی سے کام لینے کی کوشش کی تو وہ فوراً اسکا سر کچل دیتا ہے ۔ اس تنگ نظر، کٹر اور حجتی بوڑھے کی وجہ سے تمام لوگوں کے دل میں ایک مستقل دہشت بیٹھی ہوئی تھی ۔ اسکی انہیں خصلتوں کی وجہ سے اسکے بچے اسے سخت ناپسند کرتے تھے اور اسکی بیوی تو، جس نے اسکی مطلق العنانی کے خلاف پچیس برس تک ناکام لڑائی لڑی تھی، اس سے نفرت ہی کرتی تھی ۔ بیٹیاں ہمیشہ اپنی ماں کی طرفداری کرتی تھیں ۔ گھر کی یہ روز روز کی لڑائی انکی زندگی میں زہر گھول رہی تھی ۔ دن رات جھائیں جھائیں اور جھگڑا فساد مچا رہتا تھا ۔

اس کنبے کی ایک اور لعنت بقول لولا کے اسکا بھائی جارج تھا جو خالصتاً نکما اور آوارہ آدمی تھا ۔ وہ بہت ہی بددماغ اور شیخی خور تھا اور اچھے کھانے، تیز شراب اور عمدہ کپڑوں کے علاوہ اسے اور کسی چیز کی فکر نہیں تھی ۔ اسکول کی تعلیم ختم کرکے جارج نے، جو اپنی ماں کا لاڈلا تھا، دارالسلطنت جانے کا اعلان کیا اور اس سفر کے لئے رقم کا مطالبہ کیا ۔

«میں یونیورسٹی جا رہا ہوں ۔ لولا سے کہو اپنی انگوٹھی بیچ دے اور تمہارے پاس بھی تو کچھہ ضرور ہوگا جسے رہن رکھہ کر قرض مل سکتا ہے ۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے اور مجھے اس سے بحث نہیں کہ تم کہاں سے ان پیسوں کو مہیا کرتی ہو ۔»

جارج اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اسکی ماں اسکی کوئی بات نہیں ٹال سکتی اسلئے وہ بڑی بےحیائی سے اسکی محبت کا بیجا فائدہ اٹھاتا تھا ۔ وہ اپنی بہنوں کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا اور

«یہ تو اسے پہلے سے دیکھہ لینا چاھئے تھا کہ وہ کس سے شادی کر رھی ھے۔»

البینا نے دخل دیا۔ اپنے غصے کو دبانے کی ناکام کوشش کرتے ھوئے اس نے جلدی سے کہا «آخر باھر کے ایک آدمی کے سامنے ان تمام باتوں کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ھے؟ تمہارے پاس اور کوئی بات کرنے کو نہیں ھے؟»

بوڑھا مڑکر اس پر جھپٹ پڑا:

«میں جانتا ھوں کہ مجھے کیا بات کرنا چاھئے! اور تم کب سے مجھہ پر حکم چلانے لگیں!»

اس رات پاویل بڑی دیر تک لیٹا ھوًا کیوتسام گھرانے کی زندگی کے بارے میں سوچتا رھا۔ وہ یہاں اتفاق سے آیا تھا لیکن اس گھریلو ڈرامے میں وہ بھی بلا ارادہ شریک ھو گیا تھا۔ وہ سوچ رھا تھا کہ وہ ان دونوں بیٹیوں اور انکی ماں کو اس غلامی سے چھڑانے کے لئے انکی کیا مدد کر سکتا ھے۔ اسکی اپنی زندگی کا خود کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں تھا۔ ابھی بہت سے مسئلے حل کرنا تھے اور کوئی قطعی اور آخری قدم اٹھانا اب پہلے کے مقابلے میں اور بھی دشوار ھو گیا تھا۔

صرف ایک ھی راستہ تھا کہ کنبہ ٹوٹ جائے — ماں اور بیٹیاں اس بوڑھے کو چھوڑ دیں۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ پاویل اس کنبے میں یہ انقلاب کرانے کی ذمہداری نہیں لے سکتا تھا کیونکہ وہ کچھہ ھی دن میں وھاں سے چلا جانے والا تھا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ پھر کبھی ان لوگوں سے نہ مل سکےگا اس ٹھہرے ھوئے گندے پانی کو چھیڑنے کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ حالات کو انکی روش پر چھوڑ دے؟ لیکن اس بوڑھے کی نفرت انگیز صورت اسے چین نہ لینے دیتی تھی۔ پاویل کے ذھن میں کئی

ترکیبیں آئیں لیکن مزید غور کرنے پر اس نے ان سب کو ناقابل عمل پاکر رد کر دیا۔

دوسرے دن اتوار تھا اور جب پاویل شہر سے گھوم کر لوٹا تو اس نے تایا کو گھر پر اکیلے پایا۔ باقی لوگ اپنے رشتہداروں سے ملنے گئے ہوئے تھے۔

پاویل اسکے کمرے میں گیا اور تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔

«آخر تم کبھی سیر تفریح کو کیوں نہیں جاتیں؟» اسنے تایا سے پوچھا۔

«مجھے کہیں جانا اچھا نہیں لگتا» اسنے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

پاویل کو اپنی رات والی ترکیبیں یاد آئیں اور اس نے انہیں تایا کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

باقی لوگوں کے لوٹنے سے پہلے اپنی بات ختم کر لینے کے خیال سے اس نے جلدی جلدی بولنا شروع کیا اور فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔

«سنو تایا ہم دونوں اچھے دوست ہیں۔ پھر ہم دونوں کے درمیان کوئی پردہ حائل کیوں رہے؟ میں جلد ہی یہاں سے چلا جاوں گا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں تمہارے گھروالوں سے اس وقت ملا جب میں خود مصیبت میں مبتلا ہوں ورنہ بالکل ہی مختلف صورت ہو سکتی تھی۔ اگر میری ملاقات سال بھر پہلے بھی ہو گئی ہوتی تو ہم سب لوگ یہاں سے ساتھ چل سکتے تھے۔ تمہارے اور لولا جیسے لوگوں کے لئے کہیں بھی کام کی کمی نہیں ہے۔ بوڑھے کی بات جانے دو اسے راہ راست پر لانا ناممکن ہے۔ لیکن فی‌الحال تو کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے ابھی تک نہیں معلوم کہ میرا آگے کیا انجام ہوگا۔ اس وقت تو میں بالکل مجبور ہوں۔ لیکن

چارہ ھی کیا ھے۔ میں اس بات کے لئے لڑوں گا کہ مجھے پھر کام پر بھیجا جائے۔ ڈاکٹروں نے میرے بارے میں نہ جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں لکھہ دی ھیں اور میرے ساتھی مسلسل اس کوشش میں ھیں کہ میں اپنی صحت درست کر لوں۔ لیکن وہ تو بعد میں دیکھا جائیگا... میں ماں کو خط لکھہ‌کر تمہاری مصیبتوں کے بارے میں اس کا مشورہ لوں گا۔ میں حالات کو اسی طرح نہیں چلنے دے سکتا۔ لیکن تایا تمہیں یہ سمجھہ لینا چاھئے کہ اس کا مطلب یہ ھے کہ تمہیں اپنی موجودہ زندگی کو بالکل چھوڑ دینا ھوگا۔ کیا تم یہ چاھتی ھو اور کیا تم میں یہ کرنے کی طاقت ھے؟»

تایا نے اسے دیکھا۔

«میں چاھتی تو ھوں» اس نے نرمی سے کہا۔ «لیکن جہاں تک طاقت کا سوال ھے میں کچھہ کہہ نہیں سکتی۔»

پاویل اسکے تذبذب کو بخوبی سمجھہ رہا تھا۔

«فکر نہ کرو تایا! اگر آدمی میں ارادہ ھو تو سب ٹھیک ھو جاتا ھے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کیا تمہیں اپنے گھروالوں سے بہت لگاؤ ھے؟»

تایا اس سوال کے لئے تیار نہ تھی اور وہ ایک لمحے کے لئے جھجکتی رھی۔

«مجھے ماں پر بڑا ترس آتا ھے» اس نے آخرکار کہا۔ «بابا نے انکی زندگی اجیرن کر دی ھے اور اب جارج انکی جان کے پیچھے پڑا ھے۔ ان کی وجہ سے مجھے بڑا افسوس ھوتا ھے حالانکہ انہوں نے مجھے کبھی اتنا پیار نہیں کیا جتنا وہ جارج سے کرتی ھیں...»

وہ دونوں بڑی دیر تک دل کھول‌کر باتیں کرتے رھے۔ گھر کے باقی لوگوں کے واپس آنے سے تھوڑی ھی دیر قبل پاویل نے مذاق میں کہا:

«بڑے تعجب کی بات ھے کہ تمہارے باپ نے ابھی تک تمہاری کہیں شادی کیوں نہیں کرا دی۔»

تایا نے اس بات کے خیال سے ھی خائف ھوکر کانوں پر ھاتھہ رکھہ لئے۔

«نہیں نہیں۔ میں شادی وادی نہیں کرونگی۔ میں دیکھہ چکی ھوں کہ لولا کا کیا حال ھوا۔ میں کسی بھی حالت میں شادی نہیں کرونگی۔»

پاویل ھنسنے لگا۔

«تو تم نے تمام عمر کے لئے یہ فیصلہ کر لیا ھے۔ لیکن فرض کرو کہ کوئی نیک، خوبصورت نوجوان تمہیں مل جائے تو؟»

«نہیں میں تب بھی نہیں کرونگی۔ شروع شروع میں عشق کرتے وقت تو سبھی نیک ھوتے ھیں۔»

پاویل نے تسلی دینے کے انداز میں اسکے کندھے پر اپنا ھاتھہ رکھا۔

«ٹھیک ھے تایا۔ تم شوھر کے بغیر بھی اپنی زندگی اچھی طرح کاٹ سکتی ھو۔ لیکن تمہیں ان نوجوانوں کے ساتھہ اتنا ظلم تو نہ کرنا چاھئے۔ خیریت ھے کہ تم کو یہ خیال نہیں ھوا کہ میں تم سے عشق کر رھا ھوں ورنہ بڑی مصیبت ھو جاتی» اور یہ کہہ‌کر اسنے نہایت برادرانہ انداز میں اسکا بازو تھپتھپا دیا۔

«تمہارے جیسے لوگ تو دوسری ھی قسم کی لڑکیوں سے شادی کرتے ھیں» اس نے بہت دبی زبان سے کہا۔

کچھہ دن بعد پاویل خارکوف چلا گیا۔ تایا، لولا، البینا اور اسکی بہن روزا اسے چھوڑنے اسٹیشن تک آئے۔ البینا نے اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ اسکی بیٹیوں کو نہیں بھولے گا اور انکی دشواریوں کا

کوئی حل نکالنے میں انکی مدد کریگا۔ انہوں نے اسے کسی قریبی
عزیز کی طرح رخصت کیا اور چلتے وقت تایا کی آنکھوں میں آنسو
ڈبڈبا آئے۔ اپنے ڈبے کی کھڑکی سے پاویل لولا کے سفید رومال اور
تایا کے دھاری‌دار بلاؤز کو رفتہ رفتہ اوجھل ہوتے دیکھتا رہا یہاں
تک کہ وہ بالکل ہی نظر سے غائب ہو گئے۔

خارکوف پہنچ کر پاویل سیدھا اپنے دوست پیتیا ناویکوف کے گھر
گیا کیونکہ وہ ڈورا کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ سفر کی تکان
دور ہوتے ہی وہ مرکزی کمیٹی کے دفتر گیا اور وہاں آکم کا انتظار
کرنے لگا۔ اور آخرکار جب وہ دونوں اکیلے میں ملے تو اس نے
مطالبہ کیا کہ اسے فوراً کام پر بھیج دیا جائے۔ آکم نے انکار میں
اپنا سر ہلایا۔

«یہ نہیں ہو سکتا پاویل! ہم لوگوں کو ڈاکٹری کمیشن اور
مرکزی کمیٹی دونوں کی طرف سے فیصلے کی شکل میں یہ ہدایت
دی گئی ہے کہ تمہاری صحت کی نازک حالت کو دیکھتے ہوئے تمہیں
علاج کے لئے نیوروپیتھالاجکل انسٹی‌ٹیوٹ بھیج دیا جائے اور کام
کرنے کی قطعی اجازت نہ دی جائے۔»

«آکم، مجھے اسکی قطعی پرواہ نہیں ہے کہ وہ لوگ کیا کہتے
ہیں! میں تو تم سے درخواست کر رہا ہوں — مجھے کام کرنے کا
موقع تو دو! ہر وقت ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال کا چکر لگانے
سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔»

آکم نے انکار کرنے کی بہت کوشش کی۔ «ہم لوگ فیصلے
کے خلاف کیسے جا سکتے ہیں۔ پاولوشا تم آخر اتنی سیدھی سی بات
کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ سب تمہارے ہی بھلے کے لئے کیا جا رہا
ہے؟» اسنے پاویل کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پاویل نے
اتنے زوردار ڈھنگ سے اپنی پیروی کی کہ آکم کو آخرکار راضی
ہونا ہی پڑا۔

دوسرے ھی دن سے پاویل مرکزی کمیٹی کی سکریٹریٹ کے اسپیشل ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے لگا ـ اسے یقین تھا کہ ایک بار جہاں اسنے کام کرنا شروع کیا اسکی کھوئی ھوئی طاقت واپس آ جائیگی ـ لیکن جلد ھی اسے اپنی غلطی کا احساس ھو گیا ـ وہ آٹھہ گھنٹے تک متواتر اپنی میز پر بیٹھا کام کرتا رھتا تھا ـ بیچ میں وہ کھانا کھانے کے لئے بھی نہیں جاتا تھا محض اسلئے کہ تین سیڑھیاں پار کرکے نیچے کھانے کے کمرے میں جانا اسکے بس کی بات نہیں تھی ـ اکثر اسکا ھاتھہ یا پاؤں بالکل سن پڑ جاتا تھا اور کبھی کبھی تو چند لمحوں کے لئے اسکا پورا جسم مفلوج ھو جاتا تھا تقریباً ھمیشہ ھی اس پر بخار کی سی کیفیت طاری رھتی تھی ـ اور اکثر صبح کے وقت اسکے جسم میں بستر سے اٹھنے بھر کی بھی طاقت نہیں رہ جاتی تھی اور جب اس دورے کا اثر کم ھوتا تھا تب وہ بہت دکھہ اور مایوسی کے ساتھہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے کام پر پہنچنے میں پورے ایک گھنٹے کی دیر ھو جائے گی ـ آخرکار وہ دن بھی آیا کہ اسے کام پر دیر سے آنے کے لئے باضابطہ طور پر ٹوکا گیا اور وہ سمجھہ گیا کہ یہ اس چیز کی ابتدا ھے جس سے وہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ ڈرتا تھا ـ وہ رفتہ رفتہ لڑنے والوں کی صف سے باھر چلا جا رھا تھا ـ

آکم نے اسے دوسرے کاموں پر لگاکر دوبار اسکی مدد کی لیکن ھونی ھوکر رھی ـ کام شروع کرنے کے مہینہ بھر بعد ھی پاویل پھر بستر سے لگ گیا ـ اس وقت اسے باژانووا کے رخصتی الفاظ یاد آئے ـ اس نے اسے خط لکھا اور وہ اسی دن اس سے ملنے آئی اور اسکی تسلی کے لئے وھی بات کہی جو وہ سننا چاھتا تھا کہ اسے فوراً ھسپتال میں داخل ھونے کی کوئی ضرورت نہیں ھے ـ

«اچھا تو تمہارا مطلب ہے کہ میری حالت اتنی بہتر ہے کہ مجھے علاج کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیوں؟» اس نے مذاق میں کہا لیکن باژانووا پر اسکا کوئی اثر نہیں ہوا۔

جسم میں تھوڑی سی طاقت آتے ہی وہ پھر مرکزی کمیٹی کے دفتر پہنچا۔ لیکن اس بار آکم ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ پاویل کو ہسپتال بھیجنے پر مصر تھا۔

«میں کہیں نہیں جاؤنگا» پاویل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ «یہ سب فضول ہے۔ اور یہ بات میں بالکل مستند طور پر کہہ سکتا ہوں۔ اب میرے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں پنشن لیکر آرام کروں۔ لیکن میں یہ کبھی نہیں کرونگا۔ تم مجھے کام چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ میں ابھی چوبیس برس کا ہوں اور میں محنت کے ناقابل اپاہج کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ میں ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال کا چکر کب تک لگاتا رہونگا جبکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس سے مجھے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ تمہیں مجھے کوئی نہ کوئی کام تو دینا ہی پڑیگا، کوئی ایسا کام جو میں اپنی موجودہ حالت میں کر سکوں۔ میں گھر پر کام کر سکتا ہوں یا پھر مجھے دفتر میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ مجھے کوئی قلم گھسنے کا کام نہ دینا مثلاً باہر بھیجے جانے والے خطوں پر نمبر ڈالنا وغیرہ۔ مجھے کوئی ایسا کام ملنا چاہئے جس میں مجھے یہ تسکین حاصل ہو سکے کہ میں ابھی تک مفید ہوں۔»

پاویل کی آواز مسلسل اونچی ہوتی جا رہی تھی اور شدت جذبات کی وجہ سے اس میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔

آکم کو پاویل پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جوشیلے نوجوان کے لئے، جس نے اپنی مختصر سی عمر پارٹی کی خدمت میں صرف کر دی ہو، اس خیال سے سمجھوتہ کرنا کتنا بڑا المیہ

تھا کہ وہ جدوجہد سے بالکل الگ ہوکر مورچے کے پیچھے بہت دور جاکر خالی بیٹھنے پر مجبور ہے ــ اس نے عہد کیا کہ وہ اسکی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کریگا ــ

«اچھا پاویل اطمینان رکھو ــ کل سکریٹیریٹ کی میٹنگ میں میں ساتھیوں کے سامنے تمہارا مسئلہ اٹھاؤنگا ــ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی طرف سے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھونگا ــ»

پاویل بڑی دقت سے اٹھا اور اسنے آکم کا ھاتھہ تھام لیا ــ

«آکم کیا تم سچ مچ سمجھتے ہو کہ زندگی مجھے ایک کونے میں دھکیل کر مجھے کچل سکتی ہے؟ جب تک میرے سینے میں دل دھڑکتا ہے» اور یہ کہہ کر اسنے آکم کا ھاتھہ اپنے سینے پر رکھا تاکہ وہ اسکے دل کی مدھم دھڑکن محسوس کر سکے ــ «جب تک یہ دھڑکتا رھیگا مجھے کوئی بھی پارٹی سے الگ نہیں کر سکتا ــ صرف موت ھی مجھے لڑنے والوں کی صف سے ھٹا سکتی ہے ــ میرے دوست اس بات کو ھمیشہ یاد رکھنے کی کوشش کرنا ــ»

آکم نے کچھہ بھی نہ کہا ــ وہ جانتا تھا کہ یہ کھوکھلی لفاظی نہیں تھی ــ یہ ایک ایسے سپاھی کی پکار تھی جو لڑائی میں بری طرح زخمی ھو گیا تھا ــ وہ جانتا تھا کہ کورچاگن جیسے لوگ اسکے علاوہ اور کسی طرح نہیں سوچ سکتے، اور نہ اس سے مختلف بات کہہ سکتے ھیں ــ

دو دن بعد پاویل کو آکم نے یہ اطلاع دی کہ اسے ایک بڑے اخبار کے عملے میں کام کرنے کا موقع دیا جائیگا بشرطیکہ اسے ادبی کام کے قابل پایا گیا ــ اخبار کے دفتر میں پاویل کا بڑے تپاک سے استقبال کیا گیا اور ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر نے، جو پارٹی کی بہت پرانی کارکن اور یوکرین کی مرکزی کنٹرول کمیٹی کی مجلس صدارت کی ممبر تھیں، اس سے سوال جواب کئے ــ

«کامریڈ آپنے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟» انہوں نے پوچھا ــ

«تین سال پرائمری اسکول میں پڑھا ہوں۔»
«پارٹی کے کسی سیاسی اسکول میں کبھی تعلیم پائی ہے؟»
«نہیں۔»
«خیر۔ کچھ لوگ اسکے بغیر بھی بہت اچھے جرنلسٹ بن گئے ہیں۔ کامریڈ آکم نے ہمیں تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ ہم لوگ تمہیں گھر پر کرنے کے لئے کام دے سکتے ہیں اور عام طور پر ہم تمہیں تمام سہولتیں بھی دینے کو تیار ہیں۔ لیکن اس قسم کے کام کے لئے کافی علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر ادب اور زبان کی۔»

ان تمام باتوں سے پاویل کو اندیشہ ہو چلا کہ اسے یہاں بھی مایوسی ہوگی۔ آدھے گھنٹے کی اس ملاقات کے بعد وہ سمجھ گیا کہ اسکا علم ناکافی تھا اور جو مضمون اس نے نمونے کے طور پر پیش کیا تھا وہ اسے واپس کر دیا گیا۔ اس میں تقریباً تین درجن عبارت اور ہجے کی غلطیوں پر سرخ پنسل کے نشان لگے ہوئے تھے۔

«کامریڈ کورچاگن تم میں کافی صلاحیت ہے» ایڈیٹر نے کہا۔ «اور تھوڑی سی محنت کرکے تم کافی اچھا لکھنا سیکھ سکتے ہو۔ لیکن ابھی تو تمہاری قواعد میں خامیاں ہیں۔ تمہارے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں روسی زبان کافی اچھی طرح نہیں آتی ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ تمہیں پڑھنے کا موقع ہی کہاں ملا۔ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ہم لوگ تمہیں کوئی کام نہیں دے سکتے لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں تم میں صلاحیت ضرور ہے۔ اگر تمہارے مضمون کا مواد بدلے بغیر اسکی عبارت درست کردی جائے تو وہ بہت عمدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں خود ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے جو دوسروں کے مضامین درست کر سکیں۔»

کورچاگن اپنی چھڑی کا سہارا لیکر اٹھا ۔ اسکی داھنی پلک پھڑک رھی تھی ۔

«ھاں میں آپکی دشواری سمجھتا ھوں ۔ میں اب جرنلسٹ کیا بنوں گا؟ ایک زمانے میں بھٹی میں کوئلہ جھونکنے کا کام میں بہت اچھا کر لیتا تھا اور بجلی کا مستری بھی میں برا نہیں تھا ۔ گھوڑے کی سواری اچھی کر لیتا تھا اور کومسومول کے نوجوانوں کو جوش دلانے میں بھی ھوشیار تھا ۔ لیکن میں خود سمجھتا ھوں کہ آپکے مورچے پر میں بالکل ھی بیکار ثابت ھونگا ۔»

وہ ھاتھہ ملاکر چلا گیا ۔

برآمدے کے موڑ پر وہ لڑکھڑا گیا اور اگر ادھر سے گزرتی ھوئی ایک عورت نے اسے روک نہ لیا ھوتا تو وہ گر پڑتا ۔

«کیا بات ھے کامریڈ؟ آپ تو بیمار معلوم ھوتے ھیں!»

پاویل کو چند سیکنڈ بعد ھوش آیا ۔ اسنے آھستہ سے اس عورت کو ایک طرف ھٹا دیا اور چھڑی پر پورے بدن کا بوجھہ ڈالے ھوئے آگے چل دیا ۔

اس دن سے پاویل کو محسوس ھونے لگا کہ اسکی زندگی تنزل کی طرف مائل ھو گئی ھے ۔ اب کام کرنے کا کوئی سوال ھی نہیں تھا ۔ وہ اب زیادہ‌تر بستر سے ھی لگا رھتا تھا ۔ مرکزی کمیٹی نے اسے کام سے چھٹی دلا دی اور اسکی پنشن مقرر کر دی ۔ کچھہ دن بعد اسکی پنشن آئی اور اسکے ساتھہ ھی یہ سند بھی کہ اسکی علالت اور معذوری کی وجہ سے اسے کام سے چھٹی دے دی گئی ھے ۔ مرکزی کمیٹی نے اسے کچھہ پیسہ دے دیا اور اسکے کاغذات اسکے حوالے کر دئے جن سے اسے حق مل گیا کہ وہ جہاں چاھے جا سکتا تھا ۔

اسے مارتا کا ایک خط ملا جس میں اسنے اسے ماسکو آنے اور اس کے یہاں رہ کر کچھہ دن آرام کرنے کی دعوت دی تھی ۔ پاویل

یوں بھی ماسکو جانا چاھتا تھا کیونکہ اسے ابھی تک ایک موھوم سی امید باقی تھی کہ کل یونین مرکزی کمیٹی اسے کوئی ایسا کام ضرور دلا دیگی جس میں اسے زیادہ بھاگنا دوڑنا نہ پڑے ۔ لیکن ماسکو میں بھی اسے علاج کرانے کا ھی مشورہ دیا گیا اور کسی اچھے ھسپتال میں اسکے رھنے کا انتظام کر دینے کا وعدہ بھی کیا گیا لیکن اسنے انکار کر دیا ۔

مارتا اپنی ایک دوست نادیا پیٹرسن کے ساتھہ رھتی تھی ۔ اسکے یہاں پاویل کے انیس دن دیکھتے دیکھتے گزر گئے ۔ پاویل کو زیادہ وقت اکیلے ھی گزارنا پڑتا تھا کیونکہ وہ دونوں نوجوان عورتیں تو صبح ھی کام پر چلی جاتی تھیں اور شام تک لوٹ کر نہیں آتی تھیں ۔ مارتا کے پاس ایک اچھی خاصی لائبریری تھی ۔ پاویل اسی میں سے کتابیں نکال نکال کر پڑھتا رھتا تھا ۔ شام کا وقت ان لڑکیوں اور انکی سہیلیوں کے ساتھہ ھنسی خوشی کٹ جاتا تھا ۔

اسکے پاس کیوتسام کی بیوی اور بیٹیوں کے بھی کئی خط آ چکے تھے جن میں اسے بار بار آنے کی دعوت دی گئی تھی ۔ ان لوگوں کی زندگی ناقابل برداشت ھوتی جا رھی تھی اور ان لوگوں کو اسکی مدد کی ضرورت تھی ۔

اور ایک دن صبح کورچاگن گسیاتنکوف اسٹریٹ کے اس چھوٹے سے پرسکون فلیٹ کو چھوڑکر چل دیا ۔ ریل اسے بڑی تیزی سے جنوب کی سمت سمندر کی طرف لئے جا رھی تھی ـــ خزاں کی بارش اور رطوبت سے بہت دور جنوبی کریمیا کے معتدل ساحل کی طرف ۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھا ھؤا تار کے کھمبوں کو تیزی سے پیچھے بھاگتے ھوئے دیکھہ رھا تھا ۔ اسکی تیوریوں پر بل تھے اور اسکی کالی آنکھوں میں عزم مصمم کی چمک تھی ۔

آٹھواں باب

نیچے بےترتیب نکیلی چٹانوں پر سمندر کی موجیں سر مار رہی تھیں۔ دور ترکی کی سمت سے آنے والے گرم اور خشک ہوا کے جھونکے اسکے چہرے پر پنکھا جھل رہے تھے۔ بندرگاہ ایک ٹیڑھے میڑھے قوس کی شکل میں ساحل سے آگے کی طرف کو نکلا ہوا تھا اور ایک کنکریٹ کی بنی ہوئی گودی سمندر سے اسکی حفاظت کرتی تھی۔ اس تمام منظر سے اوپر کی طرف شہر کے سرے والے چھوٹے چھوٹے سفید بنگلے تھے جو پہاڑ کی ڈھال پر جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ پہاڑ کا سلسلہ سمندر کے قریب پہنچ کر یک بیک ختم ہو جاتا تھا۔

شہر کے باہر اس پرانے پارک میں مکمل خاموشی تھی۔ میپل کی زرد پتیاں ہولے ہولے پارک کے ان راستوں پر گر رہی تھیں جن پر گھاس اگی ہوئی تھی۔

وہ بوڑھا ایرانی گھوڑے گاڑی والا جو پاویل کو شہر سے یہاں تک لایا تھا اپنی اس عجیب سی سواری کے اترتے وقت یہ سوال پوچھے بغیر نہ رہ سکا:

«دوسری دلچسپ سیرگاہوں کو چھوڑکر آپ یہاں ھی کیوں آئے؟ یہاں نہ تو نوجوان خواتین آتی ھیں نہ تفریح کا ھی کوئی سامان ھے۔ یہاں تو بس گیدڑ ھی نظر آتے ھیں... آپ یہاں کیا کرینگے۔ چلئے جناب میں آپکو شہر واپس پہنچا دوں۔»

پاویل نے اسے پیسے دئے اور بوڑھا چپ چاپ گاڑی بڑھا کر چلا گیا۔

وہ پارک سچ مچ ھی بالکل اجاڑ تھا۔ پاویل نے چٹان پر ایک بینچ پڑی دیکھی جہاں سے سمندر کا منظر بہت صاف نظر آتا تھا۔

وہ موسم خزاں کے سورج کی طرف جس میں اب زیادہ تمازت نہیں رہ گئی تھی، منھہ اٹھاکر بیٹھہ گیا۔

وہ اس پرسکون مقام پر اس مسئلے پر غور کرنے آیا تھا کہ اسکی زندگی کا دھارا کس سمت جا رہا تھا اور آگے چل کر اسے کیا کرنا چاھئے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ صورت حال کا جائزہ لیکر کوئی فیصلہ کر لے۔

کیوتسام کے گھر جب وہ دوسری بار گیا تو انکا خاندانی جھگڑا اپنی پوری شدت اور عروج کو پہنچ گیا۔ بوڑھے کو جب اسکے آنے کی خبر ملی تو وہ چراغ پا ھو گیا اور اسنے بہت واویلا مچایا۔ ظاھر ھے کورچاگن کو مقابلے کے لئے پیش پیش رھنا پڑا۔ بوڑھے کو اپنی بیوی اور بیٹیوں سے اسکی توقع نہیں تھی لیکن انہوں نے بھی اسکی زبردست مخالفت کی اور جس دن سے پاویل وھاں آیا وہ گھر دو جنگجو خیموں میں بٹ گیا۔ مکان کے جس حصے میں والدین رھتے تھے اسکے دروازے میں تالا ٹھونک دیا گیا اور کونے والا ایک چھوٹا سا کمرہ کورچاگن کو کرایے پر دے دیا گیا۔ پاویل نے کرایہ پیشگی ادا کر دیا اور اس بات سے بوڑھے کا غصہ کچھہ حد تک ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب چونکہ اس کی بیٹیاں اس سے الگ ھو گئی تھیں اسلئے انکی کفالت کی ذمہ‌داری اس پر عاید نہیں ھوتی تھی۔

البینا کسی مصلحت کے تحت اپنے شوھر کے پاس رھی۔ جہاں تک بوڑھے کا تعلق تھا وہ مکان کے اپنی طرف والے حصے میں ھی رھتا تھا اور جہاں تک ممکن ھوتا تھا اس شخص سے ملنے سے پرھیز کرتا تھا جس سے اسے شدید نفرت ھو گئی تھی۔ لیکن باھر صحن میں وہ حتی‌الامکان زیادہ سے زیادہ شور مچاتا تھا تاکہ یہ ظاھر ھو کہ ابھی تک وھی اس مکان کا مالک ھے۔

کوآپریٹو کی دوکان میں کام شروع کرنے سے پہلے بوڑھا کیوتسام جوتے بناکر اور بڑھئی کا کام کرکے اپنی روزی کماتا تھا۔ اس نے مکان کے پیچھے والے صحن میں ایک چھوٹا موٹا کارخانہ بھی قایم کر رکھا تھا۔ اب محض اپنے کرایہ دار کو پریشان کرنے کے لئے اسنے اپنی کام کرنے کی میز سائبان سے نکال کر صحن میں پاویل کی کھڑکی کے عین نیچے لگا لی اور گھنٹوں وہاں ہتھوڑی سے کھٹ کھٹ کرنا شروع کر دیا۔ یہ جان کر اسے ایک خاص قسم کی کمینہ پن کی تسکین ہوتی تھی کہ وہ کورچاگن کی پڑھائی میں خلل انداز ہو رہا ہے۔

وہ زیرلب اپنے آپ سے کہتا «ٹھہرو بچو! میں تمہیں یہاں سے نکال‌کر ہی دم لونگا...»

دور، بالکل افق پر ایک اسٹیمر پانی کے اوپر دھوئیں کی سیاہ مختصر سی لکیر اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ مرغابیوں کا ایک غول تیز چیخوں کے ساتھہ سمندر پر جھپٹا۔

پاویل ہاتھہ پر اپنی ٹھوڑی ٹکائے خیالات میں گم بیٹھا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اسکی بچپن سے لیکر اب تک کی زندگی کے مناظر بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ اسنے اپنی زندگی کے یہ چوبیس سال کس طرح گزارے تھے؟ آیا بامصرف یا بےمصرف؟ ایک ایک کرکے اسنے اپنی زندگی کے ہر سال کا جائزہ لیا اور انکے متعلق سنجیدہ اور غیر جانب دارانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ جان کر اسے بڑی تقویت حاصل ہوئی کہ کچھہ بھی ہو اسنے اپنی زندگی اتنی بےمصرف نہیں گزاری تھی۔ یقیناً اس سے غلطیاں ہوئی تھیں لیکن وہ نوجوانی کی ناتجربہ‌کاری اور خصوصاً لا علمی کی غلطیاں تھیں۔ لیکن سوویت اقتدار قائم کرنے کی

جدوجہد کے طوفانی دور میں اسنے لڑائی میں پوری طرح حصہ لیا تھا اور انقلاب کے سرخ پرچم پر اسکے خون جگر کے بھی چند قطرے تھے۔

جب تک اسکے جسم میں طاقت رہی وہ لڑنے والوں کی صفوں میں رہا اور اب جبکہ وہ جسمانی طور پر معذور اور محاذ جنگ پر لڑنے سے لاچار تھا اس کے لئے فوجی ہسپتال میں پڑے رہنے کے علاوہ چارہ ھی کیا تھا۔ اسے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب انہوں نے وارسا پر یلغار کی تھی اور اسے اب تک یاد تھا کہ گھمسان لڑائی کے دوران میں کس طرح ایک سپاھی زخمی ھو کر زمین پر گر پڑا تھا اور اپنے گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے آ گیا تھا۔ اسکے ساتھیوں نے جلدی سے اسکے زخموں پر پٹی باندھ کر اسے ہسپتال لے جانے والوں کے حوالے کر دیا تھا اور دشمن کے تعاقب میں اپنے گھوڑے سرپٹ بھگاتے ھوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ میدان جنگ میں گرنےوالے ایک سپاھی کی خاطر پورے دستہ نے اپنے قدم نہیں روکے تھے۔ ھر عظیم مقصد کے لئے جدوجہد کے دوران میں یہی ھوتا ھے اور یہی ھونا بھی چاھئے۔ بے شک اسنے لنگڑے مشین گن چلانے والوں کو مشین گنوں کی گاڑیوں پر بیٹھ کر جنگ کے میدان میں جاتے دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے دشمن کی صفوں کے دل دھلا دئے تھے اور ان کی مشین گنوں نے دشمن کیلئے موت اور تباھی کی بارش کر دی تھی اور انکے آھنی عزم اور نہ چوکنے والے نشانے نے انہیں اپنے دستوں کے لئے باعث فخر بنا دیا تھا۔ لیکن ایسے لوگ گنے چنے ھی تھے۔

اب اسے کیا کرنا تھا جب شکست نے اس کو آن دبوچا تھا، اور اسکے لئے محاذ پر واپس جانے کی کوئی امید باقی نہ رہ گئی تھی؟ کیا بازانووا سے اسنے صاف صاف الفاظ میں یہ معلوم نہیں کر لیا تھا کہ مستقبل میں اسکو اس سے بھی زیادہ بھیانک مصیبتوں کا سامنا

کرنا پڑیگا؟ تو پھر کیا کیا جائے؟ یہ پیچیدہ مسئلہ اسکے سامنے ایک مہیب غار کی طرح منہہ پھاڑے کھڑا تھا۔

اب جبکہ اسکی سب سے محبوب شے، یعنی لڑنے کی صلاحیت، اس سے چھن گئی تھی تو اب وہ کاھے کی خاطر زندہ رھے آج اور آنے والے مسرت سے محروم دنوں میں وہ زندہ رھنے کے لئے کیا جواز پیش کریگا؟ وہ اپنے دن کس طرح گزارے گا؟ کیا وہ صرف سانس لینے اور کھانے پینے کے لئے زندہ رھیگا؟ کیا وہ ایک لاچار تماشبین کی طرح اپنے ساتھیوں کو جدوجہد کرتے ہوئے آگے بڑھتے دیکھتا رھیگا؟ کیا وہ اپنے دستہ پر ایک بار بنا رھیگا؟ کیا یہ بہتر نہیں ھوگا کہ وہ اپنے اس جسم کو ضائع کر دے جس نے اسے دھوکا دیا تھا؟ سینے میں بس ایک گولی کافی ھوگی! اور یہ ایک بامصرف زندگی کا معقول خاتمہ ھوگا۔ اپنی اذیت سے نجات حاصل کرنے پر سپاھی کی کون مذمت کر سکتا ھے؟

اسنے اپنی جیب میں رکھے ھوئے چپٹے سے براؤننگ پستول کو ٹٹولا۔ اس کی انگلیوں نے پستول کا دستہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور پھر اس نے رفتہ رفتہ وہ ھتھیار جیب سے باھر نکالا۔

«کون تصور کر سکتا تھا کہ تمہارا یہ انجام ھوگا؟»

پستول کا دھانہ خاموش حقارت سے اسے گھور رھا تھا۔ پاویل نے پستول اپنے گھٹنے پر رکھہ لیا اور بڑی تلخی سے اپنے آپ پر لعنت ملامت کرنے لگا۔

«میرے دوست، یہ بہت ھی گھٹیا قسم کی اولوالعزمی ھے! گولی تو کوئی بھی احمق اپنے سینے کے پار کر سکتا ھے۔ نجات حاصل کرنے کا یہ سب سے آسان طریقہ ھے لیکن یہ بزدلوں کا طریقہ ھے۔ جب بھی زندگی کی مصیبتیں نا قابل برداشت ھو جائیں تو گولی مار لینا تو سب سے آسان بات ھے۔ لیکن کیا تم نے کبھی

زندگی کی دشواریوں پر قابو پانے کی کوشش کی؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے اس فولادی شکنجے کو توڑکر باہر نکل جانے کی ہر ممکن تدبیر کر لی ہے؟ کیا تم نوووگرادوالنسکی کی لڑائی بھول گئے جب ہم نے ایک دن میں سترہ بار حملہ کیا تھا اور آخرکار تمام دشواریوں کے باوجود فتح ہماری ہی ہوئی تھی؟ پستول واپس رکھه لو اور اس واقعه کا کبھی کسی سے ذکر نه کرنا۔ زندگی ناقابل برداشت ہو جانے پر بھی زنده رهنا سیکھو۔ اپنی زندگی کو کسی مصرف میں لاؤ۔»

وه اٹھه کر سڑک پر چل دیا۔ ایک ادھر سے گزرتے ہوئے پہاڑی سیاح نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ شہر پہنچ کر وه گاڑی سے اترا اور اس نے ایک اخبار خریدا اور دیمیان بیدنی کلب میں شہر کے پارٹی گروپ کی ایک میٹنگ کا اعلان پڑھا۔ پاویل جب گھر واپس پہنچا اس وقت رات کافی بیت چکی تھی۔ اس نے اس میٹنگ میں ایک تقریر بھی کی تھی لیکن اسے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا که اسکے بعد وه کبھی کسی بڑے عام جلسے میں تقریر نہیں کر پائیگا۔

جب وه گھر پہنچا تو تایا اس وقت تک جاگ رہی تھی۔ پاویل کے اتنی دیر تک غائب رهنے کی وجه سے وه کافی پریشان تھی۔ اسے بڑی فکر ہو رہی تھی که آخر اسے ہوا کیا۔ اس دن صبح اسنے پاویل کی آنکھوں میں جو مایوسی اور سختی دیکھی تھی وه اسے اب تک یاد تھی۔ یوں عام طور پر تو اسکی آنکھیں بہت پرجوش اور زندگی کی حرارت سے بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وه کبھی اپنے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن تایا کو ایسا محسوس ہوا که وه کسی شدید ذہنی کشاکش میں مبتلا ہے۔

اسکی ماں کے کمرے میں جس وقت گھڑی نے دو کا گھنٹہ بجایا اسی وقت اس نے باہر کے پھاٹک کی چرچراہٹ سنی اور جلدی سے اپنی جیکٹ پہن کر وہ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھی ـ لولا اپنے کمرے میں سو رہی تھی ـ جب تایا ادھر سے گزری تو وہ سوتے میں کچھہ بڑبڑائی ـ

پاویل جب گیلری میں داخل ہؤا تو تایا نے خوشی اور اطمینان کا سانس لیکر چپکے سے اسکے کان میں کہا «مجھے تو بڑی فکر ہونے لگی تھی ـ»

«تایا، جب تک میں زندہ ہوں تب تک مجھے کچھہ نہیں ہو سکتا» اسنے بھی چپکے سے جواب دیا ـ «لولا کیا سو گئی؟ نہ جانے کیوں مجھے نیند نہیں آ رہی ہے ـ مجھے تم سے کچھہ بات کہنا ہے ـ آؤ تمہارے کمرے میں چلیں، نہیں تو لولا جاگ جائیگی ـ»

تایا کچھہ جھجکی ـ بہت دیر ہو چکی تھی ـ وہ اتنی رات گئے اسے اپنے کمرے میں کیسے آنے دے سکتی تھی؟ بھلا، ماں کیا سوچیگی؟ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے وہ منع بھی نہیں کر سکتی تھی ـ اسے اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ایسی کیا بات کہنا ہوگی ـ

«دیکھو تایا بات یہ ہے» پاویل نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا ـ کمرے کی مدھم روشنی میں وہ اسکے رو برو اتنا قریب بیٹھا ہؤا تھا کہ تایا اسکے سانس کو محسوس کر سکتی تھی ـ «زندگی میں ایسے عجیب و غریب موڑ آتے ہیں کہ کبھی کبھی تو حیرت ہونے لگتی ہے ـ پچھلے کچھہ دنوں سے میں بہت پریشان رہا ہوں ـ میری سمجھہ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میں کس لئے زندہ رہوں ـ مجھے زندگی اتنی تاریک کبھی نظر نہیں آئی جتنی ادھر پچھلے کچھہ دنوں کے عرصے میں ـ لیکن آج میں نے اپنے ذاتی ،پارٹ بیورو، کی ایک میٹنگ کی اور اس میں ایک بہت

اھم فیصلہ کیا۔ میں جو کچھ کہنے والا ھوں اس پر تعجب نہ کرنا۔»

اس نے تایا کو بتایا کہ پچھلے کچھ مہینوں میں اسکی زندگی میں کیا کیا واقعات پیش آئے تھے اور ابھی شام کو پارک میں بیٹھے بیٹھے اسکے دماغ میں جو خیالات آئے تھے وہ بھی اسنے کافی حد تک اسے بتا دئے۔

«تو صورت یہ ھے۔ اب میں سب سے اھم بات پر آتا ھوں۔ تمہارے گھر میں ابھی طوفان کی ابتدا ھے۔ ھم لوگ یہاں سے کہیں کھلی فضا میں بھاگ چلیں۔ اس دوزخ سے جتنا دور ممکن ھو ھمیں چلا جانا چاھئے۔ ھمیں زندگی بالکل نئے سرے سے شروع کرنا چاھئے۔ اب میں نے اس جھگڑے میں ھاتھہ ڈالا ھے تو اسے ختم کرکے ھی دم لونگا۔ ھماری زندگی، تمہاری بھی اور میری بھی، اس وقت کافی ناخوشگوار ھے۔ میں نے اس میں کچھہ حرارت پھونکنے کا فیصلہ کیا ھے۔ جانتی ھو میرا کیا مطلب ھے؟ کیا تم میری رفیقۂ حیات، میری بیوی بنوگی؟»

تایا دم سادھے اسکی بات سن رھی تھی۔ اسکے ان آخری الفاظ پر وہ چونک پڑی۔

«میں تم سے ابھی آج رات ھی اسکا جواب نہیں چاھتا» پاویل کہتا رھا۔ «تم اس سوال پر اچھی طرح غور کر لو۔ شاید تمہاری سمجھہ میں یہ نہیں آ رھا ھوگا کہ عام لوگوں کی طرح پہلے عشق کا اظہار کئے بغیر میں نے یہ بات اس طرح بےدھڑک کیسے کہہ دی۔ لیکن میرے اور تمہارے درمیان اس قسم کی خرافات کی کوئی ضرورت نہیں ھے۔ یہ لو میں تمہیں اپنا ھاتھہ دیتا ھوں ننھی لڑکی۔ اگر تم مجھہ پر اعتماد کروگی تو میں کبھی مایوس ھونے کا موقع نہیں دونگا۔ ھم دونوں ایک دوسرے کو بہت کچھہ دے سکتے

ہیں۔ تو میں نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ ہمارا معاہدہ اس وقت تک عمل میں رہیگا جب تک تم ایک سچی انسان، ایک سچی بالشویک نہ بن جاؤ۔ اگر اس سلسلے میں میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکا تو میں دو کوڑی کا بھی آدمی نہیں۔ اس وقت تک ہم اپنے اس معاہدے کو نہیں توڑینگے۔ لیکن جب تم سمجھ دار ہو جاؤ گی تب تمہارے اوپر کوئی پابندی عائد نہیں رہ جائیگی۔ اس عرصے میں کون جانے کیا ہو جائے؟ ممکن ہے میں جسمانی طور پر بالکل ہی شکستہ ہو جاؤں۔ اس حالت میں یاد رکھنا کہ تمہیں کسی بھی طرح اپنے آپ کو میری وجہ سے پابند نہ سمجھنا چاہئے۔»

وہ چند لمحوں کے لئے چپ ہو گیا۔ پھر اس نے محبت سے بھرے ہوئے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ «اور فی الحال میں تمہیں اپنی دوستی اور محبت دیتا ہوں۔»

اسنے مطمئن ہوکر اسکی انگلیاں اپنے ہاتھوں میں لے لیں گویا وہ اپنی رضامندی ظاہر کر چکی ہو۔

«کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ تم مجھے کبھی نہیں چھوڑوگے؟»

«تایا میں تمہیں صرف قول دے سکتا ہوں۔ یہ یقین کرنا تم پر منحصر ہے کہ میرے ایسے لوگ پنے دوستوں کے ساتھ بےوفائی نہیں کرتے... اور میں بھی یہ امید کرتا ہوں کہ میرے دوست میرے ساتھ بےوفائی نہیں کرینگے» اسنے بڑی تلخی سے کہا۔

«میں فوراً تو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ یہ سوال بالکل اچانک میرے سامنے آیا ہے» تایا نے جواب دیا۔

پاویل اٹھ کھڑا ہوا۔

«سو جاؤ تایا۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو جائیگی۔»

وہ خود اپنے کمرے میں جاکر کپڑے اتارے بغیر ہی بستر پر لیٹ گیا اور تکئے پر سر رکھتے ہی اسے نیند آ گئی۔

پاویل کے کمرے میں کھڑکی کے قریب والی میز پر پارٹی کی لائبریری کی کتابوں، اخباروں اور کئی کاپیوں کا ڈھیر لگا تھا جن میں پاویل نے اپنے نوٹ لکھہ رکھے تھے۔ اسکے علاوہ کمرے میں ایک پلنگ، دو کرسیاں اور دیوار پر چین کا ایک بڑا سا نقشہ تھا۔ یہ نقشہ اسکے اور تایا کے کمرے کے درمیان والے دروازے کے اوپر لگا ہوّا تھا اور اس پر سیاہ اور سرخ رنگ کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ مقامی پارٹی کمیٹی کے ساتھیوں نے پاویل کو کتابیں اور رسالے پہنچاتے رهنے کا وعدہ کیا تھا اور انہوں نے شہر کی سب سے بڑی پبلک لائبریری کے ناظم کو یہ ہدایت دے دینے کا وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اسے اسکی ضرورت کی تمام کتابیں فراهم کر دیا کرے۔ تھوڑے هی عرصے بعد کتابوں کے بڑے بڑے پارسل آنے لگے۔ لولا کو اس پر بڑی حیرت تھی کہ وہ کس طرح بہت سویرے هی سے اپنی کتابیں لیکر بیٹھہ جاتا تھا اور دن بھر پڑھتا رهتا اور نوٹ بناتا رهتا اور صرف ناشتے اور کھانے کے لئے تھوڑی تھوڑی دیر کو اٹھتا تھا۔ شام کے وقت وہ اپنا وقت ان دو لڑکیوں کے ساتھہ گزارتا تھا اور دن بھر جو پڑھتا تھا وہ انہیں بتاتا تھا۔

آدھی رات کے بہت بعد تک بھی بوڑھا کیوتسام اس ناخوشگوار مہمان کے کمرے کے دروازے کی درز میں سے روشنی هوتی دیکھتا۔ وہ دبے پاؤں کھڑکی تک جاتا اور درز میں سے اندر جھانک کر دیکھتا کہ وہ سر جھکائے میز پر بیٹھا هے۔

«سب شریف آدمی اس وقت سو جاتے هیں مگر یہ هے کہ تمام رات روشنی جلائے رکھتا هے۔ معلوم هوتا هے کہ گھر کا مالک یہی هے۔ جب سے یہ آیا هے لڑکیاں بالکل هاتھہ سے نکل گئی هیں» بوڑھا اپنے کمرے میں واپس جاتے هوئے بڑبڑاتا جاتا۔

آٹھ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسکے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں تھی اور اسے کسی کام پر حاضری نہیں دینا پڑتی تھی۔ وہ اپنے وقت کا پورا پورا استعمال کرتا تھا اور اتنے اشتیاق سے پڑھتا تھا جیسے صرف وہی شخص پڑھ سکتا ہے جس نے حال ہی میں علم کی اہمیت جانی ہو۔ وہ دن میں اٹھارہ گھنٹے پڑھتا تھا۔ یہ کہنا تو دشوار تھا کہ اسکی صحت اتنی محنت کب تک برداشت کر سکتی تھی لیکن ایک دن تایا نے یوں ہی ایک ایسی بات کہہ دی جس نے حالات بالکل بدل دئے۔

«میں نے تمہارے کمرے کے دروازے کے سامنے سے الماری ہٹا دی ہے۔ اگر کبھی مجھ سے بات کرنے کو جی چاہے تو سیدھے اندر آ جایا کرو۔ اب تمہیں لولا کے کمرے سے ہوکر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔»

پاویل کے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تایا بھی خوش ہوکر مسکرا دی۔ انکا معاہدہ پکا ہو گیا تھا۔

بوڑھے کو اب کونے والے کمرے کی کھڑکی کی درز میں سے روشنی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ بلکہ تایا کی ماں اب اپنی بیٹی کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک دیکھنے لگی جو ایک ایسی خوشی کا پتہ دیتی تھی جسے چھپانا اسکے لئے ناممکن تھا۔ اسکی آنکھوں کے نیچے سیاہی کے حلقے بے خواب راتوں کا ثبوت دیتے تھے۔ اب اکثر اس چھوٹے سے گھر میں تایا کے گانے یا گٹار بجانے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ اسکی اس مسرت میں غم کی آمیزش نہ رہی ہو۔ اسکی بیدارشدہ جوانی ان کے باہمی تعلقات کی خفیہ نوعیت کے خلاف بغاوت کرتی تھی۔ ہر آواز پر اسکا دل کانپ جاتا تھا اور اسے ایسا خیال ہوتا کہ جیسے اس نے اپنی ماں کے قدموں کی آہٹ سنی ہو۔ اگر ان لوگوں نے پوچھا کہ میں اپنے کمرے کے

دروازے کی کنڈی رات کے وقت اندر سے کیوں بندکر لیتی ہوں تو کیا ہوگا؟ یہ خیال اس کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔

پاویل کو اسکے اندیشوں کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا اسلئے اس نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

«تم ڈرتی کس بات سے ہو؟» وہ بڑی محبت سے اس سے کہتا۔ «آخر یہاں میرا اور تمہارا راج ہے۔ بے فکر ہوکر سوؤ۔ ہم دونوں کی زندگی میں کوئی دخل انداز نہیں ہو سکتا۔»

وہ مطمئن ہوکر اپنے محبوب کے گلے میں باہیں ڈال کر اسکے سینے پر اپنے گال رکھکر سو جاتی۔ وہ لیکن جاگتا رہتا اور اسکی سانس کا ہم آہنگ زیرو بم سنتا رہتا رہتا اور بالکل خاموش پڑا رہتا کہ کہیں اسکی نیند میں خلل نہ پڑ جائے۔ اسکے تمام وجود پر اس لڑکی کے لئے محبت کا ایک جذبہ چھا جاتا جس نے اپنی زندگی اسے سونپ دی تھی۔

تایا کی آنکھوں کی چمک کا سبب سب سے پہلے لولا نے دریافت کیا۔ اور اسی دن سے دونوں بہنوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہو گئی اور انکے تعلقات بگڑتے گئے۔ جلد ہی ماں کو بھی پتہ چل گیا۔ پتہ تو خیر کیا چلا کہنا چاہئے کہ وہ تاڑ گئی۔ اور اسے اس بات سے بڑی پریشانی ہوئی۔ اسے کورچاگن سے اسکی توقع نہیں تھی۔

«تایا اس کے لئے مناسب بیوی نہیں ہے» اس نے لولا سے کہا۔ «میری تو سمجھہ میں نہیں آتا کہ اسکا کیا انجام ہوگا؟»

اسکے ذہن میں طرح طرح کے پریشان کن اندیشے پیدا ہونے لگے لیکن وہ کورچاگن سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

نوجوان لوگ پاویل سے ملنے آنے لگے اور کبھی کبھی تو اتنے لوگ آ جاتے تھے کہ اس چھوٹے سے کمرے میں سب سما بھی نہ

سکتے تھے۔ انکی گفتگو کی آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناھٹ کی طرح بوڑھے کے کانوں تک پہنچتی اور اکثر تو وہ لوگ ساتھہ ملکر گانے لگتے:

یہ بپھرا ھوا سا سمندر
گرجتا رھیگا یوں ھی رات دن...

اور پھر پاویل کا محبوب گانا:

غم کے اشکوں میں ڈوبا ھے سارا جہاں...

یہ نوجوان مزدوروں کا تعلیمی حلقہ تھا۔ پاویل کے مسلسل اصرار پر کہ اسے پروپیگنڈے کا کوئی کام دیا جائے پارٹی کمیٹی نے اسے ان مزدوروں کی تعلیم کا کام سونپا تھا۔ پاویل کے دن اسی طرح گزرتے رھے۔

ایک بار پھر اسنے پتوار مضبوطی سے اپنے ھاتھہ میں تھام لئے تھے اور اسکی زندگی کا سفینہ کئی بار نہایت خطرناک انداز میں ڈگمگاکر اب ایک نئے راستے پر آگے بڑھہ رھا تھا۔ اس کا پڑھائی اور علم کے ذریعہ ایک بار پھر لڑنے والوں کی صفوں میں واپس پہنچ جانے کا خواب اب شرمندہ تعبیر ھونے والا تھا۔

لیکن زندگی اسکی راہ میں روڑے ڈالتی ھی رھی اور وہ ھر رکاوٹ کو بڑی تلخی کے ساتھہ دیکھتا تھا کیونکہ ان سے منزل تک پہنچنے کا وقت ٹلتا جاتا تھا۔

ایک دن وہ بدنصیب طالب علم جارج ماسکو سے شادی کرکے اپنی بیوی کے ساتھہ واپس آیا۔ وہ اپنے خسر کے ساتھہ ٹھہرا تھا جو وھیں کا ایک بیرسٹر تھا اور وھاں سے بیٹھے بیٹھے وہ اپنی ماں کو پیسوں کے لئے بار بار تقاضے بھیجنے لگا۔

جارج کے آنے سے کیوتسام کے گھر کا جھگڑا اور بھی بڑھہ گیا۔ جارج بلا جھجک اپنے باپ کی طرف ھو گیا اور اپنے سسرال

والوں کی مدد سے، جنکا رجحان سوویت دشمنی کی طرف تھا، وہ کورچاگن کو گھر سے نکالنے اور تایا کو اس سے تعلقات ختم کرنے پر راضی کرنے کی خفیہ ترکیبیں کرنے لگا۔

جارج کے آنے کے دو ھفتے بعد لولا کو ایک دوسرے شہر میں کام مل گیا اور وہ اپنی ماں اور بیٹے کو لیکر چلی گئی۔ اسکے کچھہ ھی دن بعد پاویل اور تایا وھاں سے بہت دور سمندر کے ساحل پر واقع ایک شہر میں جاکر بس گئے۔

آرتیم کو اپنے بھائی کے خط کبھی کبھی ھی ملتے تھے لیکن ان نادر موقعوں پر جب شہر کی سوویت میں اپنی میز پر وہ اس جانی پہچانی تحریر والا لفافہ دیکھتا تو وہ ایک ایسے جذبے کے ساتھہ اس خط کو پڑھتا جو عام طور پر اس میں نہیں پایا جاتا تھا۔ آج بھی لفافہ کھولتے وقت اس نے بڑی محبت سے سوچا:

«آہ پاویل۔ کاش تم میرے پاس رھتے۔ برادر تمھارے مشورے سے مجھے بہت فائدہ پہنچتا...» وہ خط پڑھنے لگا:

«آرتیم، میں تمھیں اس خط کے ذریعہ بتانا چاھتا ھوں کہ پچھلے کچھہ دنوں میں مجھہ پر کیا گزری ھے۔ میں یہ باتیں تمھارے سوا اور کسی کو نہیں لکھتا۔ لیکن میں جانتا ھوں کہ میں تمھیں اپنے ھر راز میں شریک کر سکتا ھوں کیونکہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ھو اور مجھے سمجھہ سکتے ھو۔

صحت کے محاذ پر زندگی مجھے بری طرح کچلے جا رھی ھے اور مجھہ پر ایک کے بعد دوسری کاری ضرب لگا رھی ھے۔ ایک حملے سے اچھا ھوکر میں اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں ھونے پاتا ھوں کہ دوسرا اس سے بھی بے رحم وار مجھے پھر لٹا دیتا ھے۔ سب سے تکلیف دہ بات تو یہ ھے کہ مجھہ

میں بیماری سے لڑنے کی طاقت نہیں رہی۔ پہلے تو میرے بائیں بازو نے حرکت کرنا بند کر دیا اور گویا اتنا کافی نہیں تھا میرے پاؤں نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے۔ میں یوں بھی بڑی مشکل سے چل پھر پاتا تھا (وہ بھی کمرے کے اندر) لیکن اب تو مجھے پلنگ سے میز تک رینگ کر جانے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ میری حالت ابھی اور بھی خراب ہو جائے۔ میرے مستقبل میں کیا لکھا ہے کوئی نہیں بتا سکتا۔

میں اب گھر سے کبھی نہیں نکلتا اور میری کھڑکی سے سمندر کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے زیادہ عبرتناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ کسی کا جسم اسکے ساتھہ دغا کرے اور اسکا حکم ماننے سے انکار کرے لیکن اسکا دل بالشویک کا دل ہو، ایک ایسے بالشویک کا دل جسکے دل میں کام کرنے کی لگن ہو، جو اس طوفانی سیلاب میں محاذ پر آگے بڑھنے والے سپاہیوں کے کندھے سے کندھا ملاکر چلنا چاھتا ہو؟

مجھے اب بھی یقین ہے کہ میں پھر لڑنے والوں کی صف میں واپس آ جاؤنگا۔ اور جلد ہی حملہ کرنے والوں کی سنگینوں میں ایک سنگین میری بھی ہوگی۔ اور مجھے اس بات کا یقین ہونا بھی چاھئے۔ مجھے یہ یقین چھوڑ دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ دس برس تک پارٹی نے اور کومسومول نے مجھے لڑنا سکھایا ہے اور ہمارے رہنما کے الفاظ جو انہوں نے ہم سب کے لئے کہے تھے میرے اوپر بھی پوری طرح لاگو ہوتے ہیں: «کوئی قلعہ ایسا نہیں ہے جسے بالشویک سر نہ کر سکتے ہوں۔»

اب میرا تمام وقت پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ کتابیں، کتابیں، بس کتابوں کے علاوہ اور کچھہ بھی نہیں۔ آرتیم اس عرصے میں میں نے بہت کچھہ کر لیا ہے۔ میں تمام کلاسیکی ادب کا مطالعہ کر چکا ہوں اور خط وکتابت کے ذریعہ کمیونسٹ یونیورسٹی کا پہلے سال کا امتحان بھی پاس کر چکا ہوں۔ شام کے وقت میں کمیونسٹ نوجوانوں کا اسٹڈی سرکل لیتا ہوں۔ انہیں نوجوان ساتھیوں کے ذریعہ پارٹی تنظیم کی عملی سرگرمیوں سے میں اپنا تعلق قایم رکھتا ہوں۔ اور پھر تایا ہے جسکی سیاسی تعلیم اور عام معلومات بڑھانے کی میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ اور اسکے علاوہ میری زندگی میں میری پیاری بیوی کی محبت اور اسکا پیار ہے۔ تایا اور میں بہترین دوست ہیں۔ ہماری گرھستی بہت سیدھی سادی ہے۔ مجھے بتیس روبل پنشن ملتی ہے۔ اسکے علاوہ تایا بھی کچھہ کما لیتی ہے۔ ہم دونوں کا کام بڑی اچھی طرح چل جاتا ہے۔ تایا بھی وھی راہ طے کر رھی ہے جس پر چل کر میں پارٹی میں آیا تھا۔ کچھہ عرصے تک وہ ایک جگہ گھر کا کام کاج کرتی تھی اور اب وہ ایک گورنمنٹ ہوٹل میں برتن دھونے کا کام کرتی ہے۔ (اس شہر میں کوئی صنعت نہیں ہے۔)

کل اسنے بڑے فخر کے ساتھہ مجھے اپنا پہلا ڈیلیگیٹ کا کارڈ دکھایا جو اسے عورتوں کے محکمہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ محض دفتی کا ایک ٹکڑا نہیں ہے۔ میں اس میں ایک نئی زندگی کی نمو دیکھتا ہوں اور اس نمو میں میں پوری مدد کر رہا ہوں۔ اسکا اگلا قدم یہ ہوگا کہ وہ کسی بڑے کارخانے میں کام کرنے لگے جہاں محنت کشوں کی ایک بڑی جماعت کے درمیان اسے رفتہ رفتہ سیاسی پختگی حاصل ہوگی۔ لیکن یہاں اس کے لئے ایک ھی راستہ ہے اور وہ اس پر چل رھی ہے۔

تایا کی ماں دو بار ہم سے ملنے آ چکی ہے۔ غیرشعوری طور پر وہ تایا کو ایک تنگ اور محدود زندگی میں واپس کھینچ لے جانے کی کوشش کر رہی ہے جو حقیقت کو ذاتی انفرادیت پسند نقطۂ نظر سے دیکھنے کی وجہ سے دب کر اور گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ میں نے البینا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی پر مصائب زندگی کا تاریک سایہ اپنی بیٹی کی راہ عمل پر نہ ڈالے۔ مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن ماں اپنی بیٹی کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کریگی اور اس وقت اس سے ٹکر لینا لازمی ہو جائیگا۔ پیار اور محبت کے ساتھہ

تمہارا بھائی

پاویل۔»

اولڈ ماتسیستا میں سینیٹوریم نمبر ۵ ...یہ ایک تین منزلی پکی عمارت ہے جو پہاڑ کو کاٹ کر ہموار کی ہوئی زمین پر بنی ہوئی ہے۔ چاروں طرف گھنے جنگل ہیں اور یہاں سے ایک چکردار سڑک بل کھاتی ہوئی سمندر تک جاتی ہے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں اور گندھک کے چشموں کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھہ کمرے میں آتی ہے۔ پاویل کورچاگن اپنے کمرے میں اکیلا ہے۔ کل نئے مریض آئیں گے تب اسکے کمرے میں بھی ایک ساتھی ہو جائیگا۔ کھڑکی کے باہر اسے قدموں کی آہٹ اور ایک جانی پہچانی آواز سنائی دیتی ہے۔ کئی لوگ باتیں کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ لیکن وہ بھاری گونجتی ہوئی آواز اس نے پہلے کہیں سنی ہے۔ اس کے حافظے کے نیم تاریک گوشوں میں ایک نام کہیں چھپا ہوا تھا لیکن وہ اسے بالکل بھولا نہیں تھا۔ آواز سنتے ہی یہ نام اسے یاد آیا «لیدینیف انوکنتی پاولووچ۔ یقیناً وہی ہے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔»

پاویل نے پورے یقین کے ساتھ اپنے دوست کو پکارا اور ایک لمحے بعد ھی لیدینیف اسکے پلنگ کے قریب کھڑا بڑے تپاک سے اس سے ھاتھ ملا رھا تھا۔

«کورچاگن ابھی تک پورے دم خم سے چل رھا ھے؟ اچھا تمہارا کیا حال چال ھے؟ خدانہ خواستہ کہیں تم نے بھی صحیح معنوں میں بیمار پڑنے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا ھے؟ اس طرح کام نہیں چلیگا! تمہیں مجھ سے سبق لینا چاھئے۔ ڈاکٹروں نے مجھے بھی طاق پر رکھ دینے کی کوشش کی تھی لیکن گویا محض انکو جلانے کے لئے میں اچھا خاصہ گھوم رھا ھوں۔» اور لیدینیف جی کھول کر ھنس پڑا۔

لیکن اس ھنسی کے پیچھے چھپی ھوئی ھمدردی اور رنج پاویل سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

وہ دونوں دو گھنٹے تک ساتھ رھے۔ لیدینیف نے پاویل کو ماسکو کی تازہ ترین خبریں بتائیں۔ اس کی زبانی پاویل کو پہلے پہل پارٹی کے ان اھم فیصلوں کی اطلاع ملی جو کھیتی باڑی کو اجتماعی شکل دینے اور گاؤں کی زندگی کو نئے سرے سے منظم کرنے کے سلسلے میں کئے گئے تھے اور پاویل ایک ایک لفظ بڑے اشتیاق سے سنتا رھا۔

«میں تو سمجھ رھا تھا کہ تم اپنے وطن یوکرین میں کسی جگہ زندگی میں حرکت اور حرارت پیدا کر رھے ھوگے» لیدینیف نے کہا۔ «تمہیں دیکھ‌کر تو مجھے بڑی مایوسی ھوئی۔ لیکن فکر نہ کرو۔ میری حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ میں اب عمر بھر کبھی بستر سے اٹھ نہیں پاؤں‌گا لیکن دیکھو میں اچھا خاصہ چلنے پھرنے لگا ھوں۔ آجکل زندگی کو آرام اور سکون سے بیٹھ‌کر گزارنا ناممکن ھے۔ کسی طرح ایسا ھو ھی نہیں سکتا! میں تسلیم کرتا ھوں کہ کبھی کبھی میں سوچتا ھوں کہ اگر تھوڑا سا آرام کرنے کو مل جائے، بس دم اپنے بھر کی فرصت

مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اب میں پہلے کی طرح نوجوان تو رہا نہیں اور دن میں دس دس بارہ بارہ گھنٹے کام کرنا اب میرے لئے کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے۔ میں کچھ دیر اس مسئلے پر غور کرتا ہوں اور بوجھ کو کچھ ہلکا کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں لیکن ہمیشہ نتیجہ وہی ہوتا ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا اور گلے گلے تک کام میں ڈوب جاتا ہوں۔ آدھی رات سے پہلے گھر پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ مشین جتنی طاقتور ہوتی ہے اسکے پہیے اتنا ہی تیز چلتے ہیں۔ اور ہم لوگوں کی رفتار تو دن بہ دن تیز ہوتی جا رہی ہے اسلئے ہم بوڑھے لوگوں کو ہر دم جوان رہنا پڑتا ہے۔»

لیدینیف نے اپنی چوڑی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور بڑی ملائمیت سے کہا:

«اچھا اب مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔»

پاویل نے پیچھلی ملاقات کے وقت سے اب تک کے تمام حالات اسے سنائے اور جس وقت وہ باتیں کر رہا تھا اسنے محسوس کیا کہ اسکا دوست اسے بڑی محبت اور پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

چھت کے ایک کونے میں سایہ دار درختوں کے نیچے سینی ٹوریم کے کچھ مریض ایک چھوٹی سی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اپنی گھنی بھویں سکیڑکر «پراودا» پڑھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ رنگ کی روسی قمیص، پرانی ٹوپی، بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور اندر کو دھنسی ہوئی نیلی آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ کانوں میں کام کرنے والا کارآزمودہ مزدور تھا۔ خرسانف چرنوکوزوف بارہ سال پہلے کانوں میں کام کرنا چھوڑکر ایک اہم سرکاری عہدے پر تعینات ہو گیا تھا لیکن ایسا معلوم

ہوتا تھا جیسے وہ ابھی کان میں سے نکلا ہو۔ اسکے برتاؤ، اسکی چال اور اسکے لہجے ہر چیز سے اسکے پیشے کا پتہ چلتا تھا۔

چرنوکوزوف علاقائی پارٹی بیورو کا ممبر تھا اور حکومت کا رکن بھی تھا۔ ایک تکلیف‌دہ مرض اسکے جسم سے ساری طاقت نچوڑے لے رہا تھا۔ چرنوکوزوف کی ایک ٹانگ میں ناسور ہو گیا تھا اور اسے اپنی اس ٹانگ سے نفرت تھی کیونکہ اسکی وجہ سے وہ پچھلے چھہ مہینوں سے بستر سے لگا ہوا تھا۔

اسکے سامنے ژیگاریوا اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔ الیکزانڈرا الیکسیئونا ژیگاریوا کی عمر سینتیس سال کی تھی اور وہ انیس برس سے پارٹی کی ممبر تھی۔ «دھات مزدور شوروچکا۔» یہ نام اسکے پیٹرس‌برگ کی حفیہ تحریک کے ساتھیوں نے اسے دیا تھا۔ وہ ابھی لڑکی ہی سی تھی کہ اسے جلاوطن کرکے سائبیریا بھیج دیا گیا تھا۔

اس محفل کا تیسرا فراد پانکوف تھا۔ اسکے چہرے کی ساخت بہت ہی خوبصورت تھی اور اسکا یک رخی چہرہ بالکل کسی بت‌تراش کی صناعی کا شاہکار معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے کوئی جرمن رسالہ پڑھنے میں مصروف تھا بس بیچ بیچ میں اپنا موٹے فریم والا چشمہ درست کرنے کے لئے ہی اس کا ہاتھہ اٹھتا تھا۔ اس تیس سالہ نوجوان کو، جسکا جسم کسی کسرتی نوجوان کا سا معلوم ہوتا تھا، اپنا مفلوج پاؤں گھسیٹ کر چلتے ہوئے دیکھہ کر بڑا افسوس ہوتا تھا۔ وہ مدیر اور مصنف تھا اور آجکل وزارت تعلیم میں کام کرتا تھا۔ وہ یورپ کے معاملات کے بارے میں مستند معلومات رکھتا تھا اور کئی زبانیں جانتا تھا۔ وہ بہت عالم شخص تھا اور چرنوکوزوف تک، جو عام طور پر بہت الگ تھلگ رہتا تھا، اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔

«تو تمہارے کمرے میں یہ تمہارے ساتھہ رہتے ہیں؟» ژیگاریوا نے پاویل کورچاگن کی کرسی کی طرف سر سے اشارہ کرکے چرنوکوزوف سے چپکے سے پوچھا۔

چرنوکوزوف نے اخبار سے نظر ہٹاکر دیکھا اور بھویں فوراً سیدھی ہو گئیں۔

«ہاں۔ وہی کورچاگن ہے۔ تم تو اسے جانتی ہوگی شورا۔ بڑا افسوس ہے کہ بیماری کی وجہ سے وہ لاچار ہو گیا ہے ورنہ اس لڑکے سے ہمیں بڑی مدد مل سکتی تھی۔ وہ کومسومول تنظیم کی ابتدا سے ہی اس میں شامل تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اسے تھوڑا سا سہارا دیں— جسکا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے— تو وہ اب بھی کام کر سکتا ہے۔»

پانکوف بھی چرنوکوزوف کی بات سن رہا تھا۔

«اسے کیا بیماری ہے؟» شورا ژیگاریوا نے دھیرے سے پوچھا۔

«خانہ جنگی کے زمانے کی دین ہے۔ ریڑھہ کی ہڈی میں کوئی خرابی آ گئی ہے۔ میں نے یہاں کے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ اسنے مجھے بتایا کہ اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ بالکل ہی مفلوج ہو جائے۔ بیچارہ!»

« میں اسے یہاں لئے آتی ہوں» شورا نے کہا۔

یہ انکی دوستی کی ابتدا تھی۔ پاویل کو اس وقت اسکا گمان بھی نہیں تھا کہ ژیگاریوا اور چرنوکوزوف اسے اتنے عزیز ہو جائیں گے اور آئندہ اسکی بیماری میں وہی اسکے سب سے بڑے سہارے ہونگے۔

زندگی حسب دستور چلتی رہی۔ تایا کام کرتی تھی اور پاویل اپنی پڑھائی میں لگا رہتا تھا۔ قبل اسکے کہ وہ تعلیمی حلقوں کا کام دو بارہ شروع کر سکتا اس کے سر پر ایک نئی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا اور اسکی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئیں۔ اب صرف اسکا داھنا ھاتھہ اسکے حکم کا پابند رہ گیا تھا۔

اس نے جھنجھلاکر اپنا ھونٹ اتنے زور سے کاٹ لیا کہ خون چھلک آیا اور کئی بار کوشش کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ھل جل نہیں سکتا۔ تایا کو اس بات کی بڑی کوفت تھی کہ وہ اسکی کوئی مدد نہیں کر سکتی لیکن وہ اپنی مایوسی اور تلخی کو بڑی بہادری سے چھپائے رھی۔ لیکن پاویل نے نہایت شرمندگی کے ساتھہ مسکراتے ھوئے کہا:

«تایا مجھے اور تمہیں اب الگ ھو جانا چاھئے۔ ھمارے معاھدے میں یہ شامل نہیں تھا۔ ننھی لڑکی، میں آج اس پر اور اچھی طرح غور کر لونگا۔»

لیکن تایا نے اسے اور آگے کچھہ نہ کہنے دیا۔ وہ سسک سسک کر رونے لگی یہاں تک کہ اسکی ھچکیاں بندھہ گئیں اور اسنے اسکے سینے میں اپنا منہہ چھپا لیا۔

جب آرتیم کو اپنے بھائی کی تازہ‌ترین مصیبت کا پتہ چلا تو اسنے اپنی ماں کو خط لکھا۔ ماریا یاکوولیونا سب کچھہ چھوڑ چھاڑ کر فوراً اپنے بیٹے کے پاس گئی۔ اب وہ تینوں ساتھہ رھنے لگے۔ تایا اور اسکی بوڑھی ساس میں شروع سے ھی بہت بننے لگی۔

تمام مشکلوں کے باوجود پاویل نے اپنی پڑھائی جاری رکھی۔

جاڑے کے دنوں میں ایک دن شام کو تایا نے آکر اپنی پہلی کامیابی کی خبر سنائی۔ وہ شہر کی سوویت کی ممبر چن لی گئی تھی۔ اسکے بعد سے پاویل کو اس سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ سینی‌ٹوریم کے باورچی‌خانے میں دن بھر کام کرنے کے بعد جہاں وہ برتن دھونے کے لئے ملازم تھی وہ سیدھے سوویت کے دفتر چلی جاتی تھی اور رات میں بہت دیر کو تھکی ھوئی لوٹتی تھی لیکن وہ اپنے نئے تجربات کے جوش میں مگن ھوتی تھی۔ تھوڑے ھی دن بعد وہ پارٹی کی ممبری کی امیدواری کے لئے عرضی دینے والی تھی اور وہ بڑے اشتیاق اور امید کے ساتھہ اس دن کیلئے تیاریاں

کر رہی تھی جس کے لئے وہ اتنے عرصے سے منتظر تھی۔ اسی عرصے میں مصیبت نے ان پر ایک اور حملہ کیا۔ پاویل کا مسلسل بڑھتا ہوا مرض چپکے چپکے اپنا کام کر رہا تھا۔ پاویل کی داھنی آنکھه میں یک بیک ایک شدید جلن اور درد پیدا ہوا جو بڑی رفتار سے بائیں آنکھه میں بھی پھیل گیا۔ اسکی آنکھوں پر ایک سیاہ پردہ سا چھا گیا اور اسکے آس پاس کی تمام چیزیں اسکی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ اور اپنی زندگی میں پہلی بار پاویل کو اس بات کا احساس ہوا کہ مکمل طور پر اندھا ہو جانا کتنی خوفناک بات ہے۔

اسکی راہ میں ایک نئی رکاوٹ چپ چاپ آکر کھڑی ہو گئی تھی اور اسکا آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ یہ رکاوٹ بہت ہی خوفناک اور ناقابل عبور معلوم ہوتی تھی۔ تایا اور پاویل کی ماں پر تو اس کی وجہ سے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن اسنے نہایت ٹھنڈے دل سے فیصلہ کیا:

«میں کچھه دن اور انتظار کر کے دیکھوں‌گا کہ کیا ہوتا ہے۔ اگر آگے بڑھنے کا کوئی امکان باقی نہ رہ گیا اور اگر اندھے ہو جانے کی وجہ سے میری لڑنے والوں کی صفوں میں واپس پہنچنے کی تمام کوششوں پر پانی پھر گیا ہے تو میں اس قصہ کو ختم ہی کر دونگا۔»

پاویل نے اپنے دوستوں کو خط لکھے اور انہوں نے جواب میں اسے ہمت رکھه‌کر جد و جہد جاری رکھنے کے لئے لکھا۔

اسکی اسی شدید جد و جہد کے زمانے میں ایک دن تایا بہت خوش خوش گھر آئی اور اسنے اعلان کیا:

«پاولوشا، میں پارٹی کی امیدوار ممبر ہو گئی۔»

وہ بڑے جوش کے ساتھه مرکزے کی اس میٹنگ کا حال بیان کر رہی تھی جس میں اسکی عرضی منظور کی گئی تھی۔ پاویل بڑے

غور سے سن رہا تھا اور اسے پارٹی میں داخل ہونے کی اپنی ابتدائی منزلیں یاد آ رہی تھیں۔

«تو کامریڈ کورچاگنا ہم دونوں اب ایک کمیونسٹ جتھا بن گئے» پاویل نے اسکا ہاتھہ دباتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن پاویل نے پارٹی کی ضلع کمیٹی کے سکریٹری کو خط لکھہکر درخواست کی کہ وہ آکر اس سے مل جائے۔ اسی دن شام کو کیچڑ میں بھری ہوئی ایک موٹر گھر کے باہر آکر رکی اور ایک منٹ بعد ہی والمر نام کا ایک ادھیڑ عمر کا لاطویائی شخص، جسکی پھیلی ہوئی ڈاڑھی اسکے کانوں تک پہنچ رہی تھی، کھڑا پاویل سے ہاتھہ ملا رہا تھا۔

«کہو کیا حال چال ہے؟ آخر تمہاری منشا کیا ہے؟ جلدی سے اچھے ہو جاؤ ہم لوگ تمہیں گاؤں میں کام کرنے کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں» اسنے بہت جی کھولکر ہنستے ہوئے کہا۔

وہ دو گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا۔ اسے ایک کانفرنس میں شریک ہونا تھا جسکا اسے کوئی خیال ہی نہیں رہا۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا اور پاویل کی پراصرار درخواست سنتا رہا کہ اسے کوئی کام دیا جائے۔

«پڑھنے پڑھانے کی بات چھوڑو» پاویل کے بول چکنے کے بعد اسنے کہا۔ «تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کو تمہاری آنکھوں کے بارے میں بھی کچھہ کرنا چاہئے۔ ممکن ہے اب بھی کچھہ کیا جا سکتا ہو۔ ماسکو جاکر کسی بڑے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ سوچ لو...»

لیکن پاویل نے بیچ ہی میں اسکی بات کاٹ دی:

«کامریڈ والمر، مجھے انسانوں کی ضرورت ہے زندہ، گوشت پوست کے، انسانوں کی۔ اب سے پہلے مجھے کبھی انکی اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی کہ اب ہے۔ میں اس طرح اکیلا نہیں رہ سکتا۔

میرے پاس نوجوانوں کو بھیج دیا کرو، ایسے نوجوانوں کو جنہیں سب سے کم تجربہ ہو۔ گاؤں میں وہ لوگ حد سے آگے بڑھ‌کر بائیں بازو کی گمراھیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اجتماعی کھیتوں سے انہیں تسکین نہیں ہوتی۔ وہ کمیون منظم کرنا چاہتے ہیں۔ تم تو کومسومولوں کو جانتے ہو کہ اگر انہیں قابو میں نہ رکھا گیا تو اسکا خطرہ ہے کہ وہ لوگ بھاگ کر باقی فوج سے بہت آگے نکل جائیں۔ میں خود اسی قسم کا تھا۔»

والمر اسکی یہ بات سنکر حیران رہ گیا۔

«تمہیں اس بات کی اطلاع کیسے ملی؟ آج ہی تو دیہات سے یہ خبر آئی ہے۔»

پاویل مسکرا دیا۔

«میری بیوی نے مجھے بتایا۔ شاید آپ اسے جانتے ہوں۔ وہ ابھی کل ہی پارٹی میں بھرتی کی گئی ہے۔»

«کون۔تمہارا مطلب کورچاگنا سے ہے وہ جو برتن صاف کرنے کا کام کرتی ہے؟ اچھا تو وہ ہے تمہاری بیوی! مجھے یہ نہیں معلوم تھا!» وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا پھر اس نے اپنے ماتھے پر اس انداز میں ہاتھہ مارا گویا اسے کوئی ترکیب سوجھی ہو۔ «اچھا اب میری سمجھہ میں آیا کہ تمہارے پاس کسے بھیجا جائے۔ لیو برسینیف کو۔ تمہارے لئے بہترین ساتھی رھیگا۔ وہ بالکل تمہاری پسند کا آدمی ہے اور تم دونوں کی اچھی نبھہ جائیگی۔ بالکل ویسے ہی جیسے دو ٹرانس‌فارمر، ایک دوسرے سے میل کھا جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں میں بجلی کا مستری تھا اور یہ تمام بجلی سے متعلق لفظ اسی زمانے سے میری زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ لیو تمہارے لئے جوڑ جاڑکر ایک ریڈیو بنا دیگا۔ وہ اس قسم کے کاموں میں بہت ماہر ہے۔ میں تو اکثر کن‌فون کان پر چڑھائے دو دو بجے رات تک اسکے گھر پر بیٹھا رہتا ہوں۔

میری بیوی کو تو مجھہ پر شبہہ ہونے لگا۔ مجھہ سے پوچھنے لگی کہ آخر میں اتنی رات گئے تک کہاں غائب رہتا ہوں۔»

کورچاگن مسکرا دیا۔

«برسینیف کون ہے؟» اس نے پوچھا۔

والمر کمرے میں ٹہلنا بند کر کے بیٹھہ گیا۔

«وہ ہمارا وکیل ہے حالانکہ بس ایسا ہی وکیل ہے جیسا کہ میں ناچنے والا ہوں۔ ابھی کچھہ عرصہ پہلے تک وہ ایک اہم عہدے پر کام کر رہا تھا۔ ۱۹۱۲ ء سے تحریک میں ہے اور انقلاب کے زمانے سے پارٹی کا ممبر ہے۔ خانہ جنگی کے زمانے میں وہ دوسری گھوڑسوار فوج کی انقلابی عدالت پر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وھایٹ گارڈوں کو چن چن کر ختم کیا جا رہا تھا۔ وہ زارتسن میں بھی تھا اور جنوبی مورچے پر بھی۔ پھر کچھہ عرصے تک وہ جمہوریۂ مشرق بعید کی اعلی فوجی عدالت کا جج رہا۔ وہاں اسے بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرکار اسے دق ہو گئی۔ وہ مشرق بعید سے یہاں کاکیشیا چلا آیا۔ شروع میں تو وہ ایک گبرنیا کی عدالت کے صدر اور علاقے کی عدالت کے نائب صدر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ لیکن پھر اسکی پھیپھڑوں کی تکلیف نے اسے بالکل ہی چور کر دیا۔ اسکے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ یہاں آکر کچھہ آرام کرے یا پھر بالکل ہی امید چھوڑ دے۔ ہم لوگوں کا تو فائدہ ہی ہو گیا کہ ایسا اچھا وکیل ہمیں مل گیا۔ بہت اچھا کام ہے۔ نہ زیادہ محنت ہے نہ ہنگامہ۔ بالکل اسی کے لائق کام ہے۔ ہاں تو پھر لوگوں نے رفتہ رفتہ اسے ایک مرکزے کو سیاسی تعلیم دینے کے کام کے لئے گھیرا۔ اسکے بعد وہ ضلع کمیٹی میں بھی چن لیا گیا۔ اور پھر قبل اسکے کہ اسے اپنے کام کے بوجھہ کا احساس ہوتا اسے ایک سیاسی اسکول کی ذمہ‌داری سونپ دی گئی اور اب اسے کنٹرول کمیشن میں رکھہ دیا گیا ہے۔ تمام پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کے لئے جتنے بھی

کمیشن مقرر کئے جاتے ھیں انمیں وہ لازمی طور پر رکھا جاتا ھے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ وہ شکار بھی کھیلنے جاتا ھے، ریڈیو کا بیحد شوقین ھے اور حالانکہ اس کا صرف ایک ھی پھیپھڑا کام کرتا ھے لیکن اسے دیکھکر کوئی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا۔ اس میں کام کرنے کا حوصلہ بےانتہا ھے۔ اسکی موت یقیناً ضلع کمیٹی اور عدالت کے راستے میں ھی کہیں ھوگی۔»

پاویل نے اسکی بات بیچ ھی میں کاٹ دی۔

«آخر آپ لوگ اس پر اتنا کام کیوں لاد دیتے ھیں؟» اسنے ترشی سے پوچھا۔ «یہاں تو اسے پہلے کے مقابلے میں بھی زیادہ کام کرنا پڑ رہا ھے۔»

والمر نے اسکو تمسخرانہ انداز میں دیکھا اور کہا:

«اور اگر میں ایک اسٹڈی سرکل تمہارے سپرد کر دوں اور کچھہ اور کام بھی دے دوں تو لیو بھی یقیناً یہی کہیگا۔ ‹آخر تم اس پر اتنا بوجھہ کیوں لاد رہے ھو؟› لیکن خود وہ یہی کہتا ھے کہ ھسپتال میں پانچ برس تک بستر پر پڑے رھنے کے مقابلے میں وہ ایک سال تک جٹکر کام کرنا کہیں بہتر سمجھتا ھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ جب تک ھم سوشلزم کی تعمیر مکمل نہیں کر لینگے تب تک ھم اپنے ساتھیوں کی ٹھیک سے دیکھہ بھال نہیں کر سکتے۔»

«یہ بالکل سچ ھے۔ میں بھی پانچ برس تک پڑے پڑے سڑتے رھنے کے مقابلے میں سال بھر تک سرگرمی سے کام کرنے کو کہیں بہتر سمجھتا ھوں۔ لیکن کبھی کبھی ھم نہایت غیرذمہداری کے ساتھہ اپنی کام کرنے کی قوت ضائع کرتے ھیں۔ مجھے اب اس بات کا پوری طرح احساس ھو گیا ھے کہ یہ بہادری کا ثبوت اتنا نہیں ھے جتنا نا اھلیت اور غیر ذمہداری کا ھے۔ اب جاکر مجھے اس بات کا احساس ھونے لگا ھے کہ مجھے اپنی صحت کے بارے میں اتنی احمقانہ غیر ذمہداری برتنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ میں اب اس بات

کو سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی بہادری نہیں تھی۔ اگر میں اس گمراہ کن جفاکشی میں مبتلا نہ رہتا تو شاید میں کچھ اور عرصے تک کام کرنے کے لائق رہ سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں بائیں بازو کی طفلانہ مہم بازی ہمارے لئے سب سے بڑے خطروں میں سے ایک ہے۔»

«ابھی تو یہ کہہ رہا ہے» والمر نے اپنے دل میں سوچا۔ «لیکن ذرا اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانے دو اور پھر کام کے آگے یہ ہر چیز بھول جائیگا» لیکن اسنے کچھ کہا نہیں۔

دوسرے دن شام کو لیو برسینیف آیا۔ وہ آدھی رات تک پاویل کے پاس بیٹھا رہا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اسے اپنا کوئی برسوں کا چھوٹا ہوا بھائی مل گیا ہو۔

صبح کچھ لوگ کورچاگن کے مکان کی چھت پر ریڈیو کا ایریل لگاتے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے اور لیو مکان کے اندر ریڈیو سیٹ لگانے میں مصروف تھا اور ساتھ ہی وہ پاویل کو اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات سنا رہا تھا۔ پاویل اسے دیکھ تو نہ سکتا تھا لیکن تایا کے بیان سے اسنے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا ایک لمبا سا نوجوان تھا اور اسکی حرکات و سکنات میں ایک اضطراری انداز تھا۔ اور پاویل نے پہلی ملاقات کے وقت اسکے بارے میں عین مین یہی قیاس کیا تھا۔

شام ہوتے ہی کمرے کے دھندلکے میں تین ,والو، چمکنے لگے۔ لیو نے نہایت فاتحانہ انداز میں کن‌فون پاویل کے حوالے کر دیا۔ فضا میں کئی آوازیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہوکر گونج رہی تھیں۔ بندرگاہ کے ٹرانس‌مٹر چڑیوں کی طرح چہچہا رہے تھے اور کچھ ہی فاصلے پر سمندر میں جاتے ہوئے ایک جہاز کے وائرلیس سے اشارتی زبان کی صوتی لہریں رواں ہو رہی تھیں۔ لیکن آوازوں اور شور کے اس گرداب میں سے جو ایک دوسرے میں خلط ملط

حرارت اور محبت تھی۔ لیکن اس وقت وہ صرف اسکی بیوی تھی، محض رفیقہ حیات تھی۔ لیکن اب وہ اسکی شاگرد اور پارٹی کامریڈ بھی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ تایا میں سیاسی اعتبار سے جتنی پختگی آتی جائیگی اتنا ھی کم وقت وہ اسے دے پائیگی اور اسنے اس ناگزیر حقیقت کے سامنے سر جھکا دیا۔

اسے ایک اسٹڈی گروپ کا کام سونپ دیا گیا اور ایک بار پھر شام کے وقت مکان میں مختلف لوگوں کی آوازوں کی چہل پہل رہنے لگی۔ نوجوانوں کے ساتھہ گزاری ہوئی گھڑیوں نے اسکے جسم میں نئی توانائی اور قوت حیات پھونک دی تھی۔

باقی وقت ریڈیو سننے میں صرف ھوتا تھا۔ کھانے کے وقت کن‌فون کو اس سے چھڑانا اسکی ماں کے لئے دشوار ھو جاتا تھا۔

اسکے اندھے ھو جانے کی وجہ سے جو کچھہ اس سے چھن گیا تھا وہ ریڈیو نے اسے پھر لوٹا دیا۔ معلومات حاصل کرنے کے موقع اور تحصیل علم کے شدید اور تمام زندگی پر چھائے ہوئے جذبہ کی وجہ سے وہ اپنے جسم کا تکلیف دہ درد اور اپنی آنکھوں کی سخت جلن اور وہ تمام اذیتیں بھول جاتا تھا جو بےرحم زندگی نے اس پر لاد دی تھیں۔

جب ریڈیو پر میگنی‌تاسترائی سے ان نوجوان کمیونسٹوں کے کارناموں کی خبریں آئیں جو اسکے بعد کی نسل کے تھے تو پاویل کا دل خوشی سے بھر گیا۔

وہ بےرحم برفانی طوفانوں اور بھوکے بھیڑیوں کے غول جیسے خطرناک یورال کے پالے کا تصور کرتا۔ اپنے تصور میں وہ گرجتی ہوئی آندھیوں کی آواز سنتا اور زبردست برف باری کے درمیان اسے کارخانے کی دیوھیکل عمارتوں کی چھت پر تیز بتیوں کی روشنیوں میں کومسومولوں کی دوسری پود کا ایک دستہ کام کرتا ھوا

نظر آتا جو اس دیو قامت کارخانے کے تعمیرشدہ حصوں کو برف باری کی زد سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس جد و جہد کے مقابلے میں جنگل میں ریل کی تعمیر کا کام کتنا چھوٹا معلوم ہوتا تھا جس پر کیئف کے کومسومولوں کی پہلی نسل نے قدرت کی تباہ کاریوں کے خلاف لڑتے ہوئے کام کیا تھا۔ ملک بہت ترقی کر گیا تھا، اور اس کے ساتھ ملک کے لوگ بھی۔

اور دریائے دنیپر کا تند دھارا فولاد کے بند کو توڑکر انسانوں اور مشینوں کو بہا لے گیا تھا۔ اور اس بار پھر کومسومول کے نوجوان اس سیلاب کو روکنے کے لئے میدان میں کود پڑے تھے اور دو دن کی شدید جد و جہد کے بعد انہوں نے دریا کے تند دھارے کو قابو میں کر لیا تھا۔ اس عظیم جد و جہد میں کومسومولوں کی ایک نئی پود سب سے آگے تھی۔ اور اس جد و جہد کے سورماؤں میں پاویل نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے پرانے ساتھی اگنات پانکراتوف کا نام سنا۔

نواں باب ۹

ماسکو میں پہلے چند دنوں تک وہ لوگ ایک ادارے کے دستاویز خانہ کی عمارت میں رہے جسکا صدر پاویل کو ایک خاص کلینک میں داخل کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اب پاویل کو اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ جب اس میں نوجوانی تھی اور جب اسکا جسم تنومند تھا تب بہادری دکھانا کس قدر آسان تھا۔ اب جبکہ زندگی نے اسے اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا اپنے قدم جمائے رکھنا اسکے لئے عزت کا سوال ہو گیا تھا۔

پاویل کو ماسکو آئے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ یہ اٹھارہ مہینے اس نے ناقابل بیان تکلیف میں گزارے تھے۔

آنکھ کے ہسپتال میں پروفیسر آورباخ نے پاویل کو بالکل صاف صاف بتا دیا تھا کہ اسکی بینائی واپس آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ آگے چل کر جب سوزش اور ورم نہیں رہ جائینگے تب شاید پتلیوں کا آپریشن کرنا ممکن ہو۔ تب تک کے لئے سوزش اور ورم کو بڑھنے سے روکنے کے لئے انہوں نے عارضی طور پر ایک آپریشن کرنے کا مشورہ دیا۔

جب پاویل کی اجازت لی گئی تو اسنے ڈاکٹروں سے کہہ دیا کہ اس سلسلے میں جو کچھ بھی ضروری ہو کیا جائے۔

آپریشن کی میز پر اسے کئی گھنٹے پڑا رہنا پڑا۔ ڈاکٹر اسکے درقی غدود نکالنے کے لئے اسکے حلق میں نشتر دے رہے تھے۔ اس عرصے میں تین بار اسے ایسا محسوس ہوا گویا موت کے سیاہ شہپروں نے اسے چھو لیا ہو۔ لیکن پاویل بڑی مضبوطی سے زندگی سے چمٹا رہا۔ تایا اپنے محبوب کو کئی گھنٹے کی کربناک ذہنی کشمکش کے بعد دیکھتی تو اسے اسکے چہرے پر موت کی سی زردی نظر آتی لیکن وہ اسے زندہ اور ہمیشہ کی طرح نرم، پرسکون اور سلیم الطبع پاتی تھی۔

«جان من فکر نہ کرو، مجھے مارنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو محض طبیب ایسکولاپیس کے ان عالم فاضل جان نشینوں کی معلومات اور اندازوں کو جھٹلانے کے لئے ہی میں زندہ رہونگا اور ہنگامہ بپا کرتا رہوں گا۔ وہ لوگ میری صحت کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ بالکل صحیح ہے لیکن جب وہ یہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ میں کام کے قطعی ناقابل ہو گیا ہوں تو یہ انکی بہت بڑی بھول ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ کس کا خیال ٹھیک ہے۔»

پاویل نئی زندگی کی تعمیر کرنے والوں کی صفوں میں شامل ہونے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ اب وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

سردیاں ختم ہو گئی تھیں اور بہار اپنے پورے حسن کے ساتھہ آ گئی تھی اور گویا کھڑکی کے راستے پاویل کے کمرے میں بھی داخل ہو گئی تھی۔ ایک اور آپریشن سے زندہ بچ نکلنے کے بعد پاویل نے فیصلہ کیا کہ حالانکہ وہ بہت کمزور تھا لیکن وہ ہسپتال میں اور زیادہ دن نہیں رھیگا۔ اتنے مہینوں تک اتنی زیادہ انسانی اذیت و مصیبت کے درمیان رھنا، اور روتے ھوئے انسانوں سے گھرا رھنا جنکے زندہ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی خود اپنی تکلیف برداشت کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ دشوار تھا۔

اسلئے جب دوسرے آپریشن کی تجویز پیش کی گئی تو اسنے صاف جواب دے دیا:

«نہیں بس بہت ھو چکا۔ میں سائنس کی خدمت میں اپنا کافی خون دے چکا ھوں۔ جو تھوڑا بہت بچ رھا ھے اسے میں دوسرے کاموں میں استعمال کرنا چاھتا ھوں۔»

اسی دن پاویل نے مرکزی کمیٹی کو ایک خط لکھا۔ خط میں اس نے لکھا کہ چونکہ ڈاکٹری علاج کی تلاش میں اسکا ادھر ادھر گھومتے رھنا اب قطعی بیکار ھے اسلئے وہ ماسکو میں ھی رھنا چاھتا ھے جہاں اسکی بیوی اب کام کر رھی تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ پارٹی سے مدد کی درخواست کر رھا تھا۔ اسکی درخواست منظور کر لی گئی اور ماسکو کی سوویت نے اسکے لئے رھنے کی جگہ کا انتظام کردیا۔ پاویل کو ھسپتال چھوڑتے وقت یہ قوی امید تھی کہ اب وہ شاید کبھی وھاں لوٹ کر نہ آئے۔

کروپاتکنسکایا اسٹریٹ کی ایک خاموش گلی کا وہ چھوٹا سا معمولی کمرہ اسے نہایت آرامدہ معلوم ھوٗا۔ اور اکثر رات کے وقت پاویل اپنے بستر پر لیٹا ھوٗا سوچتا رھتا کہ کیا سچ مچ اب ھسپتالوں سے اسکا ھمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ گیا ھے لیکن اسے بڑی مشکل سے اس بات پر یقین آتا تھا۔

تایا اب پوری پارٹی ممبر ہو گئی تھی - وہ بہت اچھی کارکن تھی اور اپنی ذاتی زندگی کے المیہ کے باوجود وہ کارخانے کے اچھے سے اچھے مزدوروں سے کم رفتار سے کام نہیں کرتی تھی - اس خاموش اور منکسر مزاج نوجوان عورت کو کارخانے کی ٹریڈ یونین کمیٹی کا ممبر چنکر اسکے ساتھہ کے مزدوروں نے اسکے لئے اپنی عزت کا ثبوت دیا - پاویل کو اپنی بیوی پر بڑا فخر تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ایک سچی بالشویک بنتی جا رہی تھی اور اس وجہ سے وہ اپنی تکلیف زیادہ آسانی سے برداشت کر سکتا تھا -

باژانووا کسی کام سے ماسکو آئی تھی اور وہ اس سے بھی ملنے آئی - وہ دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے - مستقبل قریب میں لڑنے والوں کی صف میں دوبارہ واپس جانے کے بارے میں اسے اپنے منصوبے بتاتے وقت جیسے پاویل میں پھر زندگی آ گئی -

باژانووا نے پاویل کی کنپٹی کے پاس سفید ہوتے ہوئے بالوں کو دیکھہ کر نرمی سے کہا:

«میں دیکھتی ہوں کہ تم نے کافی مصیبتیں برداشت کی ہیں لیکن تمہارے جوش میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی ہے - تم اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہو؟ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ تم نے اس کام کو شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے جسکی تم پچھلے پانچ برسوں سے تیاری کر رہے تھے - لیکن تم یہ کام کس طریقے سے کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟»

پاویل بڑے اعتماد کے ساتھہ مسکرایا -

«کل میرے دوست میرے لئے ایک قسم دفتی کا اسٹینسل لا دینگے تاکہ لکھتے وقت سطریں ٹیڑھی نہ ہونے پائیں - اسکے بغیر میرے لئے لکھنا ناممکن تھا - بہت کافی سوچنے کے بعد مجھے یہ ترکیب سوجھی - تم سمجھیں نا - دفتی کے سخت کناروں کی وجہ سے میری

پنسل سیدھی سطر سے بہکنے نہیں پائیگی ـ یہ تو صحیح ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے لکھنا بہت مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں ہے ـ میں اسے آزما کر دیکھہ چکا ہوں اسلئے میں جانتا ہوں ـ مجھے اسکی مشق کرنے میں کافی وقت لگ گیا لیکن اب میں خاصا سنبھال کر لکھنے لگا ہوں تاکہ حروف صاف ہوں اور عبارت پڑھی جا سکے ـ »

اور اس طرح پاویل نے کام کرنا شروع کر دیا ـ

اس نے اپنے ذہن میں اولوالعزم اور سورما کوتوفسکی ڈویژن کے بارے میں ایک ناول کا خاکہ تیار کیا تھا ـ ناول کا نام خود بہ‌خود تجویز ہو گیا ـ «طوفان کے پالے ہوئے ـ»

اب اسکی تمام زندگی اس کتاب کی تصنیف کے لئے وقف تھی ـ رفتہ رفتہ سطریں صفحات کی شکل اختیار کرتی گئیں ـ وہ اپنے چاروں طرف کے ماحول سے بےخبر کام میں جٹا رہتا تھا ـ وہ تصورات کی دنیا میں کھو گیا تھا اور اپنی زندگی میں پہلی بار اسے تخلیق کی دشواریوں سے دو چار ہونا پڑا ـ اسے پہلی بار اسکا احساس ہوا کہ فنکار کو کتنی سخت مایوسی ہوتی ہے جب ایسے واضح اور ناقابل فراموش مناظر جنہیں وہ بڑی آسانی سے تصورکر سکتا ہے کاغذ پر منتقل ہوتے ہی بے جان اور پھیکے معلوم ہونے لگتے ہیں ـ

اسے اپنی تحریر کا ایک ایک لفظ زبانی یاد رکھنا پڑتا تھا ـ ذرا سے بھی خلل سے اسکے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا تھا اور اسکے کام کی رفتار دھیمی پڑ جاتی تھی ـ اپنے بیٹے کا کام دیکھہ‌کر ماں کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے تھے ـ

کبھی کبھی اسے پورے پورے صفحات اور باب کے باب اپنی یادداشت سے زور زور سے پڑھنا پڑتے تھے اور ایسے ہی موقعوں پر اسکی ماں کو کبھی کبھی یہ ڈر ہونے لگتا تھا کہ اسکے بیٹے کا دماغ خراب ہوتا جا رہا ہے ـ کام کرتے وقت اسے پاویل کے پاس

آنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن فرش پر گرے ہوئے صفحات کو سمیٹتے وقت وہ دبی زبان سے اتنا ضرور کہتی تھی:

«بیٹا پاولوشا ـ تم کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے ـ میں تو نہیں سمجھتی کہ اس طرح ہر وقت لکھتے رہنا تمہارے لئے مفید ہے...»

اپنی ماں کے اندیشوں پر وہ خوب جی کھول کر ہنستا اور اپنی بوڑھی ماں کو یقین دلاتا کہ اسکے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسکا دماغ ابھی خراب نہیں ہوا ہے ـ

اسکی کتاب کے تین باب مکمل ہو گئے تھے ـ پاویل نے انہیں اپنے کوتوفسکی ڈویژن کے پرانے مجاہد ساتھیوں کے پاس انکی رائے معلوم کرنے کے لئے اودیسا بھیج دیا ـ اور تھوڑے ہی دن بعد اسے ایک خط ملا جس میں اسکی تصنیف کی بڑی تعریف کی گئی تھی ـ لیکن واپسی کے وقت وہ مسودہ ڈاک میں کہیں کھو گیا ـ چھہ ماہ کی محنت پر پانی پھر گیا ـ اسکے لئے یہ ایک زبردست دھکا تھا ـ اسے بڑا افسوس ہو رہا تھا کہ اسنے کتاب کی واحد نقل کیوں بھیج دی تھی ـ جب لیدینیف کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اسنے پاویل کو بہت برا بھلا کہا:

«میری سمجھہ میں نہیں آتا کہ تم نے ایسی لاپرواھی کی حرکت کی کیسے؟ لیکن غم نہ کرو ـ جو ہونا تھا ہو گیا اب پچھتانے سے کیا فائدہ ـ تم پھر سے اپنا کام شروع کرو ـ»

«لیکن انوکنتی پاولووچ! میری تو چھہ مہینے کی محنت پر پانی پھر گیا ـ میں نے روز آٹھہ آٹھہ گھنٹے کی سخت محنت کے بعد وہ مسودہ تیار کیا تھا ـ لعنت ہے ان حرام خوروں پر!»

لیدینیف نے اپنے دوست کو تسلی دینے کی پوری کوشش کی ـ

نئے سرے سے کام شروع کرنے کے علاوہ چارہ ھی کیا تھا۔ لیدینیف نے اسکے لئے کاغذ لا دیا اور مسودہ ٹائپ کرانے کا بھی انتظام کرا دیا۔ چھه ھفتے بعد پہلا باب دوبارہ لکھهکر تیار ھوگیا۔

جس گھر میں کورچاگن رھتا تھا اسی میں الیکسئیف نام کا ایک خاندان بھی رھتا تھا۔ اس خاندان کا سب سے بڑا بیٹا الیکزاندر کومسومول کی ایک ضلع کمیٹی کا سکریٹری تھا۔ اسکی بہن گالیا جو اٹھارہ سال کی ایک چنچل سی لڑکی تھی فیکٹری ٹریننگ اسکول میں تعلیم پاتی تھی۔ پاویل نے اپنی ماں کے ذریعه اس سے دریافت کرایا که کیا وہ «سکریٹری» کی حیثیت سے اسکی مدد کر سکتی ھے۔ گالیا فوراً راضی ھو گئی۔ وہ اسی دن نہایت خوشگوار انداز میں مسکراتی ھوئی آئی اور اسے یه جان کر بڑی مسرت ھوئی که پاویل ایک ناول لکھه رھا تھا۔

«کامریڈ کورچاگن آپکی مدد کرنے میں مجھے عین مسرت ھوگی» اسنے کہا۔ «میں اپنے پاپا کے لئے اجتماعی رھایشی مکانوں میں صفائی رکھنے کے بارے میں جو بےرنگ گشتی چٹھیاں لکھتی ھوں اسکے مقابلے میں تو یه کام کہیں زیادہ دلچسپ ھوگا۔»

اس دن سے پاویل کے کام کی رفتار بہت تیز ھو گئی اور ایک مہینے میں اتنا کام پورا ھوگیا که پاویل کو خود بڑی حیرت ھوئی۔ گالیا کی پرجوش شرکت اور ھمدردی کی وجه سے پاویل کو بڑی مدد ملی۔ اسکی پنسل بڑی روانی سے کاغذ پر سرسراتی رھتی تھی اور جب کبھی کوئی ٹکڑا اسے بہت پسند آتا تھا تو وہ اسے کئی بار پڑھتی تھی اور پاویل کی کامیابی پر اسے دلی خوشی ھوتی تھی۔ اس گھر میں شاید وھی اکیلی ایسی تھی جسے پاویل کے کام پر اعتماد تھا۔ باقی لوگ سوچتے تھے که اس کا کوئی نتیجه نه نکلیگا اور پاویل محض اپنے اوپر عائدشدہ بیکاری کے لمحات کو پر کرنے کے لئے یه سب کچھه کر رھا ھے۔

لیدینیف کسی کام سے کچھ عرصے کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا تھا ۔ ماسکو واپس لوٹنے پر اسنے کتاب کے پہلے چند باب پڑھے اور کہا:

«دوست اسی طرح اپنا کام جاری رکھو ۔ مجھے کوئی شبہہ نہیں ہے کہ فتح تمہاری ہی ہوگی ۔ کامریڈ پاویل جلد ہی تمہیں مسرتوں کا خزانہ مل جائیگا ۔ مجھے پکا یقین ہے کہ تمہارا لڑنے والوں کی صفوں میں واپس پہنچنے کا خواب جلد ہی پورا ہو جائیگا ۔ میرے بچے ہمت نہ هارنا ۔»

وہ بوڑھا اس بات پر نہایت مطمئن ہوکر وہاں سے گیا کہ پاویل میں کام کرنے کا اتنا جوش باقی ہے ۔

گالیا پابندی کے ساتھہ آتی رہی اور اسکی پنسل بڑی روانی سے کاغذ پر دوڑتی ہوئی ناقابل فراموش ماضی کے مناظر کو پھر زندہ کرتی گئی ۔ جتنی دیر پاویل اپنے خیالات میں کھویا ہؤا لیٹا رہتا اور ماضی کی یادوں کے سیلاب میں بہنے لگتا اتنی دیر گالیا اسکی کانپتی ہوئی پلکوں کو دیکھتی رہتی، جو خیالات اسکے ذہن میں تیزی سے گزرتے ہوتے انکا عکس اسکی آنکھوں میں صاف نظر آتا تھا ۔ اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ آنکھیں جنکی صاف اور بے داغ پتلیاں زندگی سے اتنی بھری ہوئی تھیں دیکھنے سے لاچار تھیں ۔

دن بھر کا کام ختم ہو جانے پر وہ لکھا ہوا تمام حصہ پڑھہ کر سناتی تھی اور پاویل اپنی پیشانی پر بل ڈالے ہوئے بڑے غور سے سنتا رہتا تھا ۔

«کامریڈ کورچاگن آپ کی پیشانی پر بل کیوں ہیں؟ یہ ٹکڑا تو اچھا ہے ۔ ہے نا؟»

«نہیں گالیا یہ برا ہے ۔»

جو صفحات اسے پسند نہیں آتے تھے انہیں وہ خود دوبارہ لکھتا تھا ۔ اسٹینسل کی پتلی سی پٹی کی وجہ سے اسکے کام میں

بڑی دشواری ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو وہ جھنجھلاکر اسے دور پھینک دیتا تھا — اور پھر اپنی زندگی سے نالاں اور خفا ہوکر، کہ اسنے اسکی بینائی چھین لی تھی، وہ پنسل توڑ دیتا تھا اور اپنے ہونٹوں کو اتنے زور سے کاٹتا تھا کہ خون نکل آتا تھا —

جیسے جیسے کام ختم ہونے کے قریب آتا گیا ممنوع جذبات اسکی محتاط قوت ارادی کی حدیں توڑکر اکثر اس پر غالب آنے لگے — یہ ممنوع جذبات غم اور اسی قسم کے دوسرے سیدھے سادے نرم اور لطیف جذبات تھے جنکے محسوس کرنے کا اسکے علاوہ سب کو حق تھا — لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ان میں سے کسی کا بھی شکار ہوا تو نتائج بہت المناک ہونگے —

تایا شام کو جب بہت دیر سے فیکٹری سے گھر لوٹ کر آتی تو اسے کام میں مصروف پاتی اور دبی زبان میں اپنی ساس ماریا یاکوولیونا سے مختصر سی گفتگو کرکے وہ سونے چلی جاتی تھی تاکہ پاویل کے کام میں خلل نہ پڑے —

آخرکار آخری باب بھی مکمل ہو گیا — اسکے بعد چند دن تک گالیا کتاب زور زور سے پڑھکر پاویل کو سناتی رہی —

کل مسودہ پارٹی کی علاقائی کمیٹی کے تہذیبی محکمہ کے پاس لینن گراڈ بھیج دیا جائیگا — اور اگر کتاب وہاں منظور کر لی گئی تو وہ ناشروں کے پاس بھیج دی جائیگی — اور پھر...

اس خیال کے آتے ہی فکر و اشتیاق کے ملے جلے جذبات کی وجہ سے اسکے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی — اگر اس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی تو اسکی نئی زندگی کی ابتدا ہو جائیگی، ایک ایسی زندگی کی جو اسنے برسوں کی مسلسل اور سخت محنت کے بعد حاصل کی تھی —

اس کتاب کی تقدیر پر خود پاویل کی تقدیر کے فیصلہ کا انحصار تھا۔ اگر مسودہ نامنظور کر دیا گیا تو اسکی تمام امیدیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔ لیکن اگر اسکے برخلاف اسکے کچھہ جزو خراب ثابت ہوئے اور انکی خامیاں تھوڑی سی محنت سے درست کرنا ممکن ہوا تو وہ ایک بار پھر نئے سرے سے دشواریوں پر یلغار کریگا۔

اسکی ماں مسودے کا پارسل ڈاک خانے لے گئی۔ اور اسکے بعد مضطربانہ اور مشتاقانہ انتظار کا زمانہ شروع ہوا۔ پاویل نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی امید و بیم کی اس کربناک کیفیت میں کسی خط کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اسکا تمام وقت صبح اور شام کی ڈاک کے انتظار میں گزرنے لگا۔ لیکن لینن‌گراڈ سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔

ناشروں کی اس طویل خاموشی سے اسکی تشویش اور بڑھتی گئی۔ دن بہ دن اس تباہ‌کن حادثے کا خطرہ بڑھتا ہی گیا اور پاویل نے یہ تسلیم کر لیا کہ اگر اسکا مسودہ نامنظور کر دیا گیا تو اسکی کمر ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائیگی۔ اور وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اسکے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جائیگا۔

ایسے موقعوں پر اسے سمندر کے کنارے کی پہاڑی والے پارک کی یاد آتی تھی اور وہ بار بار اپنے آپ سے وہی سوال کرتا تھا:

«کیا تم نے اس فولادی جال کو توڑکر باہر نکلنے اور لڑنے والوں کی صفوں میں دوبارہ پہنچنے کی اور اپنی زندگی کو بامصرف بنانے کی پوری کوشش کر لی ہے؟»

اور اسے یہی جواب دینا پڑتا تھا «ہاں مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے ہر ممکن کوشش کر لی ہے!»

آخر کار جب انتظار کا کرب تقریباً ناقابل برداشت حد تک پہنچ گیا تو ایک دن اسکی ماں، جسکی امید و بیم کی ذہنی کشمکش اپنے

بیٹے سے کسی حالت میں کم نہیں تھی، کمرے میں بھاگتی ہوئی داخل ہوئی اور چلائی:

«لینن گراڈ سے خبر آئی ہے!»

علاقائی کمیٹی کا تار آیا تھا۔ تار کے فارم پر ایک مختصر سا پیغام لکھا ہؤا تھا: «ناول بہت زیادہ پسند کیا گیا ناشروں کو بھیج دیا گیا ہے کامیابی کے لئے مبارک باد۔»

اسکا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی برسوں کی مراد پوری ہو گئی تھی۔ فولادی شکنجہ ٹوٹ کر چور چور ہو گیا تھا اور اب ایک نئے ہتھیار سے مسلح ہو کر وہ پھر لڑنے والوں کی صفوں میں اور زندگی میں واپس آ گیا تھا۔